سنگسار

سلمیٰ کنول

"بی جی! صاحباں نے تیسری بار انھیں پکارا اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد اُسی بلند آواز میں بولی "آپ کی قمیص مکمل کر دی ہے۔ بس اب جلدی سے پہن کر دکھا دیجئے کہ کیسی لگ رہی ہے۔"

کئی لمحے وہ ان کے جواب کا انتظار کرتی رہی، مگر اب بھی خاموشی ہی ملی۔ اس کے سامنے ہی تو وہ اپنے کمرے میں گئی تھیں، پھر اس کی کسی بھی آواز یا بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھیں ——؟ دل میں تشویش سی لئے وہ اُٹھ کر اُن کے کمرے کی طرف چل دی۔

"ارے ——!" دہلیز میں ہی اس کے قدم جم سے گئے۔ ان کی سسکیوں کی دلشکن آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

پہلے بھی کئی بار اس نے اُنھیں یونہی چپکے چپکے اور سب سے چھُپ چھُپ کر آنسو بہاتے دیکھا تھا، مگر کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ خاموش ہی رہتی، لیکن آج —— نجانے کیوں خود پر اختیار ہی نہ رہا۔ بی بی کا انجانا دُکھ جیسے اس کے اپنے پورے وجود میں زہر کی طرح گھُلا ہوا تھا۔

بڑے ارمان اور شوق سے ان کی قمیص پر بیل کاڑھی تھی۔ جلد از جلد انھیں دکھانا چاہتی تھی، مگر یہ ان کی درد و کرب میں ڈوبی سسکیاں —— دل بے چین ہو اُٹھا اور شوق سرد پڑ گیا —— بڑھ کر عجلت سے قمیص کو بستر پر پھینکا اور خود کھڑکی کی طرف رُخ پھیرے بیٹھی بی بی کے پاس بھاگ کر جا کھڑی ہوئی۔

"بی بی! آپ رو رہی ہیں ——؟" اس نے ہولے سے بی بی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

صاحباں کی آواز سنتے ہی اور اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی بی بی جلد جلد اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

"نہیں —— نہیں تو ——" اپنی کیفیت اس سے چھُپانے کے لئے اُنھوں نے مسکرانے کی اک بے حد ناکام سی کوشش کی۔

"خدا کے لئے بی بی! مجھ سے تو کچھ مت چھُپائیے۔"

"میں —— میں —— چھُپا تو کچھ نہیں رہی —— کچھ بھی تو نہیں —— تمھیں وہم ہوا ہے بیٹی ——!"

جھُکی جھُکی بی بی یکایک سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ اسے دکھانے کو مسکرائیں بھی —— مگر ان کی آنکھیں سارا بھید کھول رہی تھیں۔ جانے کتنا ناتھیں اور کس قدر روئی تھیں۔ جہاں آنکھوں کے پپوٹے بُری طرح متورم تھے وہیں پتلیوں میں سے اک داستان بھی جھانک رہی تھی۔

"ٹھیک ہے —— نہ بتائیے مجھے کچھ ——" صاحباں نے بغور اُن کے چہرے کو دیکھا۔ "میاں جی کو تو سب کچھ بتا ہی دیں گی نا —— میں ان سے بات کروں گی۔"

"نہ نہ —— ایسا غضب نہ کر بیٹھنا۔ اُن سے کچھ نہیں کہنا۔" بی بی سٹپٹا کر، گھبرا کر بولیں۔ "میرے دُکھ کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

میرے لئے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"کیوں بی بی ــــــ؟ لاعلاج کیوں ــــــ؟ میرے خیال میں ایسا کوئی دکھ، کوئی درد نہیں ہے جس کی کوئی دوا نہ ہو، جس کا کوئی نہ ہو سکے۔"

وہ بی بی کی سُرخ سُرخ آنکھوں کو تکے ہی گئی۔ بڑے دَرد اور انتہائی ہمدردی سے۔!!

"یہ بھی بھلا کوئی بات ہے۔ میری بی بی کی آنکھیں ہر وقت دُھندلائی رہیں، میری بی بی کے چہرے پہ دُکھوں کے سائے پھیلے رہیں اور ہم چُپ چاپ دیکھتے رہیں۔ کچھ بھی ہو مجھ سے تو اب مزید خاموش نہیں رہا جاتا۔"

"کہا نا صاحباں! میرے لئے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"میاں جی بھی نہیں جو باقی ساری دُنیا کے دُکھ دَرد بانٹتے اور دوا کرتے ہیں، جو اتنے رحم دل اور خدا ترس ہیں کہ لوگ دُور دُور سے ان کے پاس اپنے مسائل، اپنی اُلجھنیں حل کرانے آتے ہیں۔ زبان سے، مال سے، تسلی دلاسوں سے، اپنے وجود سے، غرض ہر طرح لوگوں کے کام آتے ہیں وہ۔"

"دوسروں ہی کے نا ــــــ؟"

"کیا ــــــ؟ کیا مطلب ہے بی بی آپ کا ــــــ؟ وہ آپ کے لئے کچھ نہ کریں گے ــــــ کیا ــــــ؟ آپ کے لئے بی بی، ان کی اتنی خدمت گزار اور نیک بیوی ہیں ــــــ کمال کرتی ہیں بی بی آپ بھی ــــــ"

بی بی اپنی بھاری پپوٹوں والی آنکھوں کو جھپک جھپک کر کتنی ہی دیر صاحباں کے بے انتہا خوب صورت چہرے پُرخلوص و محبت کی جگمگ جگمگ کرتی کرنوں کو گھُورتی رہیں، پھر قدرے آواز دبا کر آہستہ سے بولیں، "اور جو دُکھ ہو ہی اُن کا دیا ہوا؟"

"اُن کا دیا ہوا ــــــ؟ میاں جی کا دیا ہوا ــــــ؟؟" وفورِ حیرت سے صاحباں چلّا سی پڑی۔ روشن روشن چہرہ یکدم دُھندلا گیا۔

"میرے میاں جی ایسے نہیں ہو سکتے ــــــ بی بی! کبھی نہیں۔ ان جیسا نیک اور متقی شخص اس سارے شہر میں دوسرا کوئی نہ ہوگا اور آپ کہہ رہی ہیں ــــــ یہ سراسر الزام ہے۔"

"تو پھر تُو میرے رونے کا سبب پوچھ بھی نہیں۔" بی بی نامعلوم سی خفگی سے بولیں۔

"لیکن بی بی آپ کے آنسو بھی تو مجھ سے نہیں دیکھے جاتے ــــــ امّاں اور بابا کے بعد آپ نے اور میاں جی نے مجھے جو کچھ دیا ہے، وہ میں کیسے فراموش کر دوں۔؟ میرے دل میں آپ دونوں ہی کی ایک جیسی محبت، عزت اور احترام ہے۔"

صاحباں اپنے دوپٹے کے پلّو سے ان کے سفید سفید نم آلود رخسار خشک کرنے لگی۔

"میں آپ کے احسانات ......"

"اولاد پر والدین احسان نہیں کیا کرتے۔" بی بی نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطع کر دی۔ "تُو ہماری اولاد ہے صاحباں!"

"تو پھر اولاد بھی ماں باپ کو دُکھی نہیں دیکھ سکتی۔ خصوصاً اک بیٹی۔"

صاحباں نے ان کے گلے میں بازو حمائل کر دیئے۔

"بی بی! میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹیں سجی دیکھوں۔ میں آپ کی آنکھوں میں مسرتوں کے ستارے ٹمٹماتے دیکھوں۔ میں آپ کے چہرے پر خوشیوں کے سائے لرزتے دیکھوں ــــــ اس کے لئے ــــــ اس کے لئے بی بی! مجھ سے جو کچھ ہو سکے کرنے کو تیار ہوں سب کچھ ــــــ سب کچھ بی بی!"

بی بی نے کندھے سے لگا صاحباں کا سر تھپتھپایا۔ رخسار پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"کسی نیک کی اولاد ہے تُو بیٹی ــــــ خدا تجھے سدا اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" بی بی نے اسے خلوص سے دُعا دی ــــــ

"پھر وہی غیروں کی سی بات بی بی! آپ مجھے کسی دوسرے کی اولاد کہہ رہی ہیں ــــــ؟" صاحباں نے شکایت بھری نگاہ سے انھیں دیکھا "اور میں اس بھری پُری دُنیا میں اک صرف آپ دونوں کو ہی اپنا سمجھتی ہوں۔"

"ارے نہیں نہیں۔" بی بی نے اس کے نازک وجود کو کھینچ کر سامنے کیا۔ بڑے پیار، بڑی محبت سے اسے دیکھا، مسکرائیں اور پھر سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "تُو تو ہماری اپنی ہے ــــــ بالکل اپنی ــــــ تیرے ہی دَم سے تو ہمارے گھر میں بہار ہے۔"

"تو بی بی! بہار خوشیوں کی پیامبر ہوتی ہے پھر آپ کے یہ آنسو۔!"

ان کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں اور صاحباں کا دل ان میں ڈوبا جا رہا تھا۔

"آپ کے پاس دُنیا کا ہر سُکھ موجود ہے۔ پھر بھی آپ کی یہ کیفیت ــــــ؟ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا بی بی ــــــ! کوئی بہت ہی بڑا ہوگا نا ــــــ بتایئے بی بی! وہ کیا ہے؟ کسی کا بھی دیا ہوا سہی۔ آپ کم از کم مجھے تو بتا دیجئے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں اور ماں بیٹی کے رشتے کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔"

"لیکن صاحباں میری جان! میں نہیں چاہتی کہ ماں کا دُکھ جان کر بیٹی بھی پریشان ہو جائے۔ میں تمھیں صرف سُکھ اور خوشی دینا چاہتی ہوں۔"

"اب تو بی بی! میری اور آپ کی تقدیر سانجھی ہے۔ آپ نے اور میاں جی نے مجھے بیٹی بنا لیا ہے۔ آپ کے سُکھ میرے سُکھ ہوں گے۔ آپ کے دُکھ میرے دُکھ ہوں گے۔"

بی بی کے عین سامنے نیچے قالین پر بیٹھ کر صاحباں نے اپنا چہرہ ان کے گھٹنوں پر ٹکا دیا۔

"اگر آپ نے ابھی سب کچھ نہیں بتایا نا بی بی! تو میں سمجھ لوں گی آپ مجھے دل سے اپنا نہیں سمجھتیں۔"

اس کی آنکھوں میں بہت سارے آنسو بھر آئے۔ لمبی لمبی پلکوں پر ستارے سے ٹمٹمانے لگے۔

"بی بی! میرا آپ کے پاس رہنے کا کوئی حق بھی نہیں اور اگر آپ کے پاس نہیں رہوں گی تو پھر اس دُنیا میں بھی نہیں رہوں گی۔"

اس کے لہجے میں جیسے اک سنگین عزم تھا۔ اس کی آواز میں ضد کی سی پختگی تھی۔

"ہاں ــــــ میں نے کہہ دیا ہے ــــــ دیکھ لیجئے گا ایسا ہی ہوگا۔"

"ہائے ہائے! کچھ تو عقل و ہوش کی باتیں کر صاحباں۔!" بی بی یکایک بیقرار ہو اُٹھیں۔ تڑپ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اپنی زندگی کو کچھ کہہ کر ہماری زندگیوں کو تو بد دُعا نہ دو۔ جانتی نہیں ہو ہم دونوں ہی تمھارے بغیر اک پل نہیں رہ سکتے۔"

"جانتی ہوں سب کچھ۔ میاں جی کی محبت کا بھی اندازہ ہے اور آپ کے پیار کا بھی۔ مگر بی بی! آپ کو یہ یقین کیوں نہیں آتا کہ آپ کے جذبوں جیسے ہی میرے بھی ہوں گے بلکہ کچھ زیادہ ہی شدید۔ اس لئے کہ آپ نے مجھ بے گھر اور بے آسرا کو سہارا دیا ہے۔ میرے جذبوں میں پیار کے ساتھ اک احسان مندی کا عنصر بھی شامل ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے میں آپ کے لئے یہ جان بھی دے دوں۔"

"جانتی اور مانتی ہوں صاحباں! بہت اچھی طرح۔ تُو جس جس طرح ہماری خدمت کرتی ہے بیٹی! وہ جذبوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔"

"تب بی بی!" وہ التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "میرا صبر نہ آزمایئے۔ میری برداشت کا اور امتحان نہ لیجئے۔ کئی مہینوں سے میں آپ کی آنکھوں میں چھپے آنسو اور چہرے پر پھیلی دُکھوں کی پرچھائیاں دیکھ رہی ہوں اور پریشان ہو رہی ہوں ــــــ بی بی! میں اب وہ گاؤں کی بے علم اور کم عقل لڑکی نہیں ہوں حالات کے نشیب و فراز اور آپ کی تعلیم و تربیت نے مجھے کافی ہوشیار اور باشعور کر دیا ہے۔"

"اچھا ــــــ تو اب میری صاحباں بہت سمجھدار ہو گئی ہے۔" بی بی مذاق کے انداز میں مسکرائیں "مجھے تو اس کا علم ہی نہیں تھا۔"

"دیکھئے ــــــ دیکھئے بی بی۔! آپ اصل بات کو مذاق میں مت ٹالیں ــــــ ہاں بس۔"

پھر وہ کسی ضد میں آئے بچّے کی طرح مچل گئی۔

"آج تو دو ٹوک فیصلہ ہو کر رہے گا۔ یا تو مجھے اپنے دُکھوں کا بھی شریک بنا لیجئے... یا پھر آج صاف صاف کہہ دیجئے کہ صاحباں اپنی بی بی کی بیٹی نہیں ہے اور پھر گھر سے بھی نکال دیجئے۔"

"صاحباں پر سے اس کی بی بی قربان۔ کیوں وہ اس کی بیٹی نہیں ہے اور کیوں وہ گھر سے نکلے۔ اس گھر سے، جو اس کا اپنا ہے۔"

بی بی نے دونوں ہاتھوں میں اس کا اُجلا اُجلا، بھولا بھالا اور حسین ترین چہرہ لے کر اس کی پیشانی اور اس کی آنکھوں کے جگمگ جگمگ کرتے ستارے چوُم لئے۔ پھر اس کے تمتماتے رخساروں کے شعلوں کو دیکھتے ہوئے اور دل ہی دل میں اس کے حُسنِ صورت اور حُسنِ مزاج پہ سے تصدق ہوتے ہوئے آخر اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

"میری ان بوڑھی آنکھوں میں حارث کی جُدائی نے سدا کے لئے آنسو بھر دیئے ہیں بیٹی! میرے چہرے پر خوشیوں کے بجائے حارث کی جدائی نے دُکھوں کے قافلے اتار دیئے ہیں۔ میں اب زندگی کے آخری سانس، آخری لمحے تک کبھی خوشی کا مُنہ نہ دیکھ سکوں گی۔ کبھی نہیں صاحباں! میری تقدیر میں یہی لکھا گیا ہے۔"

بی بی کے آنسو، جو اکثر آنکھوں کے اندر ہی مقید رہا کرتے تھے اور اگر کبھی آزاد ہوتے بھی تو اکیلے میں، مگر آج وہ صاحباں کے سامنے ہی آزادانہ اُمڈ اُمڈ کر بہہ نکلنے پر بضد تھے۔ تب بی بی کو خود پر اختیار رہا نہ آنسوؤں پر۔ کسی ننھے بچّے کی طرح گھٹنوں پہ ٹکے صاحباں کے سر میں چہرہ گھساتے ہوئے پھُوٹ پھُوٹ کر رو دیں۔ صاحباں چُپ چاپ ان کے گھٹنوں پر چہرہ دھرے بیٹھی رہی اور وہ اس کے بالوں کو بھگوتی رہیں۔ کتنی ہی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔

اب شاید غبار دُھل گیا ہو۔ صاحباں نے سوچا اور آہستہ سے سر اٹھایا۔ بی بی دوپٹے کے پلّو سے آنسو صاف کرتے ہوئے سیدھی ہو گئیں۔

"میں سمجھ نہیں سکی بی بی! یہ حارث کون ہے اور کیوں آپ سے جُدا ہو گیا ہے۔؟ کیا موت ......"

"نہیں نہیں ــــــ" بی بی نے اک چیخ کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر اپنا لرزتا ہاتھ رکھتے ہوئے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"خدا کے لئے یہ نہ کہو ــــــ پروردگار اسے رہتی دُنیا تک سلامت رکھے۔"

"مگر بی بی! وہ ہے کون۔؟"

"میرے جگر کا ٹکڑا۔ میری آنکھوں کا نور۔" وہ ایک عجیب سے جذبے سے سرشار بولیں۔

"کیا مطلب۔؟"

"حارث میرا بیٹا ہے صاحباں! ہماری اکلوتی اولاد۔"

"آپ کا بیٹا ——؟ آپ کی اکلوتی اولاد ——؟؟" حیرت سے صاحباں کی آنکھیں پھیل سی گئیں اور آواز لڑکھڑانے لگی۔ "مگر آپ کی تو کوئی اولاد نہیں تھی۔ تبھی تو میاں جی نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہے۔"

"بیٹی کوئی نہیں تھی مگر خیر سے بیٹا تو ہے۔ اپنا حقیقی بیٹا۔"

بی بی کے باوقار چہرے پر ممتا کے پُرنور رنگوں نے بڑا خوب صورت سا نکھار پیدا کر دیا۔

"بڑا جوان، دلیر، بہت لائق اور بے حد خوبرو ہے میرا حارث ماشاءاللہ ——!"

"مگر بی بی! اتنا عرصہ ہو گیا مجھے یہاں آئے ہوئے۔ میں نے تو آج تک کسی کے مُنہ سے یہ بات نہیں سُنی۔ یہاں تک کہ آپ کی اور میاں جی کی زبانوں پر کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں آیا —— کیوں ——؟ بی بی کیوں ——؟"

وفورِ حیرت سے اس نے بلا سوچے سمجھے بی بی پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"کیا وہ کہیں پڑھنے گیا ہوا ہے ——؟ کسی دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں ——؟ مگر اس کا تو خط بھی کبھی نہیں آیا —— کیوں ——؟ آخر کیوں بی بی ——؟ کہاں ہے وہ ——؟؟"

"نجانے کہاں ہے ——؟" بی بی نے اک حسرت بھری آہ کھینچی اور پھر خود بخود ہی دردِ دل ہونٹوں پر آ گیا۔

"چودہ سال کا تھا جب باپ نے اسے تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا تھا۔ میرے آنسوؤں کو بھی نہیں دیکھا۔ ممتا کی چیخ و پکار بھی نہیں سُنی۔ صرف اس لئے کہ وہاں تعلیم پائے گا تو بہت زیادہ قابل ہوگا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں سے کہیں زیادہ۔"

بی بی کے آنسوؤں کی روانی اور سسکیاں ان کی زبان بند کر رہی تھیں، مگر ان کی لمحہ بھر کی خاموشی بھی صاحباں کو بے صبر بنائے دے رہی تھی۔

"پھر بی بی: پھر کیا حارث تعلیم مکمل کر کے واپس نہیں آیا؟"

"واپس کیوں نہیں آیا ——؟ آیا —— دل میں اپنے وطن کی محبت اور والدین کا ڈھیروں ڈھیر پیار لے کر آیا —— بہت بلند عزائم لے کر آیا —— مگر جانے کیا ہو گیا —— اسے واپس آئے ڈیڑھ دو مہینے ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک دن باپ سے جھگڑا ہو گیا —— وہ حارث جو کبھی باپ کے سامنے نگاہ اونچی کر کے بات نہیں کیا کرتا تھا، وہ ان سے لڑ جھگڑ کر اور ناراض ہو کر گھر سے نکل گیا۔ پانچ سال گزر گئے ہیں اس بات کو۔"

"یعنی پانچ سال سے وہ آپ کو ملا ہی نہیں ——؟"

"نہیں ——" بی بی کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ "میں تو حیران ہوں کہ اس کو دیکھے بنا میری آنکھیں روشن کس طرح رہیں ——؟ دُنیا کے باقی لوگ بھی مجھے کیوں دکھائی دیتے ہیں —— حارث میرے بچے تو کہاں ہے ——؟ تو کہاں ہے ——؟؟"

ان کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے تھے —— وہ رِس رہے تھے —— وہ تڑپ رہی تھیں۔

"بی بی —— بی بی ——!! حوصلہ کیجئے۔"

"بہت حوصلہ کیا صاحباں: بہت صبر کیا —— مگر اب —— ممتا کا یہ دُکھ ناقابلِ برداشت ہوا جا رہا ہے۔"

"مگر بی بی: ایک ہی تو بیٹا تھا آپکا۔ پھر جھگڑا کیوں ہو گیا ——؟ ایک اولاد تو بڑی عزیز ہوتی ہے —— بہت لاڈلی ——!"

بی بی کی تڑپ، بے کلی اور آنسو دیکھ دیکھ کر صاحباں کی آنکھیں بھی بھیگی جا رہی تھیں۔

"بے حد عزیز تھا —— بہت لاڈلا تھا —— چودہ سال تک ہم دونوں نے اس کا کون سا لاڈ تھا جو نہیں دیکھا۔ اس کی کونسی خواہش تھی جو نہیں پوری کی —— پھر اس کی اعلیٰ تعلیم اور بہتر تربیت کے لئے ہم نے کیسے کیسے جدائی کے دن اور راتیں نہیں کاٹیں —— غیر ملک میں اس کی آسائشوں بھری رہائش کے لئے کتنا ہم نے خرچ نہیں کیا —— یہ سب کچھ مت پوچھو —— بیٹی! —— نجانے کیا ہو گیا ——؟ اس گھر کی مسرتوں اور ہماری خوش بختیوں کو کس کی نظر کھا گئی۔ آن کی آن میں میرا لختِ جگر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔"

"وہی تو میں جاننا چاہ رہی ہوں بی بی! آخر اتنی بڑی کون سی بات ہو گئی کہ پانچ سال میں بھی ناراضگی ختم نہیں ہوئی۔ اتنی طویل مدت بھی اس کے دل پر جمی گرد کو دھو نہ سکی۔ اس نے لوٹ کر بوڑھے والدین کو شکل ہی نہیں دکھائی۔"

"جانے ایسی کون سی بات ہو گئی تھی۔ یہ تو آج تک مجھے بھی معلوم نہیں ہو سکا۔"

"کیا ——؟ آپ کو علم ہی نہیں کہ باپ بیٹے کا جھگڑا کس بات پر ہوا؟" صاحباں بھی دنگ رہ گئی۔

"بالکل نہیں ——"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بی بی ——؟" صاحباں کے آنسو وغیرہ سب خشک ہو چکے تھے اور وہ حیرتوں کے نرغے میں گھری بوکھلائی جا رہی تھی۔ "آپ ماں تھیں بی بی! آپ کو پھر بھی معلوم نہیں؟"

"میں اس دن اپنی ایک ملنے والی کی بیٹی کی منگنی پر گئی ہوئی تھی۔ واپس گھر آئی تو ملازموں سے پتہ چلا کہ حارث باپ سے جھگڑ کر گھر سے نکل گیا ہے۔ مجھ کرم جلی کو اس ہونی کا پتہ ہوتا تو اس دن جاتی ہی نہیں۔"

"ملازموں نے بھی جھگڑے کی وجہ نہیں بتائی؟"

"نہیں —— کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ بند کمرے میں دونوں کا جھگڑا ہوا اور پھر حارث کو چُپ چاپ گردن جُھکائے گھر سے باہر جاتے ہوئے اور میاں جی کو اُسے بُرا بھلا کہتے ہوئے سب نے دیکھا۔"

"آ نے میاں جی سے بھی نہیں پوچھا؟"

"پوچھا —— بھلا اک ماں کی ممتا خاموش رہ سکتی تھی۔"

"پھر میاں جی نے کیا وجہ بتائی؟"

"کچھ نہیں —— بس کہا تو اتنا کہ حارث نالائق ہے، بدزبان ہے، بدتمیز ہے، ناخلف ہے —— اس لئے اسے انھوں نے جائداد سے عاق کر دیا ہے اور آئندہ سے میں نے بھی اگر اس سے ملنے کی کوشش کی یا میری زبان پر اس کا نام آیا تو مجھے بھی اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا پڑ جائے گا۔"

"کیا مطلب ؟"

"وہ مجھے طلاق دے دیں گے۔"

"ہائے بی بی! اتنی ذرا سی بات کی اتنی بڑی سزا —— میاں جی اتنے سخت دل کیسے ہو گئے؟"

"یہی تو بیٹی! تجھے بتا رہی ہوں کہ مجھے آج تک معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ ذرا سی بات کی بڑی سزا تھی یا بات بھی سزا جتنی ہی بڑی تھی۔ میں کچھ بھی تو نہیں جانتی۔ بس چُپ چاپ اس بدبخت دل پر بیٹے کی جدائی کا سدا تازہ رہنے والا زخم لے کر بیٹھ گئی۔ اس بڑھاپے میں طلاق کی کالک ماتھے پر لگوا کر جگ ہنسائی تو نہیں کرانا تھی۔"

"اور حارث کا جھگڑا تو باپ سے ہوا تھا۔ وہ بھی آپ کی غیر موجودگی میں —— کیا پھر اس نے بھی آپ سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی؟"

"ہائے! کیا بتاؤں —— یہی کچھ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے مجھ سے پیار تو بہت تھا۔ مگر پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے ——؟ باپ بیٹے دونوں نے ہی سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر کیوں دھر لئے ہیں اور اِک میں ممتا کی ماری —— جانے کیوں اب تک میرا دل پتھر نہیں بن سکا۔ اس میں دھڑکن کیوں باقی ہے۔ یہ میرا سانس کیوں چل رہا ہے ——؟ جانے کیوں ——؟؟ جانے کیوں ——؟؟؟"

بی بی کی حالت ابتر تھی۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔

"میرے مولا! تو مجھے ایسی زندگی سے پناہ ہی دے دے۔" پھر وہ اک جنون کے سے عالم میں یہ بڑا سا دامن پھیلا کر اپنے لئے موت کی دُعائیں مانگنے لگیں۔

اور صاحباں —— گُم سُم، دم بخود بیٹھی انہیں تکے جا رہی تھی۔ بی بی کا روگ سینے میں ٹیسیں بھی اُٹھا رہا تھا مگر زبان خاموش تھی۔ ایسے الفاظ ہی اس کے پاس نہیں تھے جن سے بی بی کو کوئی تسلی دیتی۔ ایسی کوئی اُمید بھی نہیں تھی جس کی بیساکھی کا بی بی کو سہارا دیتی۔ البتہ بی بی کا دُکھ آنسوؤں کا رُوپ دھار کر خود اس کی آنکھوں سے بھی ٹپکنے لگا۔

پھر بھیگی پلکوں کو جھپک جھپک کر اس نے بی بی کے دونوں ہاتھ تھام لئے —— وہ بے بس تھی —— اور کچھ نہ کر سکی تو ان کے ہاتھوں ہی کو کبھی دبانے لگتی، کبھی تھپتھپانے لگتی اور کبھی چُوم کر سینے کے ساتھ بھینچ بھینچ لیتی۔

"کاش! میں آپ کے لئے کچھ کر سکتی بی بی! کاش میں اپنی زندگی کی قیمت پر بھی آپ کا بچھڑا ہوا بیٹا آپ کو دلا سکتی۔ سچ کہتی ہوں بی بی کبھی دریغ نہ کرتی۔"

۷

وہ اپنی خواب گاہ میں تھی۔ نرم و ملائم بستر پر لیٹی خیالات کے دھارے کے ساتھ بہتی بہتی کبھی ماضی میں جا پہنچتی اور کبھی حال کے گرداب میں چکر لگانے لگتی۔

ماضی کی یاد میں سوائے اماں اور بابا کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ گاؤں کی وہ سادہ سی زندگی۔ آج اسے بے رنگ اور بے کیف سی لگی مگر اماں اور بابا کی یاد سینے میں اک ہوک سی اٹھا گئی۔

کاش! وہ اس کے ماضی کے ساتھ نہ وابستہ ہوتے بلکہ اس کے حال کی خوش رنگ دنیا میں بی بی اور میاں جی کی طرح اس کے ساتھ آباد ہوتے۔ اس کے پاس۔ !

اماں اور بابا کی یاد کو سینے کے ساتھ لگائے لگائے وہ حال میں داخل ہوئی تو بی بی اور میاں جی کی محبتوں، خلوص، ہمدردیوں اور زندگی کی بیشمار آسائشوں نے انھیں جھٹک کر علیحدہ کر دیا۔

کاش! اس نے سچ مچ ہی خلوص و محبت کے اس باوقار پیکر بی بی کی کوکھ سے جنم لیا ہوتا ——! وہ پُر نور چہرے اور پُرکشش شخصیت والے میاں جی کی حقیقی اولاد ہوتی۔ کاش ——!

اتنا خوبصورت انھوں نے اسے گھر دیا تھا کہ وہ اکثر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔ کہیں وہ کوئی سپنا تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ گول گول سرخ ستونوں والے بڑے بڑے دالان، لمبے لمبے دریچے، وسیع و عریض کمرے، رنگ برنگے ٹائلوں والے فرش، خوبصورت منقش دروازے اور ساگوان کی خوشبودار لکڑی کا بنا ہوا فرنیچر، فوم کے بیڈ اور صوفے، دروازوں اور کھڑکیوں میں سرسراتے ریشمیں قیمتی پردے، قدموں تلے بچھے موٹے موٹے نرم نرم خوبصورت پھولوں والے قالین ——!

پہلے دن جب میاں جی کے ساتھ اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا تو اس ساری شان و شوکت نے اسے بُری طرح بوکھلا دیا تھا۔ جس شہزادے کے سپنے خالہ بالی نے اسے دکھلائے تھے وہ تو اسے مل نہیں سکا تھا لیکن اس کا محل اسے ضرور مل گیا تھا۔

وہ بہت جھجک جھجک کر اندر داخل ہوئی تھی مگر میاں جی کی محبت اور بی بی کی خلوص بھری توجہ نے چند دن میں ہی ساری غیریت، ساری جھجک دور کر دی۔ اولاد کی محرومی نے ان کے دلوں میں جو خلا پیدا کر دیا تھا اُس میں دونوں نے ہی صاحباں کو اتنے خلوص، بے تکلفی اور چاہت سے فٹ کر لیا کہ اب خود صاحباں کو بھی یہی محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس نے بی بی اور میاں جی کے گھر میں ہی جنم لیا تھا اور وہ ہمیشہ سے ہی اس محل نما گھر میں رہتی آئی تھی۔

لیکن —— اس دن یہ اپنائیت، یہ پیار، بے تکلفی کچھ متزلزل، کچھ ڈانواں ڈول سی ہونے لگی جب اسے بی بی کی زبانی پتہ چلا کہ یہاں کی ہر چیز کا مالک و مختار ان کا ایک بیٹا بھی موجود تھا۔ اس ساری وراثت کا جائز حقدار۔ !

تب اُسے اپنا وجود اک تنکے کی طرح ہلکا محسوس ہونے لگا۔ حارث باپ سے رُوٹھ کر گیا تھا، دُنیا سے تو نہیں چلا گیا تھا۔ کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے جب اسے والدین کی یاد ستاتی، وہ لوٹ کر آ گیا تو وہ، صاحباں اک بے وزن تنکا نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ شاید دوسری دُنیا میں کہ اب تو وہ اماں اور بابا کا گھر بھی چھوڑ آئی تھی۔

پھر جیسے والدین ایک ہوتے ہیں، اسی طرح بی بی اور میاں جی بھی ایک ہی ہوتے ہیں۔ صرف ایک ——!! کتنا خوش تھی وہ ان کی محبتیں پا کر، ان کا خلوص، ان کی توجہ اور ان کا پیار پا کر ——!!

نصور آباد میں صرف پرائمری اسکول تھا۔ اس لئے اس نے صرف پرائمری تک تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ یوں شہر کے لحاظ سے وہ تقریباً جاہل ہی تھی اور میاں جی اپنے علاقے کی سب سے مشہور شخصیت تھے —— جانے وہ کیا تھے ——؟ اس کا تو صاحباں کو علم نہیں تھا لیکن یہ بخوبی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شہر کی چیدہ چیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے۔

اپنے ماحول کے مطابق صاحباں کو ڈھالنے کے لئے انھوں نے اسے گھر میں ہی مزید تعلیم دلانا شروع کر دی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی تربیت بھی ہونے لگی۔ اس کے طور و اطوار کی بھی نوک پلک درست کی گئی تاکہ وہ اصل نسل میاں جی کی بیٹی بن جائے۔ کوئی دوسرا دیکھنے والا اسے غیر نہ سمجھے صحیح معنوں میں اس ماڈرن اور اعلیٰ خاندان کا ایک اہم فرد دکھائی دے۔

وہ بے حد خوش تھی۔ زندگی میں اچانک ہی آ جانے والی یہ اتنی بڑی، اتنی حیرت انگیز تبدیلی اسے بے حد خوشگوار لگ رہی تھی۔ وہ بی بی اور میاں جی کے بتائے ہوئے راستوں پر بڑے شوق اور پوری لگن سے چلنے لگی۔ ان کے اصولوں کو، ان کے طور طریقوں اور ان کے انداز کو اپنانے کی پوری پوری کوشش کرنے لگی۔ اور۔ بہت کامیاب و کامران بھی تھی۔

نصور آباد… کا کوئی فرد یہاں تک کہ اسے جنم دینے والے اماں اور بابا میں سے بھی کوئی اگر اب اسے دیکھتا تو کبھی پہچان نہ پاتا۔ اس کا لباس بدل گیا تھا۔ اس کی چال ڈھال بدل گئی تھی۔ اس کا لب و لہجہ بدل گیا تھا۔ اتنا۔ کہ اس کی شکل و صورت اور شخصیت ہی مختلف ہو گئی تھی۔ اک صرف اس کا نام تھا جو اس کی پہچان کرا سکتا تھا اور بس۔ !

ان سب ظاہری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس میں باطنی تبدیلیاں بھی بہت آئی تھیں۔ اس کا دماغ، اس کا ذہن یکسر بدل گیا تھا۔ وہ اب بی بی اور میاں جی کے ساتھ گھر کی چھوٹی موٹی باتوں کے علاوہ مذہب کی، سیاست اور دُنیا کی باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کے ساتھ اس کا بیٹی کی حیثیت سے تعارف کرایا جاتا تو وہ ان سے بلا جھجک اور بہت پُراعتماد انداز میں مختلف مسائل اور موضوعات پر بڑی روانی سے گفتگو … لیتی تھی۔

نصور آباد سے نکل نو دُنیا کی وسعت نے اس کے ذہن کو بھی وسیع کر دیا تھا۔ رفعتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ انسانی جذبات و احساسات کو پوری طرح محسوس کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اب دوسرے کے چہرے پر چھپائے دُکھوں کے سائے اور رقصاں مسرتوں کی کرنیں اسے دکھائی دینے لگ گئی تھیں۔ اور اس کا دل دُکھ کی تڑپ اور خوشی کی دھڑکن سے اچھی طرح روشناس ہو گیا تھا۔

نصور آباد والا وہ لاابالی پن اور الھڑپن جانے کہاں رخصت ہو گیا تھا۔ تبھی تو۔ اس نے آسائشوں بھری زندگی گزارنے والی بی بی کے چہرے پر بکھری خوشیوں کے پیچھے دُکھوں کے لہراتے سائے دیکھ لئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والے بکھرے ہوئے آنسو بھی اسے نظر آ گئے تھے۔

اور اب۔ جب اس نے بی بی کا سینہ کھول کر دیکھ لیا تو اس کے اپنے دل میں کئی وسوسے اتر گئے۔ کئی سوچیں آباد ہو گئیں۔ اسے میاں جی کے گھر کی زندگی کو ہمیشہ کی زندگی نہیں سمجھ لینا چاہیے تھا۔ ان کی محبتیں، ان کے خلوص اور ان کے پیار کو واحد اپنی ملکیت نہیں جان لینا چاہیئے تھا۔ ان کا مالک کوئی اور تھا۔ !!

"صاحباں! صاحباں!!"

بی بی کی عجیب سی مسرتوں کے سرور میں ڈوبی آواز نے اسے اس کے خیالات کے بہتے دھاروں سے نکال کر حقائق کے سنگین کناروں پر لا کھڑا کیا۔

"جی بی بی۔!" وہ بی بی کے پاس جانے کے ارادے سے ابھی اُٹھ کر صرف بیٹھی ہی تھی کہ بی بی تیز تیز قدموں سے خود ہی اس کے کمرے میں آ گئیں۔

"یہ دیکھو۔ حارث کی یہ تصویر بھی مل گئی۔ یہ انگلستان میں ڈگری لیتے ہوئے اس نے کھنچوائی تھی۔ دیکھو ذرا۔" بی بی نے کارڈ سائز کی ایک رنگین تصویر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"سب سے خوبصورت ہے نا۔؟" حسب معمول بی بی نے پوچھا۔

وہ اب تک سینکڑوں ہی تصویریں اسے دکھا چکی تھیں۔

"ہاں۔!" تصویر سے زیادہ صاحباں نے بی بی کے چہرے پر پھیلے خوشگوار رنگوں کو بغور دیکھتے ہوئے ان کی تائید میں گردن ہلا دی۔

"مگر وہ خود تو اس سے بھی کہیں زیادہ، کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ تصویر میں تو ہونٹ بھینچے سنجیدہ کھڑا ہے مگر وہ خود ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔ خوش مزاجی اور زندہ دلی میں اپنی مثال آپ تھا۔ مگر…۔"

وہ صاحباں کے پاس ہی فومی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"معلوم نہیں وہ باپ سے کیوں جھگڑ پڑا۔ وہ تو بڑا صلح پسند تھا۔ وہ تو انتہائی سعادتمند اور فرمانبردار تھا۔"

بی بی پانچ سال سے دل پر صبر و برداشت اور ضبط و حوصلے کے جو بند باندھے ہوئے تھے ان میں شگاف پڑا تو ممتا کے اس سیلاب نے جنونی طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ وہ اب اُٹھتے بیٹھتے صاحباں سے یہی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ ہر وقت حارث ہی کا نام اور ذکر اُن کی زبان پر ہوتا تھا۔

یوں اس کا بچپن گزرا۔ یوں وہ انگلستان کے لئے روانہ ہوا۔ ایسے ایسے خوبصورت اور دلچسپ خط اس کے انگلستان سے آتے تھے۔ ایسی ایسی مزے کی باتیں لکھتا تھا جا تو اپنی قوس و قزح جیسی حسین اور خوش رنگ شخصیت لئے ہمارے پاس موجود ہو۔ ہمارے درمیان۔ سب جدائیاں ختم ہو جائیں گی۔

پھر۔ وہ خود آ گیا۔ تعلیم مکمل کر کے۔ کیسا بانکا چھبیلا بن کر آیا تھا۔ اپنے خطوں اور اپنی بھیجی ہوئی تصویروں سے کہیں زیادہ خوبرو، وجیہہ اور باغ و بہار شخصیت کا مالک بن کر۔ ایسا لباس پہنتا تھا۔ ایسے ایسے کھانے پسند کرتا تھا اور اس انداز سے وہ اُٹھتا بیٹھتا تھا۔

اس کی اک اک بات، اک اک ادا اور اک اک حرکت بی بی اسے بتایا کرتیں۔ بی بی کے احسانات صاحباں پر اتنے زیادہ تھے کہ اسے اپنی پوری توجہ اور دلچسپی سے ان کی ساری باتیں سننا پڑتیں۔

غرض اس کی ایک ایک بات کا ذکر بی بی اتنی بار کر چکی تھیں اور صاحباں ہر بار اتنی دیانت داری سے اور توجہ سے سُن چکی تھی کہ اب اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ بچپن سے حارث کے ساتھ ہی پرورش پاتے پاتے جوانی کی سرحد پر آن کھڑی ہوئی ہو۔ اس کی زندگی کے اک اک لمحے کی تصویر اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں تھی اور اک اک واقعہ جو رُونما ہوا تھا اس کی نگاہوں میں تھا۔

"اور سُن ۔ اک راز کی بات ۔" جب صاحباں نے ان کی خوشی کی خاطر تصویر اچھی طرح دیکھ لی اور تعریفیں بھی بہت ساری کر دیں تو بی بی اس کے اور بھی قریب کھسک کر انتہائی رازداری سے بولیں ۔ "خان گل چھٹی پر گیا ہوا تھا نا ۔ ؟"

"ہاں ۔ !"

"وہ واپس آگیا ہے ۔"

"تو بی بی ! یہ کوئی اتنی رازداری کی بات تھی ؟" صاحباں مسکرا پڑی ۔

بی بی نے اس کے مذاق بھرے شوخ لہجے پر کوئی توجہ نہیں دی ۔

"ابھی ابھی میں یہ تصویر تمہیں دکھانے لا رہی تھی کہ اس نے مجھے بتایا ہے ۔ اس نے مجھے بتایا ہے ۔"

بی بی کی آنکھوں میں اک خوبصورت اور انوکھی سی جوت کے ساتھ ہلکا سا جنون کا سایہ بھی تھا ۔ ریکارڈ کی سوئی جیسے اٹک جائے ۔ بی بی بار بار یہی فقرہ کہے جا رہی تھی ۔

"اس نے مجھے بتایا ہے ... اس نے مجھے بتایا ہے ۔"

"کیا بتایا ہے بی بی ... ؟ کیا بتایا ہے ... ؟" صاحباں نے گھبرا کر بی بی کے دونوں شانے تھامتے ہوئے انہیں ہلکا سا جھٹکا دیا ۔

"وہ ... وہ ... خان گل نے ایبٹ آباد میں حارث کو دیکھا ہے ۔" بی بی کی زبان کی لڑکھڑاہٹ ان کی بے یقینی کو اُس پر ظاہر کر رہی تھی ۔ اتنے سالوں بعد بیٹے کی کوئی خبر ملی تھی تو وہ جیسے یقین کرنا چاہتی بھی تھیں مگر یقین آیا بھی نہیں تھا ۔

عجیب سی کیفیت تھی ان کی ... آنکھوں میں نمی تھی اور لبوں پر نرم نرم سی مسکراہٹ ... چہرے پر خوشی کی لہریں تھیں مگر پورے وجود پر اک عجیب قسم کی کپکپاہٹ طاری تھی ۔ یہ غیر متوقع خبر اتنی دیر دل میں لئے بیٹھی رہی تھیں شاید تب ہی ایسی حالت ہو رہی تھی ۔ صاحباں نے سوچا ۔

"آپ نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا ... ؟"

"اس لئے ... اس لئے ... کہ کہیں یہ خبر غلط نہ ہو ... جتنی دیر بھی دل کو اس جھوٹی تسلی سے بہلا سکوں اتنی دیر سہی ۔"

"کیوں بھلا ... خبر غلط کیوں ہو گی ... ؟"

"تو تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ اس نے مجھے بہلایا نہیں سچ ہی کہا ہے ۔"

صاحباں بی بی کا اندازہ جان گئی تھی ۔ اس خبر کی تائید میں کہا گیا اس کا اک چھوٹا سا فقرہ بھی انہیں بڑا سکون بخش سکتا تھا ۔ بے حد خوشی دے سکتا تھا ۔ ان کے دُکھ کی اذیت کو کم کر سکتا تھا ۔

"نہیں بی بی ! اب بھلا ، پانچ سال بعد اسے آپ کا دل بہلانے کا یکایک خیال کیوں آگیا ہے ، یقیناً اس نے حارث ہی کو دیکھا ہوگا ۔"

"تو تم بھی یہی کہتی ہو ؟ تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ وہ میرا حارث ہی ہوگا ؟"

بی بی کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کر ٹپ ٹپ رخساروں پر ٹپکنے لگی اور ہونٹوں پر بکھری ہلکی سی مسکراہٹ نے واضح تبسم کا رُوپ دھار لیا ۔

"اللہ تیرا شکر ہے ... مجھے اس کی زندگی کی اطلاع تو ملی ۔ ورنہ ... ورنہ ..."

بی بی ایک لمبی سی سسکی لیتے ہوئے صاحباں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولیں ۔

"کئی بار تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اس نے اپنی زندگی ختم کر لی ہو گی ... اسے ہم سے بہت پیار تھا صاحباں ... ! بہت ۔ اور خصوصاً مجھ سے ... مجھ سے تو ... مجھ سے تو ..." اور بی بی کی سسکیوں نے ان کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی ۔

اک ماں کے اولاد کی جدائی میں بہنے والے یہ آنسو ۔ یہ سسکیاں ، یہ جذبوں کا سیلاب ، یہ ہیجانی کیفیت ، یہ تڑپ دبے کلی ۔ صاحباں کا دل ہلکورے سے لینے لگا ۔

"بی بی ! آپ کا حارث سے ملنے کو جی چاہتا ہے ۔ ؟"

"میرا دل ... میرا دل ... ؟"

بی بی کی حالت قابلِ دید تھی ، زبان پر ہکلاہٹ ۔ آنکھوں میں ساون کے بادل ، ہونٹوں پر کپکپاہٹ ، ہاتھوں میں لرزش ۔ انہوں نے جلدی سے اپنے لرزتے ہاتھوں میں صاحباں کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے اور اس کی طرف جھک کر ہونے سے بولیں ۔

"لیکن یہ کس طرح ممکن ہے ، ہم سے تو اس نے ترکِ تعلق کیا ہوا ہے ۔"

"ان کے ترکِ تعلق کو چھوڑیئے ... میں آپ کے دل کی بات پوچھ رہی ہوں ۔"

"بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ۔" صاحباں کے ہاتھ چھوڑ کر انہوں نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ سینے پر باندھ لئے ۔ جیسے انہیں خدشہ ہو کہ دل تڑپ کر باہر آجائے گا ۔ ساتھ ہی یکایک پہلے سے بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ۔ ساون کے بادل گھن گرج کے ساتھ برسنے لگے ۔

"لیکن ، تیرے میاں جی کب گوارا کریں گے ۔ ؟"

"بی بی ! میاں جی اتنے بُرے تو نہیں ۔"

"وہ بھی ٹھیک ہے ۔ دراصل میرا ہی دماغ درست نہیں ۔" اور اس وقت تو واقعی بی بی کی دماغی حالت عجیب ہو رہی تھی ۔

"ممتا بے انصاف ہوتی ہے اس لئے ہمیشہ انہیں ہی قصور وار ٹھہراتی رہی ہوں ۔" وہ خود ہی تسلیم کرنے لگیں ۔ "حارث نے بھی تو زیادتی کی ہے ۔ آخر اپنی اولاد تھی اگر باپ نے سخت سُست کہہ بھی لیا تھا تو اسے بات کو اتنا طُول نہیں دینا چاہیئے تھا ۔ ہمارے پاس کون سی کوئی اور اولاد تھی ۔ جو پانچ سال سے اس نے شکل نہیں دکھائی ۔ یہ احساس تو اسے ضرور ہونا چاہیئے تھا ۔"

"مگر بی بی ! دو رُوٹھے ہوؤں کی صُلح کوئی تیسرا ہی کرایا کرتا ہے ۔"

"کیا مطلب ... ؟"

"مطلب یہی کہ اگر دونوں اپنی اپنی خودداری پر قائم تھے تو کچھ وقت گزرنے اور غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد آپ بیچ میں پڑ کر باپ ، بیٹے کی صُلح کرا دیتیں ۔"

"کیسے کراتی ... ؟ باپ نے اس سے نہ ملنے کی قسم خود بھی کھائی اور مجھے بھی دلائی ۔"

"کوئی اور ہی راہ نکال لیتیں ۔"

"کہاں سے ... ؟ کوئی بھی تو چور دروازہ میرے لئے باپ ، بیٹے نے نہیں چھوڑا ۔ باپ کی قسموں نے مجھے باندھ دیا تو بیٹے کے گھر سے ہی غائب ہو جانے والے فعل نے مجھے بے بس کر دیا ۔ کس کی صُلح کراتی ؟ کس سے کراتی ؟ کیسے کراتی ؟ ہمیشہ کے لئے آنسوؤں اور آہوں کا مقدر اپنی ہی پیشانی پر سجا کر بیٹھ گئی ۔"

"مگر اب ..." صاحباں نے بڑے غور سے بی بی کی آنکھوں میں دیکھا ۔

"اب تو اطلاع مل گئی ہے کہ وہ ایبٹ آباد میں ہیں ۔"

"تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے ایبٹ آباد ساتھ والے محلے میں واقع ہو ۔"

"ایبٹ آباد بے شک امریکہ سے بھی کہیں پرے واقع ہوتا ، مقصد تو باپ ، بیٹے کی صُلح کرانی ہے اور ماں ، بیٹے کو ملانا ہے ۔ جذبے سلامت رہیں فاصلے پلٹے جا سکتے ہیں ۔"

"لیکن صاحباں یہ کیسے ممکن ہے ؟" بی بی کا لہجہ پھر مرتعش ہو گیا ۔

"سب کچھ ممکن ہے بی بی ، سب کچھ ممکن ہے ۔ میں آپ سے آپ کا بیٹا ملواؤں گی ۔" وہ ایک جذبے کے ساتھ بولی ۔

"تم ... صاحباں ... تم ... ؟" بی بی کی آنکھیں یکایک پھیل گئیں ۔

"ہاں ، بی بی میں آپ کی بیٹی صاحباں ، وہی صاحباں ، جس کے قدموں میں آپ اور میاں جی ہر وقت خوشیاں لُٹانے کی فکر میں رہتے ہیں ۔" صاحباں نے بڑی عقیدت اور محبت سے ان کے ہاتھ تھام لئے ۔ "میں نمک حرام یا کم ظرف نہیں ہوں بی بی ! آپ کے آنسو دیکھتی رہوں آپ کی آہیں سنتی رہوں ، آپ کے چہرے پر لہراتی دُکھوں کی پرچھائیاں محسوس کرتی رہوں اور چُپ رہوں ۔ آپ کے جذبوں سے ، آپ کی ممتا کی تڑپ اور بے کلی سے اچھی طرح واقف ہو کر بھی اک خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھتی رہوں اور انتہائی اطمینان اور تسلّی سے آپ کی دی ہوئی آسائشیں اور خوشیاں دامن میں بھرتی رہوں ۔"

بی بی بڑے غور سے اس کے خوبصورت چہرے پر پھیلے اُن نیک خیالات ، احساسات اور جذبات کے نور کو دیکھ رہی تھیں ۔

"میں آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں ! آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں ۔ یہ میری دلی تمنا ہے ۔ یہ میری سب سے بڑی آرزو ہے ۔"

خان گل ان کے حضور سر جھکائے کھڑا تھا ۔ بی بی تو گم سُم سی بیٹھی تھیں مگر صاحباں بڑے جوش میں اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی ۔

"پھر تم نے حارث کو پکارا ؟"

"ایک بار ہی نہیں ، دو تین بار جی ... مگر انہوں نے جواب ہی کوئی نہیں دیا ۔"

"شاید سُنا نہ ہو ۔"

"ہاں جی ! یہ بھی ہو سکتا ہے ۔ پانچ چھ گز کا فاصلہ تھا ۔"

"پانچ چھ گز کا ... ؟ صرف پانچ چھ گز کا ... ؟" صاحباں تعجب سے بولی ۔ "اور تم اتنا فاصلہ بھاگ کر بھی ختم نہیں کر سکتے تھے ؟"

"جی وہ ... بھیڑ بہت تھی اور پھر وہ تھوڑی دیر بعد نظر سے اوجھل ہو گئے ۔" خان گل مجرم سا بنا کھڑا تھا ۔

"تو کیا بھیڑ میں انسان بھاگ نہیں سکتا ؟ تم خان گل ! بہت سُست ہو ۔ اک ذرا سی اپنی کاہلی کی وجہ سے اتنا اچھا موقع گنوا دیا ۔" صاحباں کو اس کے کاہل پن پر غصہ آگیا ۔ وہ اسے ڈانٹنے لگی ۔ "تمہارے بجائے میں وہاں ہوتی نا تو دیکھتے ، میں کس طرح پلک جھپکتے میں انہیں جا لیتی ۔ ایک بھیڑ چھوڑ

کرکئی بھیڑیں ہوتیں:

"وہ جی آپ تو شیر لڑکی ہوئیں نا... ہمیں پتہ ہے آپ اس اونچے سے اونچے درخت پر بھی چڑھ لیتی ہیں. جس کی بلندی کی طرف دیکھنے سے ہی ہماری ٹوپی گر جائے اور دل بیٹھ جائے۔"

ساتھ ہی خان گل نے سہم کر سر پر پہنی ٹوپی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ صاحباں کو اس کی اس حرکت پر ہنسی بھی آئی مگر ضبط کر گئی... وہ تو خان گل پر زیادہ سے زیادہ غصے کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ اس کی کاہلی کی عادت کے باعث پہلے بھی کئی نقصان ہوئے تھے۔ مگر اسے کوئی... احساس ہی نہ تھا۔

"میں تو شیر لڑکی ہوئی نا۔ تم بتاؤ تم کیا ہو...؟ گیدڑ ہو...؟ تم سے ایک لڑکا نہیں پکڑا گیا۔"

"او جی! وہ لڑکا کب ہیں وہ بھی تو شیر مرد ہیں۔ بھاگ کر پکڑ لیتا تو کیا پتہ غصے میں آکر کلائی ولائی مروڑ دیتے۔"

"تم لڑکی تھے نا، جو نازک کلائی تمہاری مروڑی جاتی تو ٹوٹ پھوٹ جاتی۔" اس کی اس صفائی پر صاحباں کو اور جلال آگیا۔ غصے سے دانت پیسنے لگی۔ چہرے پر چھایا معصومیت اور جلال کا امتزاج اسے انتہائی حسین بنائے دے رہا تھا۔

"چلو بیٹی! اب گزری بات پر غصہ کرنے سے کیا فائدہ۔؟" بی بی بڑے پیار سے اس کو تکتے ہوئے نرم آواز میں بولیں۔

"مگر بی بی! اتنا اچھا اور ہاتھ آیا موقع اس نے گنوادیا۔ چلو اُن سے ملا نہیں، کوئی بات چیت نہیں کی مگر کسی طرح ان کی رہائش گاہ کا اتہ پتہ تو معلوم کر آتا۔ اب بتائیے نا بات کیسے بنے...؟"

"آخر تم کرنا کیا چاہتی ہو۔؟"

"حارث سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ملنا چاہتی ہو...؟" بی بی نے تعجب سے اسے دیکھا۔ "کیوں...؟"

"میاں جی بھی جھگڑے کی وجہ نہیں بتاتے پھر حارث سے ہی مل کر معلوم کرنا پڑے گا نا۔"

"معلوم کرکے کیا کرو گی؟"

"دیکھوں گی اس سارے معاملے میں قصور کس کا زیادہ ہے۔ اگر حارث کی زیادتی ہوئی تو سمجھا بجھا کر، دلائل سے قائل کرکے، والدین کے حقوق کا احساس دلا کر میاں جی سے معافی منگوادوں گی اور آپ کے گلے لگوادوں گی۔"

"...اور اگر تمہارے میاں جی کی غلطی ہوئی...؟"

"تو میاں جی سے بات کروں گی۔" پھر صاحباں مسکرائی۔ "اور یہ تو آپ جانتی ہی ہیں نا کہ میں میاں جی سے ہر قسم کی بات کر لیتی ہوں۔ اور وہ میری سن بھی لیتے ہیں اور مان بھی لیتے ہیں۔"

"مگر..." بی بی خوفزدہ سی ہو کر بولیں۔ "انہوں نے تو اس سے ملنے کی قسم ڈالی ہوئی ہے۔"

"آپ ہی کو نا! میں تو ان کی کسی قسم کی پابند نہیں ہوں۔"

"مگر... مگر...!" بی بی ابھی سے سہمی جارہی تھیں۔ "تمہارے میاں جی تمہیں اس سے ملنے کی اجازت دے دیں گے؟"

"اب یہ تھوڑی سی نافرمانی تو کرنا ہی پڑے گی۔"

"کیا مطلب...؟"

"ان سے چوری چوری سب کچھ کیا جائے گا۔"

"نہ صاحباں نہ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا؟"

"کہیں تو اُن کی نگاہوں میں..." اور بی بی بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگئیں۔

"میں آپ کا مدعا سمجھ گئی ہوں بی بی لیکن مجھے اپنے اس نیک مقصد میں کامیابی ہو جائے، آپ کو آپ کا بیٹا مل جائے پھر بے شک میں بُری بن جاؤں، نافرمانی کہلاؤں، گردن زدنی قرار پاؤں۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"لیکن..."

"لیکن ویکن چھوڑیئے بی بی! مجھے ایک کوشش کر لینے دیجئے۔" بی بی کے مشفق چہرے کو بڑے پیار سے تکتے ہوئے وہ مسکرائی۔

"ویسے مجھے پوری اُمید ہے کہ میری بی بی اگر اپنی صاحباں کی یہ آرزو پوری ہونے کی دعا مانگیں گی تو انشاءاللہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائیگا۔"

"پھر جی میرے لئے کیا حکم ہے؟" خان گل اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ابھی میاں جی کے سارے کام کرنے والے پڑے ہیں اور آپ نے مجھے یہاں باندھ رکھا ہے۔"

"میاں جی کے کون سے کام کرنے والے پڑے ہیں؟" صاحباں یکایک چمک اُٹھی۔ "کپڑے اُن کے میں تیار کرکے آئی ہوں، ان کے جوتے میں نے پالش کئے ہیں، ان کے کمرے کی ساری چیزیں میں نے درست کی ہیں۔"

"بیٹی!" بی بی جلدی سے بولیں۔ "بھلا تو کیوں یہ سب کرتی ہے۔ گھر میں ملازموں کی کمی ہے کیا؟"

"ہائے بی بی! اپنے میاں جی کے کام نوکروں پر ڈال دوں جو کبھی دل لگا کر اور ڈھنگ سے نہیں کرتے اور پھر..." صاحباں کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ "تصور آباد میں اپنے بابا کے کام میں ہمیشہ خود کیا کرتی تھی، مجھے بھی مزہ آیا کرتا تھا اور بابا بھی بہت خوش ہوا کرتے تھے۔"

"چھوٹی بی بی جی... ! میں ان کاموں کے متعلق تو نہیں کہہ رہا ہوں جی۔ وہ تو انہوں نے بازار جانے کو کہا تھا۔"

"بازار...؟" بی بی تجسس سے بولی۔ "ابھی کل ہی تو سارا سودا سلف آیا ہے اور کچھ بھی تو نہیں آنے والا۔"

"بیگم صاحب جی! سودا کوئی نہیں آنا۔ درزی اور سنار کو بلوانا تھا۔"

"کیوں؟ کیا تمہارے میاں جی نئی شادی رچانے چلے ہیں۔" بیٹے کی جدائی نے بی بی کے دل میں شوہر کی طرف سے گرہ سی بٹھا رکھی تھی۔ تبھی اکثر ایسی جلی کٹی سنا دیا کرتی تھیں۔

"نہیں جی۔ اس بڑھاپے میں وہ کیا شادی کریں گے۔" خان گل بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "اب بھلا کون انہیں لڑکی دے گا جی۔"

صاحباں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"بے وقوف! بی بی تو خفگی سے کہہ رہی ہیں اور تو لڑکی کی بھی فکر کرنے لگ گیا۔"

"وہ جی... وہ جی..." وہ کھسیانا سا ہو کر سر کو کھجانے لگا۔

"بتانا۔ درزی اور سنار کو کس لئے بلایا ہے؟" بی بی پوچھنے لگیں۔

"میاں جی کہہ رہے تھے کہ اپنی چھوٹی بی بی صاحب کے لئے نئے لباس اور نئے زیورات بنیں گے جی۔"

"اوہ اچھا...!" بی بی کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آئی۔ "سمجھ گئی ہوں۔"

"کیا بی بی...؟" صاحباں تجسس بھری بے قراری سے پوچھنے لگی۔

"پچھلے ہفتے انہیں کاروبار میں ایک لاکھ کا فائدہ ہوا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ میری بیٹی صاحباں کے نصیب کا ہے۔ پھر میں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ پہلے والے سب زیور وغیرہ پرانے ہوگئے ہیں۔ نئے ڈیزائن کے بنوادیں۔"

"نہیں، نہیں۔ کوئی پرانے نہیں ہوئے۔" صاحباں جلدی سے بولی۔ "خان گل! ابھی درزی یا سنار کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس تم یوں کرو کہ آج ہی ایبٹ آباد چلے جاؤ۔ ابھی۔"

"لیکن جی! ابھی کل ہی تو دس دن کی چھٹی گزار کر آیا ہوں۔ پھر چلا گیا تو ایسا نہ ہو کہ میاں جی بالکل ہی چھٹی کرادیں۔"

"تم اس کا فکر نہ کرو۔ میں میاں جی سے خود ہی بات کرلوں گی۔"

"کیا کہو گی؟" بی بی پھر سہم گئیں۔

"کہنا کیا ہے۔ اس بار گرمی کا موسم ایبٹ آباد میں گزارنے کو دل چاہتا تھا خان گل کو وہاں جائے رہائش کا بندوبست کرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔"

اس کی بات سن کر بی بی خاموش ہوگئیں اور خان گل بھی۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ صاحباں جس معاملے کی ضامن بن جاتی تھی۔ پھر اس کی طرف سے پریشان ہونے یا فکر کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ میاں جی اتنا اُس کا مان رکھتے تھے، اتنا اسے پیار کرتے تھے۔

"تو پھر جی! ایبٹ آباد جا کر کیا کروں؟"

"پہلے تو وہاں حارث صاحب کو تلاش کرو۔"

"وہ کیسے جی؟"

"تم نے انہیں اسی بازار میں دیکھا تھا نا، جہاں سے ایبٹ آباد کے لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں خریدتے ہیں؟"

"ہاں جی...!"

"بس اسی بازار میں چلے جانا۔ ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھنا۔ اگر تو وہ ایبٹ آباد میں ہی ہوئے تو اہم ضروریات کی خرید کے لئے وہاں ضرور جائیں گے۔ ایک دن، دو، تین، چار دن، یہاں تک کہ پورا ایک ہفتہ انتظار کرنا۔"

"پھر جی۔ اگر وہ نظر آگئے تو...؟"

"تو چپکے سے ان کے پیچھے پیچھے جا کر ان کی رہائش گاہ کا پتہ معلوم کرنا۔"

"اچھا جی کرلیا... پھر...؟"

بی بی چپ چاپ بیٹھی تھیں اور بڑی توجہ اور دلچسپی سے دونوں کی گفتگو سُن رہی تھیں

"لیکن یہ خیال رہے کہ انہیں معلوم نہ ہونے پائے۔" صاحباں نے دوبارہ تاکید کی۔

"ہاں جی ٹھیک ہے۔ ورنہ پھر وہ وہاں سے بھی بھاگ جائیں گے۔"

"ہائے میرے بچے! مال اتنی بُری ہے کہ..."

"نہیں بی بی! نہیں۔" صاحباں نے ان کی بات پُوری ہونے سے پہلے ہی انہیں تسلی دینا شروع کردی۔ "یوں مت سوچیئے۔ یقیناً کوئی.. غلط فہمی ہی ہوگی، ورنہ میری بی بی جیسی اچھی ماں اس پوری دُنیا میں نہ ہوگی۔"

ساتھ ہی صاحباں نے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر انہیں پیار کرلیا۔

"جیتی رہے میری بچی تو۔ حارث کے لگائے ہوئے زخموں پر ایسا ٹھنڈا مرہم رکھتی ہو کہ اسی وقت چین سا پڑ جاتا ہے۔"

"ہاں تو خان گُل!" بی بی کو تسلی دینے کے فوراً بعد ہی اس سے مخاطب ہوگئی۔ "جب اُن کی رہائش گاہ کا پتہ چل جائے تو اس کے قریب ترین کوئی کوٹھی، مکان یا پھر دو کمروں کے فلیٹ کا ہی انتظام کرکے فوراً واپس آجانا۔"

"کرائے پر...؟"

"ہاں کرائے پر۔ پُورے سیزن کے لئے۔ رقم میں تمہیں دے دیتی ہوں۔ کسی ہوٹل میں ٹھہر جانا بے شک۔ خرچ وغیرہ کی پرواہ نہ کرنا۔"

"اور چھوٹے صاحب سے کیا کہوں جی؟"

"تم نرے پاگل ہو۔ میں نے کہا نا اُن سے ملنا نہیں۔ اُنہیں تو ذرا سا بھی شک تک نہیں ہونا چاہیئے۔"

"اور جی اگر پُورے ہفتے میں وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیئے تو؟"

"تو پھر واپس آجانا۔ ہم اخبار میں اک اٹھائیس سالہ بچے کی گم شدگی کا اشتہار دیں گے۔ کیوں بی بی؟"

اس نے شوخی بھرے لہجے میں یہ فقرہ صرف بی بی کو ہنسانے کے لئے کہا تھا۔ مگر اُن پر اُلٹا ہی اثر ہوا۔ نمناک آنکھیں چھلکنے لگیں... بہتے آنسو صاحباں سے چُھپانے کے لئے منہ پھیرتے ہوئے بڑبڑائیں۔ "میرے مولیٰ! وہ وہیں مل جائے ورنہ... اپنے بچے سے ملنے کی گھڑی، جو ابھی ابھی مجھے قریب آتی دکھائی دے رہی تھی، پھر دُور نہ چلی جائے۔ اتنی دُور کہ شاید میں پھر وہاں تک اپنی زندگی میں پہنچ ہی نہ سکوں۔"

بی بی کی کیفیت کو محسوس کرکے صاحباں جلدی سے خان گُل کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"تم اب جانے کی تیاری کرو اور آج ہی کوئی گاڑی پکڑ لو اور اگر گاڑی کا وقت نہیں ہے تو بس پر سوار ہو جاؤ۔"

"اور جی وہ نہ ملے تو کرائے کی کوٹھی، مکان اور فلیٹ تو لیتا آؤں نا...؟"

"ہاں۔ سب کچھ سر پر اُٹھا کرلے آنا۔" صاحباں جھنجھلا پڑی۔ "اور اپنے کوارٹر میں سنبھال کر رکھ لینا۔ گرمیاں اچھی گزر جائیں گی۔"

صاحباں کی اس بات نے بی بی کے افسردہ چہرے پر مسکراہٹ دوڑا دی۔

"سُن رہی ہیں بی بی! اس کی بات۔"

"ہاں... پھر وہ خود دھیمے سے لہجے میں خان گل کو سمجھانے لگیں۔ "اگر حارث وہاں نہیں ملا تو اسی طرح لوٹ آنا۔ پھر کسی کوٹھی مکان کا بندوبست کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"سمجھ گیا جی۔ چھوٹی بی بی تو ایسے ہی غصہ میں آجاتی ہیں۔"

"تم کوڑھ مغز بھی تو بہت ہو۔ کوئی بات دماغ میں جلد بیٹھتی ہی نہیں۔ اور اب جاؤ جلدی۔ وقت... ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔"

خان گُل دروازے تک پہنچا تو صاحباں کو پھر کچھ یاد آگیا۔

"سُنو خان گُل!"

"سنائیے جی۔ کوڑھ مغز تو بنالیا۔ اب پتہ نہیں اور کیا کچھ کہیں گی۔

وہ بڑبڑاتا ہوا واپس آگیا۔

صاحباں ہنستے ہوئے نرمی سے بولی۔ "میاں جی کو اس معاملے کی بھنک تک نہیں پڑنی چاہیئے۔ سمجھے...؟"

"چھوٹی بی بی جی... ! اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔ پرانا نمک خوار ہوں جی اس گھر کا۔ معاملات کی نزاکت کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں اور خصوصاً چھوٹے صاحب والا معاملہ۔ اس نے تو ہمارے بھی سینے میں گھاؤ لگایا ہوا ہے جی۔"

"پھر میرا مغز کیوں اتنا کھپایا ہے؟"

"وہ تو جی آپ ہماری چھوٹی بی بی صاحب جو ہوئیں۔ آپ سے ہمیں بہت پیار ہے۔ آپ جب غصّے میں آکر ہم پر رعب ڈالتی ہیں تو ہمیں بہت اچھا لگتی ہیں۔ اس لئے ہم جان بوجھ کر ذرا بے وقوف بن جاتا ہے جی۔"

اور وہ مسکرا کر اور بڑے پیار سے صاحباں کو دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اسلام علیکم...!" خان گُل کی پٹھانی آواز سُن کر دونوں ہی چونک پڑیں۔

میاں جی گھر نہیں تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں بی بی کا زیادہ وقت صاحباں کے پاس ہی گزرتا تھا۔ اب بھی وہ بیٹھیں حارث ہی کی باتیں... سُنا رہی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔" بی بی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بڑی حیرت سے اُسے دیکھا۔

اور صاحباں۔ وہ اس قدر متعجب تھی کہ سلام کا جواب دینا ہی بھول گئی تھی اُسے! وہ اپنی حیرت پر بی بی کی طرح قابو پا ہی نہ سکی۔

"تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟ صرف چار دن بعد۔ ایبٹ آباد تک پہنچے بھی یا...؟"

اور اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر وہ اپنی بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور سی ہوگئی۔ خان گُل کچھ کہے بغیر کھڑا بس مُسکرائے جارہا تھا۔ پانچ سات لمحے خاموشی کے جانے صاحباں نے کیسے گزارے۔ پھر بے صبری سے اس پر برس پڑی۔

"کیسے کھڑا دانت نکالے جارہا ہے۔ بات کیا ہوئی؟"

"کام کرو تب بھی چھوٹی بی بی صاحب غصہ ہوتی ہیں، کام نہ کرو تب بھی۔ آخر خان گل جائے کہاں؟"

"خان گل بھاڑ میں جائے۔" صاحباں مُسکرا پڑی۔ خان گل کے اس فقرے نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ کامیاب لوٹا ہے۔

"تو پھر خان گل اب بھاڑ میں ہی جائے گا۔" خان گل پلٹ کر کمرے سے نکلنے لگا تو صاحباں بے تابی سے بول پڑی۔

"اے خان گل! جانا ضرور بھاڑ میں لیکن پہلے ساری بات بتا کر۔"

"ایک شرط پر چھوٹی بی بی صاحب؟"

"اب شرطیں منواتے ہو۔" صاحباں نے مصنوعی تیوری سے اُسے گھورا۔

"اب تو ایسے ہی ہوگا۔" خان گل بھی بڑا شوخ ہو رہا تھا۔

"کیوں...؟"

"کام بھی تو بہت بڑا اور بہت معرکے کا کرکے آیا ہے ہم۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، ہر شرط منظور۔" صاحباں مُسکرائی۔

"خان گل بتا دے، میرا دل دھڑک رہا ہے کہیں..." بی بی نے دوپٹہ آنکھوں پر رکھ لیا۔ اُن کا سارا وجود کپکپا رہا تھا۔

"ارے..." صاحباں نے گھبرا کر بی بی کی طرف دیکھا۔ "بی بی... آپ کی حالت ایسی کیوں ہوگئی۔ خان گل ناکام تو نہیں آیا۔"

"بیگم صاحب جی! اپنے چھوٹے صاحب کا پتہ کرکے آیا ہوں جی۔ آپ کے لئے خوشی لے کر۔"

"اور یہی خوشی مجھے اتھل پتھل کئے دے رہی ہے۔" وہ رونے لگیں۔ "پانچ سال بعد مجھے اس کی صُورت نظر آئے گی۔ پورے پانچ سال اور چند مہینوں بعد۔ اتنی طویل مدت بعد، میں... میں اُسے کیسے دیکھوں گی۔"

"حد ہوگئی بی بی! ولایت میں بھی تو آٹھ سال رہے تھے۔ یہ تو پھر پانچ ہیں۔"

"یہ پانچ اُن آٹھ سے بھی زیادہ طویل تھے صاحباں! کہیں زیادہ۔ دوسرے تیسرے اس کا خط آجاتا تھا۔ تصویریں آتی رہتی تھیں۔ وہ جدائی تو مجھے محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔"

"اور اب اس جدائی کو بھی بھول جائیے بیگم صاحب جی۔" خان گل ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "ہم نے چھوٹے صاحب کے لئے بڑی دعائیں مانگا ہے جی۔ اسی لئے وہ مجھے جاتے ہی پہلے روز ہی اسی بازار میں مل گئے۔ صرف آپ کی خاطر جی۔ آپ روئیے نہیں۔ ہمارا خدا آنسو پسند نہیں کرتا۔ شکر پسند کرتا ہے۔ آپ شکر کیجئے بیگم صاحب جی! وہ مل گئے ہیں۔ اُن کے گھر کے بالکل پاس ایک بہت اچھا گھر بھی مل گیا ہے۔ خدا آپ کے ساتھ ہے نا۔ اس لئے جی۔"

"خان گل! ذرا تفصیل سے بتاؤ نا۔" صاحباں نے بے قراری سے پوچھا۔

"چھوٹا بی بی صاحب جی! تفصیل بھی یہی ہے۔ بس ہم نے ایبٹ آباد پہنچتے ہی خدا سے دعا مانگا۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ پہلے ہی دن چھوٹے صاحب ہمیں دکھائی دے گئے۔ اور ہم نے اُن کے پیچھے جا کر ان کا گھر معلوم کرلیا۔"

"انہیں پتہ تو نہیں چلا...؟"

"بالکل نہیں جی۔ ہمارا چھوٹا صاحب بہت شریف آدمی ہے۔ ہمیشہ نظر جھکا کے رکھتا ہے۔ انہیں ذرا سا شک بھی نہیں ہو سکا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔"

"پھر...؟" صاحباں جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔

"پھر ہم وہاں کے ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اس علاقے میں کوئی اچھا سا مکان کرایہ پہ چاہیئے۔ اگلے دن اس نے مجھے کئی مکان دکھا دیئے۔"

"کئی مکان...؟" صاحباں زور سے ہنس پڑی۔ "وہاں اتنے مکان خالی تھے؟"

"او جی آپ ہنستے ہیں۔ پورے تین مکان دیکھے تھے۔"

"پورے تین...؟" صاحباں کا قہقہہ بلند ہو گیا۔ بی بی بھی مسکرانے لگیں۔

"ہاں جی پورے تین۔" خان گل سنجیدگی سے بولا۔ "مگر وہ چھوٹے صاحب کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھے اور ویسے بھی آپ کے حساب سے ٹھیک نہیں تھے۔ آپ کے لئے تو میں ایک خوبصورت اور شاندار بنگلہ کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔"

"بڑی لمبی بات کرتے ہو خان گل۔" صاحباں اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ پھر کیا ہوا تھا؟"

"او جی... یہی تو بتانے لگا تھا۔ چھوٹے صاحب کے گھر کے بالکل ہی پاس ایک بہت خوبصورت بنگلہ تھا۔ بار بار میری نظر ادھر پڑتی تھی۔ پراپرٹی ڈیلر مجھے کہنے لگا کہ اس بنگلے کو کیوں دیکھتا۔ وہ تم نہیں لے سکے گا۔ وہ بڑے لوگ کا رہنے والا ہے۔ میں خوب ہنسا جی۔ میں نے کہا بول کیا مانگتا ہے اس سیزن کا کرایہ۔ پانچ ہزار، دس ہزار۔" وہ میری طرف حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ پھر ہم نے اسے زیادہ حیران نہیں ہونے دیا۔ اسے بتا دیا کہ بڑے لوگ ہی کے موافق بنگلہ چاہیئے۔ ہمارا چھوٹی بی بی صاحب بڑا نخرے والا ہے۔"

"خان گل کے بچے! میں نخرے والی ہوں؟"

"ارے چھوٹا بی بی! نہیں ہے تو کرو نخرہ۔ ہم سب کس لئے ہے۔ ہم آپ کا غصّہ اتنے پیار سے اٹھاتا ہے تو کیا نخرہ نہیں اٹھائے گا؟"

"لیکن تم نے ایک غیر کے سامنے ایسا کیوں کہا؟" صاحباں غصّے میں بولی۔

"دیکھا بی بی! کیسے مجھے بدنام کرتا پھر رہا ہے!" ہمیشہ کی طرح ان کی نوک جھونک چل نکلی تھی۔ اور بی بی معمول کی طرح کچھ بھی بولے بغیر، کسی کی بھی طرفداری کئے بغیر مسکرائے جا رہی تھیں۔

"یہ کوئی بدنامی کی بات ہے۔ چھوٹی بی بی صاحب۔" خان گل مسکرا کر بولا۔ "ہمارے گاؤں میں تو جو لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے وہ نخرا کرتا ہے اور سب اس کا حق سمجھتا ہے۔"

خان گل کی اس توجیہہ پر صاحباں شرما کر سرخ سی ہو گئی۔

"کام کی بات کرو، کام کی۔ بڑے باتونی ہو۔"

"کام کی بات تو پہلے ہی بیگم صاحب کو میں نے دو فقروں میں بتا دی تھی۔ تفصیل آپ نے ہی پوچھی تھی، چھوٹی بی بی صاحب! اور اب مجھے باتونی کہنے لگیں۔ کمال ہے جی۔"

"پھر وہ خوبصورت اور شاندار بنگلہ لے لیا؟" بی بی نے ان کا جھگڑا چکانے کی غرض سے مداخلت کی۔

"ہاں جی! لے لیا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "کچھ رقم پیشگی دے دی ہے۔ باقی وہاں پہنچتے ہی آپ ادا کر دینا اور یہ چابی میں لے آیا۔"

خان گل نے ساری جیبیں ٹٹولنے کے بعد اک چابی نکال کر بی بی کی طرف بڑھائی۔

"صاحباں کو دے دو۔" بی بی خوفزدہ نگاہوں سے چابی کو دیکھتے ہوئے تھوڑا سا پرے ہٹ گئیں۔

"آپ چابی سے کیوں ڈر گئیں بی بی؟" صاحباں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کہیں میاں جی نے دیکھ لی تو...؟"

"چابی ہی ہے نا بی بی! ایبٹ آباد والے گھر کی۔ اس کے اوپر یہ تو نہیں لکھا ہوا کہ یہ گھر حارث کے گھر کے سامنے ہے۔ اور اسے ہی کی غرض سے لیا گیا ہے۔" صاحباں ہنس پڑی۔ خان گل بھی بی بی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"بیگم صاحب جی! اب آپ کو بہت دلیر بننا پڑے گا۔"

"یہ لیجئے چابی۔" صاحباں نے وہ ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ "مجھ سے کہیں بے پرواہی سے ادھر ادھر نہ ہو جائے۔"

صاحباں کی بات سنتے ہی بی بی نے چابی یوں مٹھی میں دبائی، جیسے وہ کسی بہت بڑے خزانے کی ہو۔

"چابی سنبھال کر رکھ چھوڑنے کے لئے تو نہیں آئی۔" بی بی ہولے سے بولیں۔

"کون کہتا ہے کہ سنبھال کر رکھنے کے لئے آئی ہے۔ ہمیں تیاری میں دو چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"دو چار دن کیوں۔؟" بی بی عجلت سے بولیں۔ "آج تیاری کر لیں گے، کل صبح صبح چل پڑیں گے۔"

"میاں جی سے بھی تو بات کرنی ہے۔ صاف ظاہر ہے تیاری کر کے تو نہیں بات ہو سکتی۔ وہ کیا کہیں گے؟"

"چلو ٹھیک ہے شام کو آئیں گے تو ان سے بات کرنے کے بعد راتوں رات تیاری کر لیں گے۔" بی بی اپنے لاڈلے بیٹے کے شہر میں پہنچنے کے لئے بری طرح بے قرار تھی۔ "صبح ہمیں کون سا دفتر جانا ہے۔ گاڑی میں بھی سو لیں گے۔ کیوں خان گل؟ یہ پروگرام ٹھیک ہے نا...؟"

"ہاں بی بی! بالکل ٹھیک ہے۔ آپ جو چاہیں گی وہی ہو گا۔" صاحباں نے بڑی رحم آمیز نگاہوں سے بی بی کو دیکھا۔ "بیچاری بی بی! یہ پانچ سال نجانے کیسے گزارے ہوں گے۔" وہ دل ہی دل میں بولی

"ویسے تمہیں چاہیئے تھا صاحباں! اپنے میاں جی سے پہلے ہی بات کر لیتیں۔ اب دیکھو نا ان سے بات کرنے کے لئے شام تک انتظار کرنے سے کتنا وقت ضائع ہو گا۔ اتنے میں تو ہماری تیاری مکمل ہو سکتی تھی۔"

"اور اب..." صاحباں اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکی۔

"بی بی! ایک دن کی کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی میں میاں جی سے پہلے کیسے بات کر لیتی۔ طے تو یہی تھا نا کہ حارث وہاں ہوں گے۔ تب ہم ایبٹ آباد جائیں گے اور خان گل ان کی وہاں موجودگی کی اطلاع لے کر ابھی آیا ہے۔"

"ارے ہاں۔ یہ تو ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔" بی بی خجل سی ہو کر رہ گئیں۔ دو لمحے خاموش رہنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"چلو آؤ خان گل! تم میرے ساتھ آؤ۔"

"اب کہاں جا رہی ہیں بی بی...؟"

"بازار کے ایک دو کام ہیں۔ وہ تو ہو جائیں۔ باقی گھر میں جو تیاریاں کرنا ہوں گی، وہ رات کو بھی ہو سکتی ہیں۔"

بی بی خان گل کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گئیں۔ بی بی کی بے قراریاں تو حد سے بڑھی ہوئی تھیں۔ صاحباں ان کے متعلق سوچنے لگی۔

شام کو میاں جی گھر آئے تو بی بی نے ان کے اطلاع صاحباں کو اتنی خوشی اور جوش سے دی جیسے میاں جی کئی سالوں بعد اچانک گھر آئے تھے۔ غیر متوقع طور پر۔!

صاحباں کوئی بات میاں جی سے کہے، کسی خواہش، تمنا یا آرزو کا اظہار کرے اور وہ میاں جی تشنہ رہنے دیں ناممکن تھا یہ! صاحباں کا ایبٹ آباد ...اور اس کے نواحی علاقوں کی سیر کو دل چاہا تھا۔ میاں جی نے اس کی یہ خواہش جان و دل پر لی۔ خود ساتھ جا کر اپنی عزیز ترین بیٹی کو سیر و تفریح کراتے، مگر کاروبار کچھ ایسے مرحلے پر تھا کہ وہ ایک دن بھی غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔ فوراً اسی لمحے۔ بی بی کو حکم دیا کہ راتوں رات ایبٹ آباد جانے کی تیاری کریں اور کل ہی روانہ ہو جائیں۔

میاں جی کو صاحباں کی خواہش جلد از جلد پوری کرنے کا ارمان تھا۔ اور بی بی کو اپنا بچھڑا بیٹا ایک نظر دیکھنے کی تمنّا۔ میاں جی کے حکم کے مطابق وہ پوری رات خود بھی جاگیں اور سارے ملازموں کو بھی جگائے رکھا۔

صبح مسجد سے اذان کی آواز آئی تو ان کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ شکرانے کے نوافل کے ساتھ بی بی نے نماز ادا کی اور دن چڑھتے چڑھتے اِک ملازم کبیر خاں، اس کی بیوی شرجانہ، ڈھیر سارا ساز و سامان لئے صاحباں اور بی بی کا قافلہ روانہ ہو گیا۔

خان گل کا پسند کیا ہوا بنگلہ انہیں بھی بہت پسند آیا۔ خان گل کی عمر کا بیشتر حصّہ اسی گھر کی چوکھٹ پر گزرا تھا۔ اس لئے وہ سب کی... عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف تھا۔ جن آسائشوں میں مالک زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ویسی ہی آسائشوں والی فرنشڈ رہائش گاہ کا انتظام کیا تھا۔

خان گل خود تو ساتھ نہیں آیا تھا کہ اسے حارث اچھی طرح جانتا تھا۔ کہیں باہر آتے جاتے اسے دیکھ لیتا تو ہو سکتا تھا بات بننے کی بجائے بگڑ جاتی اس لئے اس نے صاحباں کو ہی سارا اتہ پتہ وغیرہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ نہ صرف زبانی بلکہ کاغذ پر پورا پورا نقشہ کھینچ کر بتایا تھا کہ حارث کا گھر ان کے گھر کی کس سمت واقع تھا۔

گھر کو گھوم پھر کر اچھی طرح دیکھنے کے بعد صاحباں نے اطراف و جوانب کا جائزہ لیا تو خاصی مطمئن ہو گئی۔ سب کچھ بالکل مناسب تھا۔ اب وہ دو چار دن تک سوچ سمجھ کر کوئی جامع پلان تیار کر کے اپنے مشن کا آغاز کر سکتی تھی۔

مگر۔ وہاں پہنچے انہیں ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ بی بی کی بے قراریوں نے شدّت اختیار کر لی۔ آٹھ دس گھنٹے کے سفر کی تکان کا بھی انہوں

نے احساس نہیں کیا۔ گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے کا بھی خیال نہیں آیا۔ اگلے وقت کے کھانے دانے کے لئے باورچی خانے کو ایک نظر نہیں دیکھا۔ نہ کھانے وغیرہ ہی کا کوئی معقول انتظام کیا۔ بس پریشان حال اور الجھی ہوئی سی، کبھی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتیں اور کبھی اس دروازے میں۔

"صاحباں! بیٹی ذرا مجھے بتانا تو سہی کہ حارث کہاں رہتا ہے؟" بہت دیر دروازوں اور کھڑکیوں کے چکر کاٹنے کے بعد بھی جب انہیں کوئی اندازہ نہ ہو سکا تو وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

"بی بی! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کی یہ بے چینی کام ہی نہ بگاڑ دے۔" صاحباں ان کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ آخر انہیں سمجھائے بغیر نہ رہ سکی۔

"وہ تو میں نے ایسے ہی سرسری طور پر پوچھا تھا۔" بی بی نے جلدی سے بات بدل کر اپنے اضطراب کو چھپانا چاہا۔ مگر انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے چہرے پر پھیلے، بکھرتے، سمٹتے رنگ صاحباں پر سب ہی کچھ عیاں کئے دے رہے تھے۔ وہ خاموش ہو کر اک کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔

"صاحباں! مجھے کچھ تو بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے؟" چند ہی لمحوں کے بعد بی بی نے پھر اسے مخاطب کیا۔

"کس کے متعلق بی بی؟"

"حارث کے متعلق..."

"اوہ... پھر اسی کا ذکر۔" صاحباں کو ان پر بہت زیادہ ترس آنے لگا۔ انتہائی نرمی اور ملائمت سے بولی۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں بی بی۔"

"کچھ بھی نہیں...؟" بی بی جھنجھلا سی پڑیں۔ "تو پھر اتنا طویل سفر کر کے مجھے بھی ساتھ لئے یہاں کیوں چلی آئی ہو؟"

"دل میں خلوص اور نیکی لے کر بی بی۔ آپ کے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لئے۔"

"کیا مطلب؟" بی بی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بس دل نے کہا کہ کوئی ایسا جتن کر صاحباں، جو ماں بیٹا مل جائیں۔" پھر اک نرم تبسم اس کے نازک سرخ لبوں پر لہرا گیا۔

"آپ کے جذبوں کا مجھے احساس ہے بی بی! پورا پورا احساس ہے۔"

"صاحباں! میری بیٹی تو میری کسی بات کا بُرا مت ماننا۔ میں دراصل... مجھے دراصل... وہ حارث کی جدائی نے... وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے نا... وہ..."

...اور بی بی بھیگی بھیگی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے ہکلا ہکلا کر خاموش ہو گئیں۔

"میں جانتی ہوں بی بی! اور اسی لئے اتنا طویل سفر طے کر کے آ بھی گئی ہوں۔ جو بھی ہو سکا۔ بڑی سے بڑی مشکل سے بھی گزرنا پڑا تو آپ کی خاطر گزروں گی۔ جان پر بھی کھیلنا پڑا تو آپ کی خاطر کھیلوں گی بی بی!"

"وہی تو میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا کرو گی اب؟"

"پڑوسی تو بن گئے ہیں۔ کسی طرح ان سے راہ و رسم بڑھا کر پہلے باپ بیٹے کے جھگڑے کی وجہ معلوم کروں گی۔ پھر اسے دور کر کے میاں جی سے صُلح کرا دوں گی بس!"

"میاں جی سے صلح کرا دوں... اور میں...؟" بی بی اک بے قراری کے ساتھ تنک کر بولی۔

"میاں جی سے صلح ہو گئی تو پھر آپ سے بی بی خود بخود ہی ہو جائے گی۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ حلیمی سے بولی۔ ان کا اپنا قصور کوئی نہ تھا۔ سینے میں آگ ہی ایسی بھڑک رہی تھی کہ وہ دماغی توازن بھی کھو بیٹھتیں تو کوئی عجب نہ تھا۔

"نہیں کیا...؟ صلح ہو جائے گی نا آپ کی بھی...؟"

"ہاں۔" بی بی کی سمجھ میں جیسے ساری بات آ گئی۔ چہرے پر یکایک ڈھیر ساری مسکراہٹیں سجاتے ہوئے بولیں۔ "تو پھر بڑھاؤ نا راہ و رسم۔ اتنی دیر کیوں کر رہی ہو؟"

صاحباں اپنی ہنسی روکنے کی انتہائی کوشش کے باوجود نہ روک سکی۔ انہیں یہاں پہنچے ابھی بمشکل ایک گھنٹہ تو ہوا تھا اور بی بی راہ و رسم بڑھانے کو کہہ رہی تھیں۔

"کیا ہوا، تم ہنس کیوں رہی ہو؟" بی بی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کی بات پر مجھے ہنسی آ گئی تھی بی بی!" وہ ہنستی ہی چلی گئی۔

"ابھی تو ہم پہنچے ہیں۔ بھلا اتنی جلدی کیسے راہ و رسم بڑھ سکتے ہیں؟"

"ہاں تو..." بی بی بھی قدرے کھسیانی سی ہو کر ہنسنے لگیں۔ "میں بھی پاگل ہی ہو گئی ہوں۔ ابھی تو ہم آئے ہیں۔ چل کر دیکھتی ہوں، کبیرے نے سب سامان ٹھکانے پہ لگایا یا نہیں؟"

یہ کہنے کے باوجود بی بی وہاں سے ہٹی نہیں۔ کھڑکی سے باہر ہی دیکھے گئیں۔ صاحباں ان کی بے تابیوں کو ہمدردی بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان

کے پاس کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"بی بی! وہ دیکھ۔ ہی ہیں۔ سرخ اور مٹیالی سی اینٹوں والا گھر۔ وہ نیچے والی سڑک پر۔ چھوٹا سا۔ یہیں آپ کا بیٹا رہتا ہے۔"

"اتنی دور...!"

"یہ دور ہے بی بی؟ سامنے تو دکھائی دے رہا ہے۔"

"یہ اتنی لمبی سڑک ادھر جا کر پھر موڑ مڑنے کے بعد اتنا ہی لمبا راستہ۔ پھر..."

"آپ راستوں میں نہیں الجھئے بی بی! وہ طے کرنا آپ کی بیٹی کا کام۔" صاحباں نے جیسے انہیں تسلی دی۔ پھر مسکرائی۔

ویسے بس پگڈنڈی سے نیچے اتریں تو پانچ دس گز کا فاصلہ ہے بی بی! ہمارا اور حارث کا میل ملاپ اسی پگڈنڈی کے راستے سے ہو گا۔ سڑک والا لمبا راستہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ اس طرح تو وہ ہمارے بالکل قریب ہے۔"

"بس بی بی! آپ یہ دعا کیجئے کہ ان کا دل قریب ہو، اس پگڈنڈی کی طرح۔ اگر اس نے اپنے اور آپ کے دلوں کے درمیان اس سڑک جیسے فاصلے بنا لئے ہیں تو تب مشکل ہو گی۔"

"نہیں نہیں۔ خدا نہ کرے۔" اور بی بی اسی وقت جھولی پھیلا کر اپنے رب سے جانے کیا کیا مانگنے لگیں۔

"اچھا بی بی میں ذرا کبیر خاں اور شرجانہ کو دیکھ آؤں۔ کتنا کام کیا ہے؟" ساتھ ہی وہ ہنس پڑی۔ "کہیں میاں بیوی کو اکٹھا لا کر ہم نے غلطی تو نہیں کی؟"

"کیوں...؟"

"صحت افزا مقام پر آئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کام وام چھوڑ ہنی مون منانے چل دیں۔ وہاں بھی تو اسی طرح کیا کرتے تھے۔"

"بڑی شریر ہو۔" اس کی بات پر بی بی بھی ہنس پڑیں۔ پھر لمحہ بھر بعد ہی سنجیدہ ہو کر نرمی سے بولیں۔

"یہی دن ہیں بے چاروں کے ہنسنے کھیلنے کے۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے اور شادی بھی پیار و محبت کی۔ اچھا ہے چار دن عیش منا لیں۔ میاں جی نے اسی لئے تو دونوں کو بھیجا ہے کہ وہ دلوں میں جدائی نہ پڑے۔"

"دیکھا۔ اتنے نیک اور سمجھدار ہیں میرے میاں جی۔"

"اور کیا پتہ اسی نیکی کے عوض خدا ہمیں ہمارا بچھڑا بیٹا ملا دے۔ ہیں نا۔ صاحباں؟" بی بی اپنے ہی دل کی لگی میں لگی رہیں۔

"ہاں بی بی! خدا نیکیوں کا بدلہ ضرور دیا کرتا ہے۔"

اتنا کہتے ہوئے صاحباں بی بی کو ان کے حال اور ان کی سوچوں میں گھرا چھوڑ کر کمرے سے نکلنے لگی تو بی بی نے پھر اسے بلا لیا۔

"سنو صاحباں! میں یہی کمرہ لوں گی۔ کبیرے سے کہو میرا بستر اور کپڑے وغیرہ ادھر ہی لے آئے۔"

"جی اچھا۔" اور وہ کمرے سے نکلی چلی گئی۔ ابھی ابھی ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تھی وہ معدوم سی ہو کر رہ گئی۔ بی بی اس لئے یہ کمرہ لے رہی تھیں کہ یہاں سے حارث کا گھر صاف سامنے دکھائی دیتا تھا۔

میاں جی اور بی بی کی رہائش بالکل نوابوں جیسی تھی۔ اندر اور باہر کے کاموں کے لئے کئی ملازم اور ملازمائیں موجود تھیں۔ لیکن پھر بھی بی بی گھر کے کاموں کی نگرانی خود کیا کرتی تھیں... مگر... یہاں آ کر تو بی بی سب کچھ ہی بھول گئیں۔

اس نئے گھر کی دیکھ بھال کون کر رہا تھا؟ گھر کا سارا انتظام کون سنبھال رہا تھا؟ اخراجات کی ذمے داری کس کے سر تھی۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ تو بس اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی سارا سارا دن اس عمارت کو دیکھتی رہتیں، جس کے متعلق صاحباں نے انہیں بتایا تھا کہ حارث کی... رہائش گاہ وہی تھی۔ انہیں آئے پانچ چھ دن گزر چکے تھے مگر بیٹے کی ایک جھلک، دید کی پیاسی نگاہوں کی پیاس ابھی تک نہ بجھی تھی۔

صاحباں عشا کی نماز سے فارغ ہو کر سونے کے لئے بستر پر دراز ہوئی ہی تھی کہ خاموش فضا کا سینہ چیرتی ہوئی بی بی کی درد و کرب میں ڈوبی، سسکیاں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شب خوابی کے مہین لباس پر گاؤن پہننے کا بھی ہوش نہ رہا۔ رات کافی سرد تھی۔ کوئی شال یا چادر بھی نہیں اوڑھی... اسی طرح گھبرائی گھبرائی بی بی کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔

"کیا ہوا۔ بی بی...؟"

وہ کھڑکی کی چوکھٹ میں پیشانی ٹیکے روئے جا رہی تھیں اور ان کا سارا وجود بُری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔

"کیا بات ہے بی بی...؟"

جلدی سے قریب آکر صاحباں نے چوکھٹ میں اٹکا ان کا سر اٹھایا۔ بی بی کا پورا چہرہ آنسوؤں میں تر تھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر ان کا سر سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"یہ آپ پھر رو رہی ہیں؟ اب تو آپ کی منزل سامنے ہے بی بی! پھر یہ آنسو کیسے؟"

"ہم منزل تک پہنچے اور منزل ہم سے دور ہو گئی۔ ایسا مقدر میں بھی کسی ماں کا ہوگا؟"

"کیوں...؟ ناامید کیوں ہو رہی ہیں؟"

"سات آٹھ دن ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ مجھے اس کی ایک جھلک بھی نہیں دکھائی دی۔ لگتا ہے اسے ہماری سن گن مل گئی ہے لہٰذا وہ یہاں سے کہیں اور چلا گیا ہے۔"

"نہیں بی بی! نہیں۔ وہ کہیں نہیں گئے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"تو پھر وہ مجھے دکھائی کیوں نہیں دیا، میں نے تو ان سات آٹھ دنوں کا ایک ایک لمحہ اس کھڑکی میں گزارا ہے۔ نہیں صاحباں! نہیں۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ تم مجھے بہلا رہی ہو۔"

"یہ درست ہے کہ وہ آجکل اپنے گھر میں نہیں ہیں، مگر بی بی! وہ ہمیشہ کے لئے یہ گھر نہیں چھوڑ گئے۔ یقین کیجئے میں کوئی غلط بیانی کر کے آپ کو جھوٹی تسلیاں نہیں دے رہی۔ وہ تو دفتر کی طرف سے دورے پر گئے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" بی بی نے بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بی بی! ہم یہاں سیر سپاٹا نہیں کرنے آئے۔ ایک خاص مقصد لے کر آئے ہیں۔ اور یوں سمجھئے کہ یہ مقصد میری زندگی کا سب سے اہم فرض ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں بھول گئی ہوں؟"

صاحباں کے چہرے پر سچائی کی روشنی تھی۔

"مجھے آپ کی قسم! میں ایک لمحے کے لئے بھی اس فرض سے غافل نہیں ہوئی۔ یہاں پہنچنے کے اگلے ہی دن کبیر خاں سے میں نے پتہ کرایا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ایک آدھ دن میں ہی حارث دورے سے واپس آنے والے ہیں پھر آپ کی ممتا کے اجڑے چمن میں بی بی! ... ضرور بہار آئے گی۔ انشاءاللہ! دیکھ لیجئے گا۔"

انہیں بہت ساری تسلیاں دلاسے دینے کے بعد صاحباں نے آرام کرنے کو کہا مگر وہ نہیں مانیں۔

"کیا پتہ ادھر میری آنکھ لگے اور ادھر وہ آجائے۔ میں بستر پر نہیں جاؤں گی۔ میں اس چوکھٹ سے نہیں ہٹوں گی۔"

بی بی کے اس جواب سے صاحبان کی آنکھوں سے بے اختیار کئی آنسو ٹپک پڑے۔

"یا اللہ! یوں تو میں بڑی گنہگار ہوں لیکن اگر زندگی میں میں نے کوئی ذرا سی بھی نیکی کی ہے تو اس کے بدلے تو ان ماں بیٹے کو ملا دے۔ اس ماں کے جھلسے کلیجے میں ٹھنڈک ڈال دے۔"

دل ہی دل میں بہت سی دعائیں مانگتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے، بہت پیار دلار سے، بہت سارے تسلی دلاسے دے کر بی بی کو وہاں سے اٹھایا اور لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔

بی بی کی دیوانگی تو ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ حارث کو جلد واپس آجانا چاہیے تھا۔ بہت جلد...!

صاحباں انہیں دونوں کے متعلق سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

✦

"صاحباں۔ صاحباں!!" عجب ہذیانی سی چیخوں کے ساتھ بی بی اسے پکار رہی تھی۔

صاحباں باورچی خانے میں شرجانہ کے پاس تھی اور وہ اپنے اور کبیر خان کے عشق کی داستان بالتفصیل اسے سنا رہی تھی اور صاحبان پوری توجہ اور انتہائی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ مرزا صاحباں کے قصے جیسی ہی دلچسپ داستان تھی ان کی۔ سوائے انجام کے کہ کبیر خاں اور شرجانہ بامراد و کامران تھے۔

بی بی کی چیخوں بھری پکار صاحباں کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ اٹھ بھاگی۔ نجانے کیا ہوا تھا؟ کہیں بی بی کو کسی کیڑے مکوڑے نے تو نہیں کاٹ لیا تھا۔ پریشانی کے باعث اس کے قدم لڑکھڑائے جا رہے تھے۔

پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اس کی نگاہ بی بی پر جا پڑی۔ وہ اسی کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ صاحباں کے قدموں کی آہٹ پر مڑ کر پیچھے دیکھے بنا ہی چلائیں۔

"صاحباں! حارث آگیا ہے۔ وہ دیکھو۔ شاید تالا کھول رہا ہے۔"

بی بی کی یہ چیخ و پکار صرف اس کی آمد کا اعلان تھی۔ صاحباں کے قدم قدرے سست پڑ گئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے حارث کو دیکھنے کی تمنا نے اس کے پاؤں میں جیسے بجلی دوڑا دی۔

"اوہ...!" اس کے پہنچتے پہنچتے بی بی قدرے افسردگی سے بولیں۔ "تم نے دیر کر دی صاحباں۔"

"ہائے بی بی! پوری تیزی سے تو بھاگ کر آئی ہوں۔" لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے وہ بھی حارث کے گھر کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر وہاں ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے کہ کچھ دن گھر خالی رہنے کے بعد اب وہاں کوئی متنفس موجود تھا۔

ہمیشہ کی طرح اب بھی دروازہ بند تھا اور ہر طرف خاموشی تھی۔ صاحباں شرجانہ کے پاس واپس جانے کے لیے مڑنے لگی تو بی بی نے اسے روک لیا۔

"تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ ابھی شاید پھر باہر نکلے۔" بی بی نے صرف قیافہ لگائی امید پر اسے بھی ٹھہرا لیا اور اپنی بھی نگاہیں وہاں مرکوز کر دیں۔

بی بی کے دل میں تو ممتا کے ٹھنڈے میٹھے، گرم جذبے تھے، جنہوں نے انہیں ذرا بھی تھکن کا احساس نہیں ہونے دیا مگر خود اس کے دل میں تو حارث کے لیے سوائے اجنبیت کے اور کچھ بھی نہ تھا۔

صرف بی بی کی خاطر اک موہوم سی اور خاصی غلط قسم کی امید کے سہارے ڈیڑھ دو گھنٹے کھڑے رہنا کافی صبر آزما تھا۔ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ ٹانگیں شل تھیں۔ پاؤں من من بھر کے بھاری ہو رہے تھے۔ مگر۔ وہ کھڑی تھی اور بی بی کی ہدایت کے مطابق ٹکٹکی لگا کر بند دروازے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"بیگم صاحبہ! کھانا لگ گیا ہے۔" کبیر خاں کی آواز صاحبان کو زنجیریں ٹوٹنے کی آواز محسوس ہوئی۔

"چلیئے بی بی۔" وہ جلدی سے پلٹی۔ "آج خاصا ٹھنڈا موسم ہے۔ ذرا بھی دیر کی تو کھانا بھی موسم جیسا ہی ہو جائے گا۔"

بی بی کا بازو تھام کر صاحباں نے ان کا رخ موڑا۔ "لیکن حارث۔" بی بی نے بے قرار نگاہیں اس پر جما دیں۔ "اس عرصے میں اگر وہ باہر نکلا تو۔ میں نے تو ابھی اچھی طرح اسے دیکھا بھی نہیں۔"

پھر بی بی بڑے عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔

"تم بھی تو اسے ایک نظر دیکھ لیتیں۔ پہچان ہو گی تو میل جول بڑھانا آسان ہو گا۔"

"بی بی! کبھی بھی ہتھیلی پر سرسوں نہیں جما کرتی۔ مجھے آپ کا، آپ کے دل کا، آپ کے جذبات کا اور آپ کی ممتا کا پورا پورا احساس ہے۔ انشاءاللہ! دو ایک دن میں ہی میں پہچان جاؤں گی اور آپ بھی باہر اندر آتے جاتے ہوئے انہیں دیکھ لیں گی۔ اس وقت تو آپ بے فکر ہو کر کھانا کھائیے اور آرام کیجئے۔"

"آرام؟" بی بی نے موسم جیسی ہی ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"آرام تو پچھلے پانچ سال سے اپنے نصیب میں نہیں ہوا اور اب بھی اسی وقت کروں گی جب میرا بچہ۔ میرا حارث .... اور وہ ہکلا ہکلا

کر رونے لگیں۔

"نہیں بی بی! نہیں ... روئیے نہیں۔ اب وہ وقت بہت قریب ہے۔ آپ تسلی رکھیے۔ تھوڑا سا صبر بس اور کر لیجیے۔"

بی بی کی بے تابیاں اور ان کے آنسو ہمیشہ صاحباں کے دل پر اثر انداز ہوتے۔ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بہت ساری تسلیاں اور دلاسے دے کر وہ بی بی کو کھانے والے کمرے میں لے آئی۔

بی بی کی کیفیت بڑی عجیب سی تھی۔ دُور سے ہی سہی مگر اتنے سالوں بعد بیٹے کی صورت دیکھی تھی دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ سارے وجود پر کپکپی سی طاری تھی اور آنکھیں برساتی نالوں کی طرح بہے چلی جا رہی تھیں۔

بار بار ان کی آنکھیں، ان کے رخسار پونچھ پونچھ کر صاحباں نے اپنا آدھا دوپٹہ بھگو لیا تھا اور ان کے آنسو تھے کہ ابھی بھی خشک نہیں ہو رہے تھے۔ اور نہ ہی وہ اس وقت کچھ کھانے پینے کو تیار تھیں۔ تب۔ صاحباں اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر ان کے منہ میں زبردستی ڈالنے لگی۔

"آپ کچھ نہیں کھائیں گی۔ تو آپ کی قسم میں بھی فاقے سے رہوں گی۔" پھر وہ مسکرائی۔ "اور سچی بات بتا دوں بی بی! مجھے اس وقت بھوک بھی بے حد لگی ہے۔ لگتا ہے ایک بھی فاقہ کرنے کو مل گیا تو فوراً جاں بحق ہو جاؤں گی۔"

"خدا نہ کرے!" بی بی یکایک بولیں۔

"خدا تو اسی صورت میں ایسا نہیں کرے گا کہ آپ میری بات مانیں اور میں آپ کی۔ یوں دونوں ہی خوش اور ہمارا خدا بھی خوش۔"

بی بی مسکرا پڑیں۔ جب بھی ان پر ایسے لمحات آتے تھے۔ وہ کس قدر پیارے انداز میں ان کا دُکھ بانٹتی تھی۔ کیسے اپنی من موہنی باتوں سے ان کے غم بھلا دیتی تھی۔ بی بی اس کے مسکراہٹیں بکھیرتے چہرے کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے کھانا کھانے لگیں۔

باپ بیٹے کی صلح اور ماں بیٹے کا ملاپ کرانے کا بیڑا تو اٹھا ہی بیٹھی تھی۔ پھر یہاں تک کا سفر بھی طے کر لیا تھا۔ پانچ سات دن سے حارث دورے پر تھا۔ تو وقت بڑے اطمینان سے گزر رہا تھا۔ مگر اب ... یکایک وہ آ گیا تھا تو صاحباں کے حواس پر گھبراہٹ سی سوار ہونے لگی تھی۔ کیسے اس سے ملے گی؟ کیسے اس سے بات کرے گی۔ پہلے جو ترکیبیں اور تدبیریں اس نے سوچ رکھی تھیں۔ اب سبھی احمقانہ حرکات لگ رہی تھیں اور بہت سارا سوچنے کے بعد بھی کوئی نئی سوچ ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

سینہ ٹھونک کر بڑی بہادری سے اس نے جو ذمے داری اٹھائی تھی۔ وہ اب بہت بڑی مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ ساری دلیری جانے کہاں رخصت ہو گئی تھی۔ وہ بزدل اور کم ہمت بنی جا رہی تھی۔

پوری رات گزر گئی۔ مگر وہ آرام اور سکون سے سو بھی نہ سکی۔ بی بی کا کمرہ اس کی خواب گاہ کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ کبھی کبھی بی بی کے کھانسنے کی آواز آنے لگتی اور کبھی اپنے آپ سے بڑبڑانے اور کراہنے کی، کبھی کروٹیں بدلنے کی اور کبھی اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہونے کی۔

شاید بی بی اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے مضطرب تھیں تبھی انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ مگر صاحباں۔ بھلا وہ کیوں بے خوابی کا شکار تھی؟ اسے اپنے آپ پر آپ ہی حیرت ہونے لگی اور ساتھ ہی ہنسی بھی آ گئی۔

اسے آنے والے دنوں کا فکر لگا ہوا تھا۔ کیسی عجیب تھی وہ!

اذان کی آواز پر نماز کے لیے وہ اٹھی۔ تو بی بی کے کمرے کی بتی جلتی دیکھ کر ادھر ہی چلی گئی۔

چپکے سے، ذرا سا پردہ سرکا کر دیکھا وہ مصلّے پر بیٹھی تھیں اور دوپٹے کا یہ بڑا سا دامن پھیلائے دعا مانگ رہی تھیں۔ بند آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر ان کے رخساروں کو بھگوئے جا رہے تھے۔ مگر انہیں جیسے کوئی ہوش ہی نہ تھا۔

اوہ! وہ بُری طرح لرز اٹھی۔ "اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے ماں بیٹے کا ملاپ نہ ہو سکا تو بی بی تو زندہ نہ رہ سکیں گی۔" اس نے سوچا اور بی بی کی زندگی خود اس کے لیے کتنی اہم بن چکی تھی۔ یہ تو کچھ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اپنی اماں کے بعد وہ بی بی کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

اسی وقت صاحباں بھی نماز پڑھ کر خدا کے حضور بی بی سے بھی بڑا دامن پھیلا بیٹھی۔ جانے کب تک دعا مانگتی رہی تھی۔ اسے وقت کا کوئی احساس نہ تھا۔ بی بی کے پکارنے پر ہی وہ جیسے ہوش میں آئی۔ دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

"صاحباں! یہ انڈوں کا حلوہ ہے۔ حارث کو دے آؤ۔ کہنا نیاز دلوائی ہے۔"

صاحباں نے رخ موڑا۔ بی بی کروشیے سے بنے ہوئے سفید خوب صورت سے رومال کے ساتھ ڈھکی ایک طشتری لیے کھڑی تھیں۔ "مگر۔"

صاحباں نے کچھ کہنا چاہا لیکن بی بی پہلے ہی بول پڑیں۔

"اسی طرح میل جول ہو گا نا۔"

"مگر بی بی! میں دینے جاؤں۔ میں ...؟" وہ سٹپٹا سی اٹھی۔ ایسا کام تو اس سے بی بی نے کبھی نہیں کرایا تھا پہلے۔ حیرت بھری نگاہوں سے

وہ انہیں دیکھنے لگی۔

"تمہیں نے تو کہا تھا کہ میل جول ہو جانے گا تو باپ بیٹے کی ناراضگی کی وجہ معلوم کر لو گی۔ تم خود۔ تبھی تو میں نے کبیر خاں کے ہاتھ انہیں نہیں بھیجا۔"

صاحباں گڑبڑائی۔ وہ اس وقت کے لیے خود کو ابھی اچھی طرح تیار نہیں کر پائی تھی۔

"مگر بی بی! اتنی صبح سویرے۔"

"یہ انڈوں کا حلوہ نہار منہ کھایا جائے۔ تو بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔"

"میرا تو مطلب تھا بی بی! کہ اتنی صبح کون نیاز دلواتا ہے۔؟"

"تو کچھ اور ... دینا۔" بی بی کی بے قراری جھنجھلاہٹ بن گئی۔

"اوہ۔ ہاں۔ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

پہلا تعارف حاصل کرنے کا یہ طریقہ بھی مناسب اور خاصا معقول تھا۔ اس کے ذہن نے اس کا بھی اعتراف کیا۔ مگر اک اجنبی سے ملنے کی ہچکچاہٹ بھی قدرتی تھی۔ آپ ہی آپ ایک اور بہانہ بن گیا۔

"مگر وہ تو اس وقت دفتر جانے والے ہوں گے۔"

"آج جمعہ ہے۔" بی بی کھٹاک سے بولیں۔

آگے پیچھے بی بی کو کبھی دن یا تاریخ نہیں یاد ہوتی تھی۔ مگر آج۔ بی بی نے اسے یہ راستہ بھی نہیں دیا۔

"ہائے بی بی! آپ نے تو کوئی بھی بہانہ میرے لیے نہیں چھوڑا۔"

بادلِ ناخواستہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اپنی اولاد اپنی ہی ہوتی ہے۔" پہلی بار اس کے ذہن میں بی بی کے خلاف اک معصوم سی شکایت نے جنم لیا۔ اس کی گھبراہٹ، اس کی حیل و حجت اور پس و پیش کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ خیال تھا۔ تو صرف یہ کہ کسی نہ کسی طرح بیٹا مل جائے۔

شکایت بھری نگاہوں سے بی بی کو دیکھتے ہوئے اس نے حلوے کی طشتری ان کے ہاتھ سے لے لی۔ حلوے کی خوشبو سے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی لذت کیسی تھی۔ گرم گرم خوشبودار بھاپ اس کے نتھنوں میں گھس کر اس کی اشتہا کو تیز کرنے لگی۔

ابھی ابھی وہاں جانے سے بچنے کے لیے خود ناشتہ کر لینے کا ایک سچا کھرا بہانہ وہ بنانے ہی لگی تھی کہ بی بی کے چہرے پر نگاہ پڑ گئی مامتا کے عجیب سے پُرنور رنگ بکھرے تھے۔ بڑی خوب صورت سی مسکراہٹیں ہونٹوں پر رقصاں تھیں۔

تب۔ اک لمحے میں ہی ان کے خلاف جو کوئی گلہ شکوہ اس کے دل میں ابھرا تھا وہ وہیں دم توڑ گیا۔ اب اس کی نگاہوں میں بی بی کی عنایات اور محبتوں اور خلوص کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یہاں تک۔ کہ اس کی بھوک دوک بھی غائب ہو چکی۔ اب اس کے ذہن میں، دل میں صرف ایک خیال جاگزیں تھا۔ اک ماں کو اس کی اولاد سے ملانا ہے۔

اور وہ دوپٹہ ٹھیک طرح اوڑھ کر پورے خلوص، توجہ اور ایمانداری سے اپنے آپ پر خود ہی عائد کردہ اس ذمے داری کو نباہنے کے لیے چل دی۔ گھر سے باہر نکل کر پگڈنڈی پر قدم رکھا تو اس کے ڈگمگاتے قدموں میں استحکام آ چکا تھا۔

اس کے گھر قریب پہنچی تو دل کی بے ترتیب دھڑکنوں میں استواری آ چکی تھی۔ بڑی دلیری سے اس نے بند دروازے پر دستک دے ڈالی۔

اسی لمحے گھوم کر اپنے گھر کی طرف بھی دیکھا۔ کھڑکی میں بی بی کا سایہ صاف دکھائی دیا۔ اسے جیسے اور تقویت مل گئی۔ پہلی بار دستک دینے پر دروازہ نہیں کھلا تو اس نے اسی بے خوفی سے دوبارہ دستک دے ڈالی۔ اور اب کے دروازہ کھل گیا۔

"آپ۔؟ آپ کون ہیں؟"

آواز کی تلخی نے اس کے جھکے ہوئے سر کو اک حیرت بھرے جھٹکے کے ساتھ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

صاحبان نے اس تلخ نوا انسان کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ نجانے کون تھا؟ بی بی کا بیٹا حارث تو یقیناً نہیں تھا۔ کیونکہ بی بی کی بتائی گئی صفتوں میں سے ایک بھی اس پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔

نہ وہ بہت خوبرو اور بانکا چھبیلا تھا۔ نہ خوش لباس نہ خوش اخلاق۔ نہ اس کے لبوں پر مسکراہٹوں کے قافلے تھے اور نہ اس کی پیشانی پر ماہتاب خنداں تھا۔

اس کے برعکس ہلکے گندمی رنگ والے اس کے چہرے پر بڑھی شیو اور پیشانی پر پھیلی تیوریاں جہاں اسے بدمزاج ظاہر کر رہی تھیں۔ وہیں اس کا بے رنگ اور الجھا سا لباس اسے خاصا گنوار بنائے دے رہا تھا۔

"محترمہ! آپ کون ہیں اور کس لیے تشریف فرما ہوئی ہیں؟"

اس کے لہجے میں تلخی کے ساتھ ساتھ طنز بھی شامل تھا۔ صاحباں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کی تیوریوں کے بل بھی دو چار زیادہ ہوگئے تھے۔ یہ یقیناً بی بی کا بیٹا حارث نہیں تھا۔

"یہاں حارث صاحب نہیں رہتے؟" صاحباں نے اس غصیلے اور بدمزاج شخص سے عز کھپائی کرنے سے بہتر سمجھا کہ براہ راست حارث ہی کا پوچھ لے۔

"رہتے ہیں۔" اس نے اسی روکھے سے لہجے میں روکھا اور نامکمل سا جواب دیا۔

"کہاں ہیں وہ...؟"

"آپ حارث کو کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"ہم ان کے نئے پڑوسی ہیں۔ وہ سامنے اوپر جو بنگلہ ہے نا، نہیں ہمارا قیام ہے، سیزن گزارنے آئے ہیں۔" صاحباں نے خود بخود ہی بغیر اس کے پوچھے ہی اپنا تعارف کو بالتفصیل کرا دیا۔

"معاف کیجیے گا۔ ہم کسی سے نہیں ملتے۔" انتہائی بدمزاجی اور اکھڑ لہجے کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس نے دروازہ بند کرنے کے ارادے سے کواڑ تھام لیے۔

"سنیے..." صاحباں اس کا ارادہ بھانپ کر عجلت سے بولی۔ "یہ حلوہ ہے۔ انڈوں کا حلوہ۔" ساتھ ہی طشتری اس کی طرف بڑھائی۔

"میں نے کہا نا کہ ہم کسی سے میل جول نہیں رکھتے۔ اس لیے حلوہ نہیں لیں گے۔" اسی شکن آلود پیشانی اور مسکراہٹ سے عاری ہونٹوں کے ساتھ جواب دے کر اس نے پھر دروازہ بند کرنا چاہا۔

"لیکن آپ برائے مہربانی حارث صاحب کو تو بلا دیجیے۔"

"میں حارث ہی ہوں۔ اب فرمایئے؟" لہجہ اور طنزیہ اور کسیلا ہوگیا۔ جیسے وہ بتانا نہیں چاہتا تھا مگر زبردستی اگلوایا گیا تھا۔

"آپ حارث ہیں؟ آپ؟؟" وہ حیرت کے مارے چلا سی پڑی۔ "مگر میں نے تو سنا تھا۔ میں نے تو سنا تھا۔" اور پھر فقرہ ادھورا چھوڑ، حیرتوں میں غرق وہ اسے تکے ہی گئی۔

"کیا سنا تھا؟ بتا دیجیے کیا سنا تھا...؟؟" وہ بے حد غصیلی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے تند لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں... کچھ نہیں..." صاحباں بری طرح لوکھلا گئی۔ "یہ حلوہ۔" گڑبڑا کر اس نے جلدی سے پھر طشتری اس کی طرف بڑھا دی۔

"آخر کس ناطے، کس تعلق سے میں یہ حلوہ لے لوں...؟"

"پڑوسیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں ہوتا؟"

"میں کسی کا پڑوسی نہیں ہوں۔ میرا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

اور پھر اس کی بدمزاجی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ صاحباں ابھی وہیں کھڑی تھی۔ اس نے دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔

"بدمزاج۔ بدتمیز۔ جاہل۔ گنوار۔" صاحباں دانت کچکچاتے ہوئے بے اختیار بڑبڑا اٹھی۔ "جانور، درندہ۔ حیوان۔"

وہ دروازے کے اس طرف تھا۔ [illegible] کے مارے اس کا پورا سراپا لرز رہا تھا۔ واپس جانے کے لیے رخ پھیرا۔ نگاہ اپنے گھر کی کھڑکی پر جا پڑی۔ وہاں بی بی کا ہیولیٰ اب بھی موجود تھا۔

"اوہ، کس چاؤ اور کتنے ارمانوں سے بی بی نے حلوہ بنایا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ اس حلوے کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے تو ان کے دل پہ کیا کچھ نہیں گزر جائے گا۔ وہ کیسے کیسے دکھی نہیں ہوں گی۔"

اس سوچ کے ساتھ ہی بڑھتے قدم وہیں تھم گئے۔ وہ پہلے ہی کچھ کم دکھی نہ تھیں انہیں اور پریشان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بی بی کے سامنے اب یہ طشتری یہاں سے خالی جانا چاہیے تھی۔ ہر صورت میں خالی۔

مگر۔ وہ کرے کیا...؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اور بی بی کھڑکی میں ہی کھڑی تھیں۔ سامنے نہ ہوتیں، دیکھ نہ رہی ہوتیں تو چپکے سے اسی طرح واپس لے جاکر سرجانہ کے کوارٹر میں طشتری خالی کر لیتی اور بی بی کو یہی بتاتی کہ اسے دے آئی تھی۔ بلا سے اسے جھوٹ بولنا پڑتا۔ جھوٹ بولنے کا گناہ اسے دوزخ میں لے جاتا مگر بی بی کو تو کوئی دکھ نہ ملتا۔ ان کی آنکھیں تو نہ آنسو بہاتیں۔

اب...؟ کیا کرے...؟ نہ گھر واپس جا سکتی تھی نہ اتنی دیر وہیں کھڑی رہ سکتی تھی۔ کہ بہت زیادہ پریشانی ہو تو کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ لیکن اس وقت اس کا دماغ کام کر گیا۔ یکایک ایک تدبیر روشنی کی کرن کی طرح اس کے ذہن میں آ داخل ہوئی۔

اس نے بڑھ کر پھر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اسے امید تو بالکل نہیں تھی کہ پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل جائے گا لیکن یقیناً خدا کی مدد شامل حال تھی۔ جو دروازہ جلدی کھل گیا۔

"آپ...؟ پھر نازل ہوگئیں؟" لہجہ پہلے سے زیادہ بدتمیزی لیے تھا۔ "میں نے کہا نا کہ..."

مگر صاحباں اس کڑوے کسیلے فقرے کو مکمل ہونے سے پہلے ہی میٹھے گھونٹ کی طرح حلق سے اتار کر جلدی سے بول پڑی۔

"ایک منٹ کے لیے میری بات تو سن لیجیے۔" ساتھ ہی اس کے گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ مگر وہ دروازے کے بیچوں بیچ بازو پھیلائے اس انداز میں کھڑا رہا جیسے اس کی بھی اجازت نہ تھی۔

"کیا ایک منٹ کے لیے آپ مجھے گھر کے اندر نہیں آنے دیں گے؟" آخر صاحباں نے بڑی منت سے التجا کی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ مجھ سے میل جول بڑھانے پر اتنی مصر کیوں ہیں؟ میں ذرا مختلف قسم کا انسان ہوں محترمہ!"

اس کے لہجے کی تلخی میں کمی تو نہیں آئی تھی، مگر دروازے میں پھیلے بازو سمٹ گئے۔ صاحباں نے جلدی سے دو قدم اندر جاکر گردن موڑی اب کھڑکی اور بی بی نظر سے اوجھل ہوگئی تھیں۔ صاحباں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"بات یہ ہے جناب۔ کہ ہمیں بھی آپ ایسے بدمزاج اور گنوار انسان سے میل جول بڑھانے کی نہ کوئی خاص ضرورت ہے اور نہ شوق۔" صاحباں کے ضبط کی ساری حدیں ختم ہوگئی تھیں۔ اس کے روبرو تن کر کھڑا ہوتے ہوئے پھنکاری۔

"بس ذرا اک شرط لگ گئی تھی۔ اس لیے آنا پڑا۔"

"کیسی شرط...؟ اور کس کے ساتھ؟" اس کی غیر شائستگی بدستور تھی۔

"اک سہیلی کے ساتھ۔ وہ کہتی تھی کہ آپ بہت بدمزاج ہیں، انتہائی بے مروت ہیں۔ باقی سب پڑوسی بڑی خوشی سے لے لیں گے مگر آپ کبھی نہیں لیں گے اور میں کہتی تھی کہ کوئی بھی انسان اس قدر بداخلاق، بدمزاج اور جاہل نہیں ہوسکتا کہ خلوص سے دیئے گئے تحفے کو رد کر دے کوئی بھی نہیں۔"

صاحباں کھولتے ہوئے، تلملاتے ہوئے، اک اک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولتی چلی گئی۔ حارث گردن جھکائے چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔

وہ خاموش ہوئی تو سر اٹھا کر انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"آپ نے جو کہنا تھا کہہ لیا۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔"

جانے کس قسم کا چکنا گھڑا تھا۔ اس پر تو صاحباں کے ایک بھی لفظ کا اثر نہیں ہوا تھا۔

"آپ عجیب بے حس انسان ہیں۔" صاحباں کی کھولن اور بڑھ گئی۔ "آپ۔ آپ۔ آپ کو... آپ کو..." اور تلملا تلملا کر وہ کوئی سخت سے سخت الفاظ سوچ رہی تھی کہ جن سے اسے نوازے۔ مگر عین اسی عالم میں بی بی کا خیال آگیا۔ یہ حارث ان کا بیٹا تھا۔ یہ بدتمیز اس مشفق اور مقدس خاتون کا نور نظر اور لخت جگر تھا۔ لحاظ آگیا۔ اور لحاظ آیا تو غصہ پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

"میں نے بتایا نا میری شرط لگی ہے۔ آپ نے یہ نہیں لیا تو میں ہار جاؤں گی۔" صرف بی بی کی خاطر ایک بار پھر وہ اس کی منت کرنے لگی۔

"دل میں ہار قبول کرنے کا حوصلہ نہ ہو تو شرطیں نہیں لگانا چاہئیں۔"

اس نے بڑی سنگدلی سے جواب دے کر رخ پھیر لیا جیسے اسے اب جانے کو کہہ رہا تھا۔

اس کی منت بھری التجا کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ایک بار پھر غصے کی شدت سے صاحباں تلملا اٹھی۔ جی چاہا کہ گرم گرم حلوے کی یہ پلیٹ اس بداخلاق کے منہ پر تھوپ دے۔ مگر وہ رخ پھیرے کھڑا تھا۔ ویسے بھی اسے بی بی کا لحاظ آئے جا رہا تھا۔

"تو آپ کسی صورت نہیں لیں گے؟" بڑی مشکل سے غصے کو دبا کر آواز میں کسی قدر نرمی پیدا کر کے پھر ملتجی لہجے میں بولی۔

"ایک بار نہیں کا مطلب بھی نہیں ہوتا ہے اور دس بار کا بھی۔"

اس کے سختی بھرے دو ٹوک جواب پر صاحباں کا غصہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ مگر ادھر بی بی کی ممتا کے جذبے بھی انتہا تک پہنچے ہوئے تھے۔ اپنی بے عزتی کا احساس بھی شدید تھا۔ ادھر بی بی کی اس کے لیے محبتوں، خلوص اور عنایات کا پلڑا بھی ہلکا نہ تھا۔

وہ مشکل میں پڑ گئی۔ کرے تو کیا کرے؟

"اب آپ جایئے۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔" گویا وہ اب اسے گھر سے نکالنے پر اتر آیا تھا۔ کسر صرف دھکے دینے کی رہ گئی تھی۔

بے بسی کے مارے صاحباں کی آنکھوں میں بہت سارے آنسو آگئے۔ مگر مسئلہ جوں کا توں تھا۔ شرط والی بات گھڑی تو وہ بھی بے اثر ہوئی اب؟ مزید کوئی بہانہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

ویسے بھی اب تو اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اتنا مزیدار حلوہ اس بے قدر اور بے مروت کے حلق سے نیچے اترے۔ اس بدتمیز کے دہن کی لذت بنے۔ وہ تو کسی کڑوی سے کڑوی چیز کے ہی قابل تھا۔

"ایک چمچ دے سکتے ہیں؟" آخر اس نے اپنی پریشانی کا حل سوچ لیا۔

صاحباں کو اچنبھا ہی ہوا جب حارث نے وجہ پوچھے بغیر اور مزید کوئی تلخ نوائی کیے بغیر دوسرے کمرے سے اسے ایک چمچ لا کر دے دیا۔

"شکریہ...!" بڑے طنز سے بولی۔ وہ خاموش رہا۔

اور صاجاں انتہائی غصیلی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے وہیں کھڑے کھڑے وہ حلوہ خود کھانے لگی۔ دل ہی دل میں شکر کر رہی تھی کہ وہ گھر سے ناشتہ کئے بغیر آئی تھی لیکن پھر بھی بڑی مشکل سے پلیٹ خالی کر سکی۔ بی بی کی مامتا نے بھی تو بیٹے کو حلوہ بھیجنے کے لیے گھر کی سب سے گہری طشتری استعمال کی تھی۔

پھر۔ صاجاں نے اندر ہی اندر اس وقت کو کوستے ہوئے، جب اس غلط ترین کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کا چمچ دور سے ہی اس کے پاؤں میں پھینکا اور تیز تیز قدموں سے اس کے گھر سے نکل آئی۔

سامنے نگاہ اٹھی۔ بی بی ابھی تک کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ صاجاں نے گھر کی کمپاؤنڈ میں قدم رکھا تو بی بی کھڑکی سے ہٹ کر برآمدے میں آن کھڑی ہوئیں۔ صاجاں کے ہاتھ میں خالی پلیٹ دیکھ کر ان کا چہرہ کھل اٹھا۔

"بہت دیر لگی۔ تمہیں بٹھا لیا ہوگا۔ میں نہ کہتی تھی وہ مہمان نواز ہے۔"

"ہاں بی بی۔" صاجاں نے مختصر سا جواب دیا۔

"دیکھا کتنی اچھی، کتنی مزے کی باتیں کرتا ہے۔"

"جی ہاں۔" مگر اندر سے دل اپنے تاثرات ان کے حضور پیش کرنے کو بے اختیار ہوا جا رہا تھا۔

"بی بی! وہ بدتمیز اسی قابل تھا کہ گھر سے نکال دیا جائے۔ وہ بد اخلاق بے مروت اور گنوار انسان کسی بھی طرح آپ دونوں کا بیٹا کہلانے کا مستحق نہیں تھا۔ میاں جی نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔" بڑی مشکل سے صاجاں نے دل کی زبان کو آواز نکالنے سے روکا۔

"تمہارے سامنے اس نے حلوہ کھایا ہے نا؟" بی بی اپنے بھیجے ہوئے تحفے کا ردِعمل جاننا چاہتی تھیں "تم کچھ بتا ہی نہیں رہیں۔"

"ہاں۔ ہاں بی بی۔!" صاجاں چونک کر بولی۔ "اور وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اس جیسا لذیذ حلوہ انہوں نے آج تک نہیں کھایا۔"

"جھوٹا، شرارتی۔" بی بی بڑے انداز سے مسکرائیں۔ "کہتا ہے پہلے کبھی ایسا حلوہ نہیں کھایا۔ دوسرے تیسرے دن مجھ سے بنوا کر کھایا کرتا تھا۔"

بی بی کے چہرے پر پھول بکھرے تھے۔ بی بی کی آنکھیں رنگوں کی قوسِ قزح تھیں۔ صاجاں انہیں تکے جا رہی تھی۔

"پھر اور کیا باتیں ہوئیں؟"

"وہ... وہ..." اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ زندگی میں جھوٹ کبھی نہیں بولا تھا۔ مگر اس وقت بہت ضروری تھا۔ اک فرض کی طرح واجب۔ "بس، یہی۔ کہ ہم نئے آئے ہیں۔ کوئی ضرورت ہو، کوئی مشکل پیش آئے تو ان سے بلا تکلف کہہ دیں۔ وہ ہماری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں۔" خاصی مشکل سے بات بن پائی۔

"میں نہ کہتی تھی وہ بڑا بااخلاق ہے۔" بی بی اک بے حد خوش گوار تبسم کے ساتھ بولیں۔ "اخلاق کے ساتھ ساتھ میرے بیٹے کی شخصیت کیسی پرکشش ہے؟ شکل صورت کتنی پیاری ہے؟ ہیں نا؟ دمکتی ہوئی پیشانی۔ مسکراتے ہونٹ اور ذہین آنکھیں۔"

"ہاں بی بی۔" اور ساتھ ہی صاجاں کی نگاہوں میں حارث کی پیشانی پر پھیلی تیوریاں، لبوں پہ سجی بدمزاجی، آنکھوں سے عیاں انسانوں کے لیے نفرت اور زبان سے بکھرتی ناشائستگی گھوم گئی۔

"ارے! میری بچی کو تو بھوک لگی ہوگی۔" بی بی ایک دم چونکتے ہوئے بولیں۔ "آج ناشتے کو بہت دیر ہوگئی۔ چلو آؤ جلدی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے کھانے والے کمرے تک آگئی تھیں۔ بی بی، اس کا بازو پکڑے میز پہ لے آئیں۔

"یہ دیکھو۔ پورا آدھا حلوہ تمہارے لیے رکھا ہوا ہے۔"

بی بی کے اشارے پر صاجاں نے نگاہ اٹھائی۔ سامنے میز پر ویسی ہی اک اور طشتری حلوے سے بھری رکھی تھی، جیسی ابھی ابھی حارث کے گھر کھا کر آئی تھی اور خالی طشتری بھی ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔

"لیکن بی بی! لیکن بی بی!!" صاجاں کبھی اسے اور کبھی رحم طلب نگاہوں سے بی بی کو دیکھنے لگی۔

مگر۔ بی بی نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھے بغیر مارے محبت کے خود اپنے ہاتھوں کے ساتھ چمچ بھر بھر کر اسے حلوہ کھلانا شروع کر دیا۔

٭

"صاجاں!" بی بی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"اس دن کے بعد بیٹی! پھر تم دوبارہ ادھر نہیں گئیں؟"

"کدھر بی بی...؟" اس کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔

"حارث کی طرف۔"

"حارث کی طرف...؟" صاجاں کی نگاہیں بی بی کے ہاتھوں میں پکڑی پلیٹ اور پلیٹ میں رکھے اس خوب صورت نقش و نگار والے پیالے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

"ہم صرف دو تین مہینے کے لیے یہاں ہیں۔ ایسا نہ ہو یہ وقت سستی اور بے پرواہی میں گزر جائے اور پھر باقی ساری زندگی پچھتانا پڑے۔" ان کا اشارہ حارث کی طرف تھا اور صاجاں ان کا مطلب بخوبی سمجھ بھی گئی تھی۔

"سستی اور بے پرواہی میں وقت گزار کر ساری زندگی پچھتانا بہت بہتر بی بی! ایسی اولاد کے ملنے سے۔" صاجاں کے ہونٹوں پر آئی بات بے صدا ہوگئی۔

"اس دن اس نے حلوہ بڑے شوق سے کھایا تھا۔ آج میں نے کھیر بنائی ہے۔ یہ دیکھو چاندی کے ورق لگائے ہیں۔ پستے اور بادام کی ہوائیاں چھڑکی ہیں۔ اٹھ میری بیٹی! جا کر اسے دے آ۔"

"جی۔ جی۔ یہ کھیر...؟" صاجاں بُری طرح بوکھلا گئی۔

دو دن پہلے اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ حارث نے حلوہ نہیں لیا تھا تو سارا اسے خود کھانا پڑا تھا۔ پھر گھر آ کر بی بی نے زبردستی اسے اتنا ہی حلوہ اور کھلا دیا تھا۔ بیٹے کے ملنے کی آس اور خوشی کی ترنگ میں خود کچھ کھایا ہی نہیں۔ ساری محبتیں اور خوشیاں حلوے اور ناشتے کی صورت میں صاجاں پر ہی انڈیل دیں۔

صاجاں کا وہ دن بے حد بور گزرا تھا۔ حارث سے جس قسم کی بے عزتی کرا کر آئی تھی کچھ اس کا احساس تھا اور کچھ زیادہ حلوہ کھا جانے کی وجہ سے پیٹ میں خاصی تکلیف رہی۔ بی بی کی معصومیت بھری مامتا کو تو کچھ کہہ نہ سکی حارث کو اس نے جی بھر بھر کر کوس ڈالا۔

کیسی مشکل میں جان پھنس گئی تھی۔ اب تو بی بی نے اس کے ساتھ بہت ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں اور وہ انہیں مایوس بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر اس روز چپ چاپ اپنے کمرے میں بند ہو کر اس نے حارث سے ہو جانے والی بے عزتی اور حلوے کی وجہ سے اٹھنے والے پیٹ کے درد کو چپکے سے برداشت کر لیا کسی کو بھی ذرا سی بھی اس واقعہ کی خبر نہ ہو سکی۔

وہ کمرے میں بند رہی تھی۔ بی بی نے ایک دوبار اس کو پوچھا ضرور تھا مگر اپنے جذبوں میں سرشار انہوں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا ہی نہیں۔ دن کے وقت بھی نیند کے بہانے کو سچ ہی تصور کر لیا تھا۔

دوسرے، انہیں کھڑکی میں سے حارث کے گھر کی طرف جھانکنے سے ہی فرصت نہ تھی تو کوئی اور بات کیسے کرتیں اور کیا کرتیں؟ حارث کی ایک آدھ جھلک دیکھنے کی خاطر وہ کئی کئی گھنٹے انتظار میں گزار رہی تھیں۔

ان کی حالت بھی تو خاصی قابلِ رحم تھی۔ نہ کسی سے شکوے کی گنجائش تھی نہ شکایت کی۔

اور اب۔ اب پھر کوئی ایسا ویسا واقعہ پیش آنے والا تھا۔ وہ سہمی سہمی اور رحم طلب نگاہوں سے بی بی کو اور اس پیالے کو تک رہی تھی۔

"اس نے شادی کر لی ہوتی۔ بیوی بچے گھر میں موجود ہوتے تو کوئی مشکل نہ تھی۔ اس سے میل جول پیدا کرنے کے بہت سے طریقے نکل آتے لیکن اک اکیلے انسان سے راہ و رسم بڑھانے کے لیے کھانے پینے کی چیز بطور تحفہ دینے سے بہتر اور کچھ نہیں ہے بیٹی۔"

لمبا بی بی اس کی ان نگاہوں کا مطلب ہی سمجھ سکیں۔ "ویسے بھی کھانے پینے کے معاملے میں اس کی پسند ناپسند کا مجھے اچھی طرح علم ہے۔ انشاء اللہ! معاملہ جلد آگے بڑھے گا۔"

ترمفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ صاجاں کی نگاہیں بی بی کے چہرے سے ہٹ کر ایک بار پھر کھیر کے اس اتنے بڑے پیالے پر جا ٹکیں۔

"مگر بی بی! کیا آپ کے بیٹے کو میٹھی چیزیں ہی پسند ہیں؟"

غیر ارادی طور پر ہی صاجاں کے ہونٹوں پر یہ سوال آگیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ ساری کھیر بھی اسے ہی کھانا پڑے گی اور اسے میٹھا کچھ ایسا پسند نہ تھا۔

"ہاں۔ زیادہ تر میٹھی ہی۔ ویسے قیمے والے پراٹھے، حلیم اور کباب بھی اسے بہت پسند ہیں۔" بی بی کے لبوں پر جذبوں بھری ایک خوب صورت

سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کل انشاء اللہ! اسے قیمے والے پراٹھے بھیجوں گی۔"

"اوہ ...!" بی بی کے ارادے نے صاحباں کے وجود پر لرزہ سا طاری کر دیا۔

"جلدی کرو بیٹی! جلدی کر۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا ہے، وہ ابھی ابھی شاید دفتر سے آیا ہے۔ ایسا نہ ہو کھانا وغیرہ کھا کر کہیں گھومنے پھرنے کے لیے نکل جائے۔"

"نکلتا ہے تو نکل جائے۔ میری طرف سے جہنم میں جائے۔" باآوازِ بلند چیخ چیخ کر یہ فقرہ کہنے کو اس کا دل تو بہت چاہا تھا مگر بی بی کے چہرے پر پھیلا اس خوشی کا نور بہت خوب صورت تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے قریب تھیں۔

وہ اس کی چوبیس گھنٹوں میں ایک آدھ جھلک ہی سہی، دیکھ تو سکتی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے لیے چیزیں پکا کر بھیجتی تھیں اور وہ کھا تا تھا۔ خوش ہو کر اور تعریفیں کر کر کے۔

بی بی کا چہرہ دمک رہا تھا۔ بی بی کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی نرم نرم سی پھوار تھی۔ بی بی کی آنکھوں میں بڑی انوکھی سی جوت تھی۔

ان کا یہ انداز، یہ روپ، یہ رنگ، بے حد خوب صورت تھا۔ بے حد دل کش ... اور ... صاحباں کو بی بی سے سچ مچ بہت پیار تھا۔ وہ ان کی خوشیوں کی خواہاں تھی۔

"لائیے ..." وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا اسی طرح جاؤ گی ... ؟"

صاحباں بستر پر سے اٹھی تھی۔ لباس پر ہلکے ہلکے شکن تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ شاید آنے والے وقت کی دہشت نے چہرے کی سرخی کو زردی میں بدل دیا تھا۔ رنگ عجیب سا ہو رہا تھا۔ بی بی اس کے سراپا کو گھورنے لگیں۔

"یہ شکن آلود لباس، یہ الجھے الجھے بال اور یہ پھیکا پھیکا سا چہرہ۔"

"لباس پر شکنیں ہیں تو کیا ہوا میری پیشانی تو صاف ہے نا بی بی۔! الجھے بکھرے بال ہیں تو پھر کیا ہے مزاج تو الجھا بکھرا نہیں، پھیکا پھیکا اور بے رنگ سا چہرہ ہے تو تب بھی کوئی حرج نہیں کم از کم غصے کے رنگ سے تو چہرہ نہیں رنگا ہوا۔"

یہ سب کہنے کو دل تو بہت چاہا مگر کہہ نہ سکی۔ دل ہی دل میں ڈھیر سارا بڑبڑا کر آخر میں بی بی کو بس اتنا ہی جواب دیا "کوئی بات نہیں۔" ساتھ ہی دل پھر ہولے سے بولا۔ "مجھے کون سا کسی انسان کے روبرو جانا ہے جو سوسائٹی کے آداب ملحوظ رکھوں۔ اس جانور کے مقابلے میں تو اس حالت میں بھی خاصی مہذب اور باوقار سی لگوں گی۔"

بڑے اطمینان کے ساتھ صاحباں نے ان کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔ بڑے خوب صورت سفید نیپکن سے اسے ڈھکا ہوا تھا۔ تھوڑا سا سرکا کر دیکھا۔ واقعی بی بی نے اسے چاندی کے اوراق لپیٹے اور بادام کی ہوائیوں سے بڑے ہی خوب صورت انداز میں سجایا ہوا تھا۔

کھیر کو بے نقاب کر کے دیکھنے کے بعد مسکراتے ہوئے اس نے بی بی کے چہرے کو دیکھا۔ جیسے کسی ارمانوں بھری نئی نویلی دلہن کے چہرے کا نقاب اس نے الٹ دیا تھا۔ کچھ ایسے ہی ممتا کے انوکھے، سجیلے اور سہانے سے رنگ وہاں بکھرے تھے۔

"دیکھ کر، کھا کر، خوش ہو جائے گا نا؟"

"ہاں۔ لیکن ..."

"لیکن کیا ... ؟" پوری بات سننے سے پہلے ہی بی بی بے صبری سے پوچھنے لگیں۔

"مجھے یہ بہت زیادہ لگ رہی ہے۔" صاحباں کو اپنا ہی فکر دامنگیر تھا۔ پیالے کو ہاتھوں میں تول کر اندازہ لگایا۔

"کہاں ؟" اک جواں مرد کی خوراک سے تو زیادہ نہیں۔"

"جواں مرد کی خوراک سے بے شک زیادہ نہیں لیکن اک مجھ جیسی دبلی پتلی لڑکی کے لیے تو یقیناً بہت، بہت زیادہ ہے۔" صاحباں اپنے دھان پان جسم کو دیکھتے ہوئے متردد انداز میں بڑبڑائے بنا رہ نہ سکی۔ جسم بھی دبلا پتلا تھا اور کم خور بھی وہ بہت تھی۔ اتنی کہ کم از کم یہ کھیر کا پیالہ ایک وقت میں وہ کسی صورت میں ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ یقیناً نہیں۔

زبردستی حلق کے اندر ٹھونس لیتی تو دوسری بات تھی مگر اسے یقین تھا کہ اس کا معدہ اتنے بوجھ کا متحمل کسی طور نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد میں نجانے کیا کچھ بھگتنا پڑتا تھا لیکن۔ اس وقت۔ وہ مجبور و بے بس لڑکی پیالہ لے کر چل دی۔

وہ ادھر چلی اور بی بی ادھر کھڑکی کی طرف بھاگیں۔ پگڈنڈی پر سوچ سوچ کر قدم دھرتے ہوئے ایک بار پھر صاحباں نے مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اک موہوم سی امید کے سہارے۔ مگر وہ امید بھی مایوس کر گئی۔ بی بی کھڑکی میں موجود تھیں۔

تب۔ حارث کے گھر تک پہنچتے پہنچتے صاحباں کی آنکھوں میں بے بسی کے مارے بہت سے آنسو آ چکے تھے جنہیں اندر ہی اندر پینے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پھر اسی بے عزتی کے در پر دستک دے ڈالی۔

اس دن کی نسبت آج دروازہ قدرے جلد کھل گیا۔ حارث بہت بدتمیز تھا۔ بہت بدلحاظ تھا۔ ایک بار انکار اور بے عزتی کرانے کے بعد اسے پھر کچھ پیش کرنا سراسر بے وقوفی تھی۔

اس روز تو لاعلمی میں بے عزتی کرالی تھی لہٰذا آج والی بے عزتی سے بچنے کے لیے اس بدلحاظ اور بدمزاج سے کوئی بھی بات کئے بنا صاحباں کھلے دروازے سے اندر بڑھتی چلی گئی۔ بغیر اس سے اجازت لیے اور یہ وہ جانتی ہی تھی کہ اجازت لینے کی کوشش کرتی تو وہ ملنا بھی نہ تھی۔

صاحباں یوں آندھی بگولے کی طرح اندر گھستی چلی گئی تھی۔ حارث اس دھاندلی سے گھبرا کر جلدی سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"پلیز! ذرا اک چمچ دے دیجئے۔" کوئی بھی اور بات کئے بنا صاحباں نے سیدھا سادا حرفِ مدعا زباں پر لاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی اسی طرح شکن آلود تھی۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی شاید اس لیے کہ وہ بلا اجازت اس کے گھر میں گھس آئی تھی۔ جس کا اسے کوئی حق نہ تھا۔ آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں بھی چمک رہی تھیں۔ صاحباں ایک لمحے سے زیادہ اس کی طرف نہیں دیکھ سکی۔

"آج پھر شرط لگ گئی تھی اس لیے میں مجبور ہو گئی۔" سر جھکا کر وہ سہمی ہوئی سی آواز میں گویا صفائی پیش کرنے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے متعلق شرط لگانے کا حق آپ کو آخر آپ ہی آپ کیسے مل گیا ہے؟" اس کا لہجہ غصیلے کے ساتھ ساتھ غیر شائستہ بھی تھا۔

"وہ ... وہ ..." صاحباں نے کچھ کہنا چاہا مگر صرف ہکلا کر رہ گئی۔

"میں آخر کتنی بار آپ کو بتاؤں کہ میں بالکل مختلف قسم کا انسان ہوں۔ ارد گرد اور بہت سارے لوگ رہتے ہیں۔ آپ میرا پیچھا چھوڑ کر ان میں سے کسی کے متعلق شرطیں لگانا شروع کر دیں۔ شاید کچھ حاصل ہو جائے۔"

اس نے بات ہی ایسی چبھنے والی کی تھی۔ صاحباں کے دل کے اندر جا کر پیوست ہوئی۔

"بدتمیز ...!" وہ بے اختیار ہو گئی۔ "جانے تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو؟"

جواب میں وہ بھی بدتمیزی پہ اتر آیا۔

"وہی جو آپ ہیں۔"

"کیا ہوں ... ؟" صاحباں مزید بپھری۔ "کیا دکھائی دیتی ہوں میں تمہیں ... ؟ بتاؤ ... ؟"

وہ غصے میں بھری اس کے سامنے تنی کھڑی تھی۔ چہرہ سرخ تھا اور آنکھوں سے جلال ٹپک رہا تھا۔ حارث چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر قدرے نرم پڑ کر بولا۔

"آپ تو خواہ مخواہ جھگڑا کر رہی ہیں۔"

"میں جھگڑا کر رہی ہوں؟" وہ اسی عالم میں پھنکاری۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے میں آپ کے گھر میں بلا اجازت گھسا آپ سے جھگڑا کئے جا رہا ہوں۔"

"اوہ ...!" اس کے طنز نے صاحباں کو اپنی حیثیت کا احساس دلا دیا۔ "مہربانی کر کے مجھے ایک چمچ لا دیجئے۔" خفت سے گردن جھکاتے ہوئے اب بڑی نرمی سے اس نے التجا کی۔

شاید صاحباں کی التجا کا اثر ہو گیا تھا۔ حارث چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ جلد جلد آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگی۔ کس مصیبت میں پھنس گئی تھی؟ بے چاری! اسے اپنے آپ پر آپ ہی ترس آئے جا رہا تھا۔ وہ آنسو صاف کئے تو اور آ گئے۔ پھر صاف کئے تو پھر امڈ آئے۔

"یہ لو چمچ اور اب جب شرط لگا کر آؤ تو ساتھ اپنا چمچ بھی لیتی آنا۔"

صاحباں نے جلدی سے بھیگا آنچل چھوڑ کر چمچ لے لیا۔

"پچھلی شرط میں کیا کمایا تھا اور آج کی شرط میں کیا ملے گا۔؟"

"تمہارا سر!" وہ چیخی اور پھر جلد جلد کھیر کے چمچ بھر بھر کر منہ میں ڈالنے لگی۔

"بی بی! مجھ سے اپنے احسانوں کا بدلہ اس بیدردی سے تو نہ لیجئے۔"

کھیر کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں چھلک چھلک آنے والے آنسوؤں کو بھی وہ اندر ہی اندر پیئے جا رہی تھی۔ اور جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی تھی وہ ظالم بڑے اطمینان سے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"آرام سے یہاں بیٹھ کر اور تسلی سے کھائیے۔ کوئی آپ کے پیچھے نہیں پڑا ہوا۔"

حارث کی بات سنتے ہی تیزی سے چلتا ہوا صاحباں کا ہاتھ تھم گیا۔ وہ سر اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ بجائے اس کے کہ کچھ شرمسار ہوتا وہ کیسے ڈھٹائی سے کھڑا اسے تک رہا تھا اور باتیں بنا رہا تھا۔ واقعی وہ ایسا چکنا گھڑا تھا کہ کسی بھی بات کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔

"یہ مجھے کیا دیکھے جا رہی ہیں؟ اپنا کام کیجئے اور جائیے۔"

"میں تو صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ جانور انسانوں والا لباس پہن کر، انسانوں کی آبادی میں، انسانوں جیسے گھروں میں رہنے لگیں تو کیسے لگتے ہیں۔"

غصے کے جوش میں وہ اور بھی تیزی سے چمچ بھر بھر کر کھیر اپنے منہ میں ٹھونسنے لگی۔

"کیسے انسانوں کی آبادی کی بات کر رہی ہیں۔ ایسے، جو زبردستی دوسروں کے گھروں میں گھس کر انہیں بیجا تنگ کریں۔"

"وہ... وہ....." اور وہ لاجواب سی ہو گئی۔ شرمندگی نے غصے کو اور بھڑکایا۔ تاؤ کھا کر مزید کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ یکایک بی بی کا خیال آ گیا... ارے! یہ وہ کیا کر رہی تھی۔ معاملہ سلجھانے کے بجائے یوں تو وہ اور الجھائے دے رہی تھی۔ اور۔ اس سے میل جول بڑھانے کے لیے ابھی تو کل بی بی قیمہ بھرے پراٹھے اسے بھیجنے والی تھیں۔

تب وہ یک دم ہی نرم پڑ گئی۔ بے قابو کر دینے والے غصے کو اندر ہی اندر ٹھنڈا کرنے میں من کو تکلیف تو کافی پہنچی مگر وہ ایک بی بی کے دم کی خاطر سہہ گئی۔

"معاف کر دیجئے۔ آپ کے گھر میں زبردستی گھس آنے والی غلط حرکت صرف اس لیے کرنا پڑی کہ شرط لگ گئی تھی۔"

پھر معاملہ سلجھانے کے لیے مفاہمت کرنے کے انداز میں ذرا سا مسکرائی۔

"آپ کو اگر میٹھی چیزیں پسند نہیں ہیں تو میں آئندہ سے نمکین کی شرط لگایا کروں گی۔"

اور۔ پہلی بار صاجیاں نے اس کے سختی سے بھنچے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ کی اک ہلکی سی لہر لہراتی دیکھی۔ مسکراتا ہوا وہ کیسا لگتا تھا۔ وہ ابھی اندازہ بھی نہیں کر پائی تھی کہ اس نے جلدی سے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر رُخ پرلی طرف پھیر لیا۔

"اس دن وہ سارا حلوہ کھا کر پورا دن میرا پیٹ درد کی تکلیف میں گزرا اور اب آج نجانے کیا حشر ہو۔" پھر وہ جیسے اپنے آپ سے بولی "اپنی اس شرط لگانے والی حماقت کی سزا تو بھگتنا ہی پڑے گی آخر۔"

"اوہ... !" حارث اس کی بڑبڑاہٹ سن کر جلدی سے گھوما اور تیزی سے دو قدم اس کی طرف بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ شاید کھیر کا پیالہ اس سے لینے کے لیے۔ مگر۔ صاجیاں کھیر کا آخری بھرا ہوا چمچ پٹخ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

نکلتے ہی پہلی نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھی۔ بی بی وہاں موجود تھیں۔ وہ ہولے سے بڑبڑائی۔

"ماں بیٹے کی کہانی مکمل ہوتے ہوتے صاجیاں! انشاء اللہ تو بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ خدا تیری مغفرت کرے۔" پھر وہ مسکرائی "لیکن۔ تیری تو مغفرت بھی نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ جھوٹ بولنے والے کو خدا کبھی نہیں بخشتا اور تو آج کل ڈھیروں ڈھیر جھوٹ بول رہی ہے۔"

وہ اپنے آپ پر ہنستے ہی گئی۔

گھر کے برآمدے میں داخل ہوئی تو بی بی اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھیں۔

"اس نے کھیر چکھی؟" بی بی بے قراری سے پوچھنے لگیں۔

"چکھی کیا۔ اسی وقت ساری کی ساری کھا لی۔" بڑی فراخدلی سے اپنا جھوٹ بولنے والا فرض اس نے نبھایا۔

"خوش ہوا...؟"

"بہت۔ ویسے آپ کا بیٹا کھیر کھانے کے بغیر بھی بہت خوش رہتا ہے بی بی! ہر وقت ہنستا مسکراتا رہتا ہے۔"

"ہاں۔ بچپن سے ہی اس نے بڑی باغ و بہار قسم کی طبیعت پائی ہے۔"

اور اندر جاتے جاتے بھی بی بی نے اس کے متعلق بے شمار سوالات پوچھ ڈالے۔

"تم جب گئیں تو وہ کیا کر رہا تھا؟ لباس کیسا پہنا ہوا تھا؟" "گھر کیسا سجایا ہوا ہے؟ تمہیں کیسے بٹھایا؟ کھانے پینے کو بھی کچھ پوچھا؟"

بی بی سوال کرتی رہیں اور وہ بی بی کے چہرے کو تکتے ہوئے جواب دیتی رہی۔ مناسب جواب۔ تسلی بخش جواب۔ ان کی خوشی کی خاطر اچھے سے اچھا جواب اور لاجواب سے لاجواب جھوٹ کے ساتھ آراستہ کر کے جواب عین بی بی کی خواہش اور تمنا کے مطابق۔

بی بی کے چہرے پر خوش نما رنگوں کی یلغار تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی بجلیاں اور آنکھوں میں تمناؤں کے عکس۔!!!

اپنے ہر سوال کا تسلی بخش جواب پاتے ہی وہ بالکل مطمئن ہو گئیں۔

"ایسے ہی چاندی کے ورق لگا کر اور پستہ اور بادام کی ہوائیاں چھڑک کر میں نے اپنی صاجیاں کے لیے بھی کھیر رکھی ہوئی ہے۔ آؤ اپنے ہاتھوں سے تمہیں کھلاؤں۔"

"لیکن بی بی! اس وقت...؟" وہ بوکھلائی۔ گھبرائی۔ "مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"صبح کا صرف اک توس کھایا ہوا ہے۔ اور اب دو بج رہے ہیں۔ بھلا بھوک کیوں نہ ہو گی؟"

بی بی اس کا بازو تھامے سیدھی کھانے والے کمرے کی طرف چلیں۔ "تو کیا سمجھتی ہے بیٹا دکھائی دے گیا تو تمہیں فراموش کر دوں گی پگلی! میری ایک آنکھ وہ ہے اور دوسری تو۔ کسی ایک کے بغیر بھی میری بینائی مکمل نہیں۔"

میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ حارث کے گھر سے صاجیاں کو نکلتے دیکھ کر ہی بی بی نے شرجانہ کو آواز دے دی تھی۔ کہ جلد کھانا لگا دے۔

"مگر۔ مگر بی بی... ! سچ کہتی ہوں مجھے بالکل بھوک نہیں۔"

صاجیاں کھانے والی میز کی طرف سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"چلو کھانا نہ کھاؤ مگر کھیر تو کھانا ہی پڑے گی۔"

بی بی نے اپنے ہاتھوں سے اسے کھلانے کے لیے کھیر کا پیالہ اپنے سامنے سرکایا۔ اور۔ صاجیاں رحم طلب نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ مگر بی بی اپنے جذبوں میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھیں۔ کہ صاجیاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ ہی نہ سکیں۔

"بسم اللہ... !" بی بی نے کھیر کا چمچ بھر کر مسکراتے ہوئے بڑے پیار سے اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔

دوسرے دن صاجیاں کی طبیعت بے حد خراب رہی۔ پیٹ میں شدید درد تھا۔ کھانے کی کسی بھی چیز کو دیکھتی تو متلی ہونے لگتی۔ اس کی حالت دیکھ کر بی بی کی پریشانی کی حد نہ رہی۔

شاید اسے یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی تھی۔ چند دن پہلے بھی اسے پیٹ میں درد ہوا تھا۔ وہ تو خیر گھریلو نسخے ہاضمے کے چورن وغیرہ سے ہی رفع ہو گیا مگر اب تکلیف بہت زیادہ تھی۔ ڈاکٹر کو بلوانا پڑا۔

"آپ نے اس دن کھایا کیا تھا۔ مجھے سوچ کر بتائیے۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ کھاتی ہی بہت کم ہے۔" صاجیاں کے بولنے سے پہلے بی بی بول پڑیں۔ "بس ذرا میں نے تھوڑی سی کھیر کھلا دی تھی۔ وہ بھی بڑی زبردستی۔ کھاتی ہی کچھ نہیں۔ سارا سارا دن فاقے سے گزار دیتی ہے۔"

"اچھا۔ کھیر کھائی تھی۔" ڈاکٹر صاحب کچھ سوچنے لگے پھر ایک دم چونک کر بولے۔ "مگر یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کتنی کھائی تھی۔"

"تھوڑی سی۔ بس ایک پیالہ۔" بی بی جلدی سے بولیں۔

"ہائے بی بی! پانی۔ پانی پینا ہے۔" صاجیاں یکا یک ہی پیاس کے مارے تڑپنے لگی۔

"شرجانہ... ! شرجانہ... !!" بی بی پانی منگوانے کے لیے اسے پکارنے لگیں۔

"نہیں بی بی! آپ کے ہاتھ سے پیوں گی۔" صاجیاں نے بڑے لاڈ سے بچوں کی طرح ضد کی۔

"لو تو میں خود لائے دیتی ہوں اپنی بیٹی کے لیے پانی۔" صاجیاں کے اس لاڈ سے، اس محبت بھری خواہش سے اچھل پچھل ہوتی ہوئیں بی بی عجلت سے اٹھ کر خود پانی لانے چلی گئیں

ڈاکٹر صاحب کے سامنے صاجیاں نے سچ بولنا مناسب سمجھا۔ تبھی پانی کے بہانے بی بی کو باہر بھیج دیا۔

"ایک نہیں ڈاکٹر صاحب! دو پیالے کھائے تھے۔" وہ دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "یہ اتنے بڑے بڑے دو پیالے ہائے! میں مر گئی۔" وہ کراہی۔ درد چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ "میں کھانا نہیں چاہتی تھی ڈاکٹر صاحب! میٹھی چیزیں مجھے کچھ ایسی پسند نہیں ہوتیں مگر مجھے کھانا پڑ گئی۔"

"بہت برا کیا۔ ایک تو ناپسندیدہ چیز اور پھر اتنی مقدار میں۔"

"مجبور ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب! بہت مجبور۔"

"کھانے پینے کے معاملے میں کبھی مجبور نہیں ہونا چاہیے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں، سمجھدار ہیں، آئندہ احتیاط برتیے گا۔"

"بہت اچھا۔ لیکن۔ ہائے... ! کچھ کیجئے ڈاکٹر صاحب! میں مر گئی۔"

اتنی دیر میں پانی لیے بی بی اندر آ گئیں تو ڈاکٹر صاحب ان سے مخاطب ہو گئے۔

"دیکھئے بیگم وارث! آئندہ سے انہیں مجبور کر کے کبھی کوئی چیز نہیں کھلایئے گا۔ بعض انسانوں کے معدے سب کچھ قبول کر لیتے ہیں لیکن بعض خواہش کے خلاف ذرا سا بھی کچھ لے لیں تو ان کے ہاضمے کا نظام بگڑ جاتا ہے۔"

"ہاں۔ اس دن بھی میں نے اسے اس کی مرضی کے خلاف انڈوں کا حلوہ کھلا دیا تھا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب! ایک ہی میری بیٹی ہے۔ کوئی اچھی اور مزے دار چیز گھر میں بنے اور یہ نہ کھائے تو پھر بتایئے میرے حلق سے کیسے اترے؟ مجھے خوشی کیسے ملے؟"

بی بی کی سادگی بھری، محبت بھری بات ڈاکٹر صاحب سنتے رہے اور نسخہ لکھتے رہے۔

"یہ لیجئے۔ یہ دوا بازار سے منگوا لیجیے گا۔ اور اک پورا ہفتہ، بالکل ہلکی غذا دینا ہو گی۔ اور۔" ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر بی بی

کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"جانتا ہوں ایک اولاد لاڈلی ہوتی ہے۔ مگر اتنا لاڈ بھی تو مناسب نہیں کہ اسے بیمار کر کے ڈال دیا جائے۔"

بی بی ڈاکٹر صاحب کی ہدایت سن کر خفیف سی ہو گئیں۔

"میری توبہ! میں تو اب اسے کبھی مجبور نہیں کروں گی۔ مگر ڈاکٹر صاحب! پھر آپ ہی اسے سمجھا دیجیے نا کہ اس قدر کم کھانا بھی صحت کے منافی ہے۔ ایک تو یہ کمزور ہو گی اور اسے کمزور دیکھ کر اس کے باپ کے ہاتھوں پھر میری شامت بھی آ جائے گی۔ انہیں ہر وقت اس کی صحت کی فکر لگی رہتی ہے۔"

دیکھیے صاحباں بی بی! آپ کی والدہ کی بات بھی مناسب ہے۔ خوراک کی کمی بھی انسان کو کمزور کر دیتی ہے اور اک کمزور انسان پر بیماری جلد غالب آتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اسے بھی نصیحت کی اور رخصت ہو گئے۔ ان کی دی ہوئی دوا خاصی زود اثر ثابت ہوئی۔ درد تو اسی دن ٹھیک ہو گیا۔ اگلے دو دن میں معدہ بھی نارمل حالت پر آ گیا۔ اب کھانے پینے کی کسی چیز کو دیکھتے ہی اسے متلی نہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی کے مطابق معدہ ٹھیک ہونے پر اسے صحیح اور متوازی غذا ملی تو نقاہت بھی ایک دو دن میں جاتی رہی۔

اس دن موسم بڑا خوش گوار تھا۔ صاحباں غسل کر کے باہر نکلی تو بے اختیار تھوڑا سا گھومنے پھرنے کو دل چاہ اٹھا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھیں بی بی تو بالکل گھر سے باہر نکلی ہی نہیں تھیں۔ جب تک صاحباں حارث سے اصل بات نہ معلوم کر لیتی ماں بیٹے کا آمنا سامنا نہیں ہونا چاہیے تھا اور حارث کا گھر میں آنے یا جانے کا کوئی اک وقت مقرر ہی نہ تھا۔

یوں بھی۔ بی بی کھڑکی میں کھڑے ہو کر آتے جاتے حارث کی ایک جھلک ہی دیکھ لینا ہر سیر و تفریح سے بہتر سمجھتی تھیں۔ اس اک جھلک کے لیے خواہ انہیں گھنٹوں بھی انتظار کرنا پڑتا۔ نہ وہ تھکتی تھیں اور نہ اکتاہٹ محسوس کرتی تھیں۔ بلکہ وہ اس مصروفیت میں اتنا خوش رہتی تھیں کہ پہلے ایسی کبھی دکھائی نہ دی تھیں۔

لہٰذا کہیں آنے جانے یا گھومنے پھرنے کے لیے صاحباں کا ساتھ اکثر شرجانہ ہی دیا کرتی تھی۔ وہ تقریباً اس کی ہم عمر تھی۔ ساتھ ساتھ مزے کی باتیں سنایا کرتی۔ لطیفے، قصے، کہانیاں اسے بے شمار یاد تھیں مگر سب سے بڑھ کر تو اس کی اپنی ہی داستان تھی۔ ہر بار نئے ہی نئے ہی انداز میں سناتی۔ صاحباں بے حد محظوظ ہوا کرتی۔

اتنے دنوں بعد بستر سے اٹھی تھی۔ موسم بھی خوش گوار تھا۔ دل بھی سیر و تفریح کو چاہ رہا تھا۔ ایسے میں شرجانہ کی سنگت۔ کیا کہنے۔ بی بی سے اجازت لینے کے لیے ان کے کمرے میں گئی تو وہ وہاں موجود نہیں تھیں۔ پشت پر پھیلے گیلے بالوں کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے سارے گھر میں انہیں تلاش کرنے لگی۔

"بی بی۔ ! بی بی۔ !! کہاں ہیں آپ؟" جب وہ کہیں نہیں ملیں تو وہ بلند آواز میں انہیں پکارنے لگی۔

"یہ ادھر باورچی خانے میں ہوں۔ یہیں آ جاؤ چندا۔"

صاحباں کا ماتھا ٹھنکا۔ باورچی خانے کا سارا کام شرجانہ کیا کرتی تھی۔ مگر جس دن بی بی نے حارث کو کچھ بھیجنا ہوتا تھا اس دن خود سب کچھ کرتی تھیں۔ باورچی خانے میں ان کی موجودگی یقیناً کسی ایسی ہی آفت کی نشان دہی کر رہی تھی۔

"یا الٰہی خیر" صاحباں نے ڈرتے ڈرتے باورچی خانے میں قدم رکھا۔

"بی بی! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں...؟"

"شیر خرما بنا رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اتنے دن بیمار رہنے کے بعد میری بیٹی آج صحت یاب ہوئی ہے۔ تمہارے غسل صحت کی خوشی میں چند پڑوسیوں کے ہاں بھیجوں گی۔"

"اوہ... ! مارے گئے" صاحباں دل تھام کر رہ گئی۔ پڑوسیوں میں یقیناً سب سے پہلے حارث کا نام آنا تھا۔

"تم مجھے کیوں پوچھ رہی تھیں صاحباں؟" وہ چپ سی کھڑی تھی۔ بی بی نے پوچھا۔

"میری طبیعت بڑی گھبرا رہی تھی اس لیے آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ شرجانہ کو ساتھ لے کر تھوڑا سا گھوم پھر آؤں؟"

"یہ شیر خرما بھی تقریباً تیار ہی ہے۔ تم ادھر حارث کو دے آنا اور شرجانہ سرفراز صاحب کے گھر پکڑا دے گی۔ کام بھی ہو جائے گا اور تھوڑی سی آؤٹنگ بھی۔"

"اپنے غسل صحت کا خود ہی دینے جاؤں؟" وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔

"کچھ بھیجنے کو اچھا خاصا سچا بہانہ ہے بیٹی۔" بی بی نے اک خوب صورت سی مسکراہٹ کے ساتھ جیسے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ سمجھ تو وہ پہلے ہی گئی تھی۔ مگر یہ بھی جانتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق اسے ابھی دو چار دن اور ہلکی غذا کھانا۔ چاہیے

اور ماں کی ماری بی بی شیر خرما میں بادام، چھوہارے، کھوپا، کھوپرا اور نہ جانے اور کیا کیا ڈالے جا رہی تھیں۔ خالصتاً اس کی بیماری کا سامان۔ وہ لرز کر رہ گئی۔

"جب تک تم بال بنا لو میں پلیٹوں میں نکالتی ہوں" بی بی کا بید فقرہ اس کے کانوں میں زہر بن کر ٹپکا۔

نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ وہ وہیں کھڑی گھبرا گھبرا کر شیر خرما کی اس بڑی سی پلیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے چند منٹوں بعد اس کے معدے میں داخل ہو کر ایک بار پھر اس کا ستیاناس کرنا تھا۔

"ارے! مجھے یاد آیا میری تو دوا ختم ہو گئی" بے خیالی میں وہ خود سے بولی۔

"اب دوا کیا کرنی ہے۔ ڈاکٹر نے اتنے ہی دن لینے کو کہا تھا۔ اور ویسے بھی ماشاء اللہ اب تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"مجھے [illegible] ہے بی بی! جیسے اس دوا کی ضرورت مجھے آج پھر پڑے گی۔"

شیر خرما کی بھری ہوئی پلیٹ کو غور سے دیکھتے ہوئے صاحباں بولی۔

"ہائے ہائے! کیوں بدفال منہ سے نکالتی ہو صاحباں! تمہاری تکلیف مجھے آ جائے۔" بی بی تڑپ اٹھیں۔ یکایک کام چھوڑ کر رخ اس کی طرف پھیر لیا۔

"دیکھو صاحباں! مجھے سچ سچ بتا دو۔ تمہیں یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی نا۔ ؟ اگر ایسا ہے تو میں آج ہی واپسی کی تیاری کرتی ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے صاحباں کا دل چاہا کہ ہاں کہہ دے۔ حارث والی مصیبت سے تو جان چھوٹ جائے گی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہ اسی پلیٹ پر جا ٹکی۔ جو بی بی کے جذبوں کی شدت کا کھلم کھلا اشتہار تھی۔

"ہم واپس چلے گئے تو حارث کا معاملہ کیسے نمٹے گا بی بی؟" صاحباں نے ان کا دل مزید ٹٹولا۔

"وہ جو پانچ سال سے میری شکل دیکھنے کا روادار نہیں اس بے مروت کی خاطر میں اپنی بیٹی کی جان لے لوں؟" بی بی اک جذبے کے ساتھ بولیں۔ "پیدا کی ہوئی اولاد کی محبت بے شک بہت ہوتی ہے مگر بیٹی! تیرے وجود نے جس طرح ہمارے سونے گھر کو آباد کیا ہے۔ تیری محبت میرے دل میں اس کی محبت سے کم نہیں ہے بلکہ... بلکہ..."

بی بی صاحباں کی آنکھوں میں بغور دیکھتی ہی چلی گئیں۔ "کچھ زیادہ ہی ہے صاحباں! بہت زیادہ۔ اس لیے کہ ہمارے ساتھ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی تم ہمیں والدین کی پوری عزت، بھرپور احترام اور پُرخلوص محبت اور توجہ دیتی ہو اور وہ اپنا خون ہو کر ہمیں فراموش کر بیٹھا۔"

بی بی کے چہرے پر سچائیاں تڑپ رہی تھیں۔

"ہمارے دلوں کا، ہمارے جذبات کا، ہمارے رشتے کا اس نے ذرا احساس نہیں کیا۔ میں اس بے مروت اور بے دید کی خاطر تم ایسے انمول ہیرے سے محروم ہونا کبھی بھی پسند نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں صاحباں! کبھی نہیں۔"

بی بی نے جو پلیٹ حارث کے لیے بھری تھی وہ اٹھا کر دوسری پلیٹوں کے پاس رکھ دی۔

"اب یہ بیگم احسان کے گھر جائے گی اور کبیر خاں اور شرجانہ سے کہو واپسی کی تیاری کریں۔ ہم کل ہی ان شاء اللہ..."

"نہیں بی بی! نہیں..." صاحباں نے یکایک بی بی کے ہاتھ تھام لیے۔

اس وقت، اس کی خاطر جو کچھ بی بی کہہ رہی تھیں یہ ان کی عظمت تھی۔ یہ ان کا فراخ حوصلہ تھا۔ یہ ان کے دل کی وسعت تھی۔ ورنہ حارث کے لیے، اک اولاد کے لیے، اک ماں کی بے قراری اور تڑپ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ بیٹے کی جدائی میں ماں کی دیوانوں جیسی حرکات نے خود اسے کئی بار خون کے آنسو رلایا تھا۔ •

ایسی عظیم عورت کے لیے، اپنی اتنی اچھی بی بی کی خاطر، کیا وہ یہ تھوڑی سی بھی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی تھی؟ وہ ان کے مقابلے میں کتنی چھوٹی تھی۔ وہ کتنی خود غرض تھی۔ صاحباں نے اپنے آپ کو بہت ساری صلواتیں سنا ڈالیں۔

اسے ان کی خاطر ہر تکلیف برداشت کرنا چاہیے تھی۔ ضرور۔ ضرور۔ ضرور۔ تبھی وہ ان کے احسانات کا کچھ تھوڑا سا بدل دے سکتی تھی۔ تب اس نے دل سے پکا عہد کر لیا کہ اگر اب وہ کسی ایسی وجہ سے بیمار بھی پڑی تو ظاہر نہیں ہونے دے گی اور وہ بی بی کی خاطر چپکے چپکے اپنی جان بھی دے دے گی۔

کئی بار کیا ہوا عہد دل ہی دل میں ایک بار پھر دہراتے ہوئے، اس نے بی بی کے ہاتھ چوم کر ان کے گلے میں اپنے سفید ریشمی بازوؤں کا ہار پہنا دیا۔

"میرے لیے یہاں کی آب و ہوا قطعی خراب نہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بی بی! ایک دن طبیعت ذرا خراب ہوئی ضرور تھی مگر اس کی وجہ آب و ہوا نہیں ہے۔ ویسے بی بی! پہلے بھی تو کبھی کبھار بیمار ہو ہی جایا کرتی تھی۔"

"مگر ابھی جو تو دوا کا کہہ رہی تھی۔"

"وہ تو میں مذاق کر رہی تھی۔ صرف آپ کا دل دیکھنے کے لیے کہ آپ کو مجھ سے کتنا پیار ہے۔"

صاحباں زور سے ہنس پڑی۔ سیاہ بکھرے بالوں میں اس کا روشن روشن چہرہ بڑا نمایاں تھا۔ آنکھوں کی قندیلیں عزم وارادے کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ بی بی نے اس کا تابناک چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی چمکتی پیشانی کو چوم لیا۔

"خدا تمہیں صحت مند رکھے۔ تمہاری انہیں من موہنی اداؤں نے ہی تو ہمارے گھر میں رونق اور ہمارے دلوں میں دھڑکن پیدا کی ہوئی ہے ورنہ حارث کی جدائی کے بعد میں یقیناً زندہ نہ رہتی۔"

حارث کا نام پھر ان کی زبان پر تھا۔ صاحباں مسکرائی۔ "بی بی! آپ کے دل سے حارث کی جدائی کا کانٹا ان شاء اللہ نکال کر رہوں گی۔"

دل ہی دل میں ہولے سے بڑبڑانے کے بعد وہ بآوازِ بلند بی بی سے مخاطب ہوئی۔ "لائیے ادھر وہ پلیٹ۔ میں حارث کو دے آؤں۔"

صاحباں کے اس فقرے نے بی بی کے بوڑھے چہرے پہ جیسے گلال چھڑک دیا۔

"لیکن۔" بی بی نے غور سے اسے دیکھا۔ "تمہارے یہ بکھرے بال اور۔"

"بکھرے بالوں سے چڑیل لگ رہی ہوں؟" صاحباں زور سے ہنسی۔

"اتنے دنوں بعد چہرے کی رنگت بدلی ہے۔ بکھرے بالوں کے سیاہ ہالے میں میری بیٹی کے چاند چہرے کو کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے یہی ڈر ہے۔"

"میری بی بی کی دعائیں ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بڑے پیارے انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ اٹھا لی۔

"شرجانہ کہاں ہے؟ باقی گھروں میں اس کے ہاتھ بھیج دیجیے۔ اور ہاں بی بی! زرقا اور عروسہ کے ہاں ضرور بھیج دیجئے گا۔"

"سب کے گھر بھیجوں گی۔ سب کے گھر۔ لیکن پہلے تمہیں جاتے ہوئے دیکھ لوں۔"

بی بی کھڑکی میں کھڑی ہونے کے لیے سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ بڑی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکیں۔

ایک دلفریب سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے صاحباں اپنی منزل کی طرف چل دی۔ پگڈنڈی پر قدم رکھتے ہی اس کا دھیان حارث سے والی پچھلی دو ملاقاتوں کی طرف چلا گیا۔

بے عزتی بھی کرائی۔ بیمار بھی پڑی مگر اسے حاصل کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ کچھ نہیں۔ بالکل کچھ نہیں۔ ابھی تک وہ وہیں تھی، جہاں سے چلی تھی۔ لگتا تھا حارث انسان کے بجائے اک پتھر ہے۔ اور پتھر سے سر پھوڑ کر سوائے زخموں کے اور کیا ملنا تھا؟ اردگرد رہنے والوں سے یہ تو اسے پہلے ایک دو دن میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ انتہائی خشک مزاج تھا۔ مگر یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ وہ اس قدر بدمزاج اور انتہا درجے کا بدتمیز ہائے بی بی! آپ کے نصیب کیسے پھوٹے ہیں۔ ایک اولاد اور وہ بھی ایسی بیچ بیچ۔ کاش! آپ بالکل ہی بے اولاد ہوتیں۔ نہ آپ کو اس غلط انسان کے لیے تڑپ تڑپ کر ہلکان ہونا پڑتا اور نہ مجھے ایسی مصیبت کا سامنا۔"

جانے اس کے ساتھ آج کیا ہونے والا تھا۔ ڈرتی ہوئی وہ اس کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑبڑائے جا رہی تھی۔

"پروردگار! رحم کر۔ میرے مولیٰ تو ہی میرا مددگار ہے۔ میں ایک نیک مقصد کے لیے یہ سب کر رہی ہوں۔ تو اس کے دل میں بھی نیکی ڈال دے۔ چند دنوں کے لیے اللہ میاں! تو اسے ایک خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان بنا دے۔"

ڈھیروں دعائیں مانگتے ہوئے اس نے حارث کے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے۔ آجائیے۔ دروازہ کھلا ہی ہے۔" اندر سے آواز آئی۔

اس جواب کی اسے قطعی توقع نہ تھی۔ حیرت کے مارے وہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ لمبے لمبے سانس لے کر اس نے غیر ہموار سانسوں کو جلدی مرتب کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے دروازے کا پٹ ذرا سا سرکایا۔ سامنے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ آہستہ سے کھول کر اندر چلی گئی۔ کمرے کے پرلے کونے میں ایک کرسی پہ وہ بیٹھا تھا۔ سامنے میز پہ کھانا لگا تھا اور وہ سر جھکائے کھا رہا تھا۔

"آج پھر شرط لگ گئی؟" مڑ کر آنے والے کو ایک نگاہ دیکھے بغیر وہ بولا۔

صاحباں حیران رہ گئی۔ نجانے اس نے اسے پہچان کیسے لیا تھا۔ شاید قدموں کی آہٹ سے۔ مگر...

"ایک شرط کا آپ کو کیا ملتا ہے؟" وہ بولا تو صاحباں کی سوچ ادھوری رہ گئی۔ وہ جلدی سے حارث کی طرف متوجہ ہوئی۔

"دس پندرہ شرطوں کی پیشگی رقم آپ مجھ سے وصول کر لیجئے اور پلیز! میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں لوگوں سے جول رکھنا پسند نہیں کرتا۔ پھر آپ بار بار یہاں کیوں آتی ہیں؟"

اس کے لہجے کی کڑواہٹ، صاحباں کے پورے وجود میں گھل گئی۔ نہ یہ خیال رہا کہ بی بی کی خاطر ابھی ابھی اس نے عہد کیا تھا کہ بڑی سے بڑی بات برداشت کرے گی، بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرے گی، یہاں تک کہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرے گی اور نہ ہی یہ خیال رہا کہ اس کے گھر میں تھی اور اس کے بلانے پر نہیں بلکہ خود آئی تھی۔

"آپ انتہائی بداخلاق اور بدتمیز انسان ہیں۔ آپ نے آخر مجھے کیا رکھا ہے کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں جو آپ سے رقمیں اڑا لوں گی۔ میں تو... کا باپ آپ جیسے دس بیس پچاس بدتمیزوں کو خرید کر پھینک دے۔"

وہ غیظ و غضب میں بھری ہوئی اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ "اور نجانے آپ خود کو کیا سمجھ رہے ہیں؟ مجھے آپ جیسے جانور کے لیے کوئی شرط وغیرہ لگانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ میں تو۔ میں تو صرف..."

اوہ۔ ! اور پھر اسے یکایک ہوش آ گیا۔ وہ یہ کیا کرنے لگی تھی۔ غصے میں۔ ابھی سب کچھ بک دیتی تو سارا کام بگڑ جانا تھا۔ بی بی کو سدا کیلئے ...کی جدائی مل جاتی۔ اک ماں کو اپنی حقیقی اولاد کی جدائی۔

وہ خیر تھی ان کا خون نہیں تھی۔ پھر بھی بی بی اس سے اتنی محبت کرتی تھیں۔ تو اپنی کوکھ سے پیدا کئے ہوئے بیٹے کی محبت ان کے دل میں کتنی ہو ...تی تھی۔ شاید اتنی کہ جس کا کوئی اندازہ ہی نہ کیا جا سکے۔ تبھی تو دیوانی ہوئی پھر رہی تھیں۔

اور... جتنی محبت، اتنا بڑا گھاؤ۔ بی بی کے سینے میں۔ اوہ۔ نہیں نہیں۔ وہ سب کچھ برداشت کرے گی۔ ہر مشکل کو آسان بنانے کی کوشش کرے گی۔ ...یک بار پھر دل سے وہ عہد دہرایا۔

اس دلیرانہ فیصلے کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آئے۔ بڑی مشکل سے انہیں اندر ہی اندر پیا اور پھر آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے ...دھیمی سے بولی۔

اس دن کھیر کھانے کے بعد میں سخت بیمار ہو گئی تھی اور آج میری صحت یابی کی خوشی میں میری ماں نے سب کے ہاں یہ میٹھا بھیجا ہے۔ میں ...کی ایک ہی بیٹی ہوں نا۔ اس لیے۔ ہاں اسی لیے اور تو کوئی بات نہ تھی۔"

اندر ہی اندر آنسو پینے کی کوشش میں اس کے حلق میں جیسے کچھ اٹکا جا رہا تھا۔ صاحباں نے شیر خرما کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"آئندہ میں یہاں نہیں آؤں گی۔ کبھی نہیں۔" وہ واپس جانے کے لیے پلٹی۔

"لیکن اپنی پلیٹ تو خالی کر کے لیتی جائیے محترمہ! یہ رہا چمچ..."

اس پتھر نے وہیں سے ایک چمچ اٹھا کر اس کے سامنے بازو پھیلاتے ہوئے اس کا راستہ روک دیا۔

"میں کہاں پلیٹ واپس کرتا پھروں گا۔ مجھے آپ کی طرح دوسروں کے گھروں میں زبردستی گھسنے کی عادت نہیں ہے۔"

"میں تو ابھی پرہیزی کھانا کھا رہی ہوں اس دن کی طرح خود نہیں کھا سکتی۔" اور اس کے گھروں میں گھسنے والے طنز بھرے فقرے نے اسے پھر تاؤ دلا دیا۔ "آپ اسے پلیٹ سمیت پھینک دیجئے گا۔"

"یہ کام بھی آپ اپنے ہی ہاتھوں سے کرتی جائیے۔ میں کیوں آپ کی اتنی قیمتی پلیٹ کا نقصان اور اناج کی بے حرمتی کا گناہ اپنے سر لوں۔"

"یہ گناہ نہیں لینا۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ "اور جو اتنی بار میری بے عزتی کی ہے، اس کا گناہ کوئی نہ ہوگا؟ اتنے خلوص سے دیئے گئے ...ے کو جو دھتکارا ہے اس کا تو بہت ثواب ملے گا نا آپ کو۔"

بے بسی اور طیش کی زیادتی سے وہ بلا کچھ سوچے سمجھے بولے ہی چلی گئی۔

"اور۔ اور بھی باقی سب کام آپ بہت نیکی کے کر رہے ہیں نا۔ بتائیے تو ذرا آپ کے والدین کہاں ہیں۔ بتائیے...؟"

"میرے والدین؟ میرے والدین...؟"

اور صاحباں کے اس طعن نے نجانے اس پر کیا اثر کیا۔ پھیلی پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"میرے والدین؟ میرے والدین...؟"

یونہی بڑبڑاتے بڑبڑاتے آنکھیں بند کر کے اس نے اپنا سر کرسی کی پشت کے ساتھ ٹیک دیا۔

صاحباں نے دیکھا اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ بند آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا جس سے اس کی کنپٹیاں بھیگی جا رہی ...ہیں اور اس کا سانس بھی نارمل نہیں تھا۔ اتنی تیز آواز کے ساتھ آ جا رہا تھا جس سے صاف محسوس ہوتا تھا جیسے بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔

"پانی... پانی..." پھر دونوں ہاتھوں سے گلے کو تھامتے ہوئے وہ بہت مدھم سر میں بڑبڑایا۔

"پانی...؟"

صاحباں نے گھبرا کر میز کی طرف دیکھا۔ مگر وہ عجب بے وقوف انسان تھا۔ کھانا کھانے بیٹھا تھا پانی پاس رکھا ہی نہ تھا۔

"ابھی لاتی ہوں۔ ابھی لاتی ہوں۔" صاحباں بھاگی۔

اس کے گھر کا اسے اتہ پتہ تو نہیں تھا مگر قیافے سے اس دروازے میں داخل ہو گئی جدھر سے جا کر حارث نے پہلے دن اسے چمچ لا کر دیا تھا۔ ...گے کاریڈور تھی۔ اس کے بالکل سامنے پھر ایک دروازہ تھا۔ وہ اس میں گھس گئی۔

شاید باورچی خانہ تھا وہ، مگر دکھائی بالکل ایک کباڑ خانہ دے رہا تھا۔ ادھر ادھر برتن بکھرے تھے۔ سامنے کھڑکی میں دو کتابیں پڑی

تھیں۔ بائیں ہاتھ اک چھوٹی الماری تھی۔ جس کے پٹ پورے کھلے تھے۔ کچھ برتن اس میں بھی تھے۔ ایک خانے میں ڈبے بوتلیں تھیں۔ ایک میں کپڑے تھے۔ جانے اس کے پہننے والے تھے یا میز پوش، چادریں، اور غلاف وغیرہ تھے۔

بس جو چیز نہیں دکھائی دی وہ گلاس تھا۔ جس کی اس وقت اسے ضرورت تھی۔ وہ تلاش کرنے لگی۔ مگر ادھر سے اس کے سانس کی تیز آواز برابر کانوں میں آ رہی تھی۔ تب عجلت میں اس نے چولہے کے پاس پڑی دیگچی کے اوپر سے چائے پینے والا مگ ہی اٹھا لیا۔

اور اب۔ اسے پانی نہیں مل رہا تھا۔ اس کباڑ خانے میں کوئی گھڑا نہیں تھا۔ کوئی صراحی نہیں تھی۔ ہر برتن دیکھ ڈالا۔ کسی بھی ڈول، جگ یا ڈَم میں پانی نہ تھا۔

ویسے تھا تو بدتمیز، بد اخلاق اور انتہائی گنوار۔ دنیا کے ماتھے کا کلنک رہتا نہ رہتا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ، بلکہ اگر دنیا اس کے وجود سے پاک ہو جاتی تو...

اوہ! یکایک سر جھٹک کر اس نے اپنے اس خیال کو بھی جھٹک دیا۔ ہائے! نہیں۔ بی بی کی مامتا اجڑنا نہیں چاہیے تھی۔

وہ پورے خلوص سے پانی تلاش کرنے لگی۔ اچانک اک کونے میں اسے نلکا دکھائی دے گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے بی بی کی خاطر دوبارہ آبِ حیات کا چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔ مگ پانی سے بھر کر وہ تیزی سے واپس بھاگی۔

"یہ لیجئے پانی۔" صاحباں نے عجلت سے پانی کا مگ اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔ مگ تھامنے کی شاید اس میں طاقت نہیں تھی۔ ذرا سا ہاتھ اٹھایا تھا مگر وہ واپس گھٹنے پر جا پڑا۔

"کوئی بات نہیں۔ میرے ہاتھ سے ہی پی لیجئے۔"

صاحباں اب بڑی ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پی لیجئے نا۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے حارث کا سر سہلایا۔ تب اس کے بھینچے ہونٹ کھلے اور۔ بغیر سانس لیے وہ اک لمحے میں غٹا غٹ کر کے سارا پانی چڑھا گیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

خالی مگ وہیں میز پر رکھ کر صاحباں پشیمان سی کھڑی اسے تک رہی تھی۔ یہ اس سے کیا ہو گیا؟ یہ اس نے کیا کر ڈالا؟ بی بی، جو مجسم مہر و محبت تھیں۔ جن سے اسے ڈھیروں پیار ملتا تھا۔ انہیں کے بیٹے کے ساتھ اس نے کیسا ظالمانہ سلوک کیا تھا۔ طیش میں آ کر کھانا کھاتے ہوئے کو کیا کیا کچھ سنا ڈالا تھا۔

وہ احسان فراموش تھی۔ وہ نمک حرام تھی۔ وہ بہت بری تھی۔ کئی پچھتاوے من میں اتر گئے۔ ہمدردی بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ خود کو کوسنے لگی۔

کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ اس کے وجود کی لرزش تو بند ہو گئی تھی مگر سانس ابھی تک نارمل نہیں ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر جو آنسو اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے انہیں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے صاحباں آگے بڑھ کر اس کا سینہ ملنے لگی۔ شاید اسی طرح اس کی حالت سنبھل جائے۔ کوئی نوالہ اٹکا ہوا ہو۔ وہ نیچے اتر جائے۔

"شکریہ! میں ٹھیک ہوں اب۔"

اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے اس نے بڑی نرمی سے صاحباں کا ہاتھ پرے ہٹا دیا۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔" صاحباں اس کے زرد چہرے کو تکتے ہوئے گڑگڑائی۔

اس کی کشادہ پیشانی پر اس وقت تیوریاں نہیں تھیں۔ ہر دم قہر برسانے والی آنکھیں بند تھیں اور بد مزاجی کے تیر چلانے والے ہونٹ خاموش۔ بی بی کا حارث اس روپ میں بہت بہتر لگ رہا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ اچھا۔

"یہ تھوڑا سا میٹھا کھا لیجئے۔ اس میں معدے اور قلب کو طاقت پہنچانے والی چیزیں ڈالی گئی ہیں۔ طبیعت بہتر ہو جائے گی۔"

شیر خرما کا چمچ بھر کر صاحباں نے اس کی طرف بڑھایا۔ مگر وہ اسی طرح آنکھیں موندے، ہونٹ بھینچے اور سر کرسی کی پشت کے ساتھ ٹکیے بیٹھا رہا۔

"منہ کھولیے نا۔" صاحباں نے بڑی نرم اور ملائم سی آواز میں کہا۔

جواب میں اس کے ہونٹ بھینچے رہے۔ صرف سر نفی میں ہلا دیا۔

"تھوڑا سا لے لیجئے نا۔ طاقت آ جائے گی۔" وہ منت سے بولی۔ "اور میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ آئندہ کوئی چیز نہیں لاؤں گی اور نہ ہی پھر کبھی یہاں آ کر آپ کو ستاؤں گی۔ پکا وعدہ کرتی ہوں۔ بس اس وقت تھوڑا سا کھا لیجئے۔ پلیز! آپ نے کھانا بھی تو پوری طرح نہیں کھایا تھا۔"

اور اس نے وہ بھرا چمچ اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔ شاید انکار میں کچھ کہنے کے لیے حارث نے بھینچے ہوئے ہونٹ تھوڑے سے وا کیے ہی تھے کہ صاحباں نے جلدی سے چمچ اس کے منہ میں گھسیڑ دیا۔

وہ شیر خرما کا نوالہ، جو زبردستی صاحباں نے اس کے منہ میں گھسایا۔ حارث نے تھوکنے کے بجائے حلق سے نیچے اتار لیا تو صاحباں کی ہمت بندھی۔ جرأت نے پر تولے۔ جلدی سے اس نے ایک اور چمچ بھر کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ پھر تیسرا بھی۔ پھر چوتھا بھی۔

"بس۔ ... بانچویں پر حارث نے صاحباں کا ہاتھ تھامتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ "اب میں قدرے بہتر ہوں۔"

"شکر ہے۔" اطمینان بھرے اک طویل سے سانس کے ساتھ صاحباں کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ "ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ۔"

دانستہ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں گیا اور آپ کا نام لگا؟" وہ بھی مسکرا اٹھا۔

"تو اور کیا۔ ... نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"نہیں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا نام نہیں لگے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"کبھی کبھی مجھے ایسے ہو جایا کرتا ہے۔"

"کیا... ؟ میں سمجھی نہیں؟"

"مجھے پہلے بھی ایسے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ آپ کا کوئی قصور نہ تھا۔"

"اوہ۔!" بی بی نے اس کی صفتیں تو بہت گنائی تھیں مگر اس کے اس مرض کے متعلق تو کچھ نہیں بتایا تھا۔

"بچپن سے ہی دورے پڑتے ہیں؟"

"نہیں۔ بچپن سے نہیں۔"

"پھر کب سے؟"

"یہی کوئی پانچ سوا پانچ سال سے۔"

"اتنے عرصے سے؟ علاج کوئی نہیں کرایا؟"

"ڈاکٹروں کا کہنا ہے نفسیاتی وجہ ہے۔ دواؤں سے یہ مرض دور نہیں ہو گا۔"

"تو وجہ دور کیجیے۔ اتنی تکلیف اٹھاتے ہیں۔"

وہ شاید اس بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اٹھ کر میز پر سے برتن اٹھانے لگا۔ صاحباں نے غور کیا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے شاید نقاہت سے۔

"چھوڑیئے انہیں میں سمیٹ دیتی ہوں۔" صاحباں نے اس کے ہاتھوں سے برتن لے لیے۔

"نہیں نہیں۔ میں خود ہی سب کچھ کر لوں گا۔"

"دیکھئے تکلف نہ کیجئے۔ آپ کی طبیعت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں۔"

صاحباں نے اس کی مزید کچھ سنے بنا سارے برتن اٹھائے اور باورچی خانے میں لے گئی۔ حارث اک قدم اس کے پیچھے چلا۔ مگر خود میں ہمت نہ پا کر واپس وہیں بیٹھ گیا۔ ایسے دورے کے بعد اسے ہمیشہ بہت نقاہت ہو جایا کرتی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ یونہی بیٹھا رہا۔

"یہ چائے پی لیجئے۔"

"کیا... ؟" چونک کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

صاحباں چائے کی پیالی لیے اس کے پاس کھڑی تھی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اس دورے کے بعد مجھے چائے کی شدید ضرورت ہوا کرتی ہے۔" بلا حیل و حجت چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ متشکرانہ نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولا۔

"آپ کے باورچی خانے میں، جو باورچی خانہ کم ہے، کباڑ خانہ زیادہ ہے۔"

صاحباں کی اس بات پر وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"کوئی اور چیز نہ ملے مگر چائے کا مکمل سامان موجود ہے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ چائے بہت زیادہ پینے کے عادی ہوں گے اور اس وقت آپ اس قابل نہ تھے کہ پہلے اٹھ کر بناتے اور پھر پیتے۔"

"بڑی عقل مند ہیں آپ۔"

اس نے تعریفی نگاہوں سے صاحباں کو دیکھتے ہوئے پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

"چائے پی کر آپ آرام کیجئے اور میں اب جاتی ہوں۔" جانے کے ارادے سے صاحباں نے بڑھ کر اپنی پلیٹ اٹھالی۔

"یہ واپس لیے جا رہی ہیں؟" حارث نے ایک عجیب سی بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

"تو اور کیا کروں؟"
"میرے لیے نہیں لائی تھیں؟"
"لائی تو آپ کے ہی لیے تھی۔ مگر۔ میری توبہ! جو آئندہ سے ایسی کوئی حرکت کروں۔"
"آئندہ کی آئندہ سے سہی۔ فی الحال یہ تو رہنے دیجئے۔ یہ آ چکی ہے۔"
"کیا...؟" صاحباں کی لمبی سی کیا میں حیرتیں ہی حیرتیں تھیں۔
"ہاں۔" نگاہیں جھکاتے ہوئے وہ مدھم سی آواز میں بولا۔ "کل آ کر اپنی پلیٹ واپس لے جائیے گا۔"
وہ مزید کوئی بات بھی نہ کر سکی۔ کہیں وہ پھر یہ بہروپ چھوڑ کر اپنے اصلی روپ میں آ جائے۔ اس کی اس تبدیلی پر صاحباں حیرت و استعجاب میں ڈوبی جلدی سے واپس گھر بھاگ آئی۔
بی بی اسی طرح کھڑکی سے ہٹ کر برآمدے میں اس کی منتظر کھڑی تھیں اور اس کے مسکراتے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ بھی کچھ ٹھٹھک سی گئیں۔ اس کیفیت، اس عالم میں تو صاحباں پہلے کبھی بھی حارث کے گھر سے نہیں لوٹی تھی۔ یقیناً کوئی اُمید افزا بات ہوئی تھی۔ بی بی کی بے قراریاں تمام حدود متجاوز کر گئیں۔
اتنی جلد جلد اور اتنے ڈھیر سارے سوالات کی انہوں نے صاحباں پر بوچھاڑ کر دی کہ گھبراہٹ کے مارے اس سے جواب بھی بن نہیں پا رہے تھے۔ مگر عقلمند کافی تھی۔ بی بی کے اس حملے سے بڑی خوب صورتی سے بچ نکلی۔
"پہلے کھانا بی بی! پھر کوئی دوسری بات۔"
"ارے ہاں۔ کھانے کو تو بہت دیر ہو گئی۔ چلو کھانے والے کمرے میں۔ آج سترجانہ بھی معلوم نہیں کہاں غائب ہے۔ میں خود ہی کھانا نکالتی ہوں۔"

*

آج کتنے ہی دنوں بعد وہ کچھ پڑھنے بیٹھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے والی میاں جی کی نصیحت پر بھی عمل کرنا اس کا فرض تھا لیکن اس فرض کے علاوہ خود اس کا اپنا دل مطالعے میں بہت لگا کرتا تھا۔
انسانوں کی دنیا میں جب تک رہی تو کوئی خاص شعور و آگہی حاصل نہ کر سکی لیکن کتابوں کی دنیا میں دل لگایا تو لگا جیسے ساری کائنات کے راز جان گئی تھی۔
جیسے اسے بینائی مل گئی تھی۔ جیسے اس کی عقل اور شعور بیدار ہو اُٹھے تھے۔ اس کے تمام حواس زندہ ہو گئے تھے۔ ورنہ گاؤں میں تو اندھی، بہری، بے عقل اور زندگی سے خالی تھی وہ۔
کیا زندگی تھی وہاں کی بھی۔ سوائے اپنے گھر.... اور گھر والوں کے، دو چار سہیلیوں کے اور اس چھوٹے سے گاؤں کی چند پگڈنڈیوں اور کھیتوں کے اسے کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ کہ ان ستاروں کے آگے کوئی اور جہان بھی ہیں۔
اور اب۔ علم حاصل کیا۔ مطالعہ کیا تو دوسرے جہانوں کا اور اپنی دنیا کی وسعت کا اندازہ ہوا۔
پھر دنیا کی وسعت کو جانا تو دل میں بھی وسعتیں پھیل گئیں۔ آنکھوں نے بھی صرف خود کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کو دیکھنا سیکھ لیا۔ عقل و فہم نے بھی سوائے اپنے درد اور اپنے احساس کے دوسروں کے درد اور احساس کو محسوس کرنے کا شعور حاصل کر لیا۔
"صاحباں۔ اے صاحباں..."
بی بی کی آواز یوں کانوں میں اتری جیسے کسی دوسری دنیا سے آئی تھی۔ اس کی محویت ٹوٹ گئی۔
"جی بی بی..."
جلدی سے ہاتھ میں پکڑی کتاب تکیے پر پلٹتے ہوئے خود جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"پڑھ رہی تھیں...؟" بی بی دیکھ بھی چکی تھیں پھر بھی بڑی معصومیت سے سوال کیا۔
"جی ہاں..." صاحباں مسکرا دی۔
"کوئی ضروری..."
"آپ کی اگر کوئی ضرورت ہے تو اس سے ضروری نہیں بی بی...!"
صاحباں نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بڑے پیار سے ان کے وجود کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے جواب دے دیا...
"مجھے... تو چلیے کیا پڑھ رہی تھیں؟"
جانے بی بی کیا جاننا چاہتی تھیں اور پھر اس کے بعد کیا کہنا چاہتی تھیں۔ جس کے لیے ایسی تمہید ضروری تھی۔
"تاریخ کی ایک کتاب تھی بی بی۔"
صاحباں ان کے چہرے کو غور سے تکنے لگی۔
"میاں جی نے کہا تھا کہ اسے ضرور پڑھوں۔"
"تو کب تک ختم ہوگی...؟"
بی بی بڑی میٹھی میٹھی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔
"ختم ہونے کی چھوڑیئے۔ آپ کام بتایئے۔"
صاحباں کے شعور نے ان کی کیفیت سے بہت کچھ بھانپ لیا تھا۔
"کام! کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"
بی بی تھوڑا سا ہکلا کر، تھوڑا سا مسکرا کر چپ ہو گئیں۔ ان کی یہ ہچکچاہٹ عجیب سی تھی۔ بڑی پیاری، معصوم اور سادہ ی صاحباں کو ان پر بے اختیار پیار آ گیا۔
"آپ اتنی دیر سے کہاں تھیں؟"
صاحباں کی متجسس نگاہیں ان کی آنکھوں میں گڑ گئیں۔
"میں...! میں...!"
"ہاں..." وہ مسکرائی۔ "بتا دیجیے نا۔ اپنی صاحباں سے چھپائیں گی؟"
"باورچی خانے میں..."
اس مختصر سے جواب کے ساتھ بی بی کے چہرے پر اک پُرنور سی چمک اور ہونٹوں پر معصومیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔
"آپ ہر وقت باورچی خانے میں گھسی رہتی ہیں۔ یہ آخر سترجانہ کس لیے ہے؟"
"سترجانہ ہی سب کچھ کرتی ہے۔" بی بی مزید کچھ کہے بنا چپ ہو گئیں۔
"پھر؟ آپ وہاں کس لیے گئی تھیں۔ اگر کوئی بہت ہی ضروری کام تھا تو مجھے کہا ہوتا۔"
"وہ... وہ..." بی بی پھر ہچکچائیں اور آخر میں جیسے اک جذباتی سی لہر کے ہاتھوں بے بس سی ہو کر ایک دم بول پڑیں۔
"میں باورچی خانے میں اس لیے گئی تھی کہ حارث کے لیے مرغی روسٹ کرنا تھی۔ بس تھوڑی دیر کے لیے گئی تھی۔"
"اوہ۔" صاحباں کا چہرہ قدرے اُتر سا گیا۔
"ابھی کل ہی تو شیر خرما بھیجا ہے اور آج پھر..." وہ ہولے سے بڑبڑائی۔
لیکن بی بی نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ جلدی سے کہنے لگیں۔
"تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ اس کے گھر میں سوائے اس کے دوسرا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ ملازم تک تو اس نے رکھا نہیں ہے۔"
"پھر بی بی! پھر...؟ یہ ہماری ذمہ داری تو نہیں۔"
صاحباں کا موڈ کچھ بدل گیا مگر بی بی اپنے جذبوں میں ایسی سرشار کہ نہ اس کا موڈ دیکھا اور نہ ہی جیسے اس کی بات سنی۔
"اور خود اسے بھی کچھ پکانا نہیں آتا تھا۔ اس ہونی کا پتہ ہوتا تو لڑکیوں کی طرح اسے بھی کچھ گھر گرہستی سکھا دیتی۔ اب نجانے سے کیسے پیٹ بھرتا ہوگا۔"
بی بی کی آنکھوں کی چمک غائب ہو کر ان میں نمی تیرنے لگی۔

"گھر میں اتنی اچھی اچھی چیزیں پکتی ہیں اور وہ بیچارا اتنا قریب ہو کر، جانے کیسی الا بلائیں..."

بی بی اتنی دکھی، اتنی جذباتی ہو گئی تھیں کہ بات بھی مکمل نہ کر سکیں ایک طویل سا سانس لے کر پلو آنکھوں پہ دھر لیا۔

"سچ کہتی ہوں صاحباں۔ پھر میرے حلق سے کچھ نہیں اترتا۔" اور وہ باقاعدہ رونے لگیں۔

"تبھی..." صاحباں آگے بڑھ کر بی بی کے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھنے لگی۔

"بہت دنوں سے میں غور کر رہی تھی کہ آپ کھانا بہت کم کھاتی ہیں۔"

"سچ پوچھو تو اتنا بھی نجانے کیسے زہر مار کر لیتی ہوں۔ وہ بھی صرف تمہاری خاطر۔"

بی بی کے آنسوؤں کی روانی اور تیز ہو گئی۔ پورا وجود ہچکیوں سے ہچکولے کھانے لگا۔

"ورنہ۔ ورنہ میز پر بیٹھتی ہوں۔ نوالہ توڑتی ہوں تو اس کی شکل آنکھوں میں گھومنے لگتی ہے۔ جانے اس نے اس وقت کچھ کھایا ہے یا نہیں اور اگر کھایا بھی ہے تو کیسا... بس۔ اس سوچ کے ساتھ پھر اک نوالہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتر پاتا۔"

آنسوؤں بھرا سرخ سرخ چہرہ اٹھاتے ہوئے، صاحباں کی آنکھوں میں ڈالتے ڈالتے ہوئے وہ انتہائی بے بسی سے آخر میں کہنے لگیں۔

"میں کیا کروں صاحباں۔ مجھے خود پہ اختیار نہیں رہا۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میری مت ماری گئی ہے۔"

"نہیں نہیں بی بی۔ ایسا کیوں کہتی ہیں۔"

صاحباں نے ایک دم بی بی کا پورا وجود بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"آپ بڑے شوق سے روز کچھ نہ کچھ پکا دیا کریں۔ آپ کی خوشی کی خاطر میں روز یہ ڈیوٹی دینے کو تیار ہوں۔ بسر و چشم بی بی۔ آپ بالکل جھجکیں نہیں۔"

بی بی کا چہرہ اپنے سامنے کرتے ہوئے صاحباں بڑے پیار سے مسکرائی۔

"لیکن پھر اس کام کے لیے میری بھی ایک شرط ہو گی۔"

"ایک نہیں دس کہو، بیس کہو۔ ساری منظور۔ بغیر سنے دل و جان سے منظور..."

بی بی بڑے ہی جذباتی انداز میں سینے پہ ہاتھ مار کر اک نمایاں سی عجلت کے ساتھ بول اٹھیں۔ جیسے کہیں یہ لمحہ ہاتھ سے نکل نہ جائے اور وہ اسے ہر قیمت پہ پکڑنا چاہتی تھیں۔

"دس بیس شرطوں کو میں نے کیا کرنا ہے۔" صاحباں مسکرائے جا رہی تھی۔

"میری تو بس ایک ہی ہے۔"

"تو پھر کہہ ڈالو نا جلدی سے۔"

"آپ میرے جذبات کی قدر تہہ دل سے کریں گی اور پوری جان سے ان کا خیال رکھیں گی۔"

"صاحباں! بیٹی میں نے پہلے کبھی تمہاری طرف سے بے پرواہی برتی ہے؟"

بی بی نے شاکی نگاہ سے اسے دیکھا۔

"میرے دل پر چاہے کچھ بھی گزر رہی ہو مگر میں نے تمہیں فراموش کبھی نہیں کیا۔ چندا! تو یہ خیال دل سے نکال دے۔ بیٹے کو پا کر میں تیری طرف سے لاپرواہ ہو جاؤں گی۔"

بی بی پورے خلوص سے قسمیں کھا کھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"تجھے کیا معلوم کہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ایک بیٹی کی ماں بننا تھی۔ بیٹے کی ماں بن جانے کے باوجود والی تمنا موجود تھی۔ پھر..."

لمحہ بھر کے لیے بی بی چپ سی ہو گئیں۔

"پھر کیا؟" صاحباں کی بے تابی نے بے تاب ہو کر انہیں خاموش رہنے کا موقع نہ دیا۔

"پھر خدا نے ہمیں یہ نعمت تو دی مگر سال بعد ہی اس نے واپس بھی لے لی۔"

بی بی اپنی بیٹی کی یاد میں پھر آنسو بہانے لگیں۔

"ہائے۔ چچ چچ۔" صاحباں بھی ان کے دکھ میں شریک ہو گئی۔ "اللہ میاں نے یہ کیا کیا؟ وہ ظالم تو نہیں ہے۔ اس نے میری بی بی کو یہ صدمہ کیوں دیا؟"

"ہاں وہ ظالم نہیں ہے۔ وہ رحیم اور کریم ہے۔ اس صدمے کا بدل اس نے مجھے تمہاری صورت میں دے دیا۔"

بی بی اپنے آنسو پونچھ کر جلدی سے مسکرائیں۔

"قسم ہے پروردگار کی۔ جب سے بیٹی تمہارے وجود نے میرے گھر کو رونق بخشی ہے۔ میں اس مرنے والی کو بھول گئی ہوں۔ اب میرے دل میں بیٹی والی کوئی حسرت موجود نہیں ہے۔ میں تمہیں وہی سمجھتی ہوں۔ تم میری خواہش، میری تمنا کی تکمیل ہو۔ کیا پھر بھی میں تمہارے جذبوں کا خیال نہیں رکھوں گی؟ تمہیں کیا پتہ میں کیسے راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہیں..."

"بی بی...!" بی بی کی بات کاٹتے ہوئے صاحباں بے اختیار قہقہہ لگا اٹھی۔

"میں اپنے متعلق تو کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ میرے جذبوں کا مطلب تو آپ اور میاں جی تھے۔ اپنے والدین کو کھو کر میں نے آپ دونوں کو پایا ہے۔ آپ دونوں مجھے کتنے عزیز ہیں اس کا اندازہ آپ کو کیسے کراؤں اور یقین کیسے دلاؤں۔"

اور... وہ بات تو صاحباں کہہ ہی نہ پائی۔ حارث کے لیے وہ جس قسم کے حالات سے گزر رہی تھی وہ کیسا کٹھن اور دشوار تھا۔ وہ تو انہیں بتا ہی نہ سکی کہ صرف ان کی خاطر اس نے حارث ایسے جانور سے کیسی کیسی بے عزتیاں کرائی تھیں۔ کیسے کیسے اس کی عزت نفس مجروح ہوئی تھی مگر پھر بھی ان کی خاطر، صرف ان کی خاطر وہ سب کچھ سہتی رہی تھی۔

وہ اگر تصور آباد میں ہوتی تو بی بی کو کیا پتہ کہ اماں اور بابا کی خاطر بھی یہ سب برداشت نہ کر پاتی۔ صرف بی بی کا دم تھا جو چپ رہی اور ان کی ہر خواہش پہ سر جھکا دیا۔

"مجھے اپنی پرواہ نہیں ہے بی بی! میں تو آپ کے لیے کہہ رہی تھی کہ سب کچھ کروں گی مگر صرف اس شرط پہ کہ آئندہ سے آپ اپنا خیال رکھیں گی۔ میری یہی خواہش ہے، یہی جذبے ہیں اور میری یہی تمنا ہے۔"

بی بی حیرت سے منہ کھولے اسے تکے جا رہی تھیں۔

"آپ خوش رہیں، آپ صحت مند رہیں، آپ میری ضرورت ہیں بی بی۔ بڑی ضرورت ہیں۔"

"لیکن صاحباں۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں بی بی۔"

صاحباں نے فضا کو خوش گوار کرنے کی خاطر ایک قہقہہ لگایا۔

"آج تو تحریری معاہدہ ہو گا تب آگے کام چلے گا۔"

"کیا مطلب...؟"

"آپ نے مرغی روسٹ کی ہے۔ حارث کے پاس اس وقت پہنچے گی جب آپ یہ وعدہ کر لیں گی کہ آئندہ سے آپ میری بی بی کا خیال اپنی صاحباں سے بھی زیادہ رکھیں گی۔"

پھر وہ بڑے انداز سے مسکرائی۔

"تو طے ہو گیا نا۔ آپ میری بی بی کا خیال رکھیں گی اور میں آپ کے بیٹے کا اور جس دن آپ نے ذرا سی بھی میری بی بی سے غفلت برتی اس دن میں آپ کے بیٹے کی طرف سے غافل ہونے کی پوری پوری حقدار ہوں گی اور..."

اس کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ بی بی نے بڑے والہانہ انداز میں صاحباں کو سینے کے ساتھ لگا لیا۔ پھر اس کی پیشانی، اس کے صاف شفاف چمکیلے چمکیلے گال اور اس کی ستاروں ایسی روشن اور جوت بکھیرتی آنکھوں کو چوم چوم کر اس معاہدے پر مہریں لگا دیں۔

"تیری قسم صاحباں! میری اپنی کوکھ سے پیدا کی ہوئی وہ بیٹی زندہ رہتی، تو وہ بھی تجھ ایسی نہ ہوتی۔"

بی بی نے مہریں ثبت کرنے کے بعد اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

"حارث ہی کی بہن تھی نا۔ اور حارث نے کون سی ماں کے ساتھ وفا کی ہے۔"

بی بی کا ذہن پھر بہکا۔ جنون بیدار ہوا۔ آنسو صاحباں کی پشت پہ ٹپکنے لگے۔

"وہ تو میری اپنی مامتا کی پکار ہے جو اس کے لیے یہ سب کرتی پھر رہی ہوں۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کی اولاد ہے اور اسی اولاد کی جدائی میں تو زندہ ہو کر بھی موت سے ہمکنار ہوں بیٹی۔"

اور... جانے کیا ہوا...؟ کیسا درد تھا جو خود اس کی آنکھوں سے بھی ٹپکنے لگا۔ بی بی کے آنسوؤں کا ساتھ صاحباں کے آنسو بھی دینے لگے۔

اس کی ماں بھی تو اسی کمزوری کا شکار ہو گی۔ وہ بھی تو زندہ درگور ہو گی۔ کتنا پیار تھا اسے صاحباں کے ساتھ اور... اور نے کیا کیا...؟

ماں! میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں تمہاری ممتا کی قاتل ہوں میں گناہگار ہوں میں سزاوار ہوں۔

لیکن! یہ بھی جانتی ہوں اک ماں اولاد کے لیے سینے میں ایک ایسا دل رکھتی ہے جو خدا کی طرح رحیم و کریم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ تم مجھے معاف کر دو گی۔

اور اسی معافی کے لیے میں آؤں گی تمہاری پاس۔ آؤں گی۔ تمہاری جدائی کے سب داغ مٹا دوں گی۔ سارے زخموں پہ اپنے باعزت وجود کی قسموں کی مرہم لگاؤں گی۔

مگر۔ کچھ وقت۔ تھوڑا سا وقت مجھے اور دے دو ماں۔ چند اذیت اور دکھ کی گھڑیاں اور کاٹ لو۔ اس ماں کی خاطر یہ بھی مجھے بیٹی کہتی ہے۔ اس نے مجھے جنم نہیں دیا لیکن ممتا تم جیسی ہی دی ہے۔ اس کا بھی مجھ پہ حق ہے۔ بس۔

اس کی اولاد کو اس سے ملا دوں۔ یہ فرض پورا کر لوں۔ پھر... پھر ماں میں تمہارے قدموں میں ہوں گی۔ انشاء اللہ بہت جلد۔

"بیگم صاحبہ...!"

شہنا نہ کی آواز پر دونوں اپنی اپنی محویت سے چونک کر علیحدہ ہو گئیں۔

"سارا کام ہو گیا ہے جی"۔

"جس ڈش میں مرغی نکالی ہے اچھی طرح صاف کر لی تھی نا۔؟"

"ہاں جی بہت اچھی طرح۔"

"بالکل ہی صاف تو نہیں کر دی...؟"

صاحباں کے شوخی بھرے فقرے پر شہر جانہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

"باقی مرغی سنبھال کر رکھ دی ہے نا...؟"

بی بی نے اس کے ہنستے وجود کو گھور کر دیکھا۔ وہ کام کی بات کر رہی تھیں اور وہ بیوقوفوں کی طرح کھی کھی کیے جا رہی تھی۔

"جی باقی کون سی...؟"

بی بی کی گھرکی دیکھتے ہی اس کی ہنسی تھم گئی۔

"باقی آدھی..."

"جی میں نے پوری کی پوری ہی ڈش میں نکال دی ہے"۔

"لیکن میں نے تو آدھی نکالنے کو کہا تھا"۔

"وہ مجھے یاد نہیں رہا تھا" شہر جانہ سہم کر بولی۔

"تو آدھی کو آپ نے کیا کرنا ہے...؟"

صاحباں نے شہر جانہ کے سہمے وجود کو دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

"میری بیٹی کیا کھائے گی؟" بی بی نے بڑے پیار سے صاحباں کو دیکھا۔

"کیوں...؟ اس مرغی کے علاوہ گھر میں آج اور کچھ نہیں پکا؟"

"پکا کیوں نہیں۔ کریلے گوشت ہیں۔ مصالحوں والے چنے ہیں"۔

"تو بس پھر۔ میں وہ کھا لوں گی"۔

"لیکن تمہیں مرغی پسند بہت ہے نا؟"

"کل یا پرسوں پھر پک جائے گی۔ اب شہر جانہ نے غلطی سے ساری ڈش میں نکال دی ہے تو حارث کا نصیب۔ عیش کرنے دیں اسے"۔

بی بی تو ہر بات کو مسئلہ بنا لیتی تھیں۔ صاحباں نے خوشگوار سے انداز میں بات مذاق میں ٹال دی۔

"نہیں..." بی بی بھی ضد کی پکی تھیں۔

"اس گھر کے باورچی خانے میں پکے اور میری صاحباں نہ کھائے۔ نہیں بیٹی! تم نہیں کھاؤ گی تو وہ بھی نہیں کھائے گا"

بی بی شہر جانہ کو مزید کوئی حکم دیئے بنا خود اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں خود جا کر اپنی بیٹی کا حصہ نکالتی ہوں"۔

چند قدم چل کر وہ پھر پلٹیں۔

"صاحباں! تم جلدی سے آ جاؤ۔ گرم گرم ہی اسے پہنچ جائے تو اچھا ہے۔ کہاں دوبارہ گرم کرتا پھرے گا"۔

"لیکن بی بی! ابھی ان کا دفتر سے واپسی کا وقت کب ہوا ہے؟"

"وہ تو آج دفتر گیا ہی نہیں"۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا...؟"

"وہ۔ وہ..." بی بی ہکلانے لگیں۔

بار بار اپنے جذبوں کو مشتہر کرنا نہیں چاہتی تھیں اور صاحباں بھی نجانے یہ بات کیوں بھول گئی تھی کہ حارث کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر بی بی اس کے دفتر جانے اور آنے کے اوقات میں کھڑکی میں ہی موجود رہتی تھیں۔ پھر بھلا وہ کیوں لا علم رہ سکتی تھیں۔

"دروازہ کھلا تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا ہے"۔

بی بی نے قدرے الجھ کر جواب دیا۔

"دروازہ کھلا ہے۔ وہ دفتر نہیں گیا"۔

صاحباں دل ہی دل میں بے حد فکرمند ہو گئی۔ مگر اپنے اس فکر کا بی بی پر برملا اظہار نہیں ہونے دیا۔ لہجے کو نرم اور بے فکر سا کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

"آخر دفتر کیوں نہیں گئے؟"

"اب یہ مجھے کیا معلوم؟ جاؤ گی تو پتہ چل جائے گا"۔

بی بی کو مرغی اس تک جلد از جلد پہنچانے کی جلدی تھی۔ جوانوں کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شہر جانہ بھی پیچھے پیچھے چل دی۔

صاحباں سوچوں میں کھوئی بیٹھی رہ گئی۔ کل حارث سے پکا وعدہ کیا تھا کہ آئندہ اس کے لیے کوئی چیز لے کر نہیں جائے گی۔ مگر بی بی کے سینے میں مچلنے والی ممتا کبھی اسے بے عزت کرا دیتی تھی اور کبھی وعدہ توڑنے پر مجبور۔

اف! کتنی بے بس تھی وہ۔

"ہائے حارث! تیرا کسی دوسرے شہر تبادلہ ہو جائے نا یا پھر تم خود ہی چپ چاپ یہاں سے نقل مکانی کر جائے۔ چلو مجھ سے ہی تنگ آ کر ہی۔ تم دفان ہو جاؤ گے تو میری اس سارے قضیئے سے جان تو چھوٹ جائے گی نا۔

اور نہ صرف میری جان بلکہ سچ جانو تو تمہارا ابھی بھرم رہ جائے گا۔ بی بی کے دل میں تمہاری جو تصویر موجود ہے وہی موجود رہے گی۔ تمہارے اس بگڑے تگڑے حلیے کو دیکھ کر انہیں کوئی مزید دکھ تو نہیں پہنچے گا۔

"تمہاری' میری اور بی بی کی' سب کی بہتری اسی میں ہے۔ حارث! سب کی بہتری...!!"

یہی کچھ سوچتے ہوئے صاحباں کمرے سے باہر نکلی تو بی بی ہاتھوں میں سفید چینی کی خوبصورت ڈش تھامے ادھر ہی چلی آ رہی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہو...؟"

"آپ ہی کے حکم کی تعمیل کرنے بی بی"۔

بڑا مشکل اور بے حد ناگوار قسم کا کام تھا مگر جلدی سے چہرے پر سے ناگواری کے تاثرات ہٹا کر وہ اک خوشگوار سی مسکراہٹ لے آئی۔ جیسے اس سے بڑھ کر خوبصورت اور دلچسپ کام اس نے زندگی میں کوئی کیا ہی نہیں تھا۔

"مت ماری گئی ہے صاحباں تمہاری"۔

"کیوں بی بی؟ کیا ہوا...؟"

یکا یک ہی بی بی بگڑ اٹھی تھیں۔ صاحباں حیران سی رہ گئی۔

"کیا کر دیا میں نے...؟"

"اپنا حلیہ دیکھا ہے؟ اس طرح جاؤ گی؟"

"اوہ...!" حیرت کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی۔

"جس کے گھر جا رہی ہوں اس کا بھی حلیہ دیکھا ہوا ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔"

صاحباں کا یہ کہنے کو دل تو بہت چاہا مگر بی بی کے جذبوں کا احترام آڑے آ گیا۔

"تو کیا ہے بی بی۔ میں کون سی کسی تقریب وغیرہ میں شرکت کرنے جا رہی ہوں"۔

"...نہ ہی کسی تقریب میں لیکن کسی دوسرے کے گھر تو جا رہی ہوں۔ ویسے بھی آتے جاتے کوئی پڑوسیوں میں سے مل گیا تو... عزت بنے گی۔"

"کیا صرف قیمتی لباس سے ہی عزت بنتی ہے بی بی! انسان کا کردار کوئی حقیقت نہیں رکھتا؟"

"تمہاری بات بھی درست ہے بیٹی! لیکن زمانے کے ساتھ بھی تو چلنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے میاں جی تو یہی چاہتے ہیں کہ تم ہر وقت شہزادیوں جیسے حلیے میں رہو۔ کچھ انہیں کی خواہشات کا احترام کر لیا کرو۔"

"اوں، بی بی۔ اس وقت نہیں۔" وہ بڑے لاڈ سے بولی۔

"کیوں نہیں۔" بی بی نے اک دبدبے سے کہا۔

"وہ۔ وہ۔ مرغی ٹھنڈی ہو جائے گی نا..."

اس وقت وہ بڑی کاہل ہو رہی تھی۔ یوں بھی حارث کے ہاں جانے کے لیے وہ کوئی بھی اہتمام قطعی غیر ضروری سمجھتی تھی۔ وہ اس قابل کب تھا۔

"بس میں نے کہہ دیا نا کہ اپنا حلیہ درست کرو اور مرغی ٹھنڈی کا خیال چھوڑو۔ وہ میں دوبارہ گرم کر دوں گی۔"

بی بی کے حکم نے اس کا کوئی بھی بہانہ نہ چلنے دیا۔ بادلِ ناخواستہ وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی اور بی بی شاید گرم کرنے۔ رخ ان کا باورچی خانے ہی کی طرف تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر، لباس تبدیل کر کے، بے ترتیب بالوں کو برش سے سنوار کر وہ پلٹی تو بی بی ڈش لیے پھر موجود تھیں۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔"

بی بی اسے دیکھتے ہی یکایک پکار اٹھیں۔

"خدا اچھی صورت دے تو اسے سنوار کر رکھنا بھی اک شکرانے کے مترادف ہے۔"

"لائیے بی بی! جلدی سے فارغ ہو کر آؤں۔"

صاجیاں نے ان کی ڈھیر ساری تعریف پر دھیان ہی نہیں دیا۔ انہیں تو وہ ہر رنگ، ہر روپ، ہر کیفیت، ہر عالم، ملبوس میں ہی بے حد خوب صورت لگا کرتی تھی۔ دنیا بھر سے زیادہ خوب صورت اور انوکھی اور نرالی۔

کچھ اس قدر۔ کہ روز ہی اس کی نظر اتارتی تھیں لیکن صاجیاں کے خیال میں یہ صرف ان کی محبت تھی جو آنکھوں سے ٹپکا کرتی تھی۔ ورنہ اس کی صورت میں ایسا بھی کوئی کمال نہ تھا۔

مزید کوئی بات بی بی کریں اس سے پہلے ہی وہ ان کے ہاتھ سے ڈش لے کر چل دی۔ بی بی حسب معمول کھڑکی کی طرف بھاگ گئیں۔

صاجیاں ہر تیسرے چوتھے قدم پر پلٹ پلٹ کر بی بی کو دیکھتے ہوئے اور ان کی ماں تا کے جذبوں کی شدت سے متاثر ہوئے حارث کے گھر تک پہنچ گئی۔

خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ بہت پریشان تھی اور بے حد شرمندہ بھی۔ کہ نہ آنے کا وعدہ کر کے پھر چلی آ رہی تھی۔ اور آج تو اسے کے لیے کوئی بہانہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

نہ روز روز شرط لگ سکتی تھی، نہ غسل صحت کی خوشی میں شیرینی تقسیم ہو سکتی تھی اور نہ ہی روز نذر نیاز بانٹی جا سکتی تھی۔

کس قدر پریشان تھی وہ .... اور کتنی مجبور...

کسی اجنبی یا انجان پڑوسی پر بھی تو کوئی یوں دیوانہ وار محبتیں اور خلوص بغیر کسی غرض و غایت کے کبھی نہیں لٹاتا۔ جانے سمجھے۔ وہ کیا سوچے....؟

دونوں ہی کی عمریں ایسی تھیں کہ غلط قسم کے شکوک و شبہات کی بہت گنجائش تھی۔ اصل بات سے تو کوئی واقف نہ تھا اس کے اور بی بی کے۔

یوں ہر طرح اسی کی بے عزتی اور رسوائی تھی مگر۔ اس کے باوجود وہ پھر اس کے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔

ڈھیر ساری سوچوں کے بوجھ تلے دبا دبا سر اٹھا کر وہ دروازے پر دستک دینے ہی لگی تھی کہ وہ تھوڑا سا کھلا دکھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا دیکھتے ہی صاجیاں کو یکایک اک تدبیر سوجھ گئی۔

اگر وہ اس کمرے میں موجود نہ ہوا تو وہ چپکے سے ڈش میز پر رکھ کر اور بغیر اس کا سامنا کئے واپس جا سکتی تھی۔

ہاں۔ یہ ترکیب درست تھی۔ بی بی کی بھیجی ہوئی چیز بھی ان کے بیٹے کو پہنچ جاتی اور وہ وعدہ توڑنے کے قصور سے مزید جلی کٹی سن کر شرمندہ اور پریشان ہونے سے بھی بچ جاتی۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے بڑے خلوص اور خشوع و خضوع سے بہت ساری دعائیں مانگیں کہ اگر وہ اس

میں موجود بھی تھا تو اس وقت کسی ضرورت سے دوسرے کمرے میں چلا جائے۔ خدا را اللہ میاں! ضرور چلا جائے۔ آج اس کی عزت رہ جائے۔

اپنی دعاؤں سے مطمئن ہونے کے بعد تھوڑے سے کھلے ہوئے کواڑ میں سے اس نے اندر جھانکا۔ آج اس کی قسمت اچھی تھی خدا نے اس کی دعا سن لی تھی۔ کمرے میں وہ واقعی کہیں موجود نہیں تھا۔ مسرت کی اک لہر پورے وجود میں دوڑ گئی۔

بہت آہستہ سے اس نے کھلے ہوئے کواڑ کو تھوڑا سا اور کھولا اور دبے دبے قدموں کے ساتھ اس میز تک پہنچ گئی۔ جس پہ وہ کل بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

بڑی احتیاط سے مرغی والی ڈش اس نے وہاں رکھی اور پھر اسی آہستگی اور احتیاط سے پلٹنے لگی تھی کہ نگاہ میز پر پڑی اسی شیر خرما والی پلیٹ کی طرف اٹھ گئی جو کل اس کے لیے لائی تھی اور اس نے پھر اسے کسی وقت کھانے کے لیے رکھ لی تھی۔

مگر۔ واقعی وہ بڑا کمینہ انسان تھا۔ بی بی نے اتنی محنت اور اتنی محبت سے وہ بنایا تھا۔ خاص اس کے لیے اور اس بے قدرے نے کھایا ہی نہیں تھا۔

جتنا کل اپنے ہاتھ سے وہ زبردستی اسے کھلا گئی تھی۔ بس اتنا ہی کھایا ہوا تھا۔ باقی پہ چیونٹیوں کا اک غول کا غول جمع تھا اور بڑے مزے سے ضیافت اڑا رہا تھا۔

"بدتمیز۔ بے قدر۔ بے حس۔ احسان فراموش۔"

غصے میں جو جو اس کے دل میں آیا وہ بڑبڑاتی چلی گئی۔

"حیوان۔ انسان کے نام پہ کلنک... جانور..."

کھولتے تلملاتے ہوئے وہ کئی لمحات کھڑی اس پلیٹ کو دیکھتی رہی۔ چیونٹیاں آ رہی تھیں۔ کھا رہی تھیں۔ جا رہی تھیں۔ "ہائے بی بی! آپ کس پتھر کے ساتھ سر پھوڑ رہی ہیں۔"

بی بی کے لیے دل میں ہمدردیوں کا ایک طوفان سا امڈ رہا تھا۔ آنکھیں بھی بھیگی جا رہی تھیں۔

"بی بی کو حقیقت سے آگاہ کر ہی دینا چاہیے۔ کب تک اپنی محنت اور چاہت یوں لٹاتی رہیں گی۔ حالات سے واقف ہونے کے بعد شاید کچھ صبر آ جائے۔ ہاں۔ یہی ٹھیک ہے۔"

مرغی والی ڈش واپس لے جانے کے لیے اس نے ہاتھ آگے بڑھائے تو اب نگاہ میز پر پڑی باقی چیزوں پر بھی جا پڑی۔ باقی سب کچھ بھی تو اسی طرح پڑا تھا۔ وہ جھوٹی پیالی۔ وہ سگریٹوں کا پیکٹ۔ ماچس۔ ایک نیپکن اور میز پر ہلکی ہلکی گرد کی تہہ۔

یوں۔ جیسے اس وقت وہ وہاں سے اٹھا تو پھر ادھر آیا ہی نہیں۔ کیوں؟ کیا وجہ تھی؟

ڈش اٹھانے کے لیے جو ہاتھ بڑھائے تھے وہ وہیں تھم گئے۔ ساتھ ہی سوچ کا دھارا بھی بدل گیا۔

ویسے کل جب اس نے وہ شیر خرما کھ لیا تھا اس وقت اس کا اسے یوں ضائع کرنے کا ارادہ تو کوئی نہیں لگ رہا تھا بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک تھی۔؟ یکایک یہ خیال بجلی کی طرح ذہن میں کوند گیا۔ کل جب وہ واپس گئی تھی تو اس وقت تو ٹھیک نہیں تھی۔

اس کی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ خاصی خراب، اور پھر آج بی بی نے بتایا تھا کہ وہ دفتر بھی نہیں گیا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی ویسی ہی بات ہو گی۔ یقیناً...

چپکے سے مرغی رکھ کر با عزت پلٹ آنے کا اچھا خاصا موقع تھا مگر انسانیت کے درد کے ہاتھوں وہ ایسا نہ کرنے پر مجبور سی ہو گئی...

"بلا سے آج اٹھا کر سب کچھ باہر پھینک دے اور ساتھ مجھے بھی دھکے دے کر نکال دے مگر میں اسے پوچھے بغیر گھر واپس نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں۔"

ذہن کے بدلاؤ کی بجائے اس وقت وہ دوسروں سے ہمدردی رکھنے والے اپنے دل اور جذبے کی خاطر رک گئی۔ گھر واپس جانے کا ارادہ ترک کر کے وہیں کھڑے کھڑے وہ اسے زور زور سے پکارنے لگی۔

"حارث صاحب۔ حارث صاحب۔"

پانچ چھ بار صاجیاں نے اسے پکارا مگر جواب میں کوئی جواب نہ ملا۔ وہ خاصی پریشان ہو گئی۔ کہیں راتوں رات چپکے سے اس گھر کو خیر باد تو نہیں کہہ گیا تھا۔؟

ہمیشہ پورے خلوص اور لگن سے یہ دعا مانگتی رہی تھی۔ مگر اس وقت اس خیال کے آتے ہی دل دھڑک سا اٹھا۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بی بی کیا کریں گی؟

وہ گھبرا گھبرا کر ارد گرد دیکھنے لگی۔ سامان تو سارا موجود تھا۔ اک پرانا سا صوفہ سیٹ، ایک چھوٹے سائز کی میز، دو کرسیاں، صوفے کی درمیانی میز پر سگریٹوں کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا اک ایش ٹرے اور مرجھائے ہوئے جانے کتنے دنوں کے باسی پھولوں والا اک پھول دان۔ میز پر سوکھی سوکھی پتیاں ارد گرد بکھری تھیں۔ کچھ تسلی ہوئی۔

لیکن۔ دوسرے ہی لمحے یہ خیال آیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ سب اس کی ملکیت نہ ہو اور وہ اپنے پہننے اوڑھنے والے کپڑے لے کر سدھار چکا ہو۔ تبھی تو دروازہ بھی کھلا تھا۔

ہاں۔ یہ ممکن تھا وہ گھبرا کر، بے حد پریشان ہو کر اس گھر سے اس کے چلے جانے والی خود ساختہ خبر کی تصدیق کے لیے عجلت سے باورچی خانے میں گھس گئی۔

وہاں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں تھی فرنیچر وغیرہ اس مکان کے مالک کا ہو سکتا تھا مگر باورچی خانے کے برتن اور دوسری چیزیں، چائے کی پتی، دودھ کا ڈبہ، چینی، نمک، مرچ، گھی وغیرہ یہ سب تو اس کے اپنے ہی ہونا تھے نا تو۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں گیا نہیں تھا۔ بلکہ یہیں کہیں موجود تھا۔ اطمینان بھرا اک طویل سانس اس کے لبوں سے نکل گیا۔

اور اب دل بے قرار اسے تلاش کرنے کے لیے مچل اٹھا۔ باورچی خانے کے سامنے والی کاریڈور کے پرلے پر ایک اور کمرہ تھا۔ وہ تیزی سے اس کے اندر گھس گئی۔

کاریڈور میں روشنی تھی کمرے میں ملگجا سا اندھیرا۔ کتنی ہی دیر تو اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر جب آنکھیں تاریکی سے قدرے مانوس ہوئیں تو کمرے میں موجود ہر چیز دکھائی دینے لگی۔

اس چھوٹے سے کمرے میں بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ اک پلنگ کے سرہانے کے پاس اک میز تھی جس پر ٹیبل لیمپ، چند کتابیں اور کاغذات، ایک قلم، ایک رسٹ واچ اور... اور ٹیبل لیمپ سے پرے جانے کیا پڑا تھا۔ اتنا ہی کچھ دکھائی دیا۔

داہنی طرف نگاہ دوڑائی۔ اک اور دروازہ تھا۔ بالکل چھوٹا سا۔ شاید ادھر غسل خانہ تھا یا پھر ڈریسنگ روم۔ وہاں کی طرف اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔

بائیں طرف والی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس میں پردے تنے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے نیچے دو کرسیاں تھیں۔ کھونٹی کے ساتھ دیوار پر ایک کھونٹی سی تھی۔ جس پر انتہائی بے ترتیبی سے اس کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ تو وہ یقیناً اپنے پورے ساز و ساماں اور وجود کے ساتھ اس گھر میں موجود تھا۔ مگر کہاں؟

"حارث صاحب۔ حارث صاحب۔"

وہ وہیں کھڑے کھڑے بڑے زور زور سے اسے ایک بار پھر پکارنے لگی۔

اس کا سارا گھر اور اس کی رہائش کا انداز دیکھنے کے بعد دل بری طرح بھر آ رہا تھا۔ اتنے امیر والدین کا کیسی افلاس بھری زندگی گزار رہا تھا۔ کیوں...؟ کیوں مگر؟

"حارث صاحب...!"

اور اب نہ صرف اس کی آواز پوری بلند تھی۔ بلکہ اس میں اک چیخ بھی شامل تھی۔

پلنگ پر پھیلے سرمئی کمبل میں جنبش ہوئی۔ "کون..."

"اوہ...!" تو وہ اس پلنگ پر کمبل اوڑھے پڑا تھا۔ کچھ تاریکی کی وجہ سے اور کچھ وہ مردوں کی طرح بالکل سیدھا بے سدھ سا پڑا تھا کہ لگ ہی نہیں رہا تھا کوئی کمبل کے نیچے بھی ہوگا۔ اسی لیے صاحباں نے اس طرف دھیان بھی نہیں دیا تب۔ آنکھوں میں رحم، ہمدردی اور ترس کی ڈھیروں ڈھیر نمی، اتنی کہ اک بار پلک جھپکے تو کئی مالائیں تیار ہو جائیں، وہ پلنگ کی طرف لپکی۔

"آپ یہاں ہیں...؟"

اک بیقرار سی جھپٹ کے ساتھ صاحباں نے کمبل اس کے چہرے پر سے ہٹا دیا۔

"کون ہے...؟" حارث کی آواز نارمل نہیں تھی۔

"یہ میں ہوں..." وہ ذرا سا جھجکی۔

"میں کون...؟"

سرخ سرخ آنکھوں میں اجنبیت لیے وہ بغور اسے تکنے لگا۔

"یہاں تو میں کسی سے واقف نہیں ہوں۔"

"میں صاحباں ہوں حارث صاحب!"

وہ بڑی اپنائیت سے بولی۔ لیکن یہ اسے خیال ہی نہ رہا کہ وہ ابھی تک اس کے نام سے انجان تھا۔ نہ کبھی اس نے صاحباں جنگ کی بات کی تھی اور نہ ہی صاحباں کو ٹھیک ٹھاک طرح اسے اپنا تعارف پیش کرنے کا موقع ملا تھا۔ قصور اس کا کچھ نہیں تھا۔

"صاحباں... کون صاحباں؟ میں تو اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا..."

وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑانے لگا۔

"سوائے اس صاحباں کے جس نے اپنے مرزے کو اپنے سامنے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں مروا دیا۔ مگر... وہ خود بھی تو زندہ نہیں... پھر... پھر یہاں کیسے آگئی وہ؟"

اور اس طرح بڑبڑاتے بڑبڑاتے اس نے پھر کمبل چہرے پر کھینچ لیا۔

"یہ آپ کیسی بہکی بہکی سی باتیں کیے جا رہے ہیں؟"

صاحباں نے دوبارہ اس کے چہرے پر سے کمبل ہٹایا۔

"میں مرزے والی صاحباں نہیں ہوں حارث صاحب! یہ میں ہوں حلوے اور کھیر والی لڑکی۔ میرا نام بھی صاحباں ہے۔"

اب صاحباں نے اپنا مکمل تعارف کرایا۔ حارث آنکھیں جھپک جھپک کر جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس ہی کی خاطر صاحباں نے جا کر کھڑکی کے تنے ہوئے پردے پرے ہٹا دیئے۔ ایک دم ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

"اوہ...! آپ...؟"

صاحباں کی صورت دیکھتے ہی جیسے اس کے سارے ہوش و حواس قائم ہو گئے تھے، وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟ آپ اس وقت سو رہے ہیں...؟"

"کیوں؟ اس وقت سونے پر کوئی پابندی ہے یا کسی کا حرج ہوتا ہے؟"

ہمیشہ والی تلخی نے اس کے ہونٹوں پر پھیل کر لہجہ بھی تیکھا بنا دیا۔

صاحباں کا دل اس وقت اس کے لیے ہمدردیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس لیے حارث کے تیکھے لہجے نے اس پر ذرا برابر بھی اثر نہ کیا۔ اسی طرح نرم و ملائم آواز میں اس کی سنی کو ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"اور سارا گھر بھی کھلا پڑا ہے۔ اگر کوئی چور اچکا گھس آتا...؟"

"فقیر کے ڈیرے سے کسی نے کیا لے لینا ہے۔ آ جاتا..."

کچھ ویسا ہی جلے کٹا جواب۔ صاحباں اسی طرح ان سنا کر گئی۔

"دفتر بھی نہیں گئے۔ کیوں...؟" لہجے میں پہلے سے بھی زیادہ مٹھاس تھی اور آنکھوں میں اپنائیت کی جھلک۔

"موڈ نہیں تھا..."

اس نے صاحباں کی کسی بھی بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ وہ قدرے چڑ سی گئی۔ لیکن ہمدردی اور اپنائیت دیکھی...

"عجیب بات ہے۔ موڈ نہیں تھا اس لیے دفتر نہیں گئے۔"

وہ بالکل اپنوں ہی کی طرح اسے ڈانٹنے لگی۔

"آپ نے نوکری کو بھی اک مذاق سمجھا ہوا ہے۔"

"محترمہ! جس انسان کی اپنی زندگی ہی اک مذاق ہو تو وہ باقی ساری دنیا کو بھی مذاق نہیں سمجھے گا تو کیا حقیقت جانے گا؟"

اس نے لیٹ کر پھر کمبل چہرے پر کھینچ لیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اب وہ وہاں سے چلی جائے۔ صاحباں نے مطلب کبھی نہیں سمجھا۔

"ہر وقت جلی کٹی باتیں۔ ہر وقت جلا بھنا لہجہ۔ نامعقولیت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

وہ اس کے لیے دل میں کتنی ہمدردی اور کتنا درد لے کر اسے تلاش کر پائی تھی۔ اس کے لیے کتنا فکرمند اور پریشان

ہوئی تھی۔ اس کی خاطر لاتعداد آنسو اندر ہی اندر پئے بھی تھے اور دل پہ پتھر بھی پکائے تھے اور صلہ کیا ملا...؟

وہی بیزاری، بدتمیزی، بدمزاجی!

تب وہ بے بس سی ہو کر بلند آواز میں بڑبڑانے لگی۔

"جانے آپ کیسے انسان ہیں؟ دوسروں کے خلوص کو بھی نہیں دیکھتے بس اپنی بیزاری اور بدمزاجی اور..."

"محترمہ...!"

حارث نے چلا کر چہرے پر سے کمبل ہٹایا تو صاحباں کی بڑبڑاہٹ ادھوری رہ گئی۔ ساتھ ہی اس نے کمبل میں سے ہاتھ باہر نکال کر اک زور کی آواز پیدا کرتے ہوئے صاحباں کے سامنے جوڑ دیئے۔

"میں جیسا بھی ہوں۔ بدتمیز، کمینہ، نامعقول، بدمزاج۔ پلیز۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تنگ مت کیجیے..."

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں...؟"

صاحباں نے جیسے صرف یہی چار الفاظ سنے تھے۔ بے کل سی ہو کر اس پہ جھک گئی۔

"کل سے خراب ہے نا...؟"

بالکل کسی اپنے کے سے درد کے ساتھ تڑپ کر اس نے حارث کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی۔"

بہت ہولے سے، بڑے آرام سے اس کے بندھے ہاتھ کھول کر صاحباں نے واپس کمبل میں گھسیڑتے ہوئے اسے اچھی طرح کمبل اوڑھا دیا۔

"کوئی دوا وغیرہ لی؟" بڑی میٹھی، بڑی نرم آواز میں اس نے پوچھا۔

"آپ کو کل ہی بتایا تھا کہ میرے اس مرض کا کوئی ڈاکٹر علاج نہیں کر سکا۔"

اب حارث کی آواز میں وہ تلخی اور لہجے میں تیکھاپن نہ تھا اور نگاہیں صاحباں کے ملائم اور اُجلے چہرے پر جمی تھیں۔

"کچھ کھایا پیا...؟"

"اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔"

جس انداز میں، جس لہجے میں صاحباں بات کر رہی تھی۔ وہی اب حارث کے ذہن میں گھلا جا رہا تھا۔

"چائے بھی نہیں پی...؟"

"کھانا، اٹھا ہی نہیں گیا۔ پھر بناتا کیسے؟"

اب حارث کی پیشانی پر سے تیوریاں بھی غائب تھیں۔

"اوہ! حد ہو گئی۔" وہ بڑبڑائی۔

"بدتمیز اور بداخلاق تو تھے ہی ساتھ عجیب بھی ہیں۔"

"خالی عجیب نہیں۔ عجیب و غریب کہیے۔"

"غربت تو تم نے اپنے کرتوتوں سے لی ہوئی ہے ورنہ حقیقت تو ہم بھی جانتے ہیں حارث صاحب!" زبان پہ آئی بات بے ہو گئی...

اتنی مشکل سے تو اس کے مزاج کی گرمی پر ٹھنڈک لا سکی تھی۔ من مار کر، بے عزتی کرا کے ڈھیٹ بن کر۔ کہیں سارا ریاض مٹی میں نہ مل جائے۔ ابھی اس بھڑوں کے چھتے کو نہ چھیڑنا ہی بہتر تھا۔

"ہاں۔ عجیب و غریب..."

صاحباں نے بڑی سعادت مندی سے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

اپنی ذات سے بھی بے نیاز اور لاپرواہ۔ اتنے گھنٹے بغیر کچھ کھائے پیئے گزار دیئے۔ پہلے اس دورے کی ہی کمزوری کا تھی جو اوپر سے فاقہ بھی اتار لیا۔"

حارث اس کے پُرخلوص چہرے کو تکے جا رہا تھا اور وہ بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اور کچھ بڑی اپنائیت سے اسے ڈانٹتے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کباڑ خانے کو کل اس نے تھوڑی سی باورچی خانے کی شکل دی تو تھی مگر پھر بھی ابھی کافی نوک پلک درست ہونے والی لیکن... اس وقت، وقت نہ تھا۔ اسے ٹھیک ٹھاک کرنے لگ جاتی تو ممکن تھا اس فاقے کے عالم میں ہی رحلت فرما جا

کیسے نقاہت سے ہاتھ لرز رہے تھے اور ٹھنڈے پسینوں والی یخ بستہ پیشانی لیے پڑا تھا۔ اس کے جڑے ہاتھ اس نے کھولے تو وہ بھی برف کی مانند یخ ہو رہے تھے۔ بس صرف اک مزاج ہی گرم تھا لیکن مزاج کی گرمی زندگی کو تو گرمی نہیں دے سکتی نا...

اسے خوراک کی ضرورت تھی۔ تب جلد جلد وہ چائے بنانے لگی۔ چائے کی اک گرم گرم پیالی پی کر اسے کچھ ہوش آئے تو پھر وہ اس کے لیے کھانے کا بندوبست کرے۔

گرم گرم بھاپ اُڑاتی چائے کی پیالی لے کر صاحباں واپس کمرے میں آئی تو حارث پھر چہرہ ڈھکے اسی طرح بے سدھ پڑا تھا۔ کہیں سچ مچ ہی اگلے جہاں تو نہیں سدھار گیا تھا۔ یا پھر بے ہوشی و بیہوشی کا چکر چلا لیا ہو۔ اندر ہی اندر وہ ڈر گئی۔

"[illegible] حارث صاحب!!"

پہلی دھیمی آواز کے بعد دوسری آپ ہی آپ کافی بلند ہو گئی۔

"ہوں۔" حارث نے چونک کر کمبل صرف آنکھوں پر سے ذرا سا سرکایا۔

"اُٹھیئے..."

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے صاحباں نے آگے بڑھ کر اس کے باقی چہرے پر سے بھی کمبل کھینچ کر علیحدہ کر دیا۔ ساتھ ہی بہت بہت شکر کیا کہ وہ کافی سخت جان تھا۔

"اٹھئے نا..." اس کی آنکھیں پھر بند ہو چکی تھیں۔ صاحباں نے دوبارہ کہا۔

"کیا ہے...؟"

اس نے آنکھیں کھولیں۔ گلابی گلابی سی ہو رہی تھیں اور چند منٹ پہلے والی شناسائی کی بجائے ان میں پھر اجنبیت تھی۔ "کیوں بار بار مجھے تنگ کرتی ہیں؟"

"چائے لائی ہوں..."

"چائے...؟" وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چائے کی اک پیالی کی نوید نے اس کی آنکھوں میں پھیلی اجنبیت کو یکایک دور کر دیا۔

"پہلے یہ پی لیجئے پھر میں آپ کے کھانے کا بھی کچھ بندوبست کرتی ہوں۔"

"نہیں نہیں..."

"نہیں نہیں، کھانے کے لیے تھا۔ البتہ چائے ضرور پی لوں گا۔"

اس نے جلدی سے لرزتا کانپتا ہاتھ بڑھا کر اک نمایاں بے تابی کے ساتھ صاحباں سے چائے کی پیالی جھپٹ سی لی۔ وہ لڑکھڑائی۔ چند قطرے پلیٹ میں بھی گرے مگر اس کی بے تابی اسی طرح بے تاب رہی۔

اتنی گرم تھی۔ وہ جانتا بھی تھا لیکن ذرا بھی پرواہ کئے بغیر اس نے جھٹ سے اسے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔ صاحباں اسے بڑی تکے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں بے شمار آنسو بھر آئے۔ بنا دم لیے حارث نے اوپر تلے تین چار گھونٹ بھرنے کے بعد اک طویل سا سانس لیا۔

"بس ایک ہی پیالی بنائی ہے؟"

"ہاں۔" صاحباں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو اندر ہی اندر پیئے۔

اور... صاحباں کا جواب سن کر حارث نے چپ چاپ باقی پیالی ہونٹوں سے لگا لی۔

"کیوں...؟ اور پئیں گے...؟"

"چوبیس گھنٹوں میں تو کئی پی جایا کرتا تھا اور آج یہ پہلی نصیب میں ہوئی ہے۔"

"دوسری چھوڑ تیسری چوتھی بھی نصیب میں لکھی جائے گی مگر کھانے کے بعد۔" وہ خوش گوار سے لہجے میں بولی۔

"کھانا...؟ لیکن... گھر میں تو شاید..."

"کچھ نہ ہو..." صاحباں نے اس کی بات مکمل کر دی۔

"نہ سہی۔ ہمارا گھر بھی اپنا ہی سمجھیے۔ میری بی بی نے آج میرے لیے مرغی پکائی ہے چپکے سے اڑا لائی ہوں۔"

اسے بے تکلف کرنے کے لیے صاحباں نے اپنے لہجے کو شرارت کے قالب میں ڈھال لیا۔

"بی بی...؟" اس کی شرارت کی طرف حارث نے دھیان ہی نہیں دیا۔

"بی بی کون ؟" کھویا کھویا سا بڑبڑایا۔

"میری ماں ۔ میں اپنی ماں کو بی بی کہتی ہوں ۔ بڑی اچھی ہیں میری بی بی ۔ مجھے کبھی کسی بات سے نہیں روکتیں ٹوکتیں، پر بہت اعتماد ہے انہیں۔"

صاحباں بولے جا رہی تھی اور وہ اسی کے چہرے کی طرف بڑی ہی حسرت بھری نگاہوں سے تکے جا رہا تھا۔

"ارے! آپ چائے نہیں پی رہے۔"

آخری دو تین گھونٹ اسی طرح پیالی میں پڑے تھے۔ "پیجئے نا۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"بی بی ۔ بی بی ۔ بی بی۔" کتنی ہی بار وہ بڑبڑایا۔ جیسے اس لفظ کے ساتھ اس کا نطق اس کی زبان کے بوسے لے رہا ہو۔ اسی لذت میں سرشار وہ بڑبڑائے گیا۔ صاحباں کیا کہہ رہی تھی اس نے کچھ بھی نہیں سنا۔

"بی بی۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی اپنی ماں کو بی بی کہا کرتا تھا۔ بی بی۔ کتنا اچھا لفظ ہے۔ کتنا پیارا۔"

اس کی آواز بھرا رہی تھی اور آنکھیں آبگوں تھیں۔ وہ جلدی سے پیالی پر جھک گیا جیسے صاحباں نے دیکھ لیا تو ان موتیوں کی آب کم ہو جائے گی۔

"آپ جلدی چائے ختم کیجیے میں اتنی دیر میں آپ کے کھانے کا کچھ بندوبست کر دوں۔"

صاحباں نے اس وقت اسے اکیلا چھوڑ دینا بہتر سمجھا۔ اور حارث نے بھی اسے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا مگر، کھانے کا تکلف کرنے سے منع کیا نہ روکا۔ وہ اس وقت اس حالت میں بھی نہیں تھا۔

مرغی پکی ہوئی تو صاحباں پہلے ہی لے کر آئی تھی۔ اس کے کھانے کے پورے پورے انتظام کے لیے اب مسئلہ ساتھ روٹی یا چاولوں کا تھا جس کے ساتھ اس نے کھانا تھا۔

اس کے باورچی خانے میں کچھ کر لیتی لیکن وقت لگتا اور اپنے گھر میں تو ہر چیز تیار مل سکتی۔ دوپہر ہونے والی تھی، ایک ڈیڑھ بجے ان کے گھر کھانا تیار ہو جایا کرتا تھا۔

تیزی سے گھر کی طرف بھاگی۔ دل ہی دل میں خوش بھی بہت تھی کہ آج تو بی بی کی محنت ٹھکانے لگی۔ ورنہ پچھلی تیز چیزوں کا جو حشر ہوا ان کا دُکھ ہی سینے پر لے گئی تھی۔

بی بی حسب معمول برآمدے میں ہی مل گئیں۔

"بی بی! آج چاول پکائے ہیں یا روٹیاں ؟"

جاتے ہی سانس لیے بنا بڑی عجلت سے پوچھا۔

"کیوں ... ؟"

"حارث کے لیے چاہئیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"آج اس نے کچھ بھی نہیں پکایا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔"

جلدی میں سچ ہی زبان سے نکل گیا۔ جو وہ کسی صورت بی بی کو بتانے کا ارادہ نہ رکھتی تھی۔

"ہائے۔" بی بی نے ایک دم ہی سینے پر ہاتھ دھر لیا اور آنکھوں سے بے طرح پریشانی عیاں ہونے لگی۔

"کیا ہوا اسے ؟"

"کچھ نہیں۔"

اور صاحباں کو بی بی کی حالت دیکھ کر ہی اپنی سچ بول دینے والی غلطی کا احساس ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" چہرے پر اک خوش گوار اور شوخ سی مسکراہٹ لے آئی۔

"مجھے لگتا ہے طبیعت کی خرابی کا تو انہوں نے بہانہ ہی بنایا ہے۔ ادھر سے کچھ نہ کچھ مل جو جاتا ہے اس لیے کاہل ہو گیا ہوگا۔"

"سچ کہہ رہی ہو ؟"

بی بی نے یقین بے یقینی کے عالم میں اسے گھورا۔ صاحباں نے اپنے چہرے کو اس طرح ہشاش بشاش بنائے رکھا جیسے واقعی کوئی بات نہ تھی۔

"ہاں بی بی! مجھے تو کچھ ایسی طبیعت خراب نہیں دکھائی دی جتنا وہ پوز کر رہے تھے۔ بس ذرا زکام سا تھا۔ تو وہ تو ایسی پریشانی والی بات نہیں نا۔"

"دفتر بھی تو نہیں گیا آج۔"

"یہ صرف چھٹی مارنے کا بہانہ۔ بالکل بچوں ایسی طبیعت ہے۔"

وہ بڑے زور سے ہنسی۔

"آپ بتایا کرتی تھیں نا کہ بچپن میں بھی جب ان کا سکول جانے کا موڈ نہیں ہوا کرتا تھا تو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیا کرتے تھے۔"

"ہاں۔" بی بی مسکرانے لگی۔

"اس وقت تو مجھ سے خاطریں کروانے کو ایسا ڈھونگ رچایا جاتا تھا۔"

"اب بھی ایسا ہی ڈھونگ سمجھئے۔ پکی پکائی مرغی مل گئی ہے اب روٹیوں وغیرہ کے لیے کون تردد کرے۔ میں نے بھی سوچا چلو کیا یاد کریں گے کہ کیسے سخی ہمسایوں سے پالا پڑا ہے۔ ادھر ہی سے لے جاؤں۔"

"اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا۔" بی بی بے حد مسرور ہو اٹھیں۔

"میں کس لیے ہوں ؟ اس کی خاطر دو روٹیاں ڈال دوں گی تو کیا میرے ہاتھ گھس جائیں گے۔"

"کیا پکی ہوئی نہیں ہیں ؟" صاحباں بڑی عجلت میں تھی۔ جلد از جلد اس فاقہ زدہ کے پیٹ میں کچھ جانا چاہیے تھا۔

"سنز جانہ سے میں نے ہی کہا تھا کہ تمہارا انتظار کر کے پکائے۔ پہلے پکا چھوڑیں تو ٹھنڈی ہو جائیں گی اور تم توے سے اتری پسند کرتی ہو۔"

"سنز جانہ ہے کہاں ؟" صاحباں نے اندر جاتے ہوئے ادھر ادھر متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔

"کیوں ؟" بی بی اس کے ساتھ ساتھ اندر آ گئی تھیں۔

"اسے کیوں پوچھ رہی ہو ؟"

"ذرا جلدی سے دو پھلکے ڈال دے نا۔"

"وہ کیوں ؟" بی بی قدرے تنک کر بولیں۔

"میں خود پکاؤں گی۔ اپنے بیٹے کے لیے۔ خود اپنے ہاتھوں سے۔"

بی بی تیزی سے باورچی خانے میں گھس گئیں۔ صاحباں بھی۔ ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کہیں واقعی اس کی طبیعت تو خراب نہیں ؟"

بی بی کی مامتا کچھ بے چین سی تھی۔ حالانکہ صاحباں نے اپنے بولے گئے سچ کو جھوٹ میں بدلنے کی بڑی کامیاب اداکاری کی تھی مگر ماں کا دل۔ وہ مان گئی کہ اس سے بڑی حقیقت اور سچائی اور کوئی نہ تھی مگر۔ اس نے پھر اس دل کو بہلانے کے لیے جھوٹ سچ تسلی دلاسے دینا شروع کر دیئے۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں اور میری بات کا اعتبار کریں حارث ٹھیک ٹھاک ہیں بس ذرا تھوڑا سا زکام ضرور ہے۔"

"پھر اسے کہنا سو بیماریوں کی جڑ یہ زکام ہوتا ہے۔ احتیاط برتے۔"

بی بی جتنی تیزی سے روٹی پکا رہی تھیں اتنی ہی تیزی سے حارث کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کے بعد نصیحتیں بھی کیے جا رہی تھیں۔

"کھلی ہوا میں نہ نکلے۔ بہت ٹھنڈا پانی نہ پیئے۔ اور..."

اور بی بی جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ دوسری روٹی توے سے اترتے ہی صاحباں نے جھٹ نیپکن میں لپیٹیں ....

... اور بغیر کسی پلیٹ یا طشتری میں رکھے ہاتھ میں ہی دبوچے بڑی تیزی سے پلٹ کر حارث کے گھر بھاگ گئی۔

کمرے کے کواڑ اسی طرح آدھے کھلے تھے۔ میز پر اسی طرح مرغی والی ڈش پڑی تھی۔ سب کچھ لے کر سیدھی اس کے باورچی خانے میں جا پہنچی۔

حد ہی تھی نا۔ اس کے باورچی خانے میں کوئی طشت، سینی یا ٹرے بھی نہ تھا جس میں وہ کھانا لگا کر اس کے پاس لے جاتی ایک ہاتھ میں ایک ایک چیز تھام کر لے جانے اور جاہلوں اور گنواروں کی طرح اسے کھانا پیش کرنا صاحباں کو اچھا نہ لگا... پھر کیا کرے ... ؟

وہ وہیں کھڑے کھڑے سوچنے لگی۔ یہ یاد ہی نہ رہا کہ حارث نے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ سوائے چائے کی اس ایک پیالی کے اور اس دورے کی وجہ سے اسے نقاہت بھی اتنی ہو گئی تھی کہ مزید دیر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

"ارے ہاں..."

کئی منٹ سوچنے کے بعد اسے ایکا ایک یاد آگیا۔ ابھی ابھی صوفے کے درمیان والی میز کے نیچے اس نے ڈرائنگ کرنے والا ایک بورڈ دیکھا تھا۔ ٹرے جتنے سائز والا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ اب ذرا سلیقے اور نفاست سے تو اسے کھانا پیش کروں گی۔ شاید اسی طرح اس جاہل گنوار کو کچھ عقل آ جائے۔"

مسکراتے ہوئے چٹکی بجائی اور جلدی سے جاکر وہ بورڈ اٹھا لائی۔ پھر اس پر بڑے سلیقے سے کھانا لگایا۔ ڈش رکھی، پلیٹ میں پھلکے رکھے۔ اک خالی پلیٹ اور چمچ رکھا اور حارث کے پاس لے آئی۔ چائے پی کر وہ تو پھر کمبل میں گھس چکا تھا۔

"حارث صاحب! اٹھیے، کھانا کھا لیجئے۔"

وہ شاید جاگ ہی رہا تھا۔ صاجاں کی مدھم آواز پر جلدی سے کمبل چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کھانے کو اتنا دل تو نہیں چاہ رہا مگر جبکہ آپ لے آئی ہیں تو اس کی قدر تو ضرور کروں گا۔ خواہ ایک دو نوالے ہی سہی۔" متشکرانہ نگاہوں سے صاجاں کو دیکھتا ہوئے وہ تھوڑا سا مسکرا کر بڑبڑایا۔

اس کے منہ سے صاجاں نے پہلی بار پُراخلاق اور خوش مزاج لہجے میں بات سُنی تھی، خاصی خوشی ہوئی۔

"ارے، یہ آپ نے میرے ڈرائنگ بورڈ کا ٹرے بنا لیا!"

"تو پھر میں اور کیا کرتی!"

"کہیں خراب نہ ہو جائے۔"

"تمیز سے کھائیں گے تو نہیں ہوگا۔"

تھا تو طنز مگر خوش گوار لہجے میں کہا گیا تھا۔ حارث نے مسکراتے ہوئے صاجاں کے چہرے کو بھرپور نگاہ سے دیکھا۔

"لیکن ایک بدتمیز کے پاس تمیز کا کیا کام؟ وہ کہاں سے آئے گی؟"

"جہاں سے بات کرنے کے لئے آئی ہے وہیں سے کھانے کے لئے بھی آجائے گی۔"

صاجاں نے ہنستے ہوئے خود اپنے ہاتھوں سے پلیٹ میں سالن نکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔

"چلئے اب پوری بے تکلفی سے خوب پیٹ بھر کر کھا لیجئے۔"

"ارے" پلیٹ کی طرف دیکھ کر وہ ایک دم چونکا۔

"آپ تو سچ مچ اپنی مرغی اڑا لائی ہیں، اب خود کیا کھائیں گی؟"

"صاف ظاہر ہے، غم۔" صاجاں مسکرائی۔

"غم؟" حارث نے گھبرا کر بے قرار ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسا غم؟ کیا غم ہے آپ کو؟"

"یہی مرغی کا غم، جو میرے نصیب میں نہیں ہوئی اور آپ کھا رہے ہیں۔"

صاجاں نے ایک بڑا خوبصورت اور مترنم سا قہقہہ لگایا۔

"خدانخواستہ مجھے کوئی اور غم کیوں ہو!"

"اوہ، میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔"

"کیوں؟"

"آپ کے منہ سے غم کا نام سن کر۔" وہ ہولے سے بولا۔

"غم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے، بہت! زندگی کو اس کی لذتوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے اور پھر انسان کے پاس کچھ بھی باقی رہ جاتا۔ پروردگار آپ کو اس کے سائے تک سے محفوظ رکھے۔"

بے حد خلوص بھرے انداز میں وہ اس کے لئے دعا کر رہا تھا۔

صاجاں اک نمایاں سی حیرت اور اچنبھے کے ساتھ اُسے دیکھتی چلی گئی۔

"آپ واقعی عجیب انسان ہیں!"

"اس میں عجیب کی کیا بات ہے۔"

"عجیب ہی ہوئے نا۔ کبھی تو سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور کبھی... اک انہونے سے خدشے کے تحت پریشان ہو کر دعائیں دیئے جا رہے ہیں۔"

"...انسان ہوں نا۔"

"اس وقت بھی انسان ہی تھے نا جب ایک تحفہ لانے والے پُرخلوص انسان کو دھتکار آئے تھے۔"

"وہ نہیں... ایسا مت کہیے، دھتکارا نہیں تھا۔ دراصل میں کسی سے میل جول قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس انکار کی یہی وجہ تھی۔"

"لیکن کیوں؟"

"بس، سمجھ لیجئے کوئی بات ہی ایسی ہے۔ اُمید ہے آپ کرید نہیں کریں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے میں کریدتی نہیں، لیکن یہ تو آپ بھی مانیں گے کہ میل جول کام ہی آتا ہے۔ تکلیف نہیں دیتا اور نہ ہی کچھ بگاڑتا ہے۔"

"ہاں یہ تو تحریر... گیا۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ۔"

...بڑے ...ل انداز میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہا تھا۔ صاجاں پرے کھڑکی کے پاس والی کرسی ...اپنی دلکش و پُرکشش ہنسی لئے بیٹھی مسکرا مسکرا اُسے دیکھ رہی تھی۔

"مرغی بڑے مزے کی ہے۔ آپ نے بنائی ہے؟"

"جی نہیں، میری بی بی نے۔"

"اور میری بی بی بھی ایسی ہی بنایا کرتی تھیں۔"

"آپ کی بی بی کہاں ہے؟ آپ کیسی تنہا سی زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی بی بی کو اپنے پاس لے آیئے نا۔"

"میری بی بی... میری بی بی۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"وہ... وہ تو مجھ سے بچھڑ گئیں، شاید... شاید ہمیشہ کے لئے۔"

اور پھر جانے کیا ہوا۔ کل کی طرح کوئی غصے والی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ صاجاں نے کوئی طعن طنز بھی نہیں کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بالکل کچھ نہیں۔

لیکن اس کی پھر وہی حالت ہوگئی۔ سارا وجود لرزنے لگا۔ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ سانس اسی طرح خُرخُر کی آواز کے ساتھ آنے لگا اور آنکھیں ...ہوتے ہوتے اس نے جلدی سے تکئے پر سر ڈال دیا۔

"اوہ!" صاجاں گھبرا گھبرا کر اُسے دیکھنے لگی۔ "یہ کیا ہو گیا۔"

اور پھر بے گناہ بیچاری خود کو ہی قصوروار ٹھہرا کر کوسنے لگی۔ کیسی احمق اور بے وقوف تھی وہ، اُسے کھانا تو اچھی طرح کھا لینے دیتی۔ ...وں بھلا اس سے باتیں کرنے بیٹھ گئی۔

"صاجاں، جانے تجھے زندگی میں کب عقل آئے گی۔"

"پانی... پانی۔"

حارث نے اسی طرح دونوں ہاتھوں سے گلے کو مسلتے ہوئے جیسے بڑی مشکل سے حلق سے آواز نکالی۔

وہ سہمی ہوئی سی بیٹھی اس کی حالت کو بڑے افسوس اور پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔ حارث کی گھٹی گھٹی سی پانی کی صدا کان میں اُتری ...ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے پاس لپک آئی۔

"یہ لیجئے، یہ پانی۔"

جلدی سے میز پر سے پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ بند آنکھوں سے ہی ٹٹولتے ہوئے اس نے لرزتے ہاتھ میں ...س تو تھام لیا لیکن صرف چند گھونٹ ہی پی سکا۔

"آپ... آپ اب جایئے۔"

گلاس صاجاں کو واپس دے کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اس نے پھر تکئے پر سر ڈال دیا۔ صاجاں نے دیکھا اس کے چہرے ...وہی ہر انسان سے نفرت کرنے والے سائے پھیل رہے تھے اور کشادہ پیشانی پر وہی بدمزاجی کی سلوٹیں۔

"بس چلی جایئے نا۔"

صاجاں نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ چپکے سے سارا کچھ سمیٹ کر ٹرے اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

کل کی طرح اس دورے کے بعد آج بھی اُسے چائے کی ضرورت ہوگی۔ صاجاں کی عقل نے اُسے سمجھایا۔ وہ جلدی جلدی چائے ...نے لگی۔

پانی کھولنے کے لئے رکھنے کے بعد ایک ذمہ دار گھر گرہستن کی طرح ساتھ ساتھ باورچی خانے کو کچھ درست کیا۔ بکھرے برتن سمیٹے،

دھونے والے دھوبی، بے ترتیبی اور گندگی اُسے پسند نہ تھی اور حارث کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ شاید کئی دن تک وہ باورچی خانے کا رُخ نہ کرسکتا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر کے چائے کی گرما گرم پیالی لئے واپس کمرے میں آئی تو وہ اسی طرح تکیے پر نڈھال سا پڑا تھا۔ پیشانی پسینے سے تر تھی اور بند آنکھوں سے پانی بہہ بہہ کر کنپٹیوں پر سے ہوتا ہوا تکیے کو بھگو رہا تھا۔

صاجاں اس کی کچھ بھی نہیں تھی۔ بی بی کے ناطے جو ایک تعلق قائم ہوا تھا وہ اس کی بدمزاجی اور بدسلوکی نے توڑ دیا تھا مگر اس کی کیفیت، اس کی حالت دیکھ کر اس کے ساتھ آپ ہی آپ ہمدردی کے کئی رشتے استوار ہو گئے۔

پیالی میز پر رکھ کر صاجاں اس کے پلنگ پر اس کے تکیے کے پاس ہی بیٹھ گئی اور اپنے بے حد قیمتی دوپٹے کے پلو سے پیشانی اور اس کا چہرہ صاف کرنے لگی۔

"کون؟" حارث نے آنکھیں میچے میچے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

"میں صاجاں ہوں حارث اور آپ کے لئے چائے لائی ہوں۔"

"اوہ، چائے۔"

اس نے جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر شاید نقاہت کی وجہ سے اُٹھا نہیں گیا۔ اُس نے اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑے کپکپاتا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"ہاں ہاں ... میں پیوں گا، جلدی سے دو۔"

جیسے کوئی اندھا خیرات مانگے ... بڑھتے ہوئے ہاتھ کا یہی انداز تھا۔ صاجاں کی خوبصورت آنکھیں بے اختیار چھلک گئیں۔ وہ تو اچھا تھا کہ حارث کی آنکھیں بند تھیں۔ جلدی سے آنسو صاف کر کے صاجاں نے میز پر سے پیالی اٹھالی۔

"میں آپ کو پلاتی ہوں۔"

اس کا لرزتا ہاتھ پرے ہٹا کر صاجاں نے اسے سہارا دیتے ہوئے تھوڑا سا اونچا کیا اور چائے کی پیالی اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دی۔ وہ خود پکڑ کر پیتا تو یقیناً اس نے اپنے اوپر گرا لینی تھی اس وقت اس کا پورا وجود ہی کچھ اس طرح کپکپا رہا تھا۔ چائے گرم تھی مگر وہ ایک ہی سانس میں ساری پیالی پی گیا۔

"ایک پیالی اور مل سکتی ہے؟" وہ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بڑی منت سے بولا۔

"کیوں نہیں، ایک چھوڑ دو مل سکتی ہیں، تین مل سکتی ہیں۔"

"تو پھر آپ جتنی دے سکتی ہیں دے دیں۔"

"مگر زیادہ چائے نقصان دہ ہوتی ہے۔"

"زہر زہر کو کاٹتا ہے۔ میری اس تکلیف۔"

"اوہ اچھا۔" صاجاں اس کی پوری بات سُنے بنا ہی سمجھ گئی تھی۔ جلدی سے اس کا سر تکیے پر ڈالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "بس دو منٹ میں لائی۔"

اور وہ جلدی سے اور چائے لینے کے لئے باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔ دوبارہ چائے لئے واپس آئی تو حارث آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑا تھا۔

اس کی کشادہ پیشانی پر اس کے سیاہ بال بے ترتیبی سے بکھرے تھے۔ اس کا کھلتا ہوا گندمی رنگ زرد ہو کر پہلے کی نسبت کافی پُرکشش لگ رہا تھا۔ بھرے بھرے نیم وا ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ انہیں ہونٹوں پر جہاں سے تلخ کلامی کی مے چھلکا کرتی تھی۔ واقعی بی بی درست کہتی تھیں۔ اچھے حالات میں حارث خاصا وجیہہ انسان رہا ہوگا۔ مگر اب تو اس کی بدمزاجی اور بداخلاقی نے اس کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہوئی تھی۔

صاجاں کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی لیکن وہ سب کچھ بھول بھال کھڑی بغور اسے تکے جا رہی تھی۔

"چائے۔"

حارث کے ہونٹوں سے صدا نکلی تو صاجاں اپنے خیالات سے چونک اُٹھی۔

"یہ ہے، میں لے آئی ہوں۔"

وہ جلدی سے پھر حارث کو سہارا دینے کے لئے آگے بڑھی۔

"نہیں۔" حارث نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب میں خود پی سکتا ہوں۔"

اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے پیالی صاجاں کے ہاتھ سے لے لی۔

"آپ کی ہمدردی نے میرے دورے کی شدت اور بروقت مل جانے والی چائے کی اس امداد نے اس کی مدت کو کافی کم کر دیا ہے ورنہ پہلے تو۔"

بات اُدھوری چھوڑتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا۔ جیسے اپنی وہ حالت بیان کر کے صاجاں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جُھک کر چائے کی پیالی کے ساتھ ہونٹ لگا دیئے۔ اوپر تلے تین چار گھونٹ بھرنے کے بعد پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

"اسی سے جو آج ہی آپ کو ملی ہے۔" صاجاں خوش اخلاقی سے بولی۔

"کیا مطلب؟" حارث سمجھ نہ سکا۔

"مطلب یہ کہ اخلاق والی، مروت والی، لحاظ والی، ورنہ پچھلے دنوں تو آپ کی زبان کافی بدزبان تھی۔"

"اوہ!" حارث زور سے ہنس پڑا۔

"اس زبان کی بدزبانیوں کی معافی مانگتا ہوں۔" قدرے خفیف سا ہوتے ہوئے اس کے خوش مزاج چہرے کو دیکھنے لگا۔

"میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"خدا آپ کو آپ کے اس ارادے پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

صاجاں اسی خوش دلی اور شوخی سے بولی۔ حارث کی طبیعت ابھی اتنی نہیں سنبھلی تھی کہ کوئی سنجیدہ بات کرتا۔

"ہاں، آپ کی یہ دعا میرے لئے ایک نیکی ہے۔ پوری ہو گئی تو عاقبت سنور جائے گی، شکریہ۔"

"اچھا جی، اب مجھے اجازت دیجئے۔"

باتیں کرنے کو تو وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرسکتی تھی لیکن ایکدم بی بی کا خیال آ گیا۔ اس وقت تک کھڑی ہوں گی کھڑکی میں ... وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اتنی جلد آپ جا رہی ہیں؟ کچھ دیر تو اور بیٹھئے۔"

صاجاں کے ارادے کو دیکھتے ہی حارث عجب سی بے قراری کے ساتھ بولا۔

"اتنی جلد؟ یہ اتنی جلد ہے؟"

صاجاں نے تعجب سے اس کی خود پر گڑی نگاہوں کو دیکھا۔

"معلوم بھی ہے کیا وقت ہو گیا۔ میری بی بی تو کھانے پر میرا انتظار کرتے کرتے اور بوڑھی ہو گئی ہوں گی۔"

"اوہ!" چپ اور اُداس ہوتے ہوئے اس نے گردن جھکالی۔

"کوئی کام ہے؟" صاجاں نے اس کی خاموشی سے یہی مطلب اخذ کیا۔

"اگر واقعی کوئی کام ہے تو بے تکلفی سے بتا دیجئے، کر کے جاؤں گی۔" حارث کے لئے فضا خوش گوار کرنے کی خاطر وہ زور سے ہنس کر بولی۔

"بی بی کے دو تین بال ہی اور سفید ہو جائیں گے نا۔ کوئی بات نہیں میری بی بی بڑے حوصلے والی ہیں۔"

اس کی بات پر اور اس کی ہنسی کا ساتھ دینے کے لئے حارث بھی مسکرا پڑا۔ مگر صاجاں کی حساس نگاہ نے دیکھا کافی پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ "بتایئے نا، کوئی پرابلم ہے؟"

"بس ذرا۔" وہ ہچکچا کر پھر خاموش ہو گیا۔

"کیا بس ذرا؟"

"کچھ نہیں۔" چائے ختم کر کے حارث نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"پھر بھی۔" صاجاں اصرار کئے گئی۔

"آپ کچھ کہتے کہتے رک گئے ہیں۔"

جانے کیسی اشد ضرورت تھی اسے مگر تکلف کئے جا رہا تھا اور بے وقوف اس کے خلوص کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ واقعی وہ دل سے اس کے کام آنا چاہتی تھی۔ بی بی کے تعلق یا ناطے کے بغیر، اپنے ہمدردی بھرے دل سے۔

"آپ بتا بھی دیجئے نا۔ مجھ سے تکلف کیا تو میں کل سے نہیں آؤں گی۔"

اور صاجاں کی یہ دھمکی اثر کر گئی۔

"وہ، میں کہہ رہا تھا کہ ایسے دورے کے بعد دو تین دن تک میں اُٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔"

"وہ تو آپ کی حالت ہی بتا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

"اُٹھنے کے قابل نہیں رہتا تو پھر اتنے دن کھانا بھی نہیں کھاتا یوں نقاہت زیادہ ہو جاتی ہے۔"

"تو کیوں نہیں کھاتے، کھایا کیجئے نا!"

صاجاں نے بڑے گُر کی بات اُسے بتائی تھی۔ حارث زور سے ہنس پڑا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہنسی صاجاں نے پہلی بار غور سے دیکھی تھی۔ ارے، وہ تو ہنستا ہوا بے حد اچھا لگتا تھا۔ بے حد پُرکشش اور یہ اعتراف کرنے میں اسے ذرا عذر نہ ہوا کہ اس نے آج تک کسی مرد کے چہرے پر پھیلنے والی ہنسی کو اتنا خوبصورت ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ بلا تکلف اس کے ہنستے چہرے پر نظریں گاڑے اُسے دیکھتی رہی۔

"خوب کہی آپ نے بھی۔"

ہنستے ہنستے تھوڑا سا بےدم ہو کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد اک ہلکے سے تبسم کے ساتھ اسے سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔

"جب اُٹھا نہیں جائے گا تو کھانے دانے کا کیسے بندوبست کروں گا۔ اسی لئے تو فاقے سے پڑا رہتا ہوں۔"

"اوہ!" پہلے صاجاں اپنی ناسمجھی پر تھوڑا سا نادم ہوئی پھر اُسے حارث پر بے تحاشا ترس آنے لگا۔

ہائے بیچارہ، اپنے سب کے ہوتے ہوئے کیسی کس مپرسی کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ کاش! وہ اس کے لئے بہت کچھ کر سکتی۔

"میں شام کو آپ کا کھانا لے کر آؤں گی۔" فی الحال وہ یہی پیش کش کر سکی۔

"نہیں نہیں، میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔ بخدا آپ کو اپنی حالت بتا کر کھانا مانگنا میرا مقصد ہرگز نہیں تھا۔"

وہ بڑبڑا کر، گھبرا کر کہنے لگا۔

"میں نے تو صرف اس لئے اپنا حال بیان کیا تھا کہ اسی طرح دن میں ایک آدھ چکر یہاں کا لگا جایا کیجئے۔ کسی سے دو باتیں کر لینے سے بھی بیماری یا دُکھ آدھا رہ جاتا ہے۔"

"شکر ہے آپ کو میرا اتنا فائدہ تو نظر آیا۔"

"فائدے تو بہت نظر آ رہے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرا پڑا۔

"اچھا اچھا۔" وہ اس کی مسکراہٹ اور اس کے انداز کو نظر انداز کر گئی۔ "باقی باتیں شام کو، میں کھانا لے کر آؤں گی۔"

"نہیں نہیں، کھانا نہیں۔"

"کیوں کھانا کیوں نہیں؟ آں۔" وہ اس کے قریب آ کر بے تکلفی بھرے رُعب سے بولی۔

"پھر فاقہ کرنا ہے؟ دیکھئے جناب حارث صاحب، میرے خلوص کے مقابلے میں اب اگر آپ نے بے جا مداخلت اور ویسی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا تو انجام اچھا نہ ہو گا۔"

صاجاں کے لہجے اور انداز میں کیا کچھ نہ تھا، بے تکلفی، خلوص، اپنائیت، مان، اعتماد، حارث خاموش سا ہو کر رہ گیا۔ اک اس کا وجود ہی ایسا تھا کہ اسے دیکھتے ہی سرخم ہو جاتا تھا اوپر سے یہ خلوص و اپنائیت بھرا لہجہ اور انداز، کسی بھی بات سے انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

پہلے دو تین ملاقاتوں میں جو اس نے بے رخی اور بدمزاجی برتی تھی وہ بھی شاید اس طرح سب کچھ ہو گیا کہ اس نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا نہ تھا۔ اس کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ ورنہ وہ اس وقت بھی یقیناً یہ سب نہ کر پاتا۔

"مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کو ہنسنا بھی آتا ہے اور آپ کی ہنسی بے حد خوبصورت ہوتی ہے۔ میں تو خواہ مخواہ ہی آپ کی بداخلاقی سے ڈر گئی تھی جو آپ نے بجانے کیوں خود پر طاری کی ہوئی تھی۔" صاجاں ہنستے ہوئے پیالی میز پر سے اُٹھا کر باورچی خانے میں رکھنے کے لئے چل دی۔

حارث چپ بیٹھا، اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ عجیب لڑکی تھی یا شاید خدا کا بھیجا ہوا کوئی رحمت کا فرشتہ!

ایک منٹ بعد وہ واپس کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا اک گلاس تھا۔ میز پر ڈھک کر رکھنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اب آپ آرام کیجئے، مکمل آرام، پیاس وغیرہ لگے تو یہ پانی موجود ہے۔ اٹھنا بالکل نہیں، سمجھے۔"

مسکراتے ہوئے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے حارث نے سر ہلا دیا۔

"اب میں رات کو آؤں گی۔ آپ کا کھانا لے کر۔"

"لیکن آپ، اتنی تکلیف۔"

اس نے صاجاں کے نازک سراپا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"مجھے بہت شرم۔"

"بس۔" صاجاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس موضوع پر اب مزید کوئی بات نہیں ہو گی۔"

"لیکن بات تو سُنئے۔"

"بس، بس۔ خدا حافظ۔"

اور صاجاں اس کی سُنے بغیر ہاتھ ہلاتے ہوئے چل دی۔

"لیکن ایک ضروری بات۔"

کمرے سے نکلتے نکلتے حارث کی آواز پھر سماعت سے ٹکرائی۔ جانے کیا ضروری بات تھی؟ سُننے کے لئے وہیں رُک کر اُس نے گردن موڑ دی۔

"فرمایئے۔"

"آپ کھانے والی زبردستی کرنے پر تُل ہی گئی ہیں تو یہ خیال ذہن میں ضرور رکھیے گا کہ میں اس کیفیت میں بالکل سادہ خوراک کھایا کرتا ہوں۔"

"مثلاً۔"

"یہی پتلا سا شوربہ اور پھُلکا وغیرہ۔"

"ٹھیک، یہ خیال رکھوں گی اور ایک بار پھر خدا حافظ۔"

اور وہ تیزی سے نکلی چلی گئی۔ اُسے گئے جانے کتنے منٹ گزر گئے تھے۔ حارث اسی طرح بیٹھا احمقوں کی طرح کھلے دروازے کو دیکھے جا رہا تھا۔

پھر وہ خفیف سا ہو کر، مسکرا کر جلدی سے کمبل تان کر لیٹ گیا۔ صاجاں کا حکم تھا کہ مکمل آرام کرے۔

☆☆

کھانے کے دوران صاجاں نے معمول کے مطابق کافی محتاط انداز میں بی بی کے سوالات کے جوابات دیئے۔

"حارث اب بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ ذرا فکر نہ کریں۔ بس ذرا ایک دو دن آرام کرنے کا موڈ بنا لیا ہے۔"

"صحت کے لئے آرام بھی تو بہت ضروری ہے۔ اچھا کرے گا۔ محنت بھی تو بہت کرنے کا عادی ہے۔ اپنی ہستی سے بڑھ کر۔"

"اور اب تو ایسا آرام کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دو دن کھانے وغیرہ کا بھی فکر نہ سر پہ سوار ہو۔ ان کا موڈ دیکھ کر میں اُنہیں رات کے کھانے کا کہہ آئی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" بی بی کے لبوں پر مسرور سی مسکراہٹ دوڑ اٹھی۔

"رات کو بھی ان کا کھانا ہمارے ہاں سے جائے گا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر اُٹھتے اُٹھتے صاجاں نے آخری فقرہ کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی وہ بی بی کے سوالات سے بچنا چاہتی تھی۔ ایسے کرید کرید کر، اتنی تفصیل سے پوچھتی تھیں اور جواب کی طلب گار ہوتی تھیں کہ پھر صاجاں کو ایک ایک جواب کی خاطر کئی کئی جھوٹ گھڑنا پڑتے تھے۔

اور آج ... آج تو اس کا ذہن پہلے ہی بہت اُلجھا ہوا تھا۔ وہ تو کھانا بھی اچھی طرح نہیں کھا سکی تھی۔

اس کی وجہ حارث کو بار بار پڑنے والے یہ دورے تھے۔ جانے یہ کیا مرض اُسے لگ گیا تھا اور کیوں بار بار اس شدت سے اس پر حملہ کرتا تھا۔

اُسے اس پر بے حد ترس آ رہا تھا۔ اسے بی بی پر بھی ترس آ رہا تھا۔ ماں بیٹا ایک دوسرے کی جدائی میں کیسے دیوانے اور روگی سے بن گئے تھے۔

بی بی کی دیوانگی تو مستند تھی۔ ان کے ہر فعل، ہر عمل سے عیاں ہو رہا تھا کہ بیٹے کی جدائی نے اُن کا یہ حال کر دیا تھا۔ مگر حارث؟ اُس کے دوروں کا اُسے ابھی کچھ یقین نہیں تھا کہ وہ وجہ کیا تھی؟ شاید بچپن ہی سے اُسے یہ روگ تھا یا پھر باپ سے جھگڑے کے بعد لگا یا ماں کی جدائی نے اس حال کو پہنچا دیا۔

کوئی بھی تو نتیجہ اخذ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ بے حد اُلجھی ہوئی تھی۔

حارث یقیناً جانتا تھا مگر اُسے کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ آخر وہ اس کی کون تھی جس پر دل کے بھید کھول دیتا۔

اور صاجاں کو اسے مجبور کر کے پوچھنا بھی مناسب نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اتنی مشکل سے، اتنے دنوں کی ریاضت کے بعد اب اس سے ذرا ڈھنگ سے بات کرنے لگا تھا۔ ایک دم اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیتی تو اسے ڈر تھا کہ وہ پھر اپنی اسی طرف لوٹ جاتا۔

واقعی اس سے کچھ بعید بھی تو نہ تھا۔ خصلت سے خاصا بدمزاج، بدزبان اور بدلحاظ تھا۔ یہ آج کل جو ذرا بدلا تھا تو اپنی بیماری اور ا کے بے حد نرم رویے کی وجہ سے، ورنہ بنیادی طور پر جو وہ تھا وہی تھا۔ باتوں باتوں میں کیسے اسے کہہ دیا تھا کہ اس کے ذاتی معاملات کرید نہ کرے۔

اور اب اگر وہ کرے گی تو اسے یقین تھا کہ اس کی بدلحاظی کے ہاتھوں منہ کی کھائے گی۔ پھر یوں اس کا سارا پلان دھرے کا رہ جائے گا۔ جو اُسے کسی صورت قبول نہ تھا۔

گو بی بی خود اس کے مقابلے میں بظاہر حارث کو اتنی اہمیت نہیں دیتی تھیں لیکن اس کے لئے ان کی بے تابیوں اور بے قراری ان کی دلی کیفیت دیاں ہو ہی رہی تھی۔ جسے صاجاں کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور اسی لئے حارث کی ہر قسم کی زیادتی بر کیے جا رہی تھی۔

کتنی ڈھیر ساری الجھنیں تھیں۔ ساری دوپہر دونوں ماں بیٹے کے متعلق سوچتے سوچتے گزر گئی۔ بی بی کے کمرے سے آتی ہوئی کی ٹن ٹن کی آواز نے پانچ پورے کیے تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔

آج نہ اس نے ظہر کی نماز ادا کی تھی اور نہ ابھی تک عصر کی۔ ان دونوں کے خیالوں میں ایسی غرق ہوئی کہ نماز کا بھی خیال نہ رہا۔

وہ دونوں ماں بیٹے اللہ میاں سے تو بڑے نہیں تھے کہ وہ انہیں کو سوچتے ہوئے خدا کو بھلا بیٹھی، بہت ڈھیر سارا خود کو کوسا۔ اللہ میاں سے معافیاں مانگتے ہوئے جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی۔

عصر کی نماز کا ابھی تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔ نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو پھر... پہلی سوچ دونوں ماں بیٹے ہی کی تھی۔

بعض اوقات دوا سے زیادہ دعا کام کر دیتی ہے۔ خالی خولی سوچوں اور ہمدردی سے بہتر تھا کہ وہ دعا والا ہی عملی قدم اٹھاتی۔ اس پوری دعا صرف ان دونوں کے لئے تھی۔ بی بی کے دل کے سکون کے لئے اور حارث کی صحت کے لئے۔

دل میں انسانیت اور ہمدردی کے جذبے کچھ اس طرح بیدار ہو کر جاگزیں ہوئے تھے کہ پوری حضوریٔ قلب کے ساتھ دعا مانگی۔ اتنا تھا کہ آنکھوں سے مالائیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔ دامن بھیگتا رہا مگر اُسے کچھ احساس نہ ہوا۔ البتہ دل کو اک سکون سا ضرور ملا۔

جانماز لپیٹ کر رکھ رہی تھی کہ خیال بی بی کی طرف چلا گیا۔ دوپہر کو اسے سوتے سے اکثر وہی جگایا کرتی تھیں مگر آج بی بی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ نجانے کہاں غائب تھیں۔

دوپہر گزر چکی تھی۔ وہ نماز سے بھی فارغ ہو چکی تھی۔ دعائیں بھی اتنی ڈھیر ساری مانگی تھیں کہ کافی وقت صرف ہوا ہوگا مگر بی بی دکھائی ہی نہیں دی تھیں۔ اسے بی بی دکھائی نہیں دی تھیں تو اس کا مطلب تھا خود بھی بی بی کو دکھائی نہیں دی تھی اور بی بی کا دعویٰ تھا کہ اسے دیکھے تھوڑی سی دیر بھی گزر جاتی تھی تو وہ بیکل ہو اٹھتی تھیں۔

بی بی کا یہ دعویٰ بڑا صحیح تھا۔ وہ کئی بار آزما چکی تھی۔ مگر آج... خیریت تو تھی؟

"بی بی... بی بی...!"

وہ پریشان سی ہو کر اک اک کمرے میں انہیں تلاش کرنے لگی۔

"آپ کہاں ہیں بی بی؟ کہاں چلی گئیں؟"

سارے کمرے دیکھ ڈالے وہ کہیں نہیں ملیں تو سرسری نگاہ سے باورچی خانے میں بھی دیکھ لیا۔ محض اپنی تسلی کی خاطر ورنہ اس وہاں ان کا کوئی کام نہ تھا۔

"ارے!" وہ باورچی خانے میں تھیں۔

"یہاں آپ کیا کر رہی ہیں؟"

وہ نہ صرف وہاں موجود تھیں بلکہ بے حد مصروف بھی تھیں۔

دعوت ہے کسی کی؟"

بی بی کلنگ رینج کے سارے چولھے جلائے اور ہر ایک پر کچھ نہ کچھ دھرے کھڑی تھیں۔

صاجاں پاس جا کر ایک ایک کا ڈھکنا اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگی۔

"آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں!"

بی بی اتنی مصروف تھیں کہ صاجاں کی بات کا جواب بھی نہ دے سکیں۔

"بی بی!" صاجاں نے دوبارہ پوچھا۔

"آج ہمارے ہاں کون آ رہا ہے؟"

"ہاں... [illegible] کیا پوچھ رہی ہو، کون آ رہا ہے؟"

"کوئی [illegible]"

"پھر یہ سب... یہ اتنا کچھ؟"

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ آج رات کا کھانا حارث کا یہاں سے جائے گا۔"

بی بی انتہائی معصوم انداز میں مسکرا پڑیں۔

"پانچ چھ سال بعد میرا بیٹا ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھانے والا ہے۔"

"دوپہر کو بھی تو یہیں سے گیا تھا۔"

"وہ تو اچانک والا معاملہ تھا اور اب مجھے باقاعدہ اطلاع مل چکی ہے۔ اب لاپرواہی کیسے کردوں۔ میرا تو جی چاہ رہا ہے دنیا کی ساری نعمتیں اکٹھی کر دوں۔"

"اوہ!" پہلا لمحہ صاجاں پر بی بی کے لئے رحم و ہمدردی کے جذبوں سے لبریز گزرا۔ مگر جب دوسرے لمحے ہوش آیا۔ حقیقت کا احساس ہوا تو وہ بے طرح گھبرا اٹھی۔

وہ تو بیمار تھا۔ اس نے تو سادہ سا شوربہ اور پھلکا کھانا تھا اور یہاں بی بی نے باقاعدہ دعوت کا سامان کر لیا تھا۔

بریانی، قورمہ، نرگسی کوفتے، شامی کباب اور میٹھے میں ٹرائفل، پوری صحت رکھنے اور بڑا مضبوط معدہ رکھنے والے انسانوں کے پکوان اور وہ بھی اتنی کثیر مقدار میں سب کچھ تھا جیسے وہ اکیلا ہی دس آدمیوں کے برابر کھانے والا تھا۔ ایک جن نما انسان!

گھبراہٹ کے مارے اُسے چکر سا آ گیا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر پرے کونے میں اسٹول پر جا بیٹھی، اب کیا کیا جائے؟

ان سب میں تو اس کے کھانے والی ایک چیز بھی نہ تھی اور وہ بی بی کو حقیقت سے باخبر بھی نہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ اتنا بیمار تھا اتنا کہ اس کا معدہ یہ سب قبول ہی نہیں کر سکتا تھا۔

اور بی بی کے ممتا بھرے جذبے اتنے شدید تھے کہ یہ اس کا اتنا بڑا مرض تو علیحدہ رہا اس کی ذرا سی ہی بیماری کے متعلق بھی سننے کی یقیناً وہ تاب نہ لا سکتی تھیں۔

ہائے! وہ کس امتحان میں پڑ گئی تھی؟ "صاجاں! بول صاجاں، اب کیا کرے گی؟" وہ بیٹھی سوچے جا رہی تھی اور پریشان ہوئی جا رہی تھی۔

"بی بی! آپ کو بتایا تھا ناں کہ انہیں ہلکا سا زکام ہے۔ اس کے علاوہ وہ کہتے تھے کہ جب دفتر سے چھٹی کر کے آرام کرتے ہیں تو بہت ہلکی غذا لیا کرتے ہیں۔"

"پہلے تو نہیں ایسا ہوتا تھا۔ جب چھٹی کرتا تھا تو مجھ سے اپنی پسند کی ایسی ایسی ہی چیزیں پکوا کر کھایا کرتا تھا۔ بچپن سے ہی خوش خوراک تھا۔"

"مگر اب بی بی! وقت کے ساتھ ان کی عادات بھی کافی بدل گئی ہیں۔ انہوں نے بڑی تاکید کی تھی کہ بالکل کوئی تکلف نہ کیا جائے۔ صرف سادہ شوربہ اور پھلکا بنا دیں۔ ساتھ دھمکی دی تھی کہ اس سے زیادہ کچھ ہوا تو۔ پھر وہ کبھی ہمارے ہاں سے کچھ نہیں کھائیں گے۔"

صاجاں بڑی مشکل سے کہہ رہی تھی۔ عقل سمجھ تو بی بی کو بے وقت باورچی خانے میں اور ساری دیگچیوں کے ڈھکنے کھول کر دیکھنے کے بعد ہی کافور ہو گئی تھی۔

"میں کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں بی بی۔ اس سادہ سے پھلکے اور شوربے کے لیے بھی بڑی مشکل سے مانے تھے ورنہ..."

"ورنہ کیا ہم اس کے لیے ابھی تک غیر ہی ہیں جو اتنے تکلف سے مانا۔"

بی بی کی آواز میں ہزاروں دکھ اور سینکڑوں آنسو تھے۔

"فی الحال بی بی! غیر ہی ہیں۔"

صاحباں جلدی سے ان کے قریب آتے ہوئے ان کی ڈھارس بندھانے لگی۔

"مگر بی بی! اسے اپنائیت کی پہلی کڑی بھی تو سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کے حساب سے وہ ہمارے کچھ نہیں مگر ہمارے گھر سے کھانا کھا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ ہمیں کوئی مقام ضرور دیتے ہیں۔"

"ہاں۔" بی بی جیسے سب کچھ پوری تفصیل سے سمجھ گئی تھیں۔

"یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ ہمارے درمیان چھ سالوں کی جدائی کی خلیج حائل ہے۔ اسے پاٹنے کے لیے اسے کرنے کے لیے وقت درکار ہوگا۔ کافی وقت۔"

وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی پرنم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

"بہت ناسمجھ ہوں میں... بہت..."

"نہیں بی بی! ایسا مت کہیئے۔ آپ اپنی مامتا، اپنے دل اور اپنے خون کے تعلق سے جو کچھ کر رہی ہیں وہ اپنی جگہ بالکل مناسب ہے۔ ناسمجھی کی تو کوئی بات نہیں۔"

صاحباں کے تسلی دلاسوں کی طرف انہوں نے توجہ ہی نہیں دی۔ اپنی ہی کہے گئیں۔

"دیکھو تو کیسی بیوقوفی کر بیٹھی ہوں۔"

بی بی ان ساری چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑبڑائیں۔ "ساری دوپہر کھڑے کھڑے گزار دی۔ کتنی تھک گئی ہو۔" ابھی ابھی بی بی بے حد تازہ دم دکھائی دے رہی تھیں اور اب یکایک ان کا لہجہ بھی ٹوٹ بکھر گیا تھا اور چہرے سے شدید تھکن کے آثار ہویدا ہونے لگے تھے۔

"اب ان سارے پکوانوں کو کیا کروں گی؟"

ہائے! کتنے ارمانوں اور چاؤ سے انہوں نے یہ سب کیا تھا۔ صاحباں نے ان کے یکایک ہی پژمردہ ہو جانے والے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس مامتا کی ماری ماں کی بوڑھی ہڈیوں کی محنت اکارت نہیں جانا چاہیے تھی۔

وہ ان کے چہرے کی جھریوں میں آہستہ آہستہ رواں ہوتے والی آنکھوں کی نمی کو بھی محسوس کر رہی تھی اور ان کا یہ حال کر اس کے اپنے آنسو اندر ہی اندر دل پہ ٹپکنا شروع ہو گئے تھے۔

حارث کی بیماری بہت بڑی مجبوری تھی ورنہ آج تو اس کے پاؤں پہ بھی گر کر یہ ہر چیز اسے کھلا دیتی۔ بی بی کی خاطر وہ ہر ذلیل و رسوا ہونے کو تیار تھی... مگر... اس کا خیال کرتی تھی تو تب بھی بے بس ہو جاتی تھی۔

ہاں، البتہ حارث کے علاوہ بی بی کی یہ ساری محنت اگر ان کی کسی اور عزیز ترین ہستی کے کام آجاتی تو... وہ اس قدر برداشتہ نہ ہو پاتیں۔ یقیناً انہیں کافی خوشی مل جاتی۔ حارث جتنی نہ سہی پھر بھی کچھ تو ازالہ ہو جاتا۔

"بڑی بے وقوفی ہوئی۔"

بی بی ابھی تک کھڑی ان سارے پکوانوں کو بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور افسوس کر رہی تھیں۔

صاحباں کی سوچ کا دھارا تیز ہو گیا۔

عزیز ترین ہستی۔ حارث کے بعد۔ ہاں ہاں۔ وہ خود صاحباں ہی تو تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا اور... یہ سات افراد کے لیے مکمل اور بہترین ضیافت کا انتظام تھا۔ اس کے نام کی کوئی بھی تقریب منائی جاسکتی تھی۔

"بہت ٹھیک۔ بہت مناسب۔" اپنی ہی اس سوچ نے اسے بے طرح مسرور کر ڈالا۔ مسرت سے لبریز آواز ایک دم چہک اٹھی۔

"کیوں بی بی۔ آپ اسے بیوقوفی کیوں کہہ رہی ہیں۔"

"تو اور کیا کہوں؟ بلا سوچے سمجھے جو اتنا کچھ پکا بیٹھی۔ ساری محنت فضول ہی گئی نا..."

"وہی تو کہہ رہی ہوں کہ فضول کیوں؟ بہت اچھا ہوا جو یہ سب کچھ کر لیا۔"

"کیا مطلب...؟"

"اپنی صاحباں کی سالگرہ کا دن بھول گئیں؟"

ٹوٹی پھوٹی بی بی کو سنبھالا دینے کے لیے اس سے بہتر اور کچھ بھی نہ گھڑا جاسکتا تھا۔

"آج؟" بی بی پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"صاحباں نے اپنے لہجے کو بھی اسی تقریب کے انداز سے مسرور بنا ڈالا۔

"تین چار دن ہوئے میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔"

"ارے سچ...؟"

صاحباں کی توقع کے مطابق ٹوٹی بکھری بی بی سچ مچ استوار ہو گئیں۔ پہلے سے بھی کچھ زیادہ مضبوط انداز میں۔

"پھر تو واقعی بہت اچھا ہوا۔ کبیر خاں۔ او کبیرے۔ اری او بشر جانہ۔ کہاں مر گئے دونوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں تھے۔" بی بی پر پہلے سے بھی زیادہ جوشیلی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ جھریوں میں پھیلنے والی نمی، مسرت کی شبنم بن کر چمکنے لگی۔ آنکھوں میں بڑی معصوم اور خوب صورت سی چمک لیے وہ اور بھی تیزی سے ہاتھ چلانے لگیں۔ ان کی مصروفیت اور بڑھ گئی...

"صاحباں! صاحباں ذرا ان دونوں کو بلانا۔"

"آخر کیا کہنا ہے؟"

"ہائے ہائے! گھر میں کام ہے اور وہ دونوں جانے کہاں گھسے بیٹھے ہیں۔ انہیں کچھ خبر ہی نہیں وقت تھوڑا ہے۔"

"مگر آپ اور کرنا کیا چاہتی ہیں؟"

صاحباں ان کی افراتفری بھری عجلت کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"کبیر خان کو بھیجوں گی ثمینہ، زرقا، عروسہ اور سعدیہ کو رات کے کھانے کا کہہ آئے اور بشر جانہ جلدی جلدی گھر کی کچھ صفائی وغیرہ کر لے۔ تمہاری سالگرہ ہے کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔"

سب کچھ ٹھیک تھا سب کچھ عین اس کے خیال کے مطابق ہونے لگا تھا۔ بی بی بھی خوش ہو گئی تھیں اور یہ سارے کھانے بھی ٹھکانے لگ جانا تھے۔

صاحباں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

"عجیب لڑکی ہو تم بھی۔"

بلند آواز میں بی بی کی اس بڑبڑاہٹ کے پیچھے جو پیار بھری ڈانٹ تھی وہ بڑی لذت بخش تھی۔

"دو تین دن پہلے بتایا تو تھا صبح پھر سے یاد دلا دیتیں میں باقاعدہ انتظام کرتی۔ اب بتاؤ نا۔ بھلا اتنے تھوڑے وقت میں کیا کیا ہوگا۔ بیوقوف لڑکی...!"

"بی بی! اتنا کچھ تو ہے۔ آپ اور کیا کرنا چاہتی ہیں۔ اس مہنگائی کے دور میں یہ بھی بہت ہے۔"

"مہنگائی کا دور ہوگا اوروں کے لیے۔ میری بیٹی ایسی سستی نہیں ہے۔ تمہاری اس سالگرہ کے لیے تو جی میں بہت سارے ارمان تھے۔"

"کیا بھلا...؟" وہ بہت محظوظ ہو رہی تھی۔

"تمہارا ایک خوب صورت سا لباس بنوانا تھا۔ پھر تمہارے میاں جی کو بھی اطلاع دیتی۔ تمہاری خوشیاں دیکھنے کو تو وہ سات سمندر پار سے بھی چلے آتے اور یہ فاصلہ تو بہت کم ہے۔ پھر اپنے گھر کو سجاتی۔ ہزاروں دیئے جلاتی۔ میں کیا سب کچھ تمہارے میاں جی کرتے۔ جانے تم نے مجھے کیسے بتایا جو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بتانا تھا نا۔"

وفور مسرت سے جیسے وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔

"میں چاہتی تھی بی بی! کسی طرح حارث سے صلح ہو جائے۔ تو پھر سب خوشیاں منائی جائیں۔ اس لیے میں نے سرسری سا ہی ذکر کیا تھا یا شائد نہیں کیا تھا؟ مجھے بھی تو یاد نہیں۔"

"آں۔ ہاں۔ حارث والی بات بھی درست ہے۔"

بی بی پر پھر کچھ افسردگی طاری ہونے لگی تھی کہ صاحباں اُن کا موڈ بحال کرنے کے لیے مسکرائی۔

"یہ سالگرہ وغیرہ کی تقریب تو بڑی معمولی، بڑی چھوٹی اور غیر اہم سی بات ہے۔ پھر تو بی بی! ہم حارث کی شادی اتنی دھوم دھام سے کریں گے۔ اتنی۔ کہ پچھلے سارے دکھ، سارے جدائی کے زخم اور فرقت کے سب داغ مٹ جائیں گے۔"

ڈھیر ساری مسرتوں میں غوطے کھاتیں بی بی بڑے غور سے صاحباں کو دیکھ رہی تھیں۔

"گھر میں چراغاں کریں گے۔ سب قہقہے لگائیں گے۔ آپ ایک نیا لباس بنوانے کو کہہ رہی ہیں میں سات بنواؤں گی بی بی پورے سات اور بہت سارے زیورات بھی۔ ہر لباس کے ساتھ میچ کرتے ہوئے نگینوں، ہیروں اور سچے موتیوں کے۔"

"وہ دن۔ ہائے وہ دن آئے تو سہی صاحباں۔"

صاحباں کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ بی بی کے چہرے پر خوشیوں کی پوری کی پوری بارات بڑی دھوم دھام سے اتر آئی تھی۔

آنکھوں میں سارے آسمان کے ستاروں کی جوت لرزاں ورقصاں تھی۔

صاحباں انہیں اسی عالم میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اسے کیا کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ حالات نے اسے کتنا ہوشیار چالاک بنا دیا تھا۔

ورنہ۔ صرف تین سال پہلے۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ اس کی معصومیت اپنی مثال آپ تھی۔ اور اب۔ اس کی چالاکی اور مکر شاید اپنی مثال آپ تھی۔

"واہ صاحباں! واہ۔ تو باکمال ہے۔"

وہ اپنے آپ کا ہی محاسبہ کر رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔

"صاحباں... ! صاحباں بیٹی... !!"

زور زور سے پکارنے کے بعد بی بی خود بھی اس کے کمرے میں آن داخل ہوئیں۔

"ارے! تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو اور اُدھر عروسہ اور زرقا وغیرہ آ بھی گئیں۔"

"ابھی سے... ؟"

"تو کیا آدھی رات کو آتیں۔ کچھ معلوم بھی ہے کیا وقت ہو گیا... ؟"

"کیا... ؟"

"آٹھ بج گئے ہیں۔"

"اوہ... !" صاحباں ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"خیالوں میں کھوئی بیٹھی رہی وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میں تو سمجھ رہی تھی زیادہ سے زیادہ چھ ساڑھے چھ بجے ہوں گے۔"

"چلو اچھا۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

بی بی جلدی جلدی وارڈ روب میں سے اس کا لباس منتخب کرنے لگیں۔

"جب تک تم تیار ہو گی میں ان کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

شوخ، قرمزی رنگ کا لیے ستار گوٹہ لگا غرارہ سوٹ اور ساتھ اس کے ہم رنگ نگینوں والے زیورات نکال کر بی بی نے بیڈ پر رکھ دیئے۔

"اب دیر نہیں کرنا۔"

"ہائے بی بی! یہ تو شادی قسم کی تقریبات پر پہننے والے ہیں۔"

"میری صاحباں کے نام کی کوئی بھی تقریب کسی شادی بیاہ سے کم اہمیت والی ہو گی کیا... ؟"

"لیکن..." وہ یہ پہننے سے بری طرح ہچکچا رہی تھی۔ جھوٹ کو سچ بنانا بھی کس قدر مشکل کام تھا۔ وہ پریشان کھڑی

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آج کے دن تمہاری سادگی نہیں چلے گی۔"

"لیکن بی بی! سنیئے تو۔ میاں جی بھی نہیں ہیں اور حارث بھی۔"

"سب کچھ ہے۔ خدا سب کو سلامت رکھے۔ تم ہو اور تمہارے ارمان نکالنے والی میں بھی موجود ہوں۔"

"مگر... "

"اگر مگر اب ختم۔ بس ماں کا حکم ہے۔ تم یہی پہنو گی۔"

بے بس سی ہو کر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ بی بی حکم سنا کر جا بھی چکی تھیں۔ جس خوشی سے سب کچھ کر رہی تھیں اور ماں سے حکم دے کر گئی تھیں وہ تو اب پورا کرنا اس کا فرض بن چکا تھا۔ تعمیل میں لگ گئی۔

بی بی کی ہدایات اور احکامات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ پورے خلوص اور جذبے سے تیار ہوئی۔ وہی لباس پہنا۔ مرمریں بازوؤں، سپید نازک ہاتھوں اور رخِ زیبا پر زیورات سجائے۔ بال بڑی خوب صورتی سے آراستہ کئے۔ چہرے کو میک اپ سے سنوارا۔ اور پھر... سچ مچ اس کی سالگرہ ہوتی۔ یہ سب کچھ حقیقت ہوتا تو شاید کھلے حوصلے، ذہن اور سرخرو ضمیر سے کرتی۔

مگر اب۔ اس کی ہر حرکت، ہر فعل اور ہر ادا میں گھبراہٹ، شرماہٹ اور جھجک تھی۔ اسی عالم، اسی چور چور سی کیفیت میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سبھی سہیلیاں پہنچ چکی تھیں۔

"کمال ہے۔ ہمیں صرف کھانے کی دعوت دے کر بلوا لیا اور یہاں آ کر خالہ جان سے پتہ چلا کہ صاحبزادی صاحباں کی سالگرہ ہے آج۔"

سبھی اس کی سج دھج اور اس سج دھج کو جو چکا چوند اس کی جھجک، گھبراہٹ اور حیا نے لگا دی تھی۔ اسے حیند ہیانی ہیانی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں کچھ زیادہ ہی حیرت سے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ صاحباں اتنی خوب صورت تھی۔

اور ساتھ ہی شکوہ بھی کئے جا رہی تھیں۔

"ہم ایسی غیر تو نہ تھیں کہ یوں پورے وقت پر بلاوا بھیجا اور وہ بھی نامکمل اور نہ ہی اتنی گئی گزری کہ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ اس کے حسن کی نذر نہ کر سکتیں۔"

وہ انتہائی اپنائیت اور پیار سے شکایت کرتی رہیں اور صاحباں جی ہی جی میں مسکرائی رہی۔

"فکر نہ کرو سکھیو۔ ابھی تو اسی مہینے کے اندر اندر ایسی ہی اور نجانے کتنی سالگرہ پارٹیاں مجھے منانا پڑ جائیں۔ دل کے حوصلے نکال لینا سبھی بار جتانے پائے۔"

وہ سوچتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے ان کے درمیان جا بیٹھی۔ بیٹھتے ہی نگاہ ارد گرد دوڑائی۔ جیسے اپنے گھر کے بجائے کہیں اور گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ وہاں چراغاں بھی ہو رہا تھا۔ بڑے خوب صورت انداز اور خوب صورت تازہ پھولوں سے ہال سجا ہوا اور مہک رہا تھا۔

ایسے معاملوں اور پروگراموں میں بی بی سے زیادہ پرجوش شرجانہ ہوا کرتی تھی۔ ڈھولک بھی کہیں سے منگوائی تھی اور سرحدی رقص کا بڑا خوب صورت لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ گویا کہ اس کی جوانی مستانی رقص میں آنے والی تھی۔ پٹھانی کی سی کچھ علاقائی جنم کی وجہ سے سرخ اور سفید تھی اوپر سے اس خوشی نے جیسے مٹھیاں بھر بھر کر میک اپ کر دیا تھا۔ اور بھی سُرخ اور سفید ہوئی جا رہی تھی۔

جس سالگرہ پارٹی کا دوپہر تک پتہ ہی نہ تھا وہ شادی جیسے اہتمام و انتظام سے منائی جانے لگی۔

صاحباں آ کر بیٹھی تو پہلے سلامی کے طور پر شرجانہ نے ایک بے حد خوب صورت رقص کیا ساتھ اردو اور پشتو کے گیت سنائے بڑے جوشیلے تھے۔ محفل میں گرمی اور مستی پھیل گئی۔ اس کے دیکھا دیکھی صاحباں کی تین چار سہیلیوں نے بھی گانے سنائے اور رقص کیے۔ بی بی کے چہرے پر مسرتوں نے گلال بکھیر رکھا تھا۔ خوش ہو ہو کر صاحباں اور اس کی سہیلیوں پر سے پانچ پانچ، دس دس کے نوٹ نچھاور کر رہی تھیں۔

"میرے گھر کی رونق میری بیٹی بھی سلامت رہے اور اس کی خوشیاں منانے والی اس کی سہیلیاں بھی سو سو سال لمبی عمر پائیں۔"

"ہائے خالہ جان! اپنی دعاؤں کا خلوص ذرا کم کر دیجئے۔ ہم اتنی لمبی عمر نہیں پانا چاہتیں۔ بس جہاں جوانی کی حد ختم ہوتی وہاں تک خلوص ٹھیک ہے۔"

سب ہنستی رہیں۔ قہقہے لگاتی رہیں اور شوخ ہوتی رہیں۔ ایک دوسرے پر فقرے کسے گئے۔ مذاق ہوئے۔ چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ غرض سب کچھ ہوا۔ ایسی تقریبات اور ایسی خوشیوں کے موقع پر جو کچھ ہوتا ہے وہی سب کچھ ہوا۔

کھانے والے کمرے میں سہیلیوں کے ساتھ صاحباں داخل ہوئی تو ششدر سی رہ گئی۔ نہ جانے کب اور کیسے بی بی نے یہ بڑا اور خوب صورت کیک بھی مہیا کر لیا تھا۔ شرمندگی کچھ اور بڑھ گئی۔

"کتنی موم بتیاں روشن کروں؟"

صاحباں دم بخود کھڑی تھی۔ زرقا کی آواز سے زیادہ کہنی کے ٹھوکے نے اسے چونکا دیا۔

"ہوں... ؟" روشن روشن، چھیلی چھیلی نگاہیں گھبراہٹ سے معمور ہو گئیں۔ ان کی خوب صورتی میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی۔

"کتنی... ؟" زرقا نے دوبارہ زبان سے تو مختصر مگر آنکھوں کے واضح اشارے سے پوچھا۔

"کتنی... ؟" پریشانی و گھبراہٹ بھری آنکھیں جھک گئیں۔

وہ سوچنے لگی۔ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کی عمر کیا تھی۔ شہر سے اک دور افتادہ بستی میں جنم لینے والی صاحباں کی اَن پڑھ معصوم اور سیدھی سادی ماں کو علم نہیں تھا تو اسے کیسے ہوتا۔ یہ سب تو شہروں کے چونچلے تھے نئی روشنی کی قدریں تھیں۔

"ارے لگا دو سولہ۔ تمہیں نہیں معلوم ہم لڑکیوں کی عمریں اس ہندسے پر آ کر تھم جایا کرتی ہیں۔"

عروسہ نے بڑے بے تکلف، بے باک اور خوب صورت انداز میں اپنے خلاف سچ بولا۔ سب بے اختیار ہنسنے لگیں۔ زرقا نے اس کے کہنے کے مطابق سچ مچ ہی صرف سولہ موم بتیاں روشن کر دیں۔

اسی طرح پیارے پیارے اور خوب صورت فقروں اور شوخیوں کے ساتھ کیک کٹا۔ پھر کھانا کھایا گیا۔ تقریباً ایک ہی عمر کی تھیں سب ہی بانہر جاتے پر کی ان میں ملاوٹ نہ تھی تبھی خاصی بے باک ہو رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ اور چہلیں عروج پر تھیں۔ بی بی بھی تو بے وقت کی نماز کے بہانے انہیں اکیلا چھوڑ گئی تھیں۔

یوں تو بی بی کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانوں میں ہمیشہ ہی بہت لذت ہوا کرتی تھی۔ مگر آج جیسے دنیا بھر کے ریکارڈ ٹوٹ گئے جانے بی بی نے یہ سب پکانے میں کیسی کیسی ترکیبیں استعمال کی تھیں اور کس کس قسم کے مصالحہ جات۔

ہر کسی نے انتہا سے بہت زیادہ کھالیا۔ ساتھ ساتھ بے شمار تعریفیں کئے جا رہی تھیں اور ترکیبیں بھی پوچھ رہی تھیں۔ مگر ماما انہیں کیا بتاتی۔ یہ جدائی کی ماری ممتا کے جذبوں کی لذت تھی۔ اور سب ابھی ان سے ناآشنا تھیں۔ اس کے بتانے پر بھی سمجھ نہ پاتیں۔

رخصت کے وقت ان سب کا رخصت ہونے کا انداز پہلے سے کہیں مختلف تھا۔ زیادہ محبت اور زیادہ پیار بھرا۔

صاحباں کی یہ سب سہیلیاں یہیں آکر بنی تھیں۔ کوئی بہت گہری دوستی کسی کے بھی ساتھ نہیں تھی مگر آج کے دن' ان چند لمحوں میں' ان کی دوستی بہت پکی اور گہری ہو گئی تھی۔ جس کا اعتراف جاتے جاتے ہر ایک نے بی بی کے سامنے کیا کہ اس کی بڑی وجہ ان کے بنائے ہوئے کھانے تھے اور اب وہ اکثر ان کے ہاں آنے کی خواہش کیا کریں گی۔

بی بی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ساری محنت کچھ منٹ کے ساتھ ہی وصول ہو گئی تھی۔ حارث نے یہ کھانے نہیں کھانا تھے۔ صاحباں سے یہ سنتے ہی جتنا دکھ ہوا تھا۔ اتنی ہی راحت اب ملی تھی اور اتنا ہی سکون حاصل

"توبہ توبہ... ! کیسا ہنگامہ رہا۔"

سب رخصت ہو گئیں تو صاحباں بڑبڑاتے ہوئے لباس تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جاکر زیورات اتارنے لگی تھی کہ سب سے پہلے کلائی کی گھڑی پر ہاتھ پہنچے۔ بلاارادہ' بلاضرورت ہی وقت دیکھ لیا۔

"توبہ۔ ساڑھے دس بج گئے۔ خواہ مخواہ ہی 'جھوٹ موٹ میں ہی اتنا سب کچھ..."

اور اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے وہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔

یہ سب کچھ کس لیے ہوا تھا؟ اتنا بڑا ہنگامہ کیوں کھڑا کیا گیا تھا بھلا؟ جھوٹ کا اتنا بڑا ناٹک کس لیے کھیلا گیا تھا؟ حارث کے کھانے ہی کا معاملہ درپیش تھا نا۔ اور۔ باقی سب کھا پی کر رخصت ہو گئے اور اس غریب کا کیا بنا؟ رات کے ساڑھے دس بج گئے تھے۔

"اوئے ہوئے۔ یہ تو غضب ہو گیا۔ صاحباں تو کس قدر کمینی ہے۔ اپنی خوشیوں میں اس بیمار بیچارے کو بھول ہی گئی۔ اس نے تو دوپہر کو بھی دو فاقوں کے بعد ٹھیک طرح نہیں کھایا تھا اور تو۔ تو بیٹھی ڈٹ کر مزے مزے کی چیزیں کھاتی رہی۔ ناچ گانوں سے لطف اندوز ہوتی رہی اور وہ بیچارا ادھر بھوک اور انتظار کی تکلیف برداشت کرتا رہا۔ لعنت ہے تیری زندگی پر..."

دکھ کا احساس اتنا شدید تھا کہ خود کو کوستی ہوئی گرتی پڑتی بی بی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ زیورات وغیرہ اتارنے اور لباس تبدیل کرنے میں مزید وقت صرف ہوتا اور اب تو اک لمحے کی بھی اور دیر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

"بی بی۔ ! جی بی... !!"

صاحباں کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ آنکھوں میں تھوڑی نمی بھی تھی۔

"کیا ہوا صاحباں! کیا ہوا میری جان...؟"

بی بی نے گھبرا کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ یقیناً کسی کی نظر نے پکڑ لیا تھا۔ جو اس کی ایسی حالت ہو رہی تھی۔ "بی بی! حارث کو کھانا بھیجنا تھا۔ یاد ہی نہ رہا۔"

"بس یہی بات ہے نا صاحباں۔ کوئی اور تو نہیں جو اتنا گھبرائی ہوئی ہو۔"

بی بی کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ بے یقینی بھری نگاہیں اس کے بے حد خوب صورت مگر بے حد پریشان چہرے پر گاڑے کھڑی رہیں۔

"سچ سچ بتا دو؟"

"بی بی سچ کہہ رہی ہوں یہی بات ہے۔ ساڑھے دس بج گئے اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ کہ شام کو ہی کھانا پہنچا دوں گی۔"

"تم پریشان مت ہو مجھے تمہارا وعدہ یاد تھا۔"

"یاد تھا...؟" اس کی پریشانی کچھ کم ہو گئی۔ "تو پھر کیا کیا...؟"

"کبیرے کے ہاتھ میں نے بھیجا بھی تھا مگر وہ سو چکا تھا شاید... گھر میں ہر طرف اندھیرا تھا..."

"اوہ...!" صاحباں چپ سی ہو گئی۔ اب بی بی کو یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ بیمار تھا اور اوڑھ لپیٹ کر پڑا ہوا اسے روشنی کرنے کا ہوش کب تھا... اور کبیر خان صاحب نے اسے سویا ہوا سمجھ لیا۔ اتنا بھی تو اس بے وقوف سے نہیں کیا گیا کہ اندر چلا جاتا۔

دل ہی دل میں کبیرے پر برسنے لگی۔

"ہنہ... ! اپنی عقل کو تو کبھی استعمال نہیں کرتا... فضول... بدتمیز..."

"چلو جاؤ... اب تم سو جاؤ..."

"کیا...؟ بی بی میں نے اس سے وعدہ کیا تھا..."

"مگر کبیرا گیا جو تھا..."

"کبیرا تو بے وقوف ہے۔ اگر بیرونی کمرے میں اندھیرا تھا تو اندر جاکر تو دیکھتا... اُن کا بیڈ روم بالکل پیچھے ہے... وہاں روشنی ضرور ہو گی۔"

"تمہیں تو پتہ ہے اس میں اتنی عقل نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ... جو ہوا سو ہوا۔ مگر حارث کو کھانا پہنچانا تو بے حد ضروری ہے۔ میں ان سے وعدہ کر آئی تھی... میرے وعدے کے بعد خود انہوں نے اپنے لئے کچھ نہیں بنایا ہو گا۔ اور یوں بھوکے رہیں گے تو گناہ میرے سر پر ہو گا۔"

"کھانا نہ گیا تو وہ بھوکا رہے گا...؟"

بی بی کی ممتا چونکی اور تڑپی۔

"نہیں نہیں... ایسا نہیں ہونا چاہیے..."

"پھر...؟ کچھ کیجئے نا..."

"کبیر اپنے کوارٹر میں چلا گیا ہے۔ اور..."

اور صاحباں کی ساری فکریں اور پریشانیاں بی بی کے دل میں اُترنے کے بعد چہرے سے بھی عیاں ہونے لگیں۔

"کھانا بھی سارا ختم ہو گیا ہے..."

"بالکل ختم ہو گیا...؟"

"بالکل...!"

"تو حارث کو کیا بھیجا تھا...؟"

"تمہارے کہنے کے مطابق پھلکے اور شوربہ... اس کے لئے علیحدہ تھوڑا سا شوربہ بنا لیا تھا۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ وہی دے آتی ہوں۔"

"مگر اب تو وہ بھی ختم ہو گیا۔"

"وہ بھی ختم ہو گیا...؟" صاحباں اُلجھ سی پڑی۔

"وہ کیوں ختم کر دیا...؟"

"وہ میں نے کھا لیا تھا۔"

"آپ نے...؟" صاحباں حیرت سے چلا پڑی۔ اور وہ جو اتنے انواع و اقسام کے کھانے بنے تھے۔ ان میں سے آپ نے کچھ کیوں نہیں کھایا؟"

"وہ تو تقریباً اندر مہمانوں میں ہی سارے ختم ہو گئے تھے۔"

"اوئی ماں... اتنا کھا گئیں وہ سب..."

"اچھا اچھا... نظر نہ لگاؤ... جم جم کھائیں۔"

"مگر اب کیا بنے...؟ کوئی چیز جو تھوڑی سی بچی ہو...؟"

"تمہیں بتایا نا۔ تھوڑی تھوڑی چیزیں بچی ضرور تھیں مگر وہ میں نے کبیر خان اور شرجانہ کو کھلا دیں... میری بیٹی کی خوشی منانے میں پیش پیش تھے وہ دونوں..."

"بیٹی کی خوشی گئی جہنم میں۔ اب مجھے بتائیے نا حارث کا کیا کریں۔ وہ بھوکے ہوں گے۔"

اور اب صاحباں بی بی سے ہی اُلجھنے لگی۔

"تو کیا اب بھرے پُرے گھر میں بالکل اُجاڑ پھر گئی ہے۔ اِک آدمی کے لئے تھوڑے سے کھانے کا بھی بندوبست نہیں ہو سکتا...؟ حد ہے نا..."

"ارے ہاں۔ مجھے یاد آیا۔ وہ دوپہر والا تمہارے حصے کا مرغی کا سالن پڑا ہوا ہے۔ تم نے نہیں کھایا تھا نا۔ میں نے تمہارے ہی لئے رکھا رہنے دیا۔"

"چلو وہی سہی..." اب ذرا صاحباں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اور چاول یا روٹی وغیرہ... کچھ ہے...؟"

"نہیں... سب ختم ہے..."

"او ہو... ختم ختم... جیسے آج ہمارے گھر سے ٹڈی دل کا گزر ہو گیا ہو۔"

صاحباں پھر جھنجھلائی... بی بی چور سی بنی کھڑی تھیں۔

"ارے ہاں ڈبل روٹی تو ہوگی...؟" ذہین تو تھی ہی، گھبراہٹ اور پریشانی میں بھی کوئی نہ کوئی ٹھیک بات سوجھ جاتی تھی۔

"وہ تو ہے۔ ثابت کی ثابت پڑی ہے۔ ناشتے کے لئے کبیر خان شام کو ہی لے آیا کرتا ہے۔"

"شکر ہے..." وہ یکدم خوش ہو گئی۔ "بس اب کام بن گیا۔"

چٹکی بجا کر اپنا پلان بی بی کو بتائے بغیر باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ بی بی بھی پیچھے پیچھے لپکیں۔

"کیا کرنے لگی ہو...؟"

"اس مرغی میں پانی ڈال کر شوربہ بناؤں گی اور ساتھ توس سینک لوں گی... بھوکے رہنے سے تو بہتر ہوگا..."

"ہائے ہائے ایسا کھانا...؟" بی بی کی آنکھوں میں نمی سی تیر آئی۔

"گھر میں اتنا کچھ بنا اور اس بے چارے کے نصیب ہیں..."

"بی بی، وہ ایسا ہی چاہتے تھے۔" صاحباں نے انہیں تسلی دی۔

"یقین کریں یہ عین ان کی خواہش کے مطابق ہوگا۔ اور پھر کوئی تکلف نہیں ہوا تو انہیں بے حد خوشی ہوگی۔ ہم میں اور بڑھے گی... پھر سب کچھ جلد جلد ہو جائے گا۔"

ساتھ ساتھ صاحباں مرغی کا شوربہ بنا رہی تھی۔ اور جلدی جلدی توس کاٹ کاٹ کر سینک رہی تھی

"اور دینے کون جائے گا...؟"

"میں... اور کون...؟"

"اتنی رات گئے! نہ۔ نہ۔"

"لیکن کھانا پہنچانا ضروری ہے بی بی! ورنہ وہ فاقے سے رہیں گے۔"

صاحباں یوں پریشان اور سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھی جیسے یہ فاقہ حارث پر نہیں بلکہ اُس پر گزرنے والا تھا۔

"مگر صاحباں! سوچو تو۔ دن کی بات اور ہوتی ہے۔ اور رات کے دس گیارہ بجے۔ اس وقت تمہارا وہاں اکیلے جانا نہیں لگتا..."

بیٹے کی محبت کی تڑپ علیحدہ مگر ادھر بظاہر وہ زمانے کے سامنے اِک بیٹی کی ماں تھیں۔ اور بیٹی کی ماں کی عزت نازک ہوتی ہے۔ بیٹے کے ایک فاقے سے کہیں زیادہ حساس۔

بی بی کے پُرعزم لہجے نے صاحباں کو چونکا دیا۔ تو... اب کیا ہو...؟ اب تو کھانے کی پرابلم بھی حل ہو گئی تھی۔ مگر... صاحباں تیراز جہاں پہلے اس کے گھر نہ جانے والے وعدے توڑ دیا کرتی تھی وہیں آج یہ بھی توڑ دے۔ کھانا دینے نہ جا..." اِک خیال آیا۔

"نہیں نہیں... وہ پہلے ہی بہت کمزور ہے۔ دو فاقے پہلے کئے۔ پھر دوپہر کو بھی کچھ اچھی طرح نہ کھایا۔ اور اب رات بھر بھوکا رہے گا۔ کہیں اس کی زندگی ہی... نہیں نہیں... ایسا نہیں ہونا چاہیے... اِک انسان کی زندگی ان جھوٹی مُوٹی عزتوں سے بہت اہم ہوتی ہے۔ بہت قیمتی ہوتی ہے..." اور صاحباں کا دوسرا خیال پُرعزم تھا۔

"بی بی...!" صاحباں بی بی کے عین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے بولی۔ "آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟"

"کیوں نہیں...؟" بی بی اس کے اس جملے سے گڑبڑا سی گئیں۔

"آپ کو اپنے بیٹے پر اعتماد نہیں ہے؟"

"اس پر بھی پورا ہے۔ اس کی رگوں میں بھی بہت شریف خون دوڑ رہا ہے۔"

"مگر آپ مجھے اس وقت جانے کی اجازت کیوں نہیں دے رہیں...؟"

"زمانے کے ڈر سے... کوئی کیا کہے گا۔ کیسی ماں ہے جوان بیٹی کو راتوں کو اِک غیر مرد کے پاس بھیج دیتی ہے۔"

"لوگ ہی کہیں گے نا... آپ کیا کہتی ہیں؟ مجھے اپنے دل کی بات بتائیے؟"

"میرے دل میں خدا کی قسم تم دونوں کی طرف سے اعتماد اور بھروسہ ہی بھروسہ ہے۔ بے شک چھ سال سے وہ مجھ سے جُدا ہے مگر مجھے یقین ہے وہ کبھی کوئی کمینی حرکت نہیں کرے گا... اور تم... تم جن حالات سے گزر کر میرے پاس پہنچی ہو اس کے تمہیں گندگی کے دریا میں بھی کودنا پڑے تو مجھے یقین ہے تمہارا دامن پھر بھی آلودہ نہیں ہوگا۔ تم اسے بچا لوگی..."

"پھر بھی آپ مجھے روک رہی ہیں...؟"

"بس وہی... دُنیا کی زبان کے ڈر سے۔"

"تو دُنیا کی زبان تو کبھی خاموش نہیں رہ سکی۔ وہ تو دن کے وقت جاؤں گی تب بھی چلے گی..." بی بی کو قائل کرنے کے لئے صاحباں نے دوسرا رُخ بدلا۔ "تو ٹھیک ہے میں نہیں جاتی۔ رات اور دن میں کیا فرق ہے۔ جیسے کل ہم واپس گھر چلیں۔ پھر یہاں بیٹھ رہنے کا کیا مقصد ہے...؟"

"کیا مطلب...؟"

"تو دیکھیں بی بی، دُنیا تو مجھے وہاں دن کے وقت جاتے دیکھے گی تب بھی باتیں بنائے گی... اور ہماری عزت سر بازار اُچھلے گی نہیں؟"

"نہیں..." بی بی ایک دم تڑپ سی اُٹھیں۔ "اتنے عرصے بعد اور اتنی مشکل سے تو اس سے ملنے کی اُمید بندھی تھی... پھر نہیں... یہ کام وہ کمتی ہوئے صاحباں۔" وہ اک بے چارگی سے صاحباں کو دیکھنے لگیں۔

"یہی تو کہنا ہے کرنے کے لئے میں دُنیا اور زمانے کے خوف سے بے خوف ہو گئی تھی... آپ ہی کو دُنیا کی پرواہ پڑی ہے۔"

بی بی چپ سی ہو گئیں۔ عجب بے بسی سی اُن کے حواس پر چھائی تھی۔

"دیکھئے بی بی!" صاحباں انھیں بڑے آرام سے سمجھانے لگی۔ "اگر ہم دونوں پر آپ کو پُورا بھروسہ ہے نا تو پھر کسی اور کی پرواہ مت کیجئے... یوں بھی ہم دو تین مہینے سے زیادہ نہیں رہیں گے یہاں۔ اور یہاں اِرد گرد بسنے والے لوگ نہ ہمارے شہر کے ہیں، نہ برادری کے اور نہ عزیز رشتے دار۔ چند دن کی علیک سلیک ہے۔ سیزن ختم ہونے پر ہم یہاں سے چلے جائیں گے پھر یہ ہمارے لئے اجنبی ہو جائیں گے ہم ان کے لئے۔ کون سی عزت، کس کی عزت... ہم جس مشن کے لئے یہاں آئے ہیں ہمیں بس وہ نگاہ میں رکھنا چاہیئے ورنہ..."

"ورنہ کیا...؟"

"بس وہی... بیٹے کی سدا کی جُدائی..."

"نہیں نہیں..." بی بی جنونی انداز میں بڑبڑائیں... پھر چند لمحے خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہیں۔ شاید اپنی ممتا کے جذبوں کو تول رہی تھیں کہ ان میں کتنی شدت تھی۔ تب وہ تھوڑے سے توقف کے بعد دِل پر ہاتھ رکھتے ہوئے شکست خوردہ سے لہجے میں بولیں: "اب یوں مجھ سے نہیں جیا جائے گا۔ میں یقیناً مرجاؤں گی۔ تم جاؤ صاحباں، تم ضرور جاؤ..."

انھوں نے مرغی کا شوربہ اور سینکے ہوئے توس خود ہاٹ کیس میں بند کر کے ہاٹ کیس صاحباں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "جاؤ... خدا سب کو عزت اور ایمان دے... اور تم دونوں پر تو مجھے پُورا بھروسہ ہے۔"

وہ صاحباں کے ساتھ ساتھ برآمدے تک چلی آئیں۔ اتنی رات ہو گئی تھی۔ باہر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا تھا۔ بی بی کو تو قائل کر لیا تھا مگر اس تاریکی کو دیکھ کر وہ دِل ہی دِل میں خود خوفزدہ سی ہونے لگی۔

حارث کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بیمار تھا۔ بستر پر پڑا تھا۔ اس کی طرف سے تو رتی بھر بھی بے اعتمادی نہ تھی مگر یہ راستہ... اتنا تاریک تھا... کہ کوئی بھی واقعہ اس کے ساتھ پیش آسکتا تھا۔

ڈر کر، ہچکچا کر وہیں برآمدے میں ہی رُک گئی۔

"کیوں...؟" بی بی نے اس کے قدم رُکتے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں... کچھ بھی تو نہیں..." اسے پھر حارث کا خیال آگیا، اسے کھانا ضرور پہنچنا چاہیے تھا۔ اس لئے اس نے بی بی پر کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ رات تھی... تاریکی تھی... تو کیا تھا...؟ اس نے بڑی خود اعتمادی سے سوچا۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ نہ راستے میں، نہ گھر میں، نہ تاریکی میں... ہمت تھی کسی میں...؟"

"تو پھر جاؤ... میں یہاں برآمدے میں کھڑی ہوں۔ حارث کے گھر تک جاتے ہوئے نگاہ تم پر رکھوں گی..." دُنیا کی زبانوں سے تو بی بی بے پرواہ ہو گئیں... مگر پھر بھی جوان اور خوبصورت بیٹی کی ماں ہونے کے ناطے اپنے فرض کو نباہتے ہوئے پُورے وقار اور سنجیدگی سے بولیں: "اللہ کے سپرد... وہ سب کی عزتوں کا رکھوالا ہے۔"

بی بی کی دُعاؤں اور اپنی خود اعتمادی کے سہارے صاحباں بڑے اطمینان سے اس کے گھر کے برآمدے میں جا داخل ہوئی۔ دروازہ بند نہ تھا... دستک دینے سے پہلے ذرا سا دھکیلا تو وہ کُھل گیا۔ "چلو اچھا ہے۔ دروازہ کُھلا ہی مِل گیا ورنہ کھٹکھٹانے سے رات کی خاموشی تو خاموشی پاس پڑوس والے بھی بے چین ہو اُٹھتے... پھر انھیں نہ جانے کیا کیا کچھ سوچنا پڑتا۔ سب کے لئے بھلا ہو گیا۔" اپنے آپ سے ہی باتیں کرتے ہوئے ہولے ہولے قدم اُٹھاتی وہ اندر چلی گئی۔ کمرے کی بتی روشن نہیں تھی مگر باورچی خانے کے ساتھ والی کاریڈور میں ہلکی سی روشنی تھی۔ "حارث صاحب! حارث صاحب...!" اپنی آمد سے اسے مطلع کرنے کے لئے وہ اس کا نام لے لے کر پکارتے ہوئے کاریڈور سے گزر کر اس کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

مگر کمرہ تو کمرہ اس کا بستر بھی خالی تھا۔

"حارث صاحب..." گھبراہٹ کے مارے اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی۔

کیسا عجیب انسان تھا... خود کہیں موجود نہیں تھا اور چور اُچکوں کے لئے سارے گھر کے دروازے کس خلوصِ دل سے کھول رکھے تھے۔ بد اخلاق، بد مزاج اور بدتمیز تو تھا ہی... ساتھ بے وقوف بھی کافی تھا۔ کون سی خامی تھی جو اس میں موجود نہ حارث کی شان میں بڑی فراخ دلی سے قصیدے پڑھتے ہوئے صاحباں نے ایک بار پھر اپنی پوری بلند آواز میں اُ پکارا۔ نہ جانے اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان... خاصی گھبرائی ہوئی بھی تھی۔

"حارث صاحب...!"

"کیا ہوا...؟ یہ اتنی زور زور سے چلانے کا شغل کیوں جاری کیا ہوا ہے...؟"

اپنے عقب سے حارث کی خوشگوار لہجے والی آواز سن کر وہ جلدی سے مڑی "آپ کہاں تھے...؟"

"میں ادھر غسل خانے میں تھا" وہ تولیئے سے چہرہ پونچھ رہا تھا۔

"اوہ...! میں تو گھبرا ہی گئی تھی..."

"اس میں گھبرانے والی کون سی بات تھی...؟" حارث نے متجسس نگاہوں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"اور یہ سارے گھر کے دروازے...؟"

"آپ ہی کے لئے کھلے رکھے تھے"

حارث کے اس جواب سے صاحباں پر ڈھیروں ڈھیر حیرتیں ٹوٹ پڑیں۔ یا الٰہی خیر! یہ سورج مشرق کے بجائے آج سے نکلا چلا آرہا تھا۔

حیرت کی زیادتی نے ابھی صاحباں کو بے ہوش نہیں کیا تھا کہ حارث اسی طرح اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بولا۔

"ارے! یہ آپ اس وقت اور اس قدر جگمگاتے چلیے ہیں...؟"

نگاہوں میں پسندیدگی، دلچسپی اور گہرائی لئے وہ اس کے حسین ترین چہرے اور جگمگ جگمگ کرتے پیکر کو تکے ہی چلا

"یہ... یہ... اوہ! آج میری سالگرہ تھی" صاحباں، اس کی گھورتی نگاہوں سے بری طرح گھبرا گئی۔

"مجھے صبح آپ کو بتانا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ ویسے اپنے ملازم کو بھیجا تھا مگر وہ یہی سمجھ کر لوٹ گیا کہ آپ سو رہے ہیں۔ اور میں فارغ ہوئی ہوں... ابھی ابھی..."

اپنی اس سج دھج میں اس کے، اِک غیر مرد کے گھر چلے آنے پر شرمندہ سی ہو کر جیسے صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھ

"دیر ہو گئی تھی۔ ملازم بھی اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ اس لئے خود ہی اور اسی طرح آپ کو کھانا دینے کے لئے بھاگ آئی۔ تبدیل کرنے لگ جاتی تو اور دیر ہو جاتی"

میز الم غلم سے بھری پڑی تھی۔ جلدی بڑھ کر ایک کرسی پر ہی اس کا کھانا رکھ دیا۔

"بھوک تو بہت لگی ہوگی...؟"

حارث نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو اس کی ہستی کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔

اس کے سوال کا جواب نہیں ملا۔ صاحباں نے تردد بھی نہیں کیا۔ وہ اس وقت بڑی جلدی میں تھی۔ کھانا کرسی پر ہی رکھنے اسی عجلت سے دروازے کی طرف لپکی۔

"واپس جا رہی ہیں...؟" صاحباں کا جگمگاتا وجود نگاہوں سے اوجھل ہونے لگا تو حارث نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں... ہاٹ کیس میں سے کھانا نکالنے کے لئے پلیٹیں اور ٹرے لینے جا رہی ہوں۔ میز کو بھی تو آپ نے مال گودام

"اس فقیر پُر تقصیر کے گھر میں آپ کو ٹرے کون سا دکھائی دے گیا؟"

"وہی ڈرائنگ بورڈ نا... جس سے صبح بھی ٹرے کا کام لیا تھا..."

"رہنے دیجئے لمبے چوڑے تکلفات" وہ اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے متبسم لہجے میں بولا "اپنی زندگی بڑی سادہ گزری ہے"

"وہ تو میں جانتی ہوں"

صاحباں کا اشارہ اس کے ماضی کی طرف تھا... وہی ماضی، جس میں آج کل خود صاحباں کا حال بسیرا کئے ہوئے تھ تھیں، خوبصورت زندگی کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت تکلفات تھے۔ اچھا گھر تھا۔ میل ملاقات والے بہت تھے۔ اچھی خ سوشل زندگی تھی۔ سادگی تو اسے آج تک کہیں دکھائی نہ دی تھی جیسی وہ کہہ رہا تھا... مگر... صاحباں کے سادگی بھرے ا فقرے کا نہ جانے اس نے کیا مطلب اخذ کیا۔

"کیا جانتی ہیں آپ میرے متعلق...؟" وہ بے طرح گھبرا گیا۔

"یہی..." اس کی گھبراہٹ دیکھتے ہی صاحباں نے جلدی سے بات بدل دی "بے ترتیب گھر... بے ترتیب لباس... اور بے ترتیب ہستی... سادگی ہی تو ہے"

"میرے بے ڈھنگے پن پر چوٹ کر رہی ہیں شاید..."

عجب ندامت اور خفت اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ ہائے ہائے بڑا ہی حساس تھا... صاحباں ڈر گئی۔ کہیں پھر دورے کو اپنے اوپر سوار نہ کرلے۔ پھر بات بدلی "نہیں۔ آپ کے بے ڈھنگے پن پر چوٹ نہیں کر رہی۔ میں ہی آپ کی سادگی کا اعتراف بے ڈھنگے انداز اور الفاظ میں کر گئی تھی۔ خاصی بے وقوف ہوں..."

اپنی عقل پر ہی سارے الزام دھرتے ہوئے صاحباں نے جلدی سے اس کے سامنے وہی کرسی گھسیٹ آپ... دن جس پر ہاٹ کیس لا کر رکھا تھا۔ پھر جلدی جلدی اسے کھول کر بطور سادگی اس کے ڈبے ہی اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"آپ اسی طرح کی سادگی چاہتے ہیں نا...؟" وہ بڑے پیارے انداز میں مسکرائی "لیجئے اور اب آپ جلدی سے کھانا کھا لیجئے" اسے کھانے کا اشارہ کرتے ہوئے صاحباں خود پھر دروازے کی طرف لپکی۔

"واپس جا رہی ہیں...؟" حارث نے پھر چونک کر گھبرا کر وہی سوال کیا۔

"ارے بابا نہیں..." صاحباں زور سے ہنس دی۔ پھر وہیں سے گردن موڑ کر پوچھنے لگی "چلی جاؤں کیا...؟"

"یہ میں نے کب کہا...؟" اس کے چمکیلے دمکتے پیکر کو نگاہ بھر کر دیکھنے کے بعد حارث نے اِک نمایاں سی بے قراری کے ساتھ کہا۔

"یہاں آئے مجھے دو چار منٹ ہوئے ہیں اور کئی بار آپ نے یہی سوال کیا ہے"

پھر صاحباں ایک دم ہی مسکرا پڑی۔ آنکھوں میں اِک شوخ سی چمک لہرائی۔

"گھر میں گھسنے نہیں دیا کرتے تھے نا۔ میرا خیال ہے وہی آپ کی دلی خواہش بار بار زبان پر آرہی ہے۔ مگر اب ذرا اخلاق سے"

"اوہ نہیں نہیں... بخدا نہیں..." حارث نے پُر زور انداز میں انکار کیا۔

"پھر...؟ سچ بتایئے گا... کیوں بار بار میرے جانے کا پوچھ رہے ہیں؟"

"یقین کریں گی...؟" حارث نے بڑے معصوم سے انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کیوں نہیں...؟" صاحباں نے بڑے خلوص سے اس کی آنکھوں کی معصومیت قبول کرلی۔

"میرے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا ہے کہ اب بھی آپ واپس نہ چلی جائیں، اب بھی نہ چلی جائیں۔ دروازے کی طرف آپ کا قدم جو اٹھتا ہے وہ مجھے دہلا دیتا ہے..."

"ہائیں..." صاحباں تعجب سے چلا سی پڑی۔

پھر جلدی سے پلٹ کر اس کے قریب، بہت ہی قریب آکر عین اس کے چہرے کی طرف جھکتے ہوئے اور متحیر نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ یہ آج آپ خلافِ معمول اور خلافِ مزاج اخلاق والی باتیں کئے جا رہے ہیں۔ یا پھر میں ہی کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں"

حارث خفیف سا ہوتے ہوئے اِک ہلکی مگر افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑایا "آپ بڑے گھر کی پروردہ، آپ، ہم جیسوں کے دکھ درد کیا جانیں؟ اور پھر جب اِک انسان دکھوں کے پہاڑ تلے دب کر ٹوٹ بکھر جائے تو اس کا اخلاق اور مزاج کیسا؟ یہ بھی آپ نہیں جان سکتیں..." وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"مذاق ہی اڑائیں گی نا..."

"نہیں نہیں..." اس کی سنجیدگی نے پھر صاحباں کو سراسیمہ سا کر دیا۔

"میں مذاق تو نہیں اڑا رہی تھی۔ آپ کو بتایا نا... بہت بے وقوف ہوں۔ خوشی کا اظہار بھی احمقانہ انداز میں کرنے لگی" اس کی کہیں دلآزاری نہ ہو جائے۔ اس احساس سے ایک بار پھر صاحباں نے بڑے خلوص سے خود کو ہی مجرم اور بے وقوف بنا لیا...!

"خوشی...؟ خوشی کس بات کی؟"

"کہ جیسا آپ کو سمجھتی تھی شکر ہے آپ ویسے نہیں ہیں..."

"کیسا سمجھتی تھیں...؟"

"کئی بار پہلے بھی اظہار کر چکی ہوں۔ اب بار بار کیوں زبان کھلواتے ہیں...؟"

صاحباں نے کچھ اس قدر پیارے انداز میں اس کی بدمزاجی اور بداخلاقی کا ذکر کیا کہ حارث محظوظ ہوتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑا۔

ہنس ہنس کر خوش مزاجی سے باتیں کرتا ہوا وہ خاصا معقول لگتا تھا اور نہ صرف یہ کہ معقول ہی بلکہ اَب کی بار صاحباں کو اندازہ ہُوا کہ جتنی ہنسی اس کے چہرے پر سجتی تھی اتنی اس نے کبھی کسی اور چہرے پر سجتی نہیں دیکھی تھی۔ جونہی ہنسی اس کے چہرے پر بکھرتی وہ ایک دَم ہی بے حد خوبصورت ہو جاتا۔ پھر دل چاہنے لگتا کہ وہ ہنستا جائے، ہنستا جائے اور وہ اسے دیکھتی چلی جائیں۔

شاید یہ بات اِسے معلوم نہیں تھی۔ یا شاید معلوم تھی اور وہ بڑا کنجوس واقع ہُوا تھا... بہت کم ہنستا تھا۔ بدمزاجی اور بداخلاقی کے ساتھ ساتھ طبیعت میں کمینگی بھی موجود تھی۔

صاحباں دزدیدہ نگاہوں سے اس کے ہنستے چہرے کو دیکھتے ہوئے اور اندر ہی اندر بڑبڑاتے ہوئے پھر دروازے کی طرف بڑھی۔

"جا رہی ہیں...؟" بے اختیار حارث پھر پوچھ بیٹھا۔

"اوہ...!" وہ بھی پھر پلٹ آئی اور قدرے جھنجلاتے ہوئے بولی۔ "جنابِ عالی! کھانے کے بعد چائے نہیں پئیں گے...؟"

"جی تو چاہتا ہے..." انتہائی معصومیت بھرا جواب مِلا۔

"تو وہ بنانے کے لئے اتنی دیر سے جانے کی کوشش کر رہی ہوں مگر آپ ہر بار ٹوک دیتے ہیں۔"

"اچھا اَب نہیں ٹوکوں گا..." سادہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"تو پھر جاؤں...؟"

"ضرور جائیں... لیکن آپ کا یہ قیمتی لباس۔ یہ یقیناً ایسا نہیں کہ اس کے ساتھ ہانڈی چُولھا کیا جائے۔ اس لئے رہنے ہی دیں۔ مجھے ڈر ہے کوئی چھینٹ وغیرہ پڑ کر خراب نہ ہو جائے۔"

"تو کیا ہے... لباس قیمتی ہے تو ہُوا کرے۔ مگر میری نگاہ میں اِک انسان قیمتی لباس سے بہت زیادہ کروڑوں گنا زیادہ قیمتی ہے حارث صاحب! لباس خراب ہو جائے تو وہ اور بن سکتا ہے اور انسان..."

اِتنا کہتے کہتے صاحباں خاموش سی ہو گئی۔ اس کی نگاہوں میں بی بی کی تڑپ تھی۔ اس کے خیالوں میں اپنی ماں کی بیقرار آنکھیں تھیں جو اس نے اپنی جُدائی کے بعد دیکھی تو نہ تھیں مگر بی بی کا وجود ہر لمحے اسے دکھا رہا تھا۔ اور انسانوں کی قیمت کا احساس دِلا رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آجانے کی وجہ سے اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔ تبھی بات اَدھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ حارث اس کے دل کا حال نہیں جانتا تھا اس لئے اس کی کیفیت کا اندازہ نہ لگا سکا۔ وہ بھی بڑی سہولت اور خوبصورتی سے اندر ہی اندر آنسو پی گئی تھی۔

"بہت قابلِ قدر ہیں آپ کے خیالات..." وہ اس کی جگمگ کرتی ہستی اور اتنے خوبصورت ذہن کے سحر سے مسحور سا ہوتا ہُوا بولا۔

"ارے!" موضوع بدلنے کے لئے صاحباں دانستہ چونکی۔ "آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے...؟ سب کچھ ٹھنڈا ہو گیا..."

"میں جلدی کھا لیتا تو پھر آپ جلدی چلی جاتیں۔ اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ آپ ابھی نہیں جائیں۔ مجھ سے باتیں کریں۔"

وہ بالکل بچّوں ایسی معصومیت اور سادگی سے نظریں اس کے وجود پر جمائے جمائے بولا۔ "آپ اس لباس اور اس رُوپ میں بہت اچھی لگ رہی ہیں، بہت خوبصورت۔ جی چاہتا ہے آپ میرے سامنے رہیں اور میں آپ کو دیکھتا چلا جاؤں۔"

بعض وقت وہ اتنا معصوم لگنے لگتا تھا کہ اس کی کسی بات کا وہ بُرا بھی نہ منا پاتی تھی۔ اَب کیسے اس کی کھُلم کھُلا تعریف کئے جا رہا تھا اس کے حسن کی۔ ساتھ اپنی چاہت اور طلب کا اظہار بھی۔ بے حد معصومیت اور شرافت کے ساتھ۔ نگاہوں میں خباثت یا کمینگی کے بجائے پاکیزگی اور سادگی تھی۔

صاحباں لاجواب سی ہوئی کھڑی تھی۔ چہرے پر تھوڑی تھوڑی حیا کی سُرخی جو پھیل رہی تھی اس کے احساس کے تحت نگاہیں جھکی جا رہی تھیں۔

"پھر بیٹھئے نا..." حارث کے سادگی بھرے اصرار پر وہ چونکی۔

"رات بہت ہو گئی ہے..." بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا۔ "ورنہ ضرور بیٹھتی اور آپ کے ساتھ باتیں کرتی۔ بیمار کی خدمت کرنا تو بہت بڑی نیکی ہے..."

"ہاں... آپ کی مجبوری بھی سمجھتا ہوں..." اور وہ سر جھکا کر جلد جلد کھانا کھانے لگا۔

"اَب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"پہلے تو ایسے دَورے کے بعد اتنی جلد کبھی نہیں سنبھلا کرتا تھا مگر آپ کی توجہ اور تیمارداری نے اس بار کافی جلد ٹھیک کر دیا۔"

"اللہ ہی کی مہربانی اور فضل و کرم ہے ورنہ میں تو اپنا فرض اچھی طرح نبھا ہی نہیں سکی..."

"اس سے اچھی طرح اور کیا نبھانا تھا۔ میری بداخلاقیوں اور بدتمیزیوں کے باوجود آپ نے..."

"چھوڑیئے اس ذکر کو۔" اسے ندامت کی تکلیف سے بچانے کے لئے صاحباں نے اس کی بات قطع کر دی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں..." وہ معافی مانگنے والے انداز میں بولا۔

مگر صاحباں اس کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس بار حارث خاموش رہا۔ اپنے پچھلے رویّے کے احساس کے بوجھ سے دبا سر جھکائے بیٹھا چُپ چاپ مُرغی کے ٹھنڈے شوربے میں توس بھگو بھگو کر کھاتا رہا۔ ذائقہ کیسا تھا۔ لذّت کیسی تھی...؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

صاحباں چائے بنا کر لے آئی۔ وہ اسی طرح اپنے خیالات میں ہی غوطے کھا کھا کر توس کھائے جا رہا تھا۔

"یہ آپ اتنے گُم سُم سے کیوں بیٹھے ہیں...؟"

اس کی خاموشی نے بھی صاحباں کو بے قرار کر دیا۔ چلو بدتمیزی ہی کی بات کرے مگر یوں خاموش نہ بیٹھے۔ جانے اس کے دل کو کیا ہونے لگتا تھا۔

"میں پوچھ رہی ہوں آپ اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہیں؟" صاحباں نے بڑھ کر اس کا کندھا ہلایا۔

"اوہ... کچھ نہیں..." پھر وہ یکایک مسکرا پڑا۔ اَب تو بار بار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آجاتی تھی۔ بڑی اچھی تبدیلی تھی۔ صاحباں کو خوشی ہوئی۔

"میں سوچ رہا تھا... من و سلویٰ کی عادت پڑ گئی ہے۔ اَب کل سے کیا کروں گا...؟"

"کرنا کیا ہے...؟ من و سلویٰ آتا رہے گا..."

"نہ... توبہ توبہ..." حارث نے ایک دم کانوں کو ہاتھ لگا لئے۔ "بنی اسرائیلیوں کا ساتھی تو کبھی بھی نہ بنوں۔"

"ان پر تو اللہ کی بڑی نوازشات تھیں۔"

"اللہ کی تو تھیں لیکن وہ بے قدرے اور احسان فراموش تھے... میں ایسا انسان بننا کبھی بھی پسند نہیں کروں گا۔"

"لیکن یہاں معاملہ خدا اور اس کے بندوں کا نہیں ہے۔"

"تب اور بھی زیادہ بُری بات... ہاتھ پاؤں ٹھیک ٹھاک رکھتے ہوئے ایک انسان دوسرے کا مال کیوں کھاتا چلا جائے۔ بِنا کسی مجبوری کے۔"

"مجبوری تو تھی۔ آپ بیمار تھے۔"

"وہ مجبوری ختم ہو گئی۔ اَب میں کافی بہتر ہوں۔"

"تکلّف کر رہے ہیں۔"

"نہیں۔ ایمان سے نہیں... ہاں البتہ مفت خوری کو کسی صورت اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ اِک لعنت ہے اور میرے خیال میں تو تقریباً حرام بھی۔ لہٰذا کل سے انشاء اللہ اپنے پیٹ کے اندر حق حلال کی روزی جائے گی۔"

صاحباں نے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا... اچھے ہی اصول تھے اس کے۔ پھر کیوں اسے گُمراہ کرنے کی کوشش کرتی۔ دِل ہی دِل میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے مسکرائی۔

"یعنی کہ پھر کل سے ہمارے لئے آپ کے گھر کے باہر پھر ممنوعہ علاقہ کی تختی چسپاں ہو جائے گی...؟"

"دوسروں کے لئے یقیناً... لیکن آپ کے لئے تو اَب کوشش بھی کروں تو نہیں کر سکتا۔"

"کیوں...؟"

"آپ یہاں کی ہر چیز پر قابض ہو چکی ہیں۔ مالک ہیں اندر باہر کی۔ تو پھر میں کون ہوتا ہوں تختی لگانے والا...؟"

صاحباں زور سے ہنس پڑی۔

"جناب ہم نے بھی بڑی مشکل سے قبضہ کیا ہے۔ بہت بہادری اور بڑے حوصلے سے مقابلہ کر کے، ورنہ کس میں ہمت ہے جو آپ کے قلعہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے... آپ نے بدمزاجی، بدسلوکی اور بداخلاقی کے ایسے ایسے زبردست پہرے بٹھا رکھے تھے تاکہ ان کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔"

صاحباں کے ساتھ ساتھ حارث بھی ہنستا رہا... اس کی کسی بات، کسی چوٹ کا ذرا بُرا نہیں منایا۔ ہنستے ہنستے یکایک ہی صاحباں سنجیدہ ہو گئی۔

"ویسے یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتی ہوں کہ آپ اس قدر مردم بیزار کیوں واقع ہوئے ہیں...؟"

"جی...؟ جی...؟" حارث کی بھی ہنسی تھم گئی۔ صاحباں کا یہ سوال بڑا غیر متوقع سا تھا۔

"نہ آپ اپنے متعلق کچھ بتاتے ہیں... نہ اپنے گھر والوں کے متعلق۔ آخر کچھ تو معلوم ہو آپ کے والدین کہاں ہیں...؟ آپ یوں تن تنہا کیوں رہتے ہیں...؟"

"وہ... وہ..." حارث پھیل پھیل آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ "بات یہ ہے... بات یہ ہے..."

اور پھر وہ کوئی بات بناتے بناتے خود ہی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ بات نہیں بن سکی تو خود بھی بگڑ گیا۔ اس کا سارا وجود لرزنے لگا پیلا پڑ گیا پھیلی پھیلی آنکھیں مندنے لگیں اور ان میں نمی تیر اٹھی۔ وہی دورے کی سی حالت اور کیفیت...!

چائے کی پیالی ہاتھوں میں تھی مگر ہاتھ اتنے زور زور سے کانپ رہے تھے کہ صاحباں کو لگا جیسے ابھی پیالی گر پڑے گی کر اس نے پیالی اس کے ہاتھوں سے لے لی۔

ہاتھ خالی ہوئے تو بے قرار سا ہوتے ہوئے حارث نے اسی طرح گلے کو تھام لیا، اور آنکھیں بند کر کے جلدی سے بستر پر گیا۔ دونوں کنپٹیوں پر پانی کی ایک ایک لکیر سی بہہ رہی تھی۔

پریشانی کے مارے صاحباں کو کچھ اور سوجھا ہی نہیں۔ اپنے ستاروں والے ہی دوپٹے کے ساتھ اس کی آنکھوں سے بہنے والا پانی اور پیشانی پر چمکنے والے پسینے کے قطرے صاف کرنے لگی۔

اچھا بھلا بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کتنا خوش تھا۔ کتنا مطمئن تھا۔ چہرے پر پھیلی ہوئی بے حد خوبصورت ہنسی کے ساتھ کیا اور پرکشش لگ رہا تھا۔ یہ اس نے کیا کیا؟ کیوں ایسا ذکر چھیڑا کہ اس کی ایسی حالت ہو گئی؟ کیوں اس کے ماضی کو کریدا کہ وہ حال سے بھی غافل ہو گیا؟

کئی پچھتاوے من میں اتر گئے۔ خود کو ڈھیر سارے کوسنے دے ڈالے۔ "بہت بری ہے تو صاحباں! بہت بیوقوف۔ احمق۔ بڑی کمینی اور ذلیل... کوئی ایک لمحہ بھی تو اسے سکون وچین کا نہیں آنے دیتی۔"

کئی لمحے وہ اسی طرح بے سدھ سا پڑا رہا تو صاحباں گھبرا گھبرا کر اسے پکارنے لگی۔ اور اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

"حارث صاحب... حارث صاحب...!"

"ہوں... اوں... ہاں..." اس نے جیسے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ "کیا ہے؟"

ساتھ ہی اس کی نگاہیں صاحباں کے خود پر جھکے افسردہ چہرے اور جگ مگ کرتے پیکر پر جم سی گئیں۔

"چائے پی لیجئے..." صاحباں نے جلدی سے وہی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔

اسی طرح صاحباں پر نظریں جمائے جمائے وہ نقاہت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لرزتا ہاتھ پیالی تھامنے کے لئے بڑھایا تو صاحباں نے اس کی حالت کا احساس کرتے ہوئے پیالی اسے پکڑانے کے بجائے اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دی۔

"کہیں گرم گرم اپنے اوپر ہی نہ گرا لیں۔"

"تو کیا ہو جائے گا...؟" ایک طویل سا گھونٹ لینے کے بعد وہ ڈوبتی ابھرتی آواز میں بولا۔ ساتھ ہی چہرے پر ایک پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"جل جائیں گے..." صاحباں نے بڑی نرمی سے کہا۔ جیسے کسی منے سے بچے کو سمجھایا جائے۔

"تو کیا فرق پڑے گا...؟"

"فرق کیا پڑنا ہے۔ تکلیف نہیں ہو گی کیا؟"

"باہر کے جلنے سے اتنی نہیں ہوتی جتنی اندر کے جلنے سے ہوتی ہے۔ اور وہ تکلیف میں کئی سالوں سے برداشت کئے جا رہا ہوں۔"

تکلیف کی، دکھوں کی بات ہو رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ یہ موضوع طویل ہوا تو اسے پھر دورہ پڑ جائے۔ اس احتمال کے تحت اس موضوع سے گریز کرنا ہی صاحباں نے بہتر سمجھا۔

"پچھلے تین دنوں میں یہ تیسرا دورہ ہے۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے حارث صاحب! یا تو آپ خود کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے پھر مجھے اجازت دیں، میں کل کوئی ڈاکٹر صاحب..."

"ارے نہیں نہیں..." صاحباں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سمجھ کر حارث بول پڑا۔

"آپ تکلیف مت کیجئے گا۔"

"تو پھر اس طرح کب تک چلے گا آخر...؟"

صاحباں کے لہجے میں تشویش تھی، پریشانی تھی اور سوچ تھی۔ اس کے لئے پورے خلوص واپنایت سے بھری سوچ۔

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ میرے اس مرض کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ یہ کوئی ذہنی اور نفسیاتی قسم کی بیماری ہے۔"

"تو کیا ایسی بیماریاں لاعلاج ہوتی ہیں...؟"

"نہیں تو..."

"تو پھر آپ کسی نفسیاتی ڈاکٹر کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟"

"وہ بھی کر چکا ہوں۔"

چائے کا آخری گھونٹ لے کر اس نے پیالی نیچے رکھ دی۔

"اس نے کیا مشورہ دیا؟"

"کوئی ایک...؟" وہ مسکرا پڑا۔

"کیا مطلب؟" صاحباں نے اس کی مسکراہٹ کو تحیر سے دیکھا۔ "بہت سارے مشورے دیئے؟"

"ہاں..." وہ لاپروائی سے بولا۔

"پھر...؟"

"میں نے قبول ہی نہیں کئے۔"

"قبول ہی نہیں کئے...؟"

اس کی بے نیازی پر صاحباں جھنجلا پڑی۔

"آپ بھی کمال کے انسان ہیں۔ کیوں قبول نہیں کئے؟ کیا آپ کو ایک صحت مند انسان بننا پسند نہیں...؟"

"پسند ہے... یہ جو آپ کے ہاں سے من وسلویٰ آج کل آ رہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے یہ میرے لئے باعث خوشی ہوتا ہے۔"

حارث یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

"میں صحت مند رہنا چاہتا ہوں۔ اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتا ہوں۔ اپنے کام خود کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر آپ نے ڈاکٹر کے مشورے کیوں نہیں قبول کئے؟"

"وہ مشورے ہی ایسے تھے کہ قبول نہیں کئے جا سکتے تھے۔"

"مثلاً...؟"

"مثلاً یہ کہ میں اپنی تنہائی کا ساتھ چھوڑ دوں۔" حارث کا لہجہ پھر خوشگوار ہو گیا۔

"اور آپ کی تنہائی اس وقت تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی جب تک آپ کی بدمزاجی اور بداخلاقی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔" صاحباں طنزیہ اور کٹیلے سے لہجے میں بڑبڑائی۔

"اس کی بھی ایک وجہ ہے، محترمہ! ناراض مت ہوئیے۔ میری تنہائی مجھ سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا، اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اور مشورہ کیا دیا تھا جو آپ کو قبول نہ ہوا؟"

"مجھ پر ہر وقت کسی کی توجہ اور محبت کی عنایات کی بارش رہنی چاہیے۔"

"اور یہ بارش آپ کی تنہائی والی عادت آپ پر نہیں ہونے دیتی۔"

"بس... یہی کچھ سمجھ لیجئے۔ کافی الجھا ہوا کیس ہے۔ آپ اس میں الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ پچھتائیں گی۔"

وہی خوبصورت ہنسی اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

اگر اس کی تنہائی اس کے روگ کی جڑ تھی تو وہ تو بڑی آسانی سے دور ہو سکتی تھی۔ اپنی ماں کے پاس چلا جاتا۔ یا اسے اپنے پاس لانے کی کوئی راہ نکالتا۔

صاحباں اسے یہ سب سمجھانا چاہتی تھی مگر ڈر گئی۔ پے در پے پڑنے والے دوروں سے پہلے ہی وہ اتنا ٹوٹ پھوٹ چکا تھا مزید اس ذکر سے شاید کچھ بھی نہ باقی بچتا۔

وہ جوان تھا۔ اچھی خاصی شکل صورت کا مالک تھا۔ بلکہ ایک بے حد خوب صورت اور پرکشش سی ہنسی والی خوبی بھی اس کے پاس موجود تھی۔ تب وہ بھلا پھر شادی ہی کیوں نہیں کر لیتا تھا۔ تنہائی دور کرنے کا یہ نسخہ بھی اچھا بھلا تھا۔

تب اس وقت اس کے ٹوٹتے پھوٹتے اور بکھرے بکھرے وجود کو سہارا دے کر استوار کرنے کے لئے یہ لطیف موضوع چھیڑنا صاحباں کو بہتر معلوم ہوا۔

"میرا خیال ہے آپ شادی کر لیں۔ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ تنہائی بھی نہیں رہے گی۔ توجہ اور محبت کی بارش آپ کے تن کے ساتھ ساتھ یقیناً آپ کے من کو بھی دھو دے گی۔ پھر یہ روگ سوگ بالکل دور ہو جائے گا۔ ہے نا...؟"

وہ اسے مشورہ دیتی رہی اور حارث کھویا کھویا سا بیٹھا سنتا رہا۔ جواب میں کچھ بھی نہیں بولا۔

"تو پھر میرے اس مشورے پر عمل کریں گے، نا...؟"

"شادی والے...؟"

"ہاں ہاں... بہت بہتر رہے گا"۔

"لیکن میں ٹھہرا ایک مَردم بیزار، بدتمیز اور بداخلاق انسان"۔

اس نے بڑے پیارے انداز میں جھک کر ایک شوخ نگاہی سے صاحباں کی آنکھوں میں دیکھا۔

"بھلا مجھ ایسی ڈھیر ساری اوصاف والے جانور سے کون شادی رچائے گا...؟"

"تو پھر اپنی ان صفات کو چھوڑ دیجئے نا۔ اخلاق اور تمیز جیسی بُری عادتیں ڈال لیجئے۔ پھر یقیناً کوئی نہ کوئی آپ سے شادی پر راضی ہو جائے گی"۔

"یقین دلاتی ہیں...؟" اس نے جھک کر پھر صاحباں کی آنکھوں میں جھانکا۔ اور ایک خوبصورتی سے والہانہ انداز میں جھانکنے والی ان آنکھوں کی گہرائیوں میں جانے کیا تھا کہ صاحباں کا دل بے اختیار ہو کر دھڑک اُٹھا۔

"جی...؟ جی...؟" گھبراہٹ نے اس کے چہرے پر کچھ ایسا گلال بکھیرا کہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین ہو گئی۔

"یہ... یہ... میں کیسے یقین دِلا سکتی ہوں...؟" صاحباں کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور زبان بُری طرح ہکلانے لگی۔

"چلئے چھوڑیئے... کیسے کیسے بہلائیں گی مجھے..."

صاحباں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ سٹینڈرڈ کا فرق تھا شاید اس کی نگاہ میں۔ تب حارث سنجیدہ ہو گیا۔

"شادی وغیرہ کی بات کیا کریں، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ آپ جیسی بے لوث ہمدردی رکھنے والی پُرخلوص ہستی کی توجہ ہی میرے شامل حال رہی تو انشا اللہ بہت جلد یہ بیماری میرا پیچھا چھوڑ دے گی..."

"مگر میں نے تو محسوس کیا ہے کہ میرے آنے سے آپ کو دَورے روز بروز پڑنے لگے ہیں..."

"آپ کے آنے سے...؟" اس نے تعجب سے صاحباں کو دیکھا۔ "بخدا نہیں... دوبارہ کبھی بھولے سے بھی یہ خیال دل میں نہیں لایئے گا"۔

"پھر...؟"

"ان دَوروں کی نوعیت میں جانتا ہوں"۔

"کیا مجھے نہیں بتائیں گے...؟"

"جی... جی...؟" وہ ہکلانے لگا۔ جیسے کچھ بتانے سے ہچکچا رہا تھا۔ صاحباں ڈر گئی۔ کہیں ان کی نوعیت بتاتے بتاتے پھر نہ ڈُوب جائے۔

"چلئے جانے دیجئے اس وقت۔ یہ موضوع پھر کبھی زیرِ بحث لائیں گے۔ فی الحال آپ میرے ساتھ ایک معاہدہ کریں"۔

"معاہدہ...؟ کیسا معاہدہ...؟" حارث نے لیٹتے ہوئے تھکا تھکا سا سانس لیا۔

"آپ نے ابھی ابھی کہا تھا کہ اگر میری توجہ آپ کے شامل حال رہے تو آپ کی بیماری دُور ہو سکتی ہے؟"

"ہاں... کہا تو تھا"۔

"تو اس کی خاطر آپ مجھ سے معاہدہ کریں کہ آئندہ سے آپ کا کھانا ہمارے گھر سے آیا کرے گا؟"

"نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا..." وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"۔

"پوری بات تو پہلے سُنیئے..."

"فرمایئے..." نقاہت کی وجہ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔

"پھر آپ کا کھانا میں خود لے کر آیا کروں گی۔ یوں میرا روز آپ کے ہاں آنے کا ایک معقول بہانہ بن جائے گا۔ بات تو یہ ہے کہ بلاوجہ بھی تو میں روز روز اِدھر نہیں آ سکتی۔ اور اس بہانے کے ساتھ مجھے روز روز کیا بلکہ صبح و شام یہاں موجود دیکھ کر آپ کی بیماری سرپہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہو گی... ٹھیک ہے نا...؟"

"آپ آئیں... روز آئیں... دن میں دو بار چھوڑ بیس بار آئیں۔ چشم ما روشن دِل ما شاد... مگر، مگر..."

صاحباں بڑے غور سے اسے تک رہی تھی اور اس کی بات سُن رہی تھی۔

"کھانے والی بات دُرست نہیں۔" حارث نے آنکھیں میچ لیں۔ "صاحباں۔ یہی نام آپ نے اپنا بتایا تھا نا...؟"

"جی ہاں..."

"تو مس صاحباں صاحبہ!" پھر وہ اسی طرح آنکھیں میچے میچے مسکرا پڑا۔ "نام اچھا ہے... بہت خوبصورت لگا"۔

"نام کی تعریف کا شکریہ... لیکن پہلے اپنی بات تو پوری کیجئے"۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کس طرح مناسب ہے۔ ذرا آپ خود ہی سوچئے"۔

"سمجھئے آپ کی بیماری کا علاج ہے"۔

"حارث کو اپنی صحت خود داری سے زیادہ عزیز نہیں ہے"۔

سر کے نیچے دونوں بازو باندھے وہ لیٹا ہُوا تھا اور صاحباں پلنگ کے پاس کھڑی بڑے غور سے اسے تک رہی تھی۔ خاصا نحیف اس کا جسم تھا۔ چہرے پر سُرخی کے بجائے زردی تھی اور ہاتھ نقاہت کی وجہ سے ہلکے ہلکے لرز رہے تھے۔ اس بیماری کے عالم میں دفتر بھی جانا اور گھر کا کام وغیرہ بھی کرنا۔ یہ سب اس کی تکلیف کو کم کرنے کے بجائے بڑھا سکتا تھا۔ یقیناً بہت بڑھا سکتا تھا۔ پھر...؟ وہ کس طرح اس کی مدد کر سکتی تھی۔ کوئی طریقہ، کوئی تجویز۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہتی تھی۔ اِدھر بی بی کی بھی تو زندگی کا سوال تھا۔

"ارے ہاں۔ ایک حل اور سُوجھ گیا..."

صاحباں کا ذہن زرخیز تو بہت تھا۔ ہر مسئلے کے حل کے لئے کئی کئی سوچیں فٹافٹ پیش کرنا شروع کر دیتا تھا۔

"آپ ہمارے پے انگ گیسٹ بھی تو بن سکتے ہیں...؟"

یقیناً ایسے تو اس کی خود داری کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے گی۔

"یہ آمنے سامنے گھر ہیں۔ رہیئے گا یہیں اور کھانا وہاں بن جایا کرے گا؟"

"ہاں۔ یہ سوچنے کے لائق بات ہے"۔

"تو پھر طے رہا کہ کل سے آپ ہمارے پے انگ گیسٹ ہُوئے؟" وہ پُرمسرت آواز میں بولی۔

ایک تیر سے دو شکار ہو رہے تھے۔ حارث کی مدد اور بی بی کی خوشی۔ روز بیٹے کے لئے کھانا بنانا، ان کے لئے زندگی کا بہترین مشغلہ تو ہو گا ہی۔ ساتھ جُدائی کے ان دنوں کا کچھ ازالہ بھی ہو جائے گا۔ اس کے لئے کھانا بنائیں گی تو ان کی ممتا کے بے چین جذبوں کو کچھ سکون و قرار ملے گا۔

"تو پھر طے رہا نا کہ کل سے آپ ہمارے پے انگ گیسٹ ہُوئے"۔

"لیکن طے کیسے رہا...؟ پہلے معاملے کی بات تو طے ہو لے"۔ حارث اس کے چہرے پر لہریں مارتے خوشی کے بے شمار خوشنما رنگوں کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"معاملے کی بات...؟ وہ کیا...؟"

"پے انگ گیسٹ کو پے کیا کرنا ہو گا...؟"

"اوہ...!" صاحباں سٹپٹا گئی۔ اس نقطے پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ادائیگی کا مسئلہ بھی اُٹھے گا... وہ بھلا کیا بات کر سکتی تھی۔ سب کچھ اسی کا تھا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئیں...؟"

"وہ... وہ... چلئے آپ بتایئے..." کیسے عجیب سے سارے حالات تھے۔

"کل... آج میں اس قابل نہیں کہ معاملے کی کوئی بات پورے انصاف سے کر سکوں۔ مگر آج کے دَورے کی تکلیف پہلے دَوروں سے بہت کم ہوئی ہے مگر دورہ بہرحال دورہ تھا۔ اثرات چھوڑ ہی گیا"۔

"اوہ...! معاف کر دیجئے۔ میں نے خواہ مخواہ ہی اتنی دیر آپ کا دماغ چاٹا..."

"شاید... آپ دماغ چاٹتی رہی ہیں تو تبھی اَب دَوروں میں وہ شدت نہیں ہوتی۔ پہلے کبھی آپ مجھے دَورے کی حالت میں دیکھتیں تو اندازہ ہوتا..."

"پہلے دن دیکھا تو تھا..."

"اس وقت بھی آپ میرا دماغ چاٹ رہی تھیں"۔

ایک دھیمی سی، نرم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رینگ گئی اور آنکھوں میں پیار کی جوت اُتر آئی۔

"جب کبھی اکیلے میں دَورہ پڑتا ہے تو تب دیکھنے والا نظارہ ہوتا ہے۔ پھر تو ایسے لگتا ہے جیسے زندگی سے سارے ناطے ابھی ٹوٹے، ابھی ٹوٹے۔ کچھ یوں کہ دوبارہ میل نہ ہو سکے گا"۔

"خدا نہ کرے..." ایک درد، ایک تڑپ کے ساتھ صاحباں بے اختیار بڑبڑا اُٹھی۔ حارث مُسکرا پڑا۔

"آپ کو دیر تو بہت ہو گئی ہے۔ اس کا مجھے پُورا پُورا احساس ہے۔ مگر پھر بھی ایک تکلیف دے سکتا ہوں؟"

"آپ ہمارے پے انگ گیسٹ ہیں۔ بے تکلفی سے کہیے۔ تکلیف کا ہے کی۔ ویسے بھی بیمار کی خدمت کرنے کا درجہ ملتا ہے۔"

"پھر گرم گرم چائے کی ایک پیالی اور پلا دیجئے۔ پہلی تو باتوں باتوں میں ٹھنڈی ہو گئی۔ گرم پی لوں گا تو رات اچھی گزر جائے گی۔"

"اوہ۔۔۔! یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ دورے کے بعد آپ ڈھیر ساری چائے پیا کرتے ہیں۔"

صاحباں باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ پانچ منٹ میں ہی فارغ ہو کر واپس آئی تو حارث ہمیشہ کی ایسی دورہ والی حالت کے بعد کی طرح آنکھیں بند کئے چپ چاپ لیٹا تھا مگر اس وقت اس کے چہرے پر ویسی موت جیسی زردی جیسی پہلے کھنڈ جایا کرتی تھی۔ نہ ہی یوں ہونٹ آپس میں بھینچے تھے جو بد مزاجی کا تاثر دیا کرتے تھے۔ پیشانی پر تیوری کی سلوٹیں بھی نہ تھیں۔ اس کے برعکس چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ پیشانی یوں کشادہ اور صاف تھی جیسے اس کی طرح اس کے دل میں بھی وسعت اور کشادگی تھی اور بھرے بھرے خوبصورت ہونٹوں پر بکھری ہلکی سی مسکراہٹ زندگی کی خوشگوار لذت کی غماز تھی۔۔۔!

"یہ چائے۔۔۔" کتنی دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد چائے کے ٹھنڈا ہو جانے کے احساس نے اسے چونکایا۔

"بن گئی۔۔۔؟" حارث جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"یہ پیالی تو اب پی لیجئے۔ اور کچھ میں نے تھرماس میں ڈال دی ہے۔ گرم رہے گی جب ضرورت پڑے پی لیجئے گا۔"

"جب ضرورت پڑے۔۔۔؟" وہی خوبصورت ہنسی ایک قہقہہ بن کر اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ "وہ تو ہر وقت رہتی ہے۔ بیٹھ کر ابھی ابھی ساری ختم کر دوں گا۔"

صاحباں بھی ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے اس کی نگاہ حارث کی میز پر دھری گھڑی پر جا پڑی۔ "ارے! بارہ بج گئے اور میری بی بی جانے میں مر گئی۔ وہ تو ابھی تک برآمدے میں ہی کھڑی ہوں گی۔" صاحباں نے جلدی جلدی برتن وغیرہ سمیٹے۔ "چائے پی کر سو جائیے گا۔ کوئی کام وام کرنے کی ضرورت نہیں۔ صبح آپ کا ناشتہ کبیر خان لے کر آئے گا۔"

"لیجئے۔ ہمارا اور آپ کا معاہدہ پہلے روز ہی کینسل ہو گیا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"معاہدے میں کبیر خان قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ صرف آپ تھیں۔"

"اوہ۔۔۔!" وہ ہنس پڑی۔ "بڑی پھنسی صاحباں! تو بڑی پھنسی۔۔۔" وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بڑبڑائی۔

"تو توڑ دیجئے معاہدہ۔"

"خواہ مخواہ توڑ دوں۔۔۔ منہ میں عورت کی زبان رکھتی ہوں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"اور میں نے سنا ہے عورت کی زبان بڑی بے زبان ہوتی ہے۔" حارث نے ایک بڑی شرارت بھری نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ صاحباں نے ہنستے ہوئے اس کی شرارت کا جواب شرارت سے ہی دیا۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ دیکھ لیں گے کس کی زبان بے زبان ہوتی ہے۔ عورت کی یا مرد کی۔" اور۔۔۔ کوئی مزید بات یا جواب میں حارث کی کچھ سنے بغیر وہ بڑی تیزی سے اپنے جگمگ جگمگ کرتے وجود کو لے کر کمرے سے نکل گئی۔ اسے بی بی کی تکلیف کا احساس شدت سے تھا۔

حارث نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کمرے سے نکلی تو یوں لگا جیسے سارا کمرہ تاریک ہو گیا تھا۔

حارث کے گھر سے نکلتے ہی صاحباں کو بی بی اسی طرح برآمدے میں کھڑی دکھائی دیں۔ اس کی آنکھوں میں بے سارے آنسو آ گئے۔ "ماں تو کتنی عظیم ہے۔ ہمالہ سے بھی زیادہ۔"

اور ایک ماں کی عظمت کے سامنے انتہائی عقیدت سے سر جھکانے وہ گھر کو روانہ ہو گئی۔

بہت رات گئے وہ بستر پر لیٹی تھی۔ مگر نیند اس وقت بھی آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔ ذہن اتنا مصروف تھا کہ نیند کو بھی پاس آنے کی ان کی سرگرمیوں میں دخل انداز ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔

حارث کی بیماری اس کی سوچوں کا مرکز تھی۔

صاحباں کو بے انتہا دکھ تھا کہ بی بی کا اکلوتا بیٹا جوانی کی عمر میں اک ایسے موذی مرض میں مبتلا تھا کہ جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ مرض سیدھا سادا تو نہ تھا۔ اگر ہوتا تو حارث بیچارا کیوں اتنی تکلیف اٹھاتا۔

بی بی روز اول سے ہی بیٹے کے ساتھ صلح و ملاپ کی گھڑی دیکھنے کی نہ صرف منتظر بلکہ خاصی بے تاب تھیں۔

اور اب۔ اب تو حارث کا کھانا وغیرہ بھی یہیں، ان کے اپنے گھر میں، ان کے اپنے ہاتھوں سے بننے کی انہیں نوید مل گئی تھی۔ جس سے وہ اور بھی پرامید ہو گئی تھیں۔ کہ۔۔۔

جلد۔۔۔ چند دن میں ہی شاید۔۔۔ وہ وقت آنے والا تھا جب صاحباں نے جھگڑے کی ساری بات پوچھ پوچھ، سارے راز اگلوا کر پھر اپنی ذہانت اور عقل و فہم سے ساری رنجش اور جھگڑا وغیرہ دور کر کے ان ماں بیٹے کو ملوا دینا تھا۔ ضرور۔ ضرور بالضرور۔

بی بی کو پورا یقین تھا۔ اپنے جذبوں کی صداقت کا بھی اور صاحباں کی کامیاب کوششوں کا بھی۔

لیکن۔ ادھر صاحباں کے راستے میں اک نئی مشکل آن پڑی تھی اور وہ تھی حارث کی بیماری۔ بار بار اس کے جسم ناتواں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑنے والے پر شدت کے دورے۔ جن کے باعث اس کی ہر کوشش مسدود ہو کر رہ گئی تھی۔

اب اسے یہ اندازہ بخوبی ہو چکا تھا کہ جب بھی اس کے ماضی، اس کے گھر اور اس کے والدین کے متعلق کوئی بات ہوتی تھی۔ تبھی اس پر اس مرض کا حملہ ہوتا تھا۔ اس صورت میں بھلا کوئی بھی بات پوچھنے کی یا راز اگلوانے کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی۔

کیسا عجیب سا معاملہ تھا۔ جب تک حارث کا مرض موجود تھا وہ اس کے ماضی کی، اس کے والدین کی کوئی بات اس سے نہ کر سکتی تھی۔ اور مرض ڈاکٹروں کی رائے میں لاعلاج تھا۔

تب۔ وہ کرے تو کیا کرے۔۔۔؟ کیسی پریشانیاں تھیں۔ کیسی الجھنیں تھیں۔؟

بی بی کی آس اور بے تابیاں۔ حارث کا لاعلاج مرض۔ جھگڑے کا راز جس سے صرف حارث واقف تھا۔ اور۔۔۔ والدین کی کوئی بات اس کے سامنے ہوتی تھی تو اس کا مرض اس پر شدت سے غالب آ جاتا تھا۔

سب ڈوریاں آپس میں کچھ اس طرح الجھی ہوئی تھیں کہ ایک سرا صاحباں پکڑتی تو دوسرا ہاتھ نہ لگتا۔ کیا کرتی۔۔۔؟ کس طرح ان الجھنوں سے نکل پاتی؟ پریشانی لمحہ بہ لمحہ سوا ہوتی جا رہی تھی۔

سوچ سوچ کر صاحباں صرف دکھی ہوتی رہی اور مارے پریشانی کے آنکھوں میں درد کے آنسو جمع ہوتے رہے۔ پتہ نہیں کس کس کے درد کے آنسو۔ بی بی کے یا حارث کے۔ جس کی طرف دھیان لے جاتی۔ دل ایک جیسا ہی کراہ اٹھتا۔

اور یوں۔ نیند دور بھاگتی رہی۔ سوچ سوچ کر بھی جب کوئی راہ نہ سوجھی تو بے بسی آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگی۔ ان دونوں اور دشعلے بن کر جی کو جلانے لگا۔

کب تک روتی رہی۔ کتنا روئی۔ کتنی مالائیں پروئیں۔ کتنا جی کو جلایا۔ اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔

البتہ۔ جب ہوش میں آئی تو کمرے میں اجالا ہی اجالا تھا۔ روتے روتے کچھ سوئی بھی تھی شاید۔ مگر اسے کچھ علم نہ تھا کہ اس پر کیا کچھ بیتی۔۔۔

اردگرد روشنی پھیلی دیکھی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ہر طرف سورج کی کرنیں رقصاں تھیں۔

"اوہ۔۔۔!" فجر کی نماز قضا ہونے کا اسے بے حد دکھ ہوا۔

گھڑی دیکھی ساڑھے سات بج رہے تھے۔ پریشان سی اٹھ کر عجلت سے غسل خانے میں جا گھسی۔

بی بی نے بھی تو حد کر دی تھی۔ اگر رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی تو وہی اسے جگا دیتیں۔ دل میں ان سے شکوہ کرنے کے بعد خیال آیا کہ پہلے ہمیشہ تو وہ نماز کے وقت اسے ضرور آواز دے لیا کرتی تھیں۔ آج پہنچنے کا م کو نکل لیا۔

انہی سوچوں میں کھوئے کھوئے وہ غسل خانے سے باہر نکلی۔ تو سنرجانہ ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع لیے چلی آرہی تھی۔
"لیکن میں ابھی کیسے ناشتہ کرسکتی ہوں۔ مجھے تو حارث کے لیے ناشتہ لے کر جانا ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہوچکی ہے۔"
"حارث صاحب کا ناشتہ کیا مطلب...؟"
"کیا تمہیں نہیں معلوم...؟"
"کیا چھوٹی بی بی..."
"آئندہ سے حارث کا کھانا اور ناشتہ نہیں بنا کرے گا۔"
"نہیں تو..."
"نہیں...؟" صاجیاں مارے تعجب کے چلا سی پڑی۔
"اوہ رات میں نے بی بی کو بتایا بھی تھا۔"
"پھر مجھے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔"
بال درست کرنے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ برش وہیں ڈریسنگ ٹیبل پہ پٹخ، بال اسی طرح پھیلے بکھرے بے مہار صاجیاں تیز تیز قدموں سے کھانے والے کمرے کی طرف چل دی۔
"ابھی بی بی سے پوچھتی ہوں نا۔ کہ کیا میں نے رات کو انہیں بتایا نہیں تھا۔"
وہ خاصی بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے آندھی بگولے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔
"بی بی..." نہ انہیں سلام کیا، نہ صبح بخیر کہا۔
ورنہ پہلے تو اس نے ایسی بدتمیزی کبھی نہ کی تھی۔ صبح جب بھی بی بی کا سامنا ہوتا سلام دعا پہلے ہوتی پھر کوئی دوسری بات۔
"بی بی! میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ آئندہ سے حارث کا کھانا وغیرہ نہیں بنا کرے گا۔" لہجہ بہت تیز تھا۔
"بتایا تھا..." انہوں نے اتنے ہی تحمل سے جواب دیا۔
"پھر آپ نے سنرجانہ کو کیوں باخبر نہیں کیا...؟"
"اسے بتانے کی کیا ضرورت تھی...؟"
"اس نے حارث کا ناشتہ بنایا ہی نہیں۔"
صاجیاں بے حد جوش میں تھی۔ رنگ سرخ ہو رہا تھا۔
"حارث کا ناشتہ اس کو نہیں بنانا تھا۔ وہ ذمہ داری میری ہے بیٹی۔ صرف میری..."
بی بی نے بڑے دھیمے انداز اور انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
"تو پھر اچھی ذمہ داری آپ نے بھی نبھائی۔"
وہ اسی طرح غصیلے لہجے اور پرجوش انداز میں بولی۔
"مجھے ناشتہ کرنے کے لیے بلا بھیجا ہے۔ خود ناشتے کی میز پہ بیٹھ چکی ہیں اور اس غریب کا کوئی دھیان ہی نہیں۔"
وہ اس وقت کافی غصے میں تھی اور بہت جھنجلائی ہوئی بھی تھی۔ بی بی نے اس کا یہ انداز قدرے حیرت سے دیکھا۔
صاجیاں تو ہمیشہ سے بڑے دھیمے مزاج کی مالک تھی اور اب بغیر کسی وجہ کے ہی الجھی بکھری جارہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں۔
"اس کا ناشتہ سب سے پہلے تیار کیا تھا۔"
حیرت کے باوجود بی بی کا مزاج اسی طرح ٹھنڈا اور لہجہ میٹھا میٹھا سا رہا۔ جانے کیوں اسے اس عالم میں دیکھ کر اس پہ پیار آرہا تھا۔
"خود اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔"
"تو پھر انہیں بھیجا کیوں نہیں؟ مجھے جگالیا ہوتا۔"
"جس وقت تمہیں روز جگاتی ہوں اس وقت میں اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے میں مصروف رہی۔ پھر ناشتہ تیار ہوا تو دیکھا گھر سے نکل کر کہیں جارہا تھا۔"
"کیا...؟" صاجیاں کے لیے اک اور حیرت۔
"...۔ وہ بھی چلا گیا۔ تمہاری نماز بھی قضا ہوگئی۔ پھر تمہیں جگا کر بے آرام کرنے سے فائدہ۔ پہلے ہی رات کو دیر
...شتہ بھیجا ہی نہیں؟"

"ارے بھئی بتایا نا کہ وہ تو چلا گیا۔ پھر کس کو بھیجتی...؟"
"اوہ...!" غصے اور جھنجلاہٹ کی بجائے صاجیاں پر گھبراہٹ سوار ہوگئی۔
"لیکن بی بی! وہ کہاں چلے گئے؟"
"مجھے کیا معلوم...؟" بی بی معصومیت سے بولیں۔
"لیکن وہ تو جا نہیں سکتے تھے۔" تجسس کی زیادتی کی وجہ سے بلند آواز میں ہی بڑبڑانے لگی۔
"کیوں...؟" بی بی نے پوچھا تو اسے کچھ ہوش آیا۔
"وہ... وہ..." حارث کی بیماری کا بی بی کو نہ بتایا تھا اور نہ ہی بتانا تھا۔ تب جلدی سے سوچ کر بات بنائی۔ "میرا مطلب تھا کہ وہ بغیر ناشتے کیسے چلے گئے۔ انہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔ مجھ سے وعدہ کیا ہوا تھا۔"
"میں خود حیران تھی۔"
"آپ نے بی بی! اپنی آنکھوں سے انہیں جاتے دیکھا؟"
جیسے اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔
"ہاں..."
"وقت کیا تھا...؟"
"تقریباً سات بجے ہوں گے۔"
"یہ تو دفتر کا وقت ہے۔ لیکن اس بیماری کے عالم میں؟"
صاجیاں بڑی تشویش سے اسی کے متعلق سوچتے ہوئے ناشتے کی میز پہ جا بیٹھی۔
"لیکن نہیں۔ ان کی جانے والی حالت نہیں تھی۔ یہ ممکن نہیں۔"
بی بی کی چشم دید گواہی کا بھی جیسے یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ توس ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ پھر واپس رکھ دیا۔
"کیوں...؟"
بی بی کی نگاہ اس کے متفکر چہرے پہ ہی جمی تھی۔ انتہائی تردد سے پوچھنے لگیں۔ "توس کیوں واپس رکھ دیا۔؟"
"ایسے ہی بی بی۔" وہ چپ سی ہوگئی۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ "میرا خیال ہے۔ جا کر پہلے انہیں دیکھ آؤں ہوسکتا ہے آپ کو غلطی لگی ہو۔"
"غلطی...؟ حارث کے معاملے میں صاجیاں؟ بھلا مجھے غلطی لگ سکتی ہے؟"
ماں بیٹی کی باتیں سن سن کر حیران پریشان چہرہ لیے کھڑی سنرجانہ سے بی بی مخاطب ہوگئیں
"سنو نا ذرا پگلی کی باتیں۔"
"جی...؟" سنرجانہ خود ہر بات، ہر معاملے سے لاعلم تھی۔ جواب میں صرف چہرے پہ حماقت سی برسا کر رہ گئی۔
"کمال ہے۔ کیوں چلے گئے اور کیسے چلے گئے۔؟؟"
صاجیاں کچھ بھی نہیں کھا رہی تھی۔ میز پہ کہنیاں ٹکائے، ہتھیلیوں میں چہرہ لیے بیٹھی سوچے جارہی تھی۔
"رات کو اتنی زیادہ طبیعت خراب تھی۔ اب انہیں کہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔ ابھی آرام کرنا چاہیے تھا۔"
"تم تو ناشتہ کرو۔" بی بی کی نگاہ بھی اسی پہ تھی۔
"جی بی بی...!" وہ ان کی آواز پہ چونکی۔ "کیا کہا آپ نے؟"
"میں کہہ رہی ہوں تم تو کچھ کھاؤ۔"
"پریشانی میں کچھ بھی نہیں کھایا جارہا۔"
اچانک ہی صاجیاں کے منہ سے نکل گیا۔
"پریشانی؟ کیسی پریشانی...؟"
"وہ... وہی... مجھے اپنا وعدہ نہ پورا کرسکنے کی پریشانی ہے۔"
"لو... دیکھو تو پگلی! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ وعدہ پورا نہیں ہوسکا تو یہ قصور تمہارا تو نہیں۔ اسے ذرا سا انتظار کرلینا چاہیے"
بی بی نے پورے انصاف کی بات کی لیکن دوسرے لمحے مامتا بھی دل میں مچل اٹھی۔ اس کی طرف سے بھی جیسے صفائی پیش کرنا ضروری ہوگیا۔
"ہوسکتا ہے اسے یاد ہی نہ رہا ہو کہ ناشتہ یہاں کرنے کے لیے کہہ چکا ہے۔ اس لیے منہ اندھیرے اپنے کام کو نکل گیا۔"

اس کی طرف سے مکمل صفائی پیش کرنے کے بعد وہ صاحباں کی پریشانی رفع کرنے کے لیے کہنے لگیں۔

"اس صورت میں اس نے گھر میں ہی یا پھر باہر کہیں ناشتہ کرلیا ہوگا۔ تم پریشانی چھوڑو اور ہاتھ بڑھاؤ۔ کرو ناشتہ۔"

بی بی کی تسلیاں بھی اسے کوئی تسلی نہ دے سکیں۔ کیونکہ وہ اصل حالات سے ناواقف تھیں اور صرف صاحباں ہی جانتی تھی کہ وہ بہت بیمار تھا اور اس بیماری کی حالت میں اگر کہیں گیا بھی تھا تو بہت دیر وہاں رک نہیں سکتا تھا۔

بی بی کے مجبور کرنے پر وہ ناشتہ کرنے کو تیار ہوگئی۔ انڈے والی پلیٹ اپنے آگے کھسکا کر اس پر نمک چھڑکا، کالی مرچ چھڑکی۔ توس لے کر مکھن لگایا اور... کھانے ہی لگی تھی کہ پھر حارث کا خیال آگیا۔ ہوسکتا تھا وہ کچھ دیر کے لیے کہیں گیا ہو اور واپس آچکا ہو۔ اس کے بعد تو کسی نے نہیں دیکھا۔

توس واپس انڈے والی ہی پلیٹ میں رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آج سے وہ ہمارا مہمان ہے بی بی۔ بہتر ہے میں پہلے اسے دیکھ ہی آؤں۔" اپنی ذمہ داری تو پوری ہو جائے گی۔

اب وہ بی بی کو کیسے بتاتی کہ رات کو اسے ایسی خستہ حالت میں چھوڑ کر آئی تھی کہ دل کو کسی طرح چین آ ہی نہیں سکتا تھا۔ دشمن بھی ہوتا تو وہ بھی تھوڑا سا ہی سہی خیال ضرور کرتا اور یہ صاحباں!

یہ تو نہ صرف اس کی ماں کی ساری شفقتیں سمیٹے بیٹھی تھی بلکہ اس کی ساری وراثت کی حقدار بنی ہوئی تھی۔ اس کے حصے کی ساری آسائشیں اور آرام راحت جاں کئے تھی۔

اس پر اس کے کچھ قرض تھے۔ چلو وہی چکانے کی خاطر سہی۔ کچھ اک بیمار کے فرائض جو تندرست انسان پر عائد ہوتے ہیں، ان سب باتوں کا خیال کرتے ہوئے اب وہ رک نہ سکی۔

"لیکن بیٹی..." بی بی جانے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ صاحباں نے سنا ہی نہیں۔

"یہ اچھا نہیں لگتا بی بی! کہ وعدہ کرنے کے باوجود میں آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کرلوں اور ان کی خیر خبر ہی نہ معلوم کروں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا۔ ناکہ اگر وہ ابھی تک واپس نہ آچکے ہوں گے تو دروازہ بند ملے گا، مگر کم از کم میری ذمہ داری تو پوری ہو جائے گی۔ میرے دل کو تو تسلی ہو جائے گی۔ کہ وعدہ پورا کرلیا۔"

اور اب بی بی کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر وہ کمرے سے نکل گئی۔

حارث کے گھر پہنچی۔ دروازہ بند ضرور تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ "کہا تھا میں نہ کہتی تھی کہ وہ اس بیماری کے عالم میں کہیں نہیں جاسکتے۔" صاحباں نے خود سے ہی بات کرتے ہوئے دروازہ ذرا سا دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ اندر سے بھی بند نہیں تھا۔

"شکر ہے۔" اس نے اک طویل سا اطمینان بھرا سانس لیا۔ ساتھ ہی پورے وجود میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اسی ترنگ میں اندر قدم رکھا۔

وہ اس کمرے میں نہیں تھا۔ یہ تو اس کی عادت تھی کہ خود خواب گاہ میں بھی ہوتا تو باقی سارے گھر کے دروازے کھلے رہتے۔

صاحباں وہاں سے گزر کر سیدھی اس کے بیڈروم میں جا پہنچی۔ وہ وہاں بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تو پلنگ پر پھیلا ہوا کمبل ہٹا کر دیکھنے لگی۔ جیسے وہ کوئی کاغذ کا بنا ہوا انسان تھا جو اس کمبل کے نیچے بھی موجود ہوسکتا تھا۔

پہلے دن تو تاریکی کی وجہ سے وہ اسے کمبل کے نیچے پڑا دکھائی نہیں دیا تھا مگر آج تو سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے کمرے میں بڑی آن بان سے پھیل کر ہر چیز کو اجاگر کئے دے رہی تھیں۔ آج تو کمبل ہٹا کر اسے تلاش کرنے کا کوئی جواز ہی نہ تھا مگر اس کی پریشانی نے کچھ سوچا ہی نہیں۔

"حارث صاحب... ! حارث صاحب... !!"

تب وہ وہیں کھڑے کھڑے اسے زور زور سے پکارنے لگی۔

مگر صاحباں کی ہر صدا، صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

پھر وہ گھبرا کر اسے ہر جگہ تلاش کرنے لگی۔ لیکن۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ کہیں نہیں ملا۔ اس کے گھر کا کونہ کونہ اس نے دیکھ ڈالا۔

ایک بار ہی نہیں... دو تین بار اس نے اس کے پورے گھر کی تلاشی لی۔ سوئی سلائی کی طرح اس نے اسے ڈھونڈا۔ کمروں کے علاوہ پلنگ کے نیچے، صوفوں، کرسیوں اور میزوں کے نیچے جیسے وہ کوئی مداری والے کا بندر تھا اور اسے ستانے کی خاطر کسی ایسی ہی جگہ پر چھپ گیا تھا۔

آخر... تلاش بسیار کے باوجود۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ "اوہ... !" تو گویا بی بی کی اطلاع درست تھی۔

مگر۔ وہ اس بیماری کے عالم میں کیوں چلا گیا؟ اور پھر یوں سارا گھر کھلا چھوڑ کر۔ یقیناً کوئی ایسی بات ہوگئی تھی۔ جو

...کر دروازے کھلے چھوڑ دینا اور بات تھی لیکن یہ...

...مقفل کرنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ گھر میں رہ

یہ تو سراسر پریشانی کی بات تھی۔ گھر سے باہر جاتے ہوئے تو کبھی کوئی یوں گھر مقفل کئے بغیر نہیں جاتا۔ ...زیادہ بیمار ہوگیا ہوگا۔ تبھی نہیں سوچا ہوگا۔ اور... اب تک پڑا ہوگا کسی ڈاکٹر کے کلینک میں۔ یقیناً دوائی لے کر واپس آنے کی بھی اس میں ہمت نہ رہی ہوگی...

صاحباں کی پریشانی کئی گنا بڑھ گئی۔ اسی پریشانی میں کھوئے کھوئے بلا مقصد ہی اس نے کمروں کے تین چار چکر لگا ڈالے۔ عجیب سا ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت قیمتی چیز گم ہوگئی تھی اور اب اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

بڑی دیر تک کسی آوارہ روح کی طرح کمروں کے چکر لگانے کے بعد اس نے اس کی خواب گاہ کا، اس کے باورچی خانے کا، اس کے اٹیچ باتھ روم کا... غرض سب دروازے بڑی احتیاط سے بند کرتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لی۔ مڑ مڑ کر بار بار جب تک اس کو گھر نظر آتا رہا دیکھتی رہی۔

واپس... پہنچی تو بی بی ابھی تک ناشتے کی میز پر بیٹھی تھیں۔ اور ناشتہ سارے کا سارا اسی طرح پڑا تھا۔ بی بی نے بھی کچھ نہ کھایا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"شکر ہے تمہارا وعدہ نہیں ٹوٹا۔"

اس کی حالت دیکھ کر بی بی بڑبڑائیں۔ "تمہاری ذمے داری بھی پوری ہوگئی۔ چلو اب ناشتہ کرو۔"

صاحباں تب بھی کچھ نہیں بولی۔ اسی شکست خوردہ سے انداز میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"وہ کبھی بھی ایسا نہ تھا۔ جب تک میرے پاس رہا وہ بھی وعدہ ہمیشہ پکا ہی کیا کرتا تھا۔"

بی بی نے ناشتے کی چیزیں اس کی طرف سرکانا شروع کردیں۔

"مگر ان گزرنے والے چھ سالوں نے جب اس کے دل سے ہماری محبت نکال پھینکی ہے تو دوسری عادات کیوں نہ بدل دی ہوں گی۔ وہ، وہ نہیں رہا شاید۔"

"نہیں نہیں۔" صاحباں ایک دم سے بولی "وہ بدلے نہیں ہیں۔ وہ ویسے ہی ہیں بی بی۔"

اور... چاہنے کے باوجود صاحباں انہیں یہ بتا نہ سکی کہ ان سے اب بھی اسے کتنی محبت تھی کس انداز میں اور کس لہجے میں وہ اپنی بی بی کی بات کرتا تھا۔ رہیں دوسری عادات، تو وہ تو اس کی نگاہ میں اس وقت کوئی بھی نہ تھیں۔

نہ اس کی بداخلاقی، نہ بدمزاجی، نہ اکھڑپن۔ اس وقت اس کا کوئی بھی عیب یاد نہیں تھا۔ بس خیال تھا، فکر تھا تو یہی کہ پچھلی رات اسے کافی بری حالت میں چھوڑا تھا اور اب وہ کہیں چلا گیا تھا تو کیوں؟ جا نہیں سکتا تھا پھر بھی چلا گیا تھا۔ کیوں...؟

فکر اور پریشانی کے مارے اس سے ناشتہ بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ مگر بی بی نے قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ کچھ نہیں کھائے گی۔ تب تک وہ بھی بھوکی بیٹھی رہیں گی۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی صاحباں نے کبیرے کو بلا کر کچھ ہدایات جاری کر دیئے کہ اسے آج کوئی اور کام نہیں کرنا تھا وہ بس حارث کے گھر کی طرف نگاہ رکھے۔ حفاظت کی خاطر بھی اور اس کی واپسی کی انہیں اطلاع دینے کے لیے بھی۔

"کبیر خان کو اپنے کام کرنے دو۔"

صاحباں جب اسے اچھی طرح سمجھا چکی تو آخر میں بی بی بولیں۔ "بازار سے بہت ضروری سودا لانا ہے۔ صبح اگر وہ ناشتہ بھول گیا تو دوپہر کا تو اس کا کھانا یقیناً بنے گا ہی۔"

"ہاں۔ یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں آیا۔ پھر بی بی! ان کے گھر کا خیال کون رکھے گا اور ان کی واپسی کی فوری اطلاع ہمیں کیسے ہوگی؟"

"فوری اطلاع کی کیا ضرورت ہے۔ اب کھانا تو دوپہر کو ہی جائے گا نا۔"

"اوہ... ! ہاں..." وہ بری طرح گھبرا گئی۔ یہ کہیں آج وہ پاگل تو نہیں ہوگئی تھی۔ اسے اپنی عجیب و غریب حرکات کا اب تھوڑا سا احساس ہوا۔ "میرا اصل مطلب یہ تھا بی بی! کہ گھر کھلا پڑا ہے۔ بس ہر لمحہ کسی کی نگاہ رہے۔"

"وہ۔ میں جو ہوں..."

"آپ... ؟ کیا مطلب... ؟" صاحباں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "آپ یہ ڈیوٹی دیں گی؟"

"ہاں۔ کیا حرج ہے... ؟"

بی بی بے نیازی سے بولیں۔

"پہلے صرف اپنے جذبوں کی خاطر کھڑکی میں گھنٹوں کھڑی رہا کرتی تھی۔ آج کام سے یا ضرورت سے دو چار گھنٹے کھڑی ہو جاؤں گی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اس کے گھر کی حفاظت مقصود ہے نا۔ یوں بھی اولاد کے لیے ماں کیا کچھ نہیں کرسکتی۔ سب کچھ کر گزرتی ہے..."

سب کچھ تو بی بی بڑبڑاتے ہوئے ابھی سے دو رکعت کی نیت باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔

صاحباں کو بی بی کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ "پروردگار! تو اپنے انسانوں کو کیسی کیسی آزمائشوں میں ڈال چھوڑتا ہے۔ میرے مولا امتحان اب ختم بھی کر دے۔"

صاحباں خود تفکرات میں ڈوبی ان کے لیے دعائیں کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ پڑھنا چاہا۔ پڑھا نہیں گیا۔ ریڈیو لگایا۔ ایک دو منٹ بعد وہ بھی بند کر دیا۔ وہی موسیقی، وہی فیچر، مکالمے جو کبھی اچھے لگتے تھے۔ اب کچھ بھی پسند نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اور بھی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

پریشانی سی پریشانی تھی۔ یوں جیسے حارث اس کی اور صرف اس کی ذمہ داری اور ملکیت تھا اور وہ اسی کی کسی غفلت کی وجہ سے کہیں کھو گیا تھا۔ ایسے ہی بے کار سی ٹوٹی بکھری، سوچوں میں کھوئی بیٹھی رہی۔

"صاحباں! بیٹی حارث آ گیا ہے۔"

بی بی کی آواز کانوں میں یوں اتری جیسے اچانک شہنائیاں گونج اٹھیں۔ وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کیا وقت ہوا تھا؟ کتنے گھنٹوں بعد آیا تھا؟ اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ اپنی خبر نہ تھی تو وقت کا احساس کیسے ہوتا۔

"پھر صاحباں! کھانا تو اس کا بنے ہی گا نا؟" اسے جاتے جاتے بی بی نے پکارا۔

"کیوں نہیں بی بی ضرور بنے گا۔"

ایک لمحہ کے لیے رکی۔ اسی ملکیت اور ذمہ داری کے احساس کے تحت پورے وثوق کے ساتھ جواب دیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے گھر چل دی۔

اس تک پہنچنے کے لیے وہ اتنی بے تاب تھی کہ تیز چلنے سے دو تین بار ٹھوکر بھی لگی۔ بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچی۔ مگر رفتار میں فرق نہ آیا۔

کسی محبوب کے دل کی طرح دروازہ کھلا ہی تھا۔ وہ بغیر دستک دیئے، بغیر اطلاع کیے سیدھی اندر بڑھتی چلی گئی۔ حارث سامنے ہی اپنے اسی مخصوص سے صوفے پر جھکا بیٹھا جوتوں کے بند کھول رہا تھا۔

صاحباں کے قدموں کی آہٹ پر اس نے سر اٹھایا۔ وہ عجیب اڑی اڑی سی رنگت اور پریشان سا چہرہ لیے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

"کیوں ... ؟ کیا ہوا ... ؟"

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" حارث کی بات تو نہیں سنی۔ البتہ اس کی آنکھیں خود پر گڑی پائیں تو جلدی سے پوچھنے لگی۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔"

وہ جوتوں کے بند ادھ کھلے چھوڑ، اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

صاحباں نے حیرت و استعجاب سے اس کے مسکراتے ہونٹوں والے بے حد شگفتہ چہرے کی طرف دیکھا۔ رات والی اس کی ٹوٹی ہوئی کیفیت کا وہاں شائبہ تک نہ تھا۔

"مگر یہ آپ کے چہرے پر ہوائیاں سی کیوں اڑ رہی ہیں؟"

"ان ہوائیوں کا مطلب تو بعد میں بتاؤں گی۔"

کئی منٹ، کتنے گھنٹے صاحباں نے جس قیامت کی پریشانی میں کاٹے تھے۔ وہ کچھ وہی جانتی تھی۔ حارث کو ٹھیک ٹھاک ہنستا مسکراتا سامنے دیکھا تو وہ ساری پریشانی، ساری اذیت غصہ بن کر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی۔

یہ شخص ہر طرح ہی باعث تکلیف تھا۔ بیمار تھا تو تب اور اب ٹھیک تھا تو۔ تو بھی اتنے گھنٹوں کا اسے دکھ اور پریشانی کا جہنم دے گیا۔

"پہلے آپ یہ بتایئے کہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔؟"

غصہ اور کھولن سے چہرہ بھی سرخ تھا اور پوچھنے کا انداز بھی وہی تھا جیسے اپنے کسی زر خرید پر کوئی ملکیت کا اظہار کرتے ہوئے اس سے اس کے ایک ایک منٹ کا حساب مانگے۔

"رات کو آپ کی طبیعت اتنی خراب تھی اور صبح سیر سپاٹے کو چل پڑے۔"

صاحباں کا جمال تو حسین تھا ہی اس کا جلال بھی کم پرکشش نہ تھا۔ چہرے پر سینکڑوں گلابوں کی سرخی۔ آنکھوں میں بجلیاں۔ خوب صورت ہونٹوں پر حسین ترین کپکپاہٹ۔ بے شک غصے کی تھی۔ لیکن اسے ایسا حسن بخش رہی تھی کہ حارث دیکھنے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔؟"

یوں بالکل اپنوں کی طرح اس سے پوچھ گچھ کرتی ہوئی وہ اسے اتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اتنی اپنی لگ رہی تھی کہ وہ یہ خواب توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بس چپ کھڑا اسے دیکھے ہی چلا گیا۔

"یہ کیا ہو گیا آپ کو۔ میری بات کا جواب نہیں دے رہے؟"

وہ پھر غصے میں لہرائی۔

زبان سے اب بھی کچھ بولنے سے پہلے حارث نے آگے بڑھ کر اسے دونوں کندھوں سے تھامتے ہوئے آہستہ سے صوفے پر بٹھایا اور بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے متبسم لہجے میں کہنے لگا۔

"پہلے یہ بتایئے میڈم! آپ کے جمال میں اتنے زبردست جلال کی آمیزش آخر کیوں ہو گئی؟ کیا قصور سرزد ہو گیا مجھ غریب سے؟" پھر بڑے خوب صورت انداز میں ہنستے ہوئے انتہائی پر اخلاق اور شائستہ لہجے میں بولا۔

"ویسے جمال و جلال کے آمیزے سے خاصا حسین اور پرکشش پیکر تیار ہوا ہے۔ بہت، بہت پسند آیا۔" وہ عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

تعریف کرنے کا اس کا انداز اتنا پیارا تھا کہ صاحباں کا غصہ آپ ہی مدھم پڑنے لگا۔

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے اور میں اتنا پریشان ہو گئی تھی۔"

"پریشان؟ وہ کیوں ... ؟"

"آپ صبح سویرے چلے کہاں گئے تھے؟"

"دفتر ..." اس نے اسی خندہ پیشانی سے مختصر سا جواب دیا۔

"دفتر ...؟" صاحباں حیرت کے مارے چلا سی پڑی۔

"اتنی طبیعت خراب تھی۔ پھر بھی دفتر چلے گئے۔ کیوں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ آپ کا وجود بڑا بابرکت ہے۔ رات کو بے شک میری طبیعت بڑی خراب تھی مگر صبح ہوتے ہوتے معجزانہ طور پر بالکل سنبھل گئی۔"

سنجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ پھر مسکرا پڑا۔ "ویسے پہلے کبھی اتنی جلد افاقہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ جانے کس کی دعاؤں نے اثر کیا۔ کیا آپ نے گھر جا کر میرے لیے دعا کی تھی۔؟"

"میں نے؟ میں نے ...؟" وہ بوکھلا سی گئی۔

وہ تو تقریباً ساری رات ہی اس کے لیے دعائیں مانگتی رہی تھی اور ساتھ ساتھ روتی بھی رہی تھی ... مگر ... نہیں نہیں۔ یہ اس کی ماں کی، بی بی کی دعاؤں کا اثر تھا۔ وہ کون ہوتی تھی اس کے لیے دعائیں کرنے والی۔

یہ اعتراف نہ وہ اپنے آپ سے کرنا چاہتی تھی اور نہ حارث کے سامنے کسی ایسی کمزوری کا اظہار۔ یہ سب غلط تھا۔ یہ سب غلط تھا۔ اس نے خود کو پورے خلوص سے جھٹلا دیا اور ... حارث کو کوئی ایسا جواب دینے ہی لگی تھی کہ وہ خود ... بول پڑا۔

"چلیے چھوڑیئے اس بات کو۔ دعاؤں میں کچھ نہیں پڑا ہوا۔ اور نہ ہی مانگنا چاہئیں۔ میرا یہی تجربہ ہے۔ دعا بہت کم قبول ہوتی ہے ..." پھر موضوع بدل کر وہ جلدی سے کہنے لگا۔ "صبح طبیعت بالکل ٹھیک تھی تو میں نے سوچا۔ آج دفتر چلا جاؤں۔ بلاوجہ اپنے فرائض سے کترانا یا منہ موڑنا بھی تو اک بددیانتی ہے۔ مہینے کے بعد تنخواہ پوری وصول کرتا ہوں تو کام بھی پورا کیوں نہ کروں۔ تب میں جلدی سے اٹھا اور دفتر چلا گیا۔"

"اور ناشتہ ...؟ اس کا کیا کیا ...؟"

"کچھ نہیں ..."

"کیا مطلب ...؟"

"کیا ہی نہیں ..." سادگی بھرا معصوم سا جواب تھا۔

"کیوں ...؟" وہ ایکا ایک ہی پھر بھڑک اٹھی۔ "میں کیا مر گئی تھی۔ رات ہی رات میں؟"

"خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔" حارث یک دم ایک نمایاں سی بے قراری کے ساتھ سنجیدگی سے بولا۔ "میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔"

"مجھے نہیں ایسی زندگی چاہیے۔" وہ اسی طرح غصے میں بھری رہی۔ "آپ سیدھی طرح میری بات کا جواب دیجیے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"کیا کیا میں نے؟" غصے میں بھر کر اس کا چہرہ واقعی بڑا حسین ہو جاتا تھا۔ حارث اسے دیکھتے ہوئے شگفتہ انداز میں بولا۔ "آج آپ کو مجھ پر اتنا شدید غصہ کیوں آئے جا رہا ہے۔ ویسے ایمان کی بات ہے۔ جتنا غصہ سجتا میں نے آپ کے چہرے پر دیکھا ہے اتنا ..."

"آپ پھر بات کو بدل رہے ہیں۔" اس نے حارث کی بات کاٹ دی۔ "آپ بتایئے نا۔ رات کو ایک فیصلہ نہیں ہوا تھا؟"

"ہوا تھا۔" اس کی سنجیدگی نے حارث کو بھی سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

"پھر ناشتے کا انتظار کیوں نہیں کیا؟" وہ بڑے بارعب انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ناشتے کا انتظار کرتا تو دفتر سے دیر ہو جاتی۔" اس کے رعب کا مان رکھتے ہوئے، وہ واقعی مرعوب اور نرم لہجے میں بولے…

"اور یہ سوچا ہی نہیں کہ آپ کے یوں غائب ہو جانے سے میں کتنا پریشان ہوں گی۔"

"اس قصور کی آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔" حارث نے اسی نرمی سے جواب دیتے ہوئے سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ…

"معافی..." صاحباں اس کے ہاتھ جھٹک کر علیحدہ کرتے ہوئے اور بھی تیز ہو کر بولی۔ "اب معافی سے کیا فائدہ اور… اتنے گھنٹے آپ فاقہ سے رہے۔ آپ کی حالت ایسی تھی کہ مزید فاقہ کیا جاتا۔؟"

"اوہ... یا تو ہماری ہی خاطر ہم سے جھگڑا کیا جا رہا ہے۔ زہے نصیب۔ زہے نصیب۔" وہ بڑے زور سے ہنسا۔ روتی… ہنسی۔ صاحباں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو برقرار رکھا۔ ورنہ یہ شخص تو اور بھی کھل کھیلتا۔ اسے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں… کی بی بی کو تو تھی اور خود صاحباں کو... نہیں نہیں... اس نے پھر اپنے وجود کو درمیان میں سے نکال لیا۔

"رات کو جب آپ گئی ہیں۔ اس وقت یقیناً میری حالت ایسی نہ تھی۔" صاحباں کو سنجیدہ دیکھ کر اسے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"مگر اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے۔"

انتہائی سنجیدگی سے وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر باڈی بلڈرز کی طرح اپنے بازوؤں کی نمائش کرتے ہوئے دفتر چلے جانے وا… کو درست ثابت کرنے لگا۔ کسی طرح اس کا موڈ تو ٹھیک ہو۔ "ہوں نا اس قابل؟"

"لیکن..." صاحباں اسی رعب و جلال کے عالم میں کچھ اور کہنے ہی لگی تھی کہ حارث نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بس اب لیکن ویکن پھر ہوتا رہے گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے مصالحت بھرے انداز میں بولا۔ "پہلے چائے تو پلا دیجیے۔ یقین کریں آج دفتر میں بھی چائے کی کوئی پیالی نہ… میں نہیں ہوئی۔ چپڑاسی چھٹی پر تھا۔"

"اچھا ہوا۔ ہمارا بنا بنایا ناشتہ برباد کیا ہے نا۔ آپ کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔"

وہ اسی طرح اپنا خوب صورت سا چہرہ پھلائے بیٹھی رہی۔

"یہ ماڈل بھی اچھا ہے۔" حارث نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ایک بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ پھر اس کے سا… کر میز پر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے انتہائی اطمینان سے بولا۔ "ہم بیٹھے اسے ہی دیکھتے رہیں گے۔ کام و دہن کی نہ سہی دل و دماغ کی تو… ہی رہے گی۔ چائے وغیرہ سے بہت بہتر ہے۔ بہت لذت بخش بہت تسکین دہ۔ بہت روح پرور۔"

کافی باتونی تھا۔ صاحباں نے سوچا۔ بولنے پہ آتا تھا۔ تو بولتا ہی چلا جاتا تھا۔ خاصی اچھی اچھی باتیں کر لیتا تھا اور اسے شاید باتوں میں مزہ آتا تھا۔ بنا کچھ بولے بیٹھی سنتی رہی۔

"چائے نہ ملی۔ کھانا نہ ملا تو آپ سوچ رہی ہوں گی کہ اس فاقے سے میں کبھی نہیں بچ سکوں گا۔ مگر محترمہ! مجھے کوئی فرق… پڑتا۔ پچھلے پانچ چھ سالوں میں بہت فاقے گزارے ہیں۔ اوپر تلے کئی کئی۔ مگر اگلی منزل تو تب بھی نہیں ملی اور اب تو۔"

وہ بڑے انداز سے مسکراتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

"اور اب تو کیا...؟" صاحباں بڑی توجہ اور پوری دلچسپی سے سن رہی تھی۔ "بات تو پوری کیجیے۔"

"اب تو ساتھ ٹانک مل رہا ہے۔ طاقت کے انجیکشن مل رہے ہیں۔ اب تو فاقہ بالکل بے ضرر ہے بلکہ کچھ طاقت بخش اور… قلب قسم کی چیز سمجھ لیجیے۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ ٹانک اور طاقت کے انجیکشن سے اس کی مراد صاحباں کی توجہ، ہمدردی اور خلوص تھا۔ مگر... وہ پہلے… جلال میں بیٹھی تھی۔ کھل کر کہہ نہ سکا۔ بس گول مول سی بات شوخی اور مسکراہٹ میں لپیٹ کر کہہ گیا۔

"ٹانک...؟ طاقت کے انجیکشن...؟" صاحباں اس کا معنی خیز انداز سمجھ نہ سکی۔ یا شاید اس طرف دھیان ہی نہیں دینا چا…

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کے ان دوروں کا کوئی علاج نہیں...؟"

"وہ بیان بھی اپنی جگہ درست ہے۔"

"یہ آپ کیسی پہیلیاں سی بوجھوائے جا رہے ہیں؟"

رعب و جلال کے بجائے اب اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

"نہیں سمجھ سکو گی۔ صاحباں بی بی! نہیں سمجھ سکو گی۔"

اس کے سامنے بیٹھا بڑے بامعنی انداز میں اسے تکے جا رہا تھا اور بڑی شگفتگی سے مسکرائے جا رہا تھا۔ آنکھوں میں شوخ سی چمک تھی....

"تو آپ سمجھا دیجیے نا۔"

"سمجھانے سے بھی سمجھ نہیں آئے گی۔ وہ جذبہ نہیں ہے آپ کے پاس۔"

"جی ہاں ہم میں تو جذبوں کی بہت کمی ہے نا۔"

"یہ میں نے کب کہا۔ آپ کو تو بلکہ اللہ میاں نے دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی جذبوں سے نوازا ہے۔"

اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ "رحم، ہمدردی، ترس، اور... اور... میرا خیال ہے اتنے ہی کافی ہیں۔ بہت ہیں۔ خاص طور پر کسی جانور کو انسان بنانے کے لیے تو بہت کافی ہیں۔"

صاحباں بوجھ کر بھی ناسمجھ بن گئی۔

"کبھی ایسے تھے کہ بات بھی کرنا دوبھر تھا اور اب بولنے لگے ہیں تو بولے ہی چلے جا رہے ہیں۔" صاحباں بظاہر اس کی بے تکی [illegible] کہہ کر بڑبڑانے لگی۔ "آپ ہر معاملے میں ہی عجیب ہیں... بالکل عجیب۔"

"یہ تو آپ مجھے پہلے بھی کئی بار بتا چکی ہیں۔ اب کوئی نئی بات بتایئے۔"

وہ ہنسے جا رہا تھا اور صاحباں سچ مچ چڑ گئی۔ "بتاؤں؟"

"بتا دیجیے۔" وہ بڑی دلچسپی سے بولا۔

حیا کی زیادتی سے یا غصے کی زیادتی سے تمتماتے ہوئے صاحباں کے گال شعلے اگل رہے تھے اور حارث کا تن من ان کی حدت سے پگھلا جا رہا تھا۔

"آپ میں عقل کی بھی بہت کمی ہے۔ خاصے بیوقوف ہیں آپ۔"

"ارے ارے! یہ آپ یکایک میری عقل پر کیوں حملہ آور ہو گئیں؟"

"مجھے ابھی ابھی یاد آیا ہے کہ گھر کے ایک کمرے میں موجود ہو کر باقی کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ دینا تو خیر ایسی بہت زیادہ احمقانہ حرکت نہ تھی۔ لاپرواہی کہی جا سکتی ہے۔ یا پھر آپ بیمار تھے۔ مجبوری کہی جا سکتی ہے۔ مگر یوں اچھے بھلے صحت مند ہو کر دفتر جانا اور سارا گھر کھلا چھوڑ جانا۔ یہ کیسی مجبوری ہے؟ سراسر بیوقوفی نہیں...؟"

"میرے خیال میں تو ذرا بھی بے وقوفی والی بات نہیں ہے۔"

"کیا مطلب...؟" وہ متعجب سی ہو گئی۔

"یہ بیوقوفی کی بات نہیں...؟ سارا گھر چوپٹ کھلا ہے اور جناب چار چھ گھنٹوں کے لیے دفتر سدھارے ہوئے ہیں۔"

"بیوقوفی کی نہیں میڈم! جذبے کی بات ہے۔"

حارث کی اس بات پر صاحباں نے ایک بڑا زوردار کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔

"یہ جذبے کی بات ہے...؟"

"مذاق مت اڑایئے۔" حارث یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ "میں نے بڑے خلوص سے گھر کھلا چھوڑا تھا۔"

صاحباں پھر اسی انداز میں ہنسی۔ "چور اچکوں کے لیے بڑے خلوص سے گھر کھلا چھوڑا تھا۔ کہ جب چاہیں آئیں۔ وقت کافی تھا۔ ایک بار نہیں سو بار آئیں اور جو جی چاہے اٹھا اٹھا کر لیتے جائیں... ہے نا...؟"

اس کا مذاق اڑانے کے انداز میں صاحباں ہنستی ہی چلی گئی۔

"کیا انسان گھر کے دروازے صرف چور اچکوں کے لیے ہی کھلے چھوڑتا ہے؟"

حارث بے حد سنجیدہ تھا۔ جھک کر صاحباں کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ صاحباں کی ہنسی یکایک تھم گئی۔

"کیا اپنوں کے لیے گھر کے دروازے کھلے نہیں رکھے جا سکتے...؟"

"کیا مطلب...؟"

حارث کی نگاہوں کے انداز، معنی اور گہرائی سے گھبرا کر صاحباں نے جلدی سے نظریں پھیر لیں۔

"میں نے آپ کے لیے اور صرف آپ کے لیے دروازے کھلے رکھے تھے۔ دانستہ کھلے۔" حارث نے اس کے وجود پر نگاہیں جمائے... اک اک لفظ پر زور دیا۔

"جی ... ؟ جی ... ؟" اس کی بات کے وزن کے مقابلے میں خود وہ بے وزن ہوئی جا رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اُٹھے۔

"میں جانتا تھا کہ آپ میرا حال چال پوچھنے آئیں گی اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ میرے گھر آئیں اور آپ کو اس کے دروازے بند ملیں۔"

"آپ گھر میں نہیں تھے تو دروازے بند ہی ملنا تھے نا۔"

صاجباں اس سے نگاہیں ملائے بغیر بہت ہولے سے بکھری بکھری سی آواز میں بولی۔

"بس یہی بات آپ نہیں سمجھ سکیں گی صاجباں صاحبہ! احساس کی بات ہے۔ جذبے کی بات ہے ... اور ..." مزید کچھ کہتے کہتے یکایک ہی خاموش ہو گیا۔ پھر چند لمحوں بعد دھیمی آواز میں بڑبڑایا "نہیں سمجھ سکیں گی۔"

"ہاں۔ میں بہت بیوقوف ہوں نا۔" وہ بھی اسی جیسی دھیمی آواز میں بڑبڑائی۔ مگر انداز بڑا خجل خجل سا تھا۔

"توبہ توبہ ...!" حارث نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"بھلا میں ایسے کہہ سکتا ہوں۔"

"بہت کچھ کہتے رہتے ہیں۔ یہ بھی کہہ لیجئے۔ بے حس بنایا۔ بے جذبہ بنایا۔ کون سی کمی باقی ہے۔"

"اوہو۔ لگتا ہے آپ بھی مجھ سے کچھ کم نہیں ہیں۔" حارث شوخی سے ہنسا۔ "خاصی جنگجو اور جھگڑالو واقع ہوئی ہیں۔"

"شکر ہے بداخلاق اور بدمزاج نہیں ہوں۔"

"ہاں شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ہے۔ ورنہ یہ ایسے حسین لمحات میری زندگی میں کبھی نہ آتے۔ میں ایک بداخلاقی کرتا تو آپ جواباً دو کر کے بھاگ بھوگ چکی ہوتیں۔"

"اور اب بھاگنے میں کیا فرق ہے۔" اپنی مسکراہٹ ہونٹوں کے اندر ہی دباتے ہوئے صاجباں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ارے! کہاں چلیں ...؟" حارث نے بے قرار ہوتے ہوئے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب تو نہیں جانے دوں گا۔ کبھی بھی نہیں۔ چاہے جان چلی جائے۔"

"میرا ہاتھ تو چھوڑیئے۔"

"سچ کہہ رہا ہوں کہ آج وقت سے پہلے چھٹی کر کے صرف اس لیے گھر آ گیا تھا کہ آپ کی صحبت میں کچھ وقت گزاروں گا۔ تو تھوڑا بہت اخلاق سیکھ لوں گا۔ اور آپ غصہ ہی کئے جا رہی ہیں۔ بھاگی ہی جا رہی ہیں۔"

حارث نے اس کے ہاتھ پر گرفت اور مضبوط کر لی۔ "کسی بھی نقصان کی پرواہ کئے بغیر اتنی نیک نیتی سے صرف اس لیے چھوڑ گیا تھا کہ میں گھر میں موجود ہوں یا نہیں آپ کو میرے گھر کے دروازے کھلے ہی ملیں اور آپ جھگڑا ہی کیے جا رہی ہیں۔ خلوص کا یہ صلہ دے رہی ہیں؟؟"

"میں اپنے گھر تو نہیں جا رہی تھی۔"

صاجباں کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

"آپ نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا ہے۔ چائے بنانے لگی تھی۔"

"اوہ ...!" جیسے حارث کی ساری حیات گنگنا اٹھی تھی۔ مسکراتے ہوئے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پھر اس کے ہاتھ کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"میرے سارے قصور معاف کر دیئے نا ...؟"

"مقدمے کا فیصلہ اسی وقت تو نہیں سنا دیا جایا کرتا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔"

صاجباں نے اپنا ہاتھ بہت آہستہ سے اس کی گرفت سے نکالا اور چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کو چل دی۔

حارث دفتر سے آیا تھا۔ جتنی دیر صاجباں کو چائے بنانے میں لگی۔ وہ لباس تبدیل کر کے منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر، تازہ دم ہو کر وہیں آ بیٹھا۔

صرف چائے کی ایک پیالی لانے کے بجائے آج صاجباں اسی ہارڈ بورڈ والے ٹرے میں چائے دانی، شکر داں، دودھ دان اور اک پیالی بڑے قرینے سے رکھے لیے آ گئی۔

حارث نے اسے آتے دیکھا تو جلدی سے میز پر سے پاؤں اٹھا لیے۔ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور شلوار میں دھلے ہوئے نکھرے چہرے پر رقصاں مسکراہٹیں لیے بیٹھا بے حد جاذبِ نظر لگ رہا تھا۔ ٹرے میز پر رکھتے رکھتے سر اٹھا کر کتنی ہی دیر صاجباں اسے غور سے دیکھتی

رہی۔ "اک جانور خواہ انسانوں والا لباس پہن کر انسانوں کی آبادی میں رہنے لگے، مگر رہے گا تو جانور ہی۔ آپ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہیں۔ بدلا نہیں ہے۔"

"بدلا کیوں نہیں ہے ...؟"

صاجباں بھی اسی کے سے شگفتہ اور شوخ انداز میں بولی۔ "مجھے تو لگتا ہے انسان بن گیا۔"

"کوئی نشانی؟"

"ماتھے پر تیوریاں نہیں ہیں۔ آنکھوں میں نفرت و حقارت نہیں ہے۔ ہونٹوں پر زہر میں بجھے الفاظ نہیں ہیں۔ مزاج میں سختی نہیں ہے۔" وہ بڑے پیارے انداز میں مسکرا رہی تھی اور اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"اور سب سے بڑی بات۔ گھر آنے والے کے لیے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ جو پہلے آنے والے کو دھکے دے دے کر نکالتا تھا اور دھڑام دھڑام دروازے بند کرتا تھا۔ سچ ہے نا یہ سب ...؟"

ساتھ ساتھ وہ چائے پیالیوں میں انڈیل رہی تھی۔ حارث اس کا اک اک لفظ بڑے غور سے سن رہا تھا اور مسکرائے جا رہا تھا اور اس کی نگاہیں صاجباں کے خوب صورت ہاتھوں پر جمی تھیں۔ کتنے نازک اور حسین اس کے ہاتھ تھے اور کام کرتے ہوئے۔ یکایک ہی اس کی سوچ بھی نامکمل رہ گئی اور اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی۔

"یہ ... یہ آپ کا چائے بنانے کا انداز۔" اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہونے لگے۔

"کیا ہوا ...؟" صاجباں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل میری بی بی جیسا ہے۔ ویسے ہی آپ نے پیالی میں چائے کی بجائے پہلے دودھ ڈالا ہے۔ پھر شکر ڈال کر اسے ملایا ہے اور پھر سب سے آخر میں چائے ڈالی ہے۔"

فقرے کے آخری الفاظ جیسے اس نے ڈوبتے ڈوبتے کہے تھے۔ "عام لوگوں سے مختلف انداز۔ لیکن آپ ... آپ نے یہ انداز کیوں اپنایا ... کیوں ...؟ یہ تو صرف میری بی بی ..."

"وہ ... وہ ... میں نے تو بس یونہی، بے خیالی میں ہی ایسا کر دیا۔"

صاجباں گھبرا گھبرا کر کوئی بات بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر حقیقت تو یہی تھی۔ اس نے سب کچھ بی بی سے ہی سیکھا تھا۔ گاؤں میں تو سوائے کھیتوں میں گھومنے، سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے اور اماں بابا سے جا و بیجا ناز اٹھوانے کے اور اس نے کبھی کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ اس کی ہستی کی، اس کے مزاج اور انداز کی، ساری نوک پلک بی بی نے ہی درست کی تھی۔ پھر کیسے ان کا رنگ اس پر نہ آتا؟

"بے خیالی ہی ہو گی مگر ..." وہ اسی طرح پڑا ہوا ڈوبا ڈوبا سا بڑبڑاتا رہا۔ "یہ درست ہے۔ آپ کی بعض باتوں کا انداز بھی بالکل ویسا ہی ہوتا ہے اور اکثر آپ کی حرکات بھی۔"

حارث نے آنکھیں میچ کر سر صوفے کی پشت سے ساتھ ٹیک دیا۔

"کہاں ہیں میری بی بی ...؟ کہاں ہیں وہ ...؟ مجھے لگتا ہے جیسے وہ یہیں کہیں، میرے آس پاس ہی ہیں۔"

"حارث صاحب ... ! حارث صاحب ...!!"

صاجباں گھبراہٹ اور پریشانی کے مارے چلانے لگی۔ کہیں اسے پھر نہ دورہ پڑ جائے۔

"ہوں ..." اس نے آنکھیں کھول لیں۔

"آپ ٹھیک ہیں نا ...؟"

"ہاں ... لیکن ... لیکن ..." مدھم آواز بھی ڈوب گئی۔

"میں پانی لاتی ہوں ..."

فٹافٹ پانی لا کر اس نے گلاس حارث کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔ پانی پلانے کے بعد صاجباں نے جلدی سے چائے کی پیالی بھی اس کے ہاتھ میں دے دی۔

"جلدی سے پی لیجئے۔ پھر دوسری بناؤں۔"

صاجباں کے کہنے کے مطابق وہ جلدی سے پی گیا۔ بڑے بڑے گھونٹ لے کر ایک منٹ میں پیالی خالی کر دی۔ صاجباں نے جلدی سے دوسری بنا کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ اس کے دوروں سے بہت ڈرنے لگی تھی۔ اپنے لیے نہیں، اس کی خاطر۔ ایک تو دورے کی تکلیف اتنی۔ پھر اس کے بعد وہ کمزور بھی تو بہت ہو جاتا تھا۔ اور اس کی حالت دیکھ کر صاجباں کے دل میں ڈھیروں دکھ اتر جاتے۔

پہلی پیالی کے بعد دوسری وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔ صاجیاں بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ گو اس کے چہرے پہ چند منٹ پہلے والی شوخی اور بشاشت نہ تھی مگر پہلے دوروں کے بعد کی طرح حالت بھی اتنی خراب نہ ہوئی تھی۔ جس سے ظاہر تھا کہ کوئی بات اس کے دل کو لگی ضرور تھی مگر اتنی نہیں کہ ویسا ہی شدت کا دورہ پڑ جاتا۔

یا پھر شاید اس نے اپنی قوت ارادی سے بروقت خود کو سنبھال لیا تھا۔ صاجیاں کچھ اچھی طرح سمجھ نہ سکی لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ اب وہ بہتر تھا۔ لہذا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں ... ؟" حارث نے اس کے ارادے کو بھانپتے ہوئے قدرے بیقراری سے پوچھا۔

"ناشتہ تو آپ نے گول کر دیا" صاجیاں خوش گوار سے لہجے میں بولی۔ "مگر کھانا تو کھانا ہی ہوگا۔ اسی کے لیے جا رہی ہوں۔"

"نہیں۔ ابھی نہیں ..."

حارث نے بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے اس کا بازو تھام کر اسے واپس اس کی جگہ پہ بٹھا دیا۔

"دورے کی حالت میں ہوں تو کیا ہے۔ بازوؤں میں اور ارادے میں اتنا دم خم اور مضبوطی ابھی ہے کہ آپ کو روکنا چاہوں تو روک لوں۔" آنکھوں میں بڑی خوب صورت سی جوت جگائے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

"بازوؤں اور ارادے کا رعب نہ دیں۔ ادھر بھی صاجیاں ہے۔ جس کا بچپن اک گاؤں کی تازہ ہواؤں اور آزاد فضاؤں میں اور خالص خوراک کھا کر گزرا ہے۔"

صاجیاں نے ایک خوب صورت سی ادائے دلبری کے ساتھ ہنس کر کہا۔

"البتہ۔ من کی مرضی کی بات علیحدہ ہے۔ چاہوں تو صرف اک اشارے پہ ہی رک جاؤں۔ کسی کو بازو اور ارادہ آزمانے کی ضرورت ہی نہ پڑے ..."

"تو ... اس کا مطلب ہے۔"

حارث نے بڑے انداز سے، بڑی گہرائی سے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یہ بازو کام نہیں آئیں گے بلکہ گاؤں کی گوری کا من جیتنا ہوگا۔"

"وہ ... وہ ..."

صاجیاں شپٹا سی گئی۔ اس نے تو بی بی اور ان کے بیٹے والے معاملے کو نگاہ میں رکھ کر بات کی تھی کہ حارث بازو آزمائے یا نہیں اسے تو یہاں آنا ہی تھا۔ بی بی کے جذبوں کی خاطر بھی۔

مگر ... یہ حارث۔ یہ جانے کیا سوچ رہا تھا؟ اس کا انداز مختلف تھا۔ وہ اتنی بھی ناسمجھ نہ تھی لیکن ناسمجھ بننا ضرور تھی۔ جھکی ہوئی نگاہیں بڑی مشکل سے اس نے اٹھائیں۔

"بی بی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

اس نے پھر اٹھنے کا ارادہ کیا۔

"کھانے کے لیے میں انہیں تاکید کر آئی تھی کہ بس تیار ہی رکھیں۔"

صاجیاں کی گڑبڑاہٹ اور اضطراری کیفیت حارث نے محسوس کر لی تھی۔ فوراً موضوع بدل دیا۔

"اسی لیے تو آپ کو جانے ... سے روک رہا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں ..."

"کھانے کی بات بعد میں اور معاملے کی پہلے۔"

"کیا مطلب ... ؟"

"مطلب یہ کہ ..." حارث نے جیب میں سے بٹوہ نکالا۔

"یہ لیجئے ..." سو سو کے دو نوٹ صاجیاں کی طرف بڑھاتے ہوئے ہوئے سے بولا۔ "فی الحال میرے پاس اتنے ہی ہیں باقی پھر۔ چند دن بعد اور اب جھگڑا بالکل نہیں کرنا۔"

"نہیں نہیں۔" صاجیاں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کیسا عجیب معاملہ تھا۔ سب کچھ اسی کا تھا۔ باپ کی وراثت کے حساب سے ہر چیز کا مالک و مختار۔ اور وہی کھانے کی قیمت چکا رہا تھا۔ کل تو صاجیاں نے صرف اسے ٹالنے کے لیے ایسی بات کی تھی اور وہ اس پہ سچ مچ ہی عمل پیرا ہو گیا تھا۔ اس نے کب چاہا تھا؟ کب سوچا تھا؟ یہ لمحہ بھی آ جائے گا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"یہ میں نہیں لے سکتی کسی صورت نہیں۔"

وہ یوں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی جیسے یہ نوٹ نہ تھے کالے ناگ تھے اور جونہی اس نے انہیں چھوا۔ انہوں نے اسے ڈس لینا تھا۔

"لیکن کیوں ... ؟"

"میری بی بی تو مجھے قتل کر دیں گی کہ کھانا بیچتی پھرتی ہوں۔"

"نہیں کرتیں۔" حارث شوخی سے مسکرایا۔

"کون ماں ایسی ہے جو اپنی اتنی لاڈلی، اتنی پیاری اور اتنی اچھی بیٹی کو ذرا سی بات پہ قتل کر دے گی۔"

"اوہ ... ! آپ مذاق میں ٹال رہے ہیں اور بخدا میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میری بی بی بہت نیک ہیں۔ کسی کو کھانے کھلا کر قیمت وصول کرنے کو وہ گناہ سمجھتی ہیں۔"

"لیکن مفت خوری بھی تو اک گناہ ہے۔"

"ہمارے گھر سے بھی کھانا کھانے کو آپ مفت خوری کہہ رہے ہیں؟"

اپنے اور اس کے اتنے ہمدرد، مخلصانہ اور گہرے تعلقات کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہوئے صاجیاں نے بڑے شاکی انداز میں اسے دیکھا۔

"کیا آپ کے گھر سودا سلف بغیر داموں کے آ جاتا ہے؟"

"اوہ ... ! آپ میرا مطلب سمجھے نہیں۔ آپ کا اور ہمارا تو میل جول ہے۔ ہم پڑوسی ہیں ایک دوسرے کے۔ ایک دوسرے پہ حق رکھتے ہیں۔ ہمارے آپس میں اچھے تعلقات ہیں۔"

"سب کچھ درست۔ سب کچھ مناسب۔ مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میل جول ہے۔ تعلقات اچھے ہیں تو دوسرے پہ سارے کا سارا بوجھ ڈال دیا جائے۔"

"یقین کریں ہم پہ کوئی بوجھ نہیں۔"

"خدا آپ کو اس سے بھی زیادہ دولت و ثروت سے نوازے۔ اتنا کہ آپ کے دسترخوان پہ روز ہی مجھ ایسے دس بیس فقرا بھی بیٹھ جائیں تو آپ کو بوجھ محسوس نہ ہو مگر ..."

پھر یکایک حارث کا موڈ بدل گیا۔ آنکھوں میں حیرت و استعجاب پھیل کر لبوں تک چلا آیا۔

"یہ تو بتائیے کہ کل آپ نے پھر مجھ سے ایسی بات کیوں کی تھی؟"

"کیسی بات ... ؟"

"یہ پے انگ گیسٹ والا معاہدہ ..."

"اس لیے کہ آپ کھانا ہمارے گھر سے کھا لیا کریں۔"

وہ جرح کئے جا رہا تھا اور صاجیاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس رقم کو نہ لینے کی تاویل کون سی پیش کرے۔ "اور ... اور ... بخدا اس وقت تو میرے ذہن میں یہ قیمت لینے والی بات بالکل نہ تھی۔"

"دیکھنے سے آپ پڑھی لکھی خاتون لگتی ہیں۔ پے انگ گیسٹ کے مطلب کا آپ کو پتہ ہے ... ؟"

"پتہ تو ہے۔ لیکن ..." اور صاجیاں پھر کوئی جواب نہ دے سکی۔

"ہاں ہاں ... لیکن کیا ... ؟"

"کیا یہ عجیب سی بات نہیں لگتی ... ؟"

"بالکل نہیں ... جہاں تک ایک دوسرے کی ہمدردی کا سوال ہے تو اس کا مجھے اعتراف ہے ضرور ہونا چاہیے اور آپ نے اپنا یہ فرض بہت اچھی طرح، بلکہ کچھ زیادہ ہی اچھی طرح ادا کیا ہے۔ میں آپ کا احسان مند ہوں۔ بس، اس سے اگلی حد پھر کچھ اور کہلاتی ہے ..."

"کیا ... ؟"

"بے غیرتی۔ مفت خوری۔ کمینگی ..."

"کیا۔ کیا ... ؟"

"اچھا بھلا کماؤ انسان ہوں۔ مفت میں دوسرے کا مال کھانا شروع کر دوں تو یہ سب صفات میری ہوں گی۔"

"میں تو اپنی خوشی سے کہہ رہی ہوں نا۔ آپ تو کسی دھوکے یا فریب سے ہمارا مال کھانے کی کوشش نہیں کر رہے نا۔ ایسا ہوتا

تو تب یہ صفات ضرور آپ کی ہوتیں۔ چلیں اب جانے بھی دیں نا۔

بڑے پیار سے اسے منانے کے انداز میں بولی۔ حارث پر اس کے لہجے اس کے انداز نے اثر تو بہت کیا مگر کاش۔" اس میں صاحباں تم نے کچھ اور طلب کیا ہوتا۔ کوئی اور خواہش، کوئی اور آرزو کی ہوتی۔ جان و دل ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر دیتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے نا۔" صاحباں نے اس کی خاموشی کا یہی مطلب اخذ کیا۔

"یہ رقم واپس بٹوے میں ڈال لیجئے اور میں کھانا لینے جاتی ہوں۔"

"سنیئے۔" حارث کی آواز پر صاحباں چلتے چلتے رک گئی۔

"بات یہ ہے۔" وہ صاحباں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے بولا۔"کیا آپ یہ گوارا کریں گی کہ میری خودداری پر کوئی آنچ آئے۔۔۔"

"جی۔۔۔؟ جی۔۔۔؟"

"ہاں۔ جواب دیجئے نا۔ اگر آپ کو میرے ساتھ ذرا سی بھی کوئی ہمدردی یا خلوص ہے تو مجھے یقین ہے آپ کو یہ کبھی گوارا نہ ہوگا کہ میری خودداری مجروح ہو۔ یا میری غیرت پر کوئی حرف آئے۔"

"ہاں۔۔۔" صاحباں نے سر جھکا لیا۔

"تو پھر یہ چپکے سے پکڑ لیجئے یا پھر کل والا معاہدہ کینسل سمجھیئے۔"

پھر وہ اک پرکشش سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔" جیسا تیسا بھی ہے اتنے عرصہ سے پیٹ بھر ہی رہا ہوں نا کسی دن آپ کو بھی اپنے ہاتھ کا کھلاؤں گا۔"

"یعنی کہ آپ چاہتے ہیں میں یہاں نہ آیا کروں؟"

صاحباں نے دانستہ اس انداز میں بات کی۔ شاید یہی طعن اسے ماننے پر مجبور کر دے۔ ایک آخری کوشش۔

"میں چاہتا ہوں؟ میں۔۔۔؟ جو آپ کی خاطر ہر وقت گھر کے دروازے کھلے رکھتا ہوں۔ حد کرتی ہیں آپ بھی۔"

وہ پورے خلوص سے کہہ رہا تھا اور اب صاحباں دبدھا میں پڑ گئی۔ یہ رقم لے لے۔؟

لیکن۔۔۔ یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔

اور۔۔۔ نہیں لیتی۔ تو معاہدہ ٹوٹتا تھا۔

ادھر بی بی کل سے کتنا خوش تھیں۔ اپنے ہاتھ سے اور ہر روز بیٹے کے لیے اچھی سے اچھی اور اس کی پسند کی چیز پکا کر بھیجا کریں۔ ان کے دل کو کتنی راحت اور تسکین ملے گی۔

دوسرے۔ صاحباں کا بھی روز دونوں تینوں وقت آنے کا بہانہ ختم ہو جائے گا۔ پھر نہ وہ جھگڑے کا راز معلوم کر سکے گی۔ والا مشن پورا ہو سکے گا نہ بی بی کی جدائی ختم ہو گی۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔

کیا وہ خود اس کے گھر آئے بغیر رہ سکے گی؟

اک لمحے کے لیے یہ خیال بھی دل میں آیا مگر اس نے سر جھٹک کر اس خیال اور خیال والی کو پرے پھینک دیا۔

"ان کے معاملے میں تو کیوں گھسی چلی آئی ہے بیوقوف!"

تو پھر۔۔۔ یہ رقم لے لینی ہی بہتر تھا۔ مگر۔۔۔ اس رقم کو بھی دیکھ کر بی بی دکھی ہو جائیں گی۔ اس راحت سے کہیں زیادہ یہ دکھ ہو گا کہ بیٹا کھانے کی قیمت چکاتا تھا۔

نہیں نہیں۔ وہ پہلے ہی بہت دکھوں کی ماری تھیں۔ انہیں مزید تکلیف نہیں پہنچانا چاہیے تھی۔

"پھر۔۔۔؟ ہائے اللہ کیا کروں؟ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"دیکھئے میڈم! جلد کوئی فیصلہ کیجئے۔ مجھے بڑی سخت بھوک لگی ہے۔"

"اوہ۔۔۔! یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ دوپہر ہو رہی ہے اور آپ نے کل رات کا کھانا کھایا ہوا ہے۔"

صاحباں نے ہاتھ بڑھا کر وہ رقم تھام لی۔

اگر اسی میں سب کی بہتری تھی تو یہی سہی۔ رہی بات بی بی کی۔ تو جہاں اور اتنی ڈھیر ساری باتیں وہ ان سے چھپا گئی تھی یہ بھی چھپا لے گی۔

جہاں اور بی بی سے بے شمار جھوٹ بولتی رہی تھی وہاں یہ اک اور سہی۔ فی الحال انہیں اس معاہدے کے متعلق کچھ بتائے گی ہی نہیں اور یہ رقم سنبھال کر، چھپا کر اپنے پاس رکھ لے گی۔ پھر جب سب معاملات نمٹ جائیں گے تو ماں کی جھولی میں بیٹے

کمائی ڈال دے گی۔" ہاں۔ یہ مناسب ہے۔" سوچیں مکمل ہوئیں۔ تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ کوئی گناہ یا برا کام نہیں کر رہی تھی۔

"جیسی آپ کی خوشی۔ مجھے حارث صاحب! آپ کی خوشی منظور ہے۔"

وہ انتہائی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ کہنے لگی۔" آپ کی خودداری مجروح ہو۔ آپ کی غیرت پر کوئی حرف آئے۔ یہ کبھی مجھے گوارا نہیں۔"

احسان مندی کے جذبوں سے مغلوب سا ہوتے ہوئے حارث نے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت بہت شکریہ۔۔۔ اور اب۔۔۔"

بے حد اپنائیت اور سرشاری سے بولا۔

"اسی خوشی میں چائے کی ایک پیالی اور پلا دیں۔"

"نہیں۔" صاحباں کے چہرے پر وہی رعب و جلال پھیل گیا۔" اب اور چائے کھانے کے بعد ملے گی۔ کھانا بھی تیار ہی ہوگا۔ بس میں ابھی لائی۔" وہ چٹکی بجا کر تیز تیز چل دی۔

"اور ہاں۔ ایک بات۔"

حارث کی آواز پر چلتے چلتے وہ پھر رکنے پر مجبور ہوگئی۔

"چائے کا میرا اپنا بندوبست ہوگا۔ یہاں اس گھر میں۔"

"وہ کیوں۔۔۔؟" صاحباں واپس اس کے قریب چلی آئی۔"کیا اب پھر کوئی خودداری آڑے آگئی۔۔۔؟"

"نہیں۔ اس کی دو تین وجوہ علیحدہ ہیں۔"

"دو تین۔۔۔" حسین پیشانی پہ بار بار بکھر آنے والی لٹ کو سر جھٹک کر پرے کرتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔" ایک نہیں۔ دو تین۔ فرما دیجئے وہ بھی۔"

"ایک تو وہاں سے بن کر آتے آتے ٹھنڈی ہو جایا کرے گی۔"

یوں سر تھام کر بیٹھنے والا اس کا انداز انتہائی پرکشش تھا۔ حارث بے انداز محظوظ ہوا۔ وہی خوب صورت ہنسی بے اختیار کے ہونٹوں پر بکھر آئی۔

"دوسرے۔ کتنی بار وہاں سے آئے گی؟ میں سینکڑوں بار پینے کا عادی ہوں۔ آپ کی بی بی تنگ آ کر کہیں ہمارا معاہدہ کینسل نہ کرا دیں۔ جو میرے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ میں اس کے کینسل ہونے کا نقصان کسی صورت نہیں برداشت کر سکتا۔ تیسری اور سب سے ضروری وجہ۔۔۔"

"سبھی بہت ضروری ہیں۔ فرماتے جایئے۔"

صاحباں اسی طرح سر تھامے تھامے بولی۔

"غور سے سنیئے۔ یہ واقعی بہت ضروری ہے۔"

صاحباں نے ہاتھوں میں سے سر نکالا۔ حارث کے چہرے پر وہی خوب صورت مسکراہٹ بکھری تھی اور آنکھوں میں جیسے آکاش کے سارے کے سارے ستارے اتر آئے تھے۔

"یہاں چائے بنے گی تو آپ کو کچھ دیر رکنے کا موقع تو ملا کرے گا۔ ورنہ کھانا تو آپ بنا بنایا لایا کریں گی اور دے کر منٹ میں واپس بھاگ جایا کریں گی۔۔۔ اور۔۔۔"

"اور۔۔۔؟" وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"میرا جی چاہتا ہے آپ کا زیادہ سے زیادہ وقت یہاں، اس گھر میں۔ گزرے اور آپ میری۔ میری نگاہوں کے سامنے رہیں۔۔۔"

اور۔۔۔ جھکی جھکی نگاہوں سے رک رک کر، جھجک جھجک کر یہ فقرہ ادا کرنے کے بعد حارث نے سر اٹھایا۔۔۔ تو۔۔۔ وہ وہاں نہیں تھی۔

"اب صاحباں! اب کیا کرے گی تو؟"

وہ اپنے آپ سے ہی پوچھ رہی تھی۔

"تو تو بڑے یقین، بڑے مان اور پورے اعتماد کے ساتھ باپ بیٹے کی صلح اور ماں بیٹے کا ملاپ کرانے چلی تھی اور۔۔۔ یہاں یہ کیا ہو گیا؟"

وہ اکیلی سوچوں میں کھوئی بیٹھی تھی۔

"یہاں تو مسئلہ ہی دوسرا درپیش ہے۔ تو کیسے اس سارے معاملے کو سلجھائے گی۔ تو... جو خود الجھی ہوئی ہے، خود اور احمق ہے۔ تو۔ جو اپنی حیات نہ سنوار سکی، اپنی زندگی کو عقل اور سمجھ بوجھ سے صحیح راستہ پہ نہ ڈال سکی۔ تو ان سب کو کیا راہ دکھائے گی۔ ان سب کے لیے کیا کرے گی۔... تو... ہاں، تو صاحباں... ! تو بے وقوف !"

وہ انتہائی بے بسی سے سارے حالات پہ غور کر رہی تھی لیکن سوجھ کچھ نہیں رہا تھا۔ خود پر ہی غصہ آئے جا رہا تھا۔ کو ہی کوس رہی تھی۔

"ڈاکٹروں کے پاس میرے اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔"

حارث کا یہ بے درد فقرہ بار بار کانوں میں گونج اٹھتا تو اس پر اور بھی جھنجھلاہٹ سوار ہو جاتی۔

"ہائے حارث! تم نے بھی کم بخت ایسا ہی مرض خود کو لگانا تھا کہ جس کا علاج کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔ یوں تو سدا بیمار... اور بی بی تیری جدائی میں تڑپتی رہیں گی اور میں، اپنی زندگی کی سب سے بڑی بھول کو کوستی رہوں گی۔"

وہ اٹھ کر کمرے میں دیوانہ وار ٹہلنے لگی۔

"صاحباں! اب بھی وقت ہے نکل بھاگ یہاں سے۔ اس سارے معاملے، ساری گتھیوں کو سلجھانا تجھ ایسی بیوقوف لڑکی کا... بس کا روگ نہیں ہے۔ تیری عزت اسی میں ہے کہ چھوڑ جا ان سارے جھمیلوں کو... لیکن... لیکن"

اس کے قدم اور بھی تیزی سے اٹھنے لگے۔

"یہ بی بی کا وجود۔ یہ حارث کی تکلیف۔ یوں انہیں اس حال میں چھوڑ کر جا بھی سکے گی کہیں اور چین پا بھی سکے گی؟"

"ہائے ہائے! کیسا برا دل لے کر صاحباں تو اس دنیا میں آگئی ہے۔"

مامتا کی ماری بی بی جب حارث کے لیے تڑپتی تھیں تو خود اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اس کے دل کو مسلے دے رہا ہو... پھر اس وقت اس کا جی چاہتا جلدی سے جائے اور حارث کو گردن سے دبوچ کر بی بی کے قدموں میں لا کر پھینک دے۔ کیسا تھا جو ماں کو یوں تڑپا تڑپا کر مار رہا تھا۔

اور ادھر جب حارث سے بات کرنا چاہتی تو وہ دورے میں مبتلا ہو کر کراہنے لگتا۔ وہ کیفیت وہ نظارہ۔ اسے یوں لگتا اس کے یہ دورے خود اس کے اپنے وجود پر سے گزر رہے ہوں۔

اسے تو جو تکلیف اٹھانا پڑتی تھی، اپنے مقدر کی وجہ سے، وہ اٹھانا ہی تھا۔ مگر اس پاگل صاحباں پر اس دیوانی پر... جو کچھ بیت جاتا وہ بیچاری تو کسی کو بتا بھی نہ سکتی تھی۔

تب دل اتنا دکھی ہو جاتا، اتنا کہ اسے خود اپنی یہ صحت مند زندگی اک بہت بڑا روگ محسوس ہونے لگتی۔ اپنی... بھری حیات اک بہت بڑا عذاب، اک جہنم دکھائی دیتا جس سے وہ گزر رہی تھی۔

اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ حارث کا یہ مرض خود لے لیتی اور اپنی صحت و تندرستی اسے دے دیتی۔ اس کی یہ آ... آسائش سے پر زندگی اپنا نصیب بنا لیتی اور اپنی آسائشوں بھری زندگی اس کا مقدر بنا دیتی۔

کاش! وہ ایسا کر سکتی۔ کاش! کوئی اور ایسا کر ڈالتا۔ کاش! پروردگار کاش...!

بہت دیر ٹہلتے رہنے کے بعد جا کر دھڑام سے بستر پر گر پڑی۔ "ہائے! یہ کیسی الجھنوں میں پھنس گئی تو صاحباں! اللہ... تو خود ہی مر جائے نا۔ نہ زندہ ہوگی۔ نہ حارث کی تکلیف ان بے نصیب آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر پریشان ہوگی اور نہ ہی بی بی کی بے چینی تجھے تڑپائے گی۔ بلا سے کچھ بیت جائے۔ دونوں پر۔ تو تو بڑے آرام اور ٹھاٹھ سے بہشت میں..."

وہ ایک دم چونک پڑی۔ پھر اک زہر خند سے دل ہی دل میں بڑبڑائی "بہشت میں...؟" وہ خود پر ہنسنے ہی لگی۔

"آج تک کوئی نیکی کا کام کیا نہیں اور خواب دیکھ رہی ہے بہشتوں کے۔ واہ صاحباں واہ...! خوب ہے تو بھی۔"

"چھوٹی بی بی...!"

"بیوقوف... احمق...! پاگل... دیوانی..."

"چھوٹی بی بی..."

صاحباں نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا۔

"یقین کریں چھوٹی بی بی! تقریباً دس بار آپ کو پکارا ہوگا۔"

شرجانہ اپنی پارے جیسی ہستی لیے کھڑی دانت نکال رہی تھی۔

"آپ چپ تو بول ہی نہیں۔ آخر میں بولی ہیں تو وہ بھی گالیوں سے۔"

"گالیوں سے...؟" صاحباں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہاں، ابھی مجھے بیوقوف، احمق اور دیوانی وغیرہ کہہ رہی تھیں۔ کیوں بھلا۔ میں نے کیا کیا...؟"

شرجانہ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوئی تھی۔ ہنسے ہی جا رہی تھی۔

"اوہ..." صاحباں بھی ہنس پڑی۔

"وہ میں تجھے کب کہہ رہی تھی؟"

"پھر...؟ اور تو یہاں کوئی نہیں تھا؟"

"وہ... میں... ..."

اپنی اس بے خودی اور حماقت پہ صاحباں شرمندہ سی ہوگئی۔ بات بنا کر شرجانہ کو ٹالنا چاہا تو، مگر بڑی کوشش کے باوجود بات بنا نہ سکی۔

"وہ میں۔ کچھ بھی نہیں۔ تم کیوں پوچھے جا رہی ہو؟"

صاحباں بوکھلا بوکھلا کر آخر شرجانہ ہی کو ڈانٹنے لگی۔

"تم خواہ مخواہ ہی۔"

"میں جانتی ہوں سب کچھ۔" شرجانہ نے اس کی جھنجھلائی ہوئی ڈانٹ کو میٹھے گھونٹ کی طرح حلق سے اتار کر معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا...؟" صاحباں بری طرح سٹپٹا گئی۔

"کیا جانتی ہو تم...؟"

"میں بھی اسی طرح ہر وقت کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی اور اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہتی تھی جب..."

اور اپنی بات شرجانہ نے دانستہ مکمل نہیں کی۔ بڑے غور سے صاحباں کے معصوم و حسین چہرے پر پھیلی بوکھلاہٹ کو دیکھنے لگی۔

"جب کیا...؟ میں بالکل نہیں سمجھی شرجانہ۔"

"جب میری ملاقات کبیر خاں سے ہوئی تھی۔"

"یہ کیا کہے جا رہی ہو...؟" صاحباں کے چہرے پر تعجب پھیلا تو وہ اور بھی حسین ہوگئی۔

"تجربے کی بات بتا رہی ہوں چھوٹی بی بی!"

شرجانہ حسب عادت ہنسنے ہی لگی۔ اس کا پورا وجود ہنسی کا گول گپا بنا ہوا تھا۔

"وہی کیفیت آج کل آپ پر گزر رہی ہے۔"

"کیا...؟"

"عشق اور مشک بھلا کبھی چھپانے سے چھپتا بھی ہے چھوٹی بی بی..."

شرجانہ اس کے پاس قالین پر ٹانگیں پھیلا کر انتہائی بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے چھوٹی بی بی... سب..."

"کیا سب...؟ یہ آخر تم کیا بکواس کر رہی ہو۔"

صاحباں کی حیرت نے پریشانی کا روپ دھار لیا۔

"بکواس نہیں۔ بالکل سچ..."

وہ کھی کھی کر کے ہنستی ہی رہی اور معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"جس طرح دن میں کئی کئی بار آپ پڑوسی صاحب کے پاس جاتی ہیں نا اسی طرح میں بھی کئی حیلوں بہانوں سے اپنے پڑوسی برخاں کی کوٹھڑی میں جایا کرتی تھی۔ سب سے چھپ کر سب سے چوری۔"

"اوہ۔ تو تجھے یہ تکلیف ہے...؟"

صاحباں کی سمجھ میں اب شرجانہ کی پہیلیاں آئیں۔ "اسے۔ ہوش میں تو ہے؟"

صاحباں نے کھل کھل کرتی شرجانہ کا کان پکڑ لیا۔

"یہ کیا سب سے چوری یا چھپ کر حارث کے ہاں جاتی ہوں؟"

"چھوٹی بی بی! آپ لوگ امیر اور فیشن ایبل جو ہوئے۔ آپ کو بھلا چوری چھپے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو صرف اپنی

مثال دی ہے۔"
"لیکن کیوں؟ کیوں تم نے اپنی مثال دی تھی؟"
"مجھے معاملہ جو ایسا لگتا ہے۔ بس صرف فرق یہ ہے کہ ہم غریب لوگ تھے۔ دنیا زمانے کی نگاہوں اور زبانوں سے ڈرتے تھے۔ دنیا زمانے کی نگاہوں اور زبانوں سے ڈرتے تھے۔"
"میں اس لیے چوری چھپے جاتی تھی۔ آپ امیر ہیں۔ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ کھلم کھلا جاتی ہیں۔ اب بیگم صاحبہ کو دیکھ لیجئے۔ آپ ان کے سامنے پڑوسی صاحب کے گھر جاتی ہیں مگر انہوں نے کبھی آپ کو منع نہیں کیا۔ بلکہ..."
"ہاں بول۔ بلکہ کیا... کہہ دے سب کچھ۔" صاحباں نے اس کا کان تھوڑا سا اور کھینچا۔
"بلکہ وہ خود آپ کو بھیجتی ہیں۔ ان کی جگہ میری ماں ہوتی نا تو مجھے خود سے بھیجنا تو ایک طرف رہا وہ تو میری چوٹی ادھیڑ ڈالتی اس کے سامنے میں کبیر خاں کی کوٹھڑی کی طرف دیکھ لیتی تو..."
"... پھر بھی تو اس سے روز ملاقات کرتی تھی اور پھر سب سے چوری چوری اس کے ساتھ بیاہ تک کر لیا۔ بہت زیادہ خوف تھا تجھے۔"
صاحباں اک طنز سے مسکرائی۔
"دنیا زمانے کی نگاہوں اور زبانوں کا بھی اور ماں کا بھی۔"
صاحباں نے اپنی دانست میں اس پر زبردست چوٹ کی تھی۔ اور اب وہ اس کے سامنے بات کرنے کے قابل نہ رہی تھی مگر شہر جانہ، شہر جانہ ہی تھی۔
"وہ تو چھوٹی بی بی! ہمارا عشق سچا تھا۔"
شہر جانہ صاحباں کے طنز کا ذرا سا بھی برا منائے بغیر انتہائی بے باکی اور بے شرمی سے ہنستے ہوئے کہنے لگی۔
"تبھی تو ہر قسم کے ڈر اور خوف کے باوجود ہم ایک دوسرے کے ہو گئے۔ اور میں یہی دعا آپ کے لیے بھی کرتی ہوں چھوٹی بی بی!"
"دعا کی بچی۔ یہاں ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔"
صاحباں نے مسکرا کر اس کا کان چھوڑتے ہوئے جیسے بات اک اختصار کے ساتھ ختم کر دی۔
لیکن... شہر جانہ کو صاحباں کی اس بات کا بالکل یقین نہیں آیا۔ اس کے چہرے کو انتہائی تجسس اور بڑے غور سے دیکھتے ہوئے ایک زور کا قہقہہ لگا کر بولی۔
"اور یہ ہر وقت چپ چپ اور تنہا تنہا رہنا۔ اس کا پھر کیا مطلب ہے، چھوٹی بی بی؟"
صاحباں نے اس کے قہقہے کا اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اپنی سوچوں میں کھو گئی۔
"میں جانتی ہوں چھوٹی بی بی! اچھی طرح جانتی ہوں۔"
"تو خاک بھی نہیں جانتی۔"
صاحباں کے معصوم اور حسین چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔
"لیکن یوں کھوئے کھوئے رہنے کا تو وہی مطلب ہے۔ صرف وہی۔"
شہر جانہ انتہائی پُر خیال انداز میں بولے چلی گئی۔
"آپ سوچیے چھوٹی بی بی! ذرا غور تو کیجئے۔ مجھے تو وہی معاملہ لگتا ہے۔ بالکل ویسا ہی۔ اپنے والا۔ ورنہ اس میں اور... پاگل..."
صاحباں نے مسکرا کر اس کی بات کاٹ دی۔
"تو بالکل پاگل ہے شہر جانہ۔"
پھر دوسرے لمحے صاحباں کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ معدوم ہو کر رہ گئی۔ اب اس کے چہرے پر بڑے بوڑھوں ایسی سنجیدگی تھی۔
"میری پریشانی کی وجہ دوسری ہے۔ تم جو دل میں ایسے ویسے شکوک بھرے بیٹھی ہو وہ نکال دو۔"
"آپ پریشان ہیں...؟" شہر جانہ کی مسکراہٹ بھی کافور ہو گئی۔
"ہاں..."
"اتنا ڈھیر سارا کچھ خدا نے آپ کو دیا ہوا ہے پھر بھی پریشان ہیں؟"
"ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔" صاحباں اس کے پے در پے اور احمقانہ سوالات سے جھنجھلا سی گئی۔
"تم بے حد باتونی ہو شہر جانہ۔"

"مجھے حیرانی ہو رہی ہے چھوٹی بی بی! بھلا امیروں کو بھی کوئی پریشانی ہوتی ہے؟"
"کیوں؟ امیروں کے دل دماغ نہیں ہوتے؟"
"مگر ان کے پاس دولت بھی تو بہت ہوتی ہے۔ وہ سب فکر اور پریشانیاں دور کر سکتے ہیں۔"
"دولت سے سب فکر اور پریشانیاں دور نہیں ہو سکتیں شہر جانہ۔"
"تو... تو کیا چھوٹی بی بی! واقعی آپ کو کوئی پریشانی ہے؟"
شہر جانہ اب بھی بے یقینی سے صاحباں کو دیکھ رہی تھی۔
"آپ سچ کہہ رہی ہیں۔؟"
"... جھوٹ بولا ہے؟" صاحباں بے حد سنجیدہ تھی اور اس کے اس انداز سے شہر جانہ کو یقین ہو گیا۔
"تو کیا چھوٹی بی بی! اپنی پریشانی مجھے نہیں بتائیں گی؟"
ہر دم، ہر لمحہ ہنستے رہنے والی شہر جانہ کے چہرے پر یکا یک سنجیدگی طاری ہو گئی۔
"اک ملازمہ ہوں تو کیا ہوا۔ سینے میں دل تو انسانوں والا رکھتی ہوں۔"
اس نے اک جوش، اک جذبے کے ساتھ سینے پر ہاتھ مارا۔
"آپ کی پریشانی دور کرنے کے لیے جان بھی لڑانا پڑی تو لڑا دوں گی چھوٹی بی بی۔ ہم پٹھان لوگ جسے پیار کریں اس کے لیے زندگی کا نذرانہ تو ہر وقت ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں۔"
اور شہر جانہ کو صاحباں سے کتنی محبت، کتنا پیار تھا یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ دونوں کے آقا و خادمانہ کے بجائے دوستانہ اور رازدارانہ قسم کے تعلقات تھے۔ شہر جانہ نے اپنی اور کبیر خاں کی پہلی ملاقات سے لے کر شادی تک کی داستان کے سارے نقیہ، حزنیہ اور طربیہ باب صاحباں کو سنا ڈالے ہوئے تھے۔
صاحباں سوچ رہی تھی اور پریشانی کی وجہ جانے بغیر ہی شہر جانہ کے بری طرح پریشان ہو جانے والے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس پر اخلاص و ایثار کی ایسی چھاپ تھی جو دوسرے سب جذبوں سے زیادہ گہری اور نمایاں تھی۔ تب اب تک کھاتے میں یک طرفہ رازداری کا حساب چل رہا تھا۔ آج صاحباں نے بھی اپنا کھاتا کھول لیا اور اس نے بی بی اور حارث والی ساری بات اسے سنا ڈالی۔
"اب بتا۔ کیسے میں چپ چپ نہ رہوں۔ کیسے فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔"
"معاملہ تو واقعی بہت ٹیڑھا ہے۔"
سدا ہنستے رہنے والی شہر جانہ کے لب فکر مندی سے بھنچ گئے اور پل بھر بعد وہ بھی صاحباں ہی کی طرح سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔
"تو بھی میری طرح کھو گئی شہر جانہ؟" صاحباں اس کے متفکر چہرے پر نظریں گاڑے مسکرائی۔
"اس کا مطلب ہے اب میں بھی تمہیں کوئی ایسی ویسی ہی بات کہوں؟"
"کہہ لیجئے چھوٹی بی بی! مگر میں انکار نہیں کروں گی۔ مجھے آپ سے پیار ہے اور آپ پریشان ہوں گی تو میں کیا خوش ہوں گی؟"
"لیکن فائدہ کوئی نہیں ہے نا؟"
"فائدہ کیوں نہیں۔ ایک اکیلا دو گیارہ۔ میں بھی آپ کے ساتھ مل کر کوئی تدبیر... ارے...!"
اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ خود ہی چونک پڑی۔
"مجھے خیال آیا ہے کہ وہ آپ کے حارث..."
"اونہوں۔" صاحباں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرا نہیں۔ بی بی کا حارث۔"
"اوہ...!" شہر جانہ مسکرا پڑی۔ "غلطی ہو گئی چھوٹی بی بی۔"
"ہاں۔ کیا خیال بتا رہی تھیں تم؟"
"میں کہہ رہی تھی۔ وہ اپنی زبان سے یہی کہتے ہیں نا کہ ان کے اس مرض کا علاج کوئی ڈاکٹر نہیں کر سکتا۔"
"تو ان کے منہ میں انہیں کی زبان ہو گی نا۔"
"اونہہ..." شہر جانہ زور سے ہنس پڑی۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا چھوٹی بی بی! آپ تو ہر بات پکڑتی ہیں۔"
وہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔

"اب بتا نا کب تک ہنسے جائے گی ؟" صاحباں کے ہونٹوں پر بھی تبسم پھیلا تھا۔
"وہ ، میرا مطلب تھا کسی ڈاکٹر نے تو نہیں آپ کو بتایا ۔ کیا پتہ آپ کو ٹالنے کے لیے انہوں نے ایسے کہہ دیا ہو"
"کیا مطلب ... ؟" صاحباں چوکنی ہو کر بیٹھ گئی ۔
"آپ خود کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہیں کرتیں ؟ "
" میں ... میں ... ؟ مگر کیسے ؟"
"جیسے مجھے سب کچھ بتایا ہے اسی طرح ڈاکٹر کو بتا کر ۔"
"ارے ہاں ۔" صاحباں اس کی تجویز سے اچھل سی پڑی ۔" یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو ... مگر ... مگر ..."
اور دوسرے لمحے وہ پھر متفکر ہوتے ہوئے کہنے لگی ۔
"میں کس ڈاکٹر سے بات کروں گی ؟"
"اپنے ڈاکٹر چیمہ جو ہیں ۔"
"نہ نہ ۔ ان سے بات نکل جائے گی اور بی بی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے ۔ بیٹے کی بیماری کا سن کر وہ اس سے ہی جا پڑیں گی ۔"
"انہیں منع کر دیں کہ بیگم صاحبہ سے اس کا ذکر نہ کریں ۔"
"نہیں ، وہ گھر میں آتے جاتے ہیں ۔ کیا پتہ کبھی منہ سے بات نکل ہی جائے ۔ میں یہ خطرہ نہیں مول لے سکتی مجھے اپنی بی بی دنیا کی دوسری ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے ۔"
"ارے ... !" سترجانہ گڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔" آپ کے سامنے آجاؤں تو پھر باتوں میں لگ کر اور سب کچھ بھول جاتی ہوں میں تو زرقا بی بی کا پیغام لے کر آئی تھی ۔"
"زرقا کا پیغام ؟ کیسا پیغام ؟"
"انہوں نے آپ کو بلا بھیجا ہے ۔ ابھی ابھی ۔ کوئی چائے پالٹی ہے ان کے گھر ۔"
"پالٹی نہیں پارٹی ۔ لاکھ بار تجھے کہہ چکی ہوں کہ درست لفظ بولا کر ۔"
صاحباں کی ڈانٹ میں پیار تھا ۔ سترجانہ حسب معمول ہنسنے لگی ۔
"لیکن سترجانہ ! میرا ذرا بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا ۔"
"میں تو کہتی ہوں چلی جایئے ۔ کچھ دیر کے لیے جی بہل جائے گا ۔"
"دل کے اندر پریشانی بسی ہو تو کہیں بھی نہیں بہلتا ۔ اور پھر دوسرے اچھے بھلے خوش لوگوں کو بھی افسردہ کر دیتا ہے ۔"
"لیکن چھوٹی بی بی ! ابھی آپ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ پریشان ہونے سے فائدہ کوئی نہیں ہوگا ۔"
"یہ بھی درست ہے ۔ تو پھر اب تو ہی بتا میں کیا کروں ۔ میں ان الجھنوں سے کیسے نکلوں ؟"
"یہاں سارے ایبٹ آباد میں اک صرف ڈاکٹر چیمہ ہی تو نہیں ہیں اور بھی بہت ڈاکٹر ہوں گے ۔"
"ہوں گے تو ضرور ۔ مگر میں کسی کو نہیں جانتی ۔"
"نہ جانتی ہوں ۔ ایک مریض کے لیے تو ہر جانے انجانے ڈاکٹر کا در کھلا ہوتا ہے ۔"
"ہاں ۔" صاحباں کچھ سوچنے لگی ۔" تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ... لیکن سترجانہ ! میں کس بہانے سے کسی ڈاکٹر تک پہنچوں گی بی بی کو کیا بتاؤں گی اور ۔"
"ارے ..." سترجانہ یکایک ہی چلا پڑی ۔" آٹھیے فٹافٹ ، تیار ہو جایئے اور چلیے زرقا بی بی کے گھر ۔"
ساتھ ہی وہ صاحباں کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی ۔

"ہائے ہائے ۔ یہ یکایک تمہیں ہوا کیا ؟ اس کے گھر جانے کو اس وقت میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا ۔"
"ارے چھوٹی بی بی ! اس سے اچھا موقع کون سا ملے گا ؟"
سترجانہ اک فاتحانہ تبسم کے ساتھ بولی ۔
"بیگم صاحبہ کو زرقا بی بی کے ہاں جانے کا ہی بتایئے گا لیکن اصل میں آپ کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں گی ۔"
"کسی ڈاکٹر کے پاس ؟" صاحباں پر گھبراہٹ سوار ہو گئی " لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے نا میں کسی ڈاکٹر کو نہیں جانتی اور نہ ہی"
"ارے ڈر کیوں رہی ہیں ۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی ۔"

"وہ تو پتہ ہے تم ہی ساتھ جاؤ گی ۔ مگر کسی انجان کے ساتھ بات چیت کرنا ۔" وہ بُری طرح گھبرا رہی تھی ۔" بڑا مشکل ہو جائے گا سترجانہ ۔"
"مشکل کیوں ؟ میں ایک ڈاکٹر کو جانتی ہوں ۔ بڑے اچھے مزاج کے مالک ہیں وہ ۔ ان سے بات کرتے ہوئے آپ کو ذرا جھجک محسوس نہیں ہو گی ۔"
"کون سے ڈاکٹر کو جانتی ہو ۔ پہلے تو تم نے نہیں بتایا ۔"
"ایک بار مجھے بخار چڑھا تھا تو کبیر خاں مجھے وہیں لے کر گیا تھا ۔ ابھی ابھی مجھے ان کا خیال آیا ہے ۔ سچ چھوٹی بی بی وہ اتنے خوش مزاج تھے کہ انہوں نے ہنس کر اور بڑے پیار سے مجھ سے بات ہی کی تو میرا بخار اتر گیا ۔"
... نے ایک شوخ تبسم کے ساتھ تعجب کا اظہار کیا ۔
"دوا پینے کی نوبت ہی نہیں آئی ۔" وہ معصومیت سے بولے چلی گئی ۔
"اسی طرح مجھے یقین ہے آپ کے مریض کو ..."
"میرا مریض نہیں ۔" صاحباں نے اسے پھر ٹوکا ۔
"اوہ ۔ بھول گئی چھوٹی بی بی ۔" وہ ایک زور دار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی ۔" آپ کا آپ کا کرتے کہیں سچ مچ ..."
"چپ بدتمیز ۔" صاحباں نے بہت گھور کر اسے دیکھا ۔" وہ بی بی کا بیٹا ہے ۔ ایسی بات سوچنا بھی نہیں ۔"
"تو بس پھر اٹھیئے نا ۔ مجھے یقین ہے اس ڈاکٹر پر ۔ وہ آپ کے پڑوسی کو دیکھے بغیر ہی اس کی حالت کے بارے میں سن کر ہی ضرور کوئی نہ کوئی اچھا مشورہ دیں گے اور آپ کا پڑوسی ..."
"پھر آپ کا ..." اور اب صاحباں نے بڑے غصے سے اسے دیکھا ۔
"آپ کا نہیں کہوں تو اور کس کا کہوں ؟" اس بار سترجانہ بھی جھنجھلا کر بولی ۔" اس گھر میں صرف آپ ہی کا اس کے ساتھ تعلق ہے نا ۔"
"بی بی کے ناطے سترجانہ ! صرف بی بی کے ناطے ۔"
"تو جب بیگم صاحبہ سے اس کا ٹوٹا ناطہ جڑے گا تو پھر میں ان کا کہہ دیا کروں گی ۔"
سترجانہ جیسے کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئی اور صاحباں نے خاموش ہو جانے میں ہی اپنی عافیت جانی ۔ سترجانہ کی تیزی طراری کے سامنے وہ اکثر بے بس ہو جایا کرتی تھی ۔
"اٹھیے نا پھر ۔" سترجانہ نے اصرار کیا ۔
"لیکن تمہیں اتنی جلدی کیوں پڑ گئی ہے ؟" اب صاحباں نے ایک طنزیہ تبسم کے ساتھ اسے دیکھا ۔
"آپ کی خاطر ۔ آپ پریشان رہتی ہیں نا تو پھر مجھے بھی کچھ اچھا نہیں لگتا ۔"
سترجانہ سنجیدگی سے بولی ۔
"جتنی جلد ہو سکے پریشانیوں کو دور کر دینا چاہیے ۔"
"ٹھیک ہے ۔" صاحباں بھی سنجیدہ ہو گئی ۔" ہم چلی جائیں گی ڈاکٹر کے پاس لیکن بی بی کے آگے جھوٹ بولیں ۔ نہیں نہیں ۔ میں بی بی سے جھوٹ نہیں بول سکتی سترجانہ ! اسی لیے گھبرا رہی ہوں ۔"
"اور ابھی جو آپ نے مجھے اتنا سب کچھ پڑوسی صاحب اور بیگم صاحبہ کے متعلق بتایا ہے ۔ اتنا کچھ آپ اپنی طرف سے گھڑتی رہی ہیں ۔ اس میں کچھ بھی تو سچ نہ تھا ۔"
"وہ بی بی کی خاطر ۔ صرف بی بی کی خاطر سترجانہ ۔ ورنہ خدا گواہ ہے میں نے بی بی کو کبھی دھوکا نہیں دیا ۔"
"تو یہ والا جھوٹ بھی انہیں کی خاطر ہو گا ۔ اک ماں کی خاطر ۔ اک بیٹے کی خاطر ۔ آپ کو تو بیچ میں سے کچھ لینا دینا نہیں ۔"
"ہاں تو ۔" صاحباں قائل سی ہو گئی ۔" پھر ایک جھوٹ اور سہی ۔" اور وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ ذہن میں پھر ایک خیال بجلی کی طرح کوندگیا ۔
"اور اگر ہمارے جانے کے بعد زرقا کی طرف سے پھر کوئی بلانے آگیا ... تو ... ؟"
"ارے ہوئے ۔" سترجانہ ماتھے پر ہاتھ مار کر واپس بیٹھ گئی ۔" یہ خیال تو مجھے بھی نہیں آیا ۔"
وہ بڑی بے بسی سے صاحباں کو دیکھنے لگی ۔ اور اس کی اس بے بسی کو دیکھ کر صاحباں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔
"بڑی چالاک بنتی ہو ۔ اب بتاؤ ؟"
"تو ہوں نا چالاک ۔ غلط تھوڑا بنتی ہوں ۔" سترجانہ یکایک جوش میں بھر کر اٹھ پڑی ۔" ہم سچ مچ ہی زرقا بی بی کے گھر جائیں گی ۔ چھوٹی بی بی ! مگر وہاں رکیں گی نہیں ۔ انہیں کہہ دیں گی کہ بہت ضروری کام ہے اور پھر ہم وہاں سے ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جائیں گی وہی تو ہے ..."

"ہاں۔ یہ ہوسکتا ہے۔" صاحباں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "زرقا ایسی ہی طبیعت کی مالک ہے۔ دوسرے کی کو بہت جلد سمجھ لیتی ہے اور مان بھی لیتی ہے۔"

"اس طرح تو ہمارا ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا راز میں رہ ہی جائے گا نا؟" شرجانہ مسرت بھری آواز میں بولی۔

"ہاں۔ بالکل۔"

"تو پھر آپ کا لباس تیار کروں؟" شرجانہ وارڈ روب کی طرف لپکی۔

"کوئی سادہ سا منتخب کرنا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا ہے۔"

"چھوٹی بی بی! اب اتنی بھی بے وقوف نہ سمجھئے۔"

وہ الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔

"بے وقوف تو میں نے تمہیں کبھی بھی نہیں سمجھا۔"

"ان پڑھ انسان بے وقوف ہی ہوتا ہے نا۔" وہ ایک ایک خانے میں جھانکنے لگی۔

"اتنی باعقل تجویز تم ہی نے تو بتائی ہے۔" صاحباں بیٹھی ٹانگیں جھلا رہی تھی اور کسی سوچ کے تحت مسکرا رہی تھی اور مج لکھی کو دیکھو۔ اتنے دنوں سے صرف پریشان ہی ہوئی جارہی تھی۔ اللہ کرے اب ڈاکٹر صاحب کوئی اچھی اچھی بات بتادیں۔

"بتادیں گے۔" شرجانہ ہلکے آسمانی رنگ کا سادہ سا فلیپر سوٹ ہاتھوں میں اٹھائے۔ اس کے پاس چلی آئی۔ بڑا عجیب اور تبسم اس کی ہونٹوں پہ پھیلا تھا اور آنکھوں میں شوخ سی چمک تھی۔

"عاشقوں کے جذبے۔۔۔"

"تمہیں خدا سمجھے۔۔۔" صاحباں نے اسے بات بھی پوری نہیں کرنے دی۔ اس کے ہاتھوں سے سوٹ چھینتے ہوئے اسے دے کر کمرے سے باہر نکال دیا۔

"بہت بدتمیز، بے حیا اور بے شرم ہوتی جارہی ہو۔"

اور یونہی جانے کیا کیا بڑبڑاتے ہوئے اور کھولتے تلملاتے ہوئے صاحباں جلد جلد تیار ہونے لگی۔

بی بی نے اسے کبھی کہیں جانے سے روکا نہیں تھا اور یہ بھی بات پکی تھی کہ بی بی خود کبھی گھر سے نہیں نکلتی تھیں۔ اس ڈر کہیں آتے جاتے حارث سے مڈبھیڑ نہ ہوجائے۔ اس لیے صاحباں کے ساتھ وہ ہمیشہ شرجانہ ہی کو بھیجا کرتی تھیں۔ صاحبا تھی خوب صورت تھی۔ لہٰذا اسے کبھی اکیلی بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ یوں بغیر کوئی پریشانی اٹھائے یا ہیر پھیر کئے ان کا کام بڑا سے بن گیا۔

زرقا نے صاحباں کی مجبوری سن کر اسے زیادہ دیر وہاں ٹھہرنے کے لیے بالکل مجبور نہ کیا۔ البتہ چائے کے لیے کچھ گھریلو تیار کردہ اور کچھ بازار سے منگوائے ہوئے، سب یہ بڑی ساری پلیٹ بھر کر اس کے لیے لے آئی۔ صاحباں کو بصد پیار کر

"بس، یہ کھالو اور چلی جاؤ۔ اس کے بعد بے شک ایک منٹ بھی نہ ٹھہرنا۔"

مسکراتے ہوئے بڑے پیار سے وہ خود اسے کھلانے لگی۔

"ارے! مہمان تو ابھی آئے نہیں اور تم اتنا سب کچھ میرے لیے نکال لائیں۔ کہیں کم نہ ہو جائے۔"

"کم بھی نہیں ہوتا اور یہ سارا حصہ بھی تمہارا ہے۔ تمہیں ختم کرنا ہوگا۔"

"توبہ توبہ! اتنا ڈھیر سارا تو ایک جنم اور مل جائے تب بھی نہ ختم کرسکوں۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تم کم خور ہو مگر تم بھی یقیناً یہ جانتی ہو گی کہ میں کتنی زبردست ہوں اور اس وقت تم میرے بس

"اوہ۔ تب تو ماری گئی بالکل۔"

اور صاحباں کے نہ نہ کرتے ہوئے بھی زرقا نے زبردستی خود اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں ٹھونس ٹھونس کر بہت سارا اسے کھلا دیا۔

"مجبوری کے باوجود تمہاری دعوت قبول کرلی۔ میرے خلوص کی یہ سزا ہے؟" صاحباں پیٹ پکڑ کر دہائی دینے لگی۔

"تمہارے خلوص کی یہ سزا نہیں۔ میرے خلوص کی اک ذرا سی نشانی ہے۔"

"توبہ توبہ۔ باز آئی تمہارے خلوص سے۔" صاحباں ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے! اک منٹ ٹھہرو۔ میں بھی کیسی بے وقوف ہوں شرجانہ کو پوچھا تک نہیں۔"

زرقا پلیٹ لیے بھاگی "بس ابھی آئی۔" وہ عجلت میں دروازے سے ٹکرائی پھر بھاگی۔ صاحباں اس کی حرکات پر ہنستے ہوئے شرجانہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"اسی لیے میں یہاں آنے سے ہچکچا رہی تھی۔ یہ زرقا نی بڑی زبردست ہے۔"

"آپ سے پیار بھی تو بہت کرتی ہے میری طرح۔" پھر وہ مسکرائی۔ "شاید سبھی آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ جو بھی ایک بار مل لیتا ہے وہی بس۔۔۔"

شرجانہ اپنی بات نامکمل چھوڑتے ہوئے ہنسنے لگی۔ پھر یکایک سنجیدہ ہوتے ہوئے ہولے سے بڑبڑائی۔ "پڑوسی صاحب کی خیر ہو۔ مجھے تو ان کا فکر۔۔۔"

اور اسی لمحے زرقا واپس آگئی۔ صاحباں صرف تلملا کر، کھول کر ہی رہ گئی۔ زرقا نہ آجاتی تو اس نے شرجانہ کو مزہ چکھا دینا تھا۔ وہ بے حد بدتمیز، بیہودہ، زباں دراز اور فضول ہوتی جارہی تھی۔

زرقا نے حفظ مراتب کے حساب سے شرجانہ کی بھی مٹھائی اور چائے وغیرہ سے تواضع کرکے پندرہ بیس منٹ میں ہی دونوں کو فارغ کردیا۔

"جاؤ بھئی اب تم جاسکتی ہو۔ مابدولت کی طرف سے اجازت ہے۔"

"شکریہ بہت بہت عالی جاہ! اور خدا حافظ۔۔۔"

دونوں بڑی عجلت سے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے چل پڑیں۔

"دیکھ شرجانہ! ڈاکٹر صاحب کے سامنے حارث کو میں تیرا رشتہ دار بتاؤں گی اور نام بھی کوئی دوسرا لوں گی۔ تم بلاسوچے سمجھے کچھ بک نہ پڑنا۔"

راستے میں صاحباں نے اسے سمجھایا۔

"لیکن کیوں؟" یہ فہمائش شرجانہ کے ذہن کے اوپر ہی اوپر سے گزر گئی۔

"ہوسکتا ہے اس ڈاکٹر سے حارث کی واقفیت ہو۔ ایک ہی شہر میں جو رہتے ہیں۔"

لیکن پھر دوسرے ہی لمحے صاحباں مسکرائی۔

"ویسے امید کم ہے۔ کافی بدمزاج شخص ہے۔ لگتا نہیں کہ کسی سے بھی بنا کر رکھی ہو۔"

"مگر آپ سے تو بہت بنی ہوئی ہے۔" شرجانہ اک آنکھ دبا کر زور سے ہنسی۔

"اپنی شرارت سے تو باز نہیں آتی نا۔" صاحباں نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"ویسے یہ تجھے اچھی طرح سمجھا دوں۔ میرے ساتھ جو اس کی بنی ہوئی ہے تو یہ اس کا کوئی کمال نہیں۔ یہ میں نے خود بنائی ہے اور بڑی مشکل سے بنائی ہے۔ صرف بی بی کی خاطر۔ ورنہ وہ تو۔۔۔"

"چلو چھوٹی بی بی! اپنی خاطر بھی بنالو گی تو پھر کیا ہے۔ مجھے خوشی ہی ہوگی۔"

"ہاں۔ میرے لیے بڑا اچھا سوچتی ہو نا۔ اس بدمزاج سے بنے گی تو تمہیں خوشی ہوگی۔ بے حد کمینی ہو تم۔"

صاحباں نے بڑے غصے سے اسے گھورتے ہوئے اک تھپڑ اس کی کمر پہ رسید کردیا۔ مگر شرجانہ کو اس کا یہ غصہ بناوٹی ہی لگا۔

"ارے! ارے، سڑک ہے اور لوگ آجارہے ہیں۔" وہ ہنسے ہی گئی۔

"تو پھر تو انسان بن جانا۔"

"فی الحال بن گئی۔ وہ دیکھیے سامنے ڈاکٹر صاحب کی دکان۔"

"ڈاکٹر کی دکان نہیں ہوتی کلینک ہوتا ہے۔"

"لگتا ہے چھوٹی بی بی! آپ مجھے انگریجی ار دو پڑھا کر ہی چھوڑیں گی۔"

"تو پڑھتی ہی نہیں۔ ورنہ میرا تو بہت دل چاہتا ہے کہ تھوڑی سی تعلیم حاصل کرلے۔ پاکستان کے ہر فرد کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ بے علمی اور جہالت اک لعنت ہے شرجانہ۔ میرے دل میں علم کی بڑی قدر ہے۔"

"ہم لوگوں کو علم ولم سے کیا لینا ہے چھوٹی بی بی۔"

"ہم لوگ، ہم لوگ۔" صاحباں جھنجھلا پڑی۔

"ہمیشہ تم یہ ہم لوگ کہہ کر خود کو ہم سے علیحدہ کرلیتی ہو۔ کیا فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔"

"فرق۔؟" شرجانہ زور سے ہنسی۔ اک نگاہ اپنے وجود کی طرف ڈالی۔ گھٹیا سی چھینٹ کا ڈھیلا ڈھالا سا سوٹ پہنے تھی۔ پھر اک نظر صاحباں کے چم چم چمکتے سراپا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ریشمی ملائم ملائم سے سوٹ میں وہ خود بھی ریشم کی ہی بنی ہوئی ملائم ملائم اور نازک نازک سی گڑیا دکھائی دے رہی تھی۔

آپ کو نہیں معلوم ؟" سترجانہ پھر ہنسی ۔ مگر اُس ہنسی اور اِس ہنسی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"بتاؤں گی ۔ مگر پھر کبھی ۔" وہ یکایک سنجیدہ ہوگئی ۔

"اب تو ڈاکٹر کی دکان" اوہ نہیں نہیں ۔ کلینک آگیا ۔"

اور دونوں خاموش ہوگئیں ۔

سترجانہ کی اطلاع کے مطابق ڈاکٹر نواز واقعی بڑے اچھے مزاج اور اخلاق کے مالک تھے ۔ مریض موجود نہیں تھا لیکن پھر بھی مرض کی تفصیل پوری توجہ اور دلچسپی سے سنی ۔

دورے کی حالت میں اس کی کیا کیفیت ہوتی تھی ۔ کب سے اسے یہ تکلیف تھی ۔ اس کے گھریلو، خاندانی اور ذاتی حالات کیا تھے ۔ یہ سب کچھ انہوں نے پوچھا ۔ صاحباں جو کچھ جانتی تھی اس کی پوری تفصیل بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان کر دی ۔ سب سننے کے بعد بہت دیر ڈاکٹر صاحب کچھ سوچتے رہے ۔ پھر سر اُٹھایا ۔

یوں تو آپ کی پریشانی دیکھتے ہوئے میں آپ کو کوئی نہ کوئی دوا لکھ دوں لیکن یہ دیانتداری کی بات نہ ہوگی ۔ آپ کا مریض ڈاکٹر کا کیس ہے ۔ بہتر ہے آپ انہیں کے پاس جائیے ۔"

"ڈاکٹر عابد ؟ کون سے ڈاکٹر عابد ؟ کہاں ہے ان کا کلینک ؟"

"پنڈی میں ۔ بہت مشہور ماہرِ نفسیات ہیں ۔ آپ یقیناً جانتی ہوں گی ۔"

"نہیں ۔" صاحباں نے مختصر سا جواب دیا ۔

"تو کوئی بات نہیں ۔ میں ان کے نام رقعہ لکھے دیتا ہوں ۔ وہ اس کیس پر خصوصی توجہ دیں گے ۔ آپ بے فکر رہیں ۔"

بہت ساری تسلیاں اور دلاسے دینے کے بعد ڈاکٹر نواز نے ڈاکٹر عابد کے نام اک رقعہ اور ساتھ ان کا تفصیلی پتہ دے دیا ۔ ڈاکٹر نواز کے کلینک سے باہر نکلی تو صاحباں پہلے سے زیادہ پریشان تھی ۔ بی بی سے اور حارث سے راز میں رکھ کر وہ یہ کام کر چلی تھی مگر یہ ماہرِ نفسیات اور پنڈی والے معاملے نے سب کچھ ہی گڑبڑ کر دیا ۔ اب بھلا وہ چوری چوری پنڈی تک تو نہیں پہنچ سکتی تھی نا ...!

"آپ ایک دم چپ کیوں ہوگئیں چھوٹی بی بی ؟" واپسی میں سترجانہ نے پوچھا ۔

"تو اور کیا کروں سترجانہ ! جہاں آس دکھائی دیتی ہے وہاں ساتھ ہی پہلو سے لگی مایوسی بھی آن کھڑی ہوتی ہے ۔"

"کون سی آس اور کون سی مایوسی ؟"

"ڈاکٹر صاحب نے بہت یقین دلایا ہے کہ حارث ٹھیک ہو جائیں گے ۔ مگر یہ پنڈی والا معاملہ ۔ سوچو نا ۔ پنڈی کس طرح جا سکتا ہے اور اس ماہرِ نفسیات سے کیسے ملا جا سکتا ہے ؟"

"لو ۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ۔ جس طرح یہاں تک چلی آئی ہیں اسی طرح پنڈی بھی جا پہنچیں گی ۔ ہم دونوں ۔"

"ہم دونوں ؟ یعنی کہ میں اور تم ۔ اکیلی ...؟"

"آپ اور میں مل کر اکیلی کیسے ہوئیں ؟" سترجانہ قہقہہ لگا اٹھی ۔ "دو ہوگئیں چھوٹی بی بی ! پوری دو ۔"

"لیکن سترجانہ ..." اس کے قہقہے اور مذاق نے بھی صاحباں کی پریشانی رفع نہیں کی ۔ وہ اسی طرح بوکھلائی رہی ۔

"بی بی کی اجازت کے بغیر ؟"

"نیکی کا کام ہے چھوٹی بی بی ۔ ہم کوئی گناہ تو کرنے جائیں گی نہیں جو ڈریں ۔"

"مگر میں نے آج تک نہ کبھی بی بی کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا ہے اور نہ ہی ان کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم نکالا ہے یہ ۔ یہ پنڈی تک کا سفر ۔ نہ نہ سترجانہ ...!"

صاحباں لرز لرز کر کانوں کو ہاتھ لگانے لگی ۔

"اتنے ٹریفک کے حادثے ہو رہے ہیں ۔ روز کسی نہ کسی بس کے الٹنے کی خبر ہوتی ہے ۔ اگر ہمارے والی بس کو کچھ ہوگیا ۔"

"اگر بس کے حادثے کے ذریعے ہماری جانیں جانا تقدیر میں لکھی گئی ہیں نا ۔ تو ہمیں بستر پر کبھی موت نہیں آئے گی چھوٹی بی بی ..."

"وہ تو جانتی ہوں ۔ مگر میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب ہماری لاشیں پنڈی جانے والی ایک بس میں سے نکلیں تو بی بی کیا سوچیں گی ۔ کہ میں ان کی اجازت کے بغیر اور اس طرح چوری چوری اتنی اتنی دور تک چلی جایا کرتی تھی ۔ ہائے نہیں ۔ سترجانہ نہیں ۔ ایسا نہیں ہو ..."

سترجانہ پھر اک قہقہہ لگا کر ہنس دی ۔

"مرنے کے بعد جب پتہ چلے گا تو پھر وہ کیا کرلیں گی ہمارا ؟"

"نہیں نہیں ۔ میری بی بی کو دکھ ہوگا ۔"

"ہماری موت سے زیادہ اس کا دکھ ہوگا کہ بس میں کیوں مریں اور ان کی اجازت کے بغیر کیوں مریں ؟" سترجانہ ہنستی ہنستی ...

"بڑی بھولی ہیں آپ چھوٹی بی بی ...!"

"لیکن سترجانہ ! تم خود ہی سوچو ۔" صاحباں کھسیانی سی ہوگئی ۔

"چھوڑیے چھوٹی بی بی ! ایسے ایسے خدشات دل میں نہیں لائیے ۔ اس طرح زندگی تنگ ہو جاتی ہے ۔ مجھے دیکھ لیں میں اپنے ... کے بغیر نہ اک پل کے لیے جینا پسند کروں اور نہ مرنا ۔ مگر چونکہ پوری رازداری سے یہ کام کرنا ہے ۔ پھر بھی ایک انسان کی بہتری ... زندگی کا سوال ہے ۔ اس لیے کہیر خاں کو بتائے بغیر آپ کے ساتھ چلوں گی بھی اور جو بیتے گی کاٹوں گی بھی ۔ بے شک مرنا پڑے ... خیر ..."

سترجانہ صاحباں سے بہت زیادہ دلیر تھی ۔ اسے سمجھانے لگی ۔ "آپ بھی بہادر بنئے نا ۔ اتنے بڑے اور نیکی کے کام کا بیڑا اُٹھایا ہے تو میں بھی یہی دعا کر رہی ہوں کہ خدا آپ کو اسے انجام تک پہنچانے کی ہمت اور طاقت دے ۔ پروردگار آپ کے ساتھ ہے اور میں بھی آپ کی پوری پوری مدد کروں گی ۔"

سترجانہ کی ڈھارس نے واقعی صاحباں کی ہمت کو بڑی تقویت دی ۔ "لیکن سترجانہ ! پنڈی جانے اور واپس ایبٹ آباد آنے میں تقریباً اک پورا دن لگ جائے گا ۔ بی بی کے آگے اس کا کیا جواز پیش کریں گی ؟"

"وہ ۔ ہاں ۔ یہ سوچنے والی بات ہے ۔"

صاحباں اور سترجانہ دونوں مل کر سوچنے لگیں کہ پورے دن کی غیر حاضری کے لیے کون سا بہانہ بہتر تراشا جا سکتا تھا ۔ پکنک کا بہانہ بنائیں تو اس میں بہت سارے خطرات تھے ۔ چند سہیلیوں نے مل کر ہی منانا تھی اور ان میں سے کسی کا ملازم کسی کام وام کے لیے یا کوئی خود ملنے کی خاطر ہی اس کے گھر پہنچ سکتی تھی ۔

کوئی رشتہ دار بھی ایبٹ آباد میں نہیں تھا جس کے ہاں جانے اور پورا دن گزارنے کو جی چاہ اٹھتا ۔

کسی سہیلی کے ہاں بھی کوئی تقریب نہیں تھی کہ آج کی طرح اسے جھوٹ سچ اپنی مجبوری بتا کر آگے چل دیتیں ۔

بہت سارے بہانے دونوں نے سوچے مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی کجی رہ جاتی ۔ کوئی نہ کوئی جھول نکل ہی آتا ۔

"ارے ۔" پریشانی کے عالم میں بھی سترجانہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی ۔ یکایک ہی زور سے چلا پڑی ۔ "وہ مارا ۔"

"اب کیا ہوا ؟" صاحباں کو اس کی چیخ و پکار اچھی نہ لگی ۔ بہت گھور کر اُسے دیکھا ۔

"جھگیوں میں جانے کا بہانہ بنائیں گی ۔"

"کیا مطلب ؟" صاحباں اس علاقے اور یہاں کے راستوں اور خرید و فروخت کی جگہوں سے بالکل ناواقف تھی ۔ اس لیے سترجانہ کی بات سمجھ نہ سکی ۔

"جھگیوں میں پٹھان کپڑا بیچتے ہیں ۔ وہ جگہ ہمارے گھر سے بہت دُور ہے جانے آنے میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے اور پھر کپڑا ڈھونڈنے میں ۔ وہ بھی کوئی خاص قسم کا کپڑا ڈھونڈنے میں ۔ بہت وقت لگ سکتا ہے چھوٹی بی بی ۔"

"صبح سے شام تک ؟"

"اک صبح سے شام تک تو کیا ۔ چاہیں تو کئی صبحوں سے کئی شامیں کریں ۔" سترجانہ مسکرائی ۔

"بیگم صاحبہ کو کہیں گی کہ آج زرتاب بی کے گھر آپ کو اک ایسا کپڑا پسند آیا ہے جو صرف جھگیوں میں سے ملے گا اور وہ بھی صرف ایک پٹھان ٹلے پاس ہے ۔"

"تو ... ؟"

"ہاں اتنے مرد اور عورتیں اپنا اپنا مال لیے بیٹھے ہوتے ہیں کہ ان سب میں سے کسی خاص کو تلاش کرنا واقعی بہت مشکل ہو سکتا ہے ۔ اس بہانے کی آڑ لے کر تو ہم کئی دن پنڈی جا آ سکتی ہیں ۔"

"سچ ... ؟" صاحبان نے بے یقینی سے سترجانہ کو دیکھا ۔

"بالکل سچ ۔" سترجانہ ہنسی ۔

اور اس بار اس کی ہنسی بڑی طویل تھی ۔ کافی دیر بعد تھمی تو آنکھوں میں آیا ہوا پانی صاف کر کے کہنے لگی ۔

"شام کو واپس آ کر کہہ دیں گی کہ وہ ملا ہی نہیں ۔"

"کپڑا یا پٹھان ؟"

صاحباں کے اس معصوم سوال پر ستر جانہ کا ہنسی کے مارے پھر بُرا حال ہو گیا۔

"کچھ کہہ دیں گی چھوٹی بی بی! بات ایک ہی ہے۔"

"لیکن اگر بی بی نے وہاں جانے کی اجازت نہ دی ہو؟"

"ناممکن ہے چھوٹی بی بی! آپ کی کوئی خواہش ہو اور وہ بیگم صاحبہ پوری کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بالکل ناممکن۔"

صاحباں کو لاعلمی کی وجہ سے ستر جانہ کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔ اس کے بغیر کوئی اور چارہ بھی نہ تھا اور نہ کوئی اور راستہ کوئی حل۔

بی بی کو جب صاحباں کی خواہش کا علم ہوا تو بلا سوچے سمجھے نہ صرف یہ کہ اجازت دے دی بلکہ ضرور بالضرور وہاں جھگیوں پر اور اپنا من پسند کپڑا لے آنے کی تاکیدیں بھی کرنے لگیں۔

ستر جانہ بی بی کی نظریں بچا بچا کر صاحباں کو اشارے کرتی اور ہنستی رہی۔

"بیگم صاحبہ! اگر کپڑا تلاش کرتے کرتے ہمیں صبح سے شام ہو گئی تو۔؟"

ستر جانہ نے دانستہ بی بی کی توجہ پیشتر ہی اس طرف مبذول کرا دی۔ پیش بندی کے طور پہ کہ بعد میں دیر ہو جانے پر وہ پریشان ہونے لگیں۔

"کوئی بات نہیں۔ میری صاحباں کی خواہش پوری ہو جائے۔"

وہ بڑے اطمینان سے بولیں مگر دوسرے ہی لمحے کسی سوچ کے تحت یکایک گڑبڑاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"ہاں مگر۔ حارث کے کھانے کا کیا بنے گا؟"

اب ان کی نگاہ صاحباں پہ مرکوز ہو گئی۔ اس نے خود ہی تو یہ ذمہ داری اُٹھائی تھی۔

"ارے ہاں۔ حارث کے کھانے کا کیا بنے گا؟" صاحباں بھی فکر مند ہوتے ہوئے متردد لہجے میں بڑبڑائی۔

"بیگم صاحبہ! کبیر خاں کس لیے ہے؟ کیا وہ نہیں دے آئے گا؟"

"ہاں بی بی! ستر جانہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کبیر خاں دے آئے گا۔ ایک دن کی تو بات ہے"۔

صاحباں نے ستر جانہ کا مشورہ جیسے دل و جان سے قبول کر لیا۔

"اور بیگم صاحبہ! اسے کہیے گا۔ کھانا دینے جائے تو ان کے اور بھی چھوٹے موٹے کام کر آئے۔"

"وہ ذرا بے وقوف ہے نا۔" بی بی جھٹ سے بولیں "کہیں اس سے اُلٹ پلٹ باتیں نہ کرنے لگ جائے۔ کام وام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"بے وقوف۔" کبیر خاں کو دیئے گئے بی بی کے اس خطاب پہ صاحباں کو بہت مزہ اور ہنسی آئی۔ وہ بے قابو ہو کر ہنسنے لگی اور ستر جانہ پہلے ذرا خفیف سی ہوئی پھر یک دم خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے بولی۔

"اول تو بیگم صاحبہ وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے، دوسرے میں اسے کوئی فالتو بات کرنے سے منع کر دوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"اور اگر وہ منع نہ ہوا تو؟" صاحباں شوخی سے بولی۔

"کیسے نہیں منع ہوگا۔" ستر جانہ بھی اسی طرح شوخ ہو گئی "مٹھی میں کیا ہوا ہے چھوٹی بی بی! مٹھی میں۔"

"کسی جادو سے مکھی بنایا ہوا ہے؟" صاحباں مسکرائی۔

"ہاں۔ یہی سمجھ لیجئے۔ محبت بھی تو اک جادو ہے۔ سب سے بڑا جادو۔"

اور وہ کھل کھل کرتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

❋

اگلے دن علی الصبح نماز سے فارغ ہوتے ہی صاحباں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ کچھ اضطراری سی حرکات ... اُلٹ پلٹ کر رہی تھی۔

بی بی نے یہ سب دیکھا بھی مگر متعجب بالکل نہیں ہوئیں۔ ان کے خیال میں صاحباں کا شوق اتنا شدید تھا کہ اسی کے جوش و مسرت میں ذرا بی یہ سب کچھ کئے جا رہی تھی۔

آج صاحباں نے ناشتہ بھی سب سے پہلے ہی کر لیا۔ ستر جانہ لا لا کر دیتی رہی اور وہ بی بی کو بھی پوچھے بغیر کیں ہی جھجکی کھاتی رہی، معمول سے کہیں زیادہ کھا گئی۔ بی بی اس کی خوشی، اس کا شوق اور دیوانوں ایسی حرکات دیکھ کر مسکراتی رہیں اور اس کے پیارے پیارے انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے دل ہی دل میں اس پر سے فدا اور قربان بھی ہوتی رہیں۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر، لباس وغیرہ تبدیل کر کے، یہ بڑا سا پرس بازو میں لٹکائے ہوئے صاحباں ستر جانہ کو ساتھ لیے روانہ ہونے لگی تو بی بی برآمدے تک اس کے پیچھے لپکی چلی آئیں۔

"یہ لو۔" بہت ڈھیر سارے روپے انہوں نے بازو میں لٹکے ہوئے صاحباں کے پرس میں ڈال دیئے۔ "مجھے تو ابھی ابھی خیال آیا ہے"۔

"یہ اتنے سارے اور۔ بی بی! میرے پاس تو پہلے ہی بہت تھے۔"

صاحباں گھبرا گئی۔ بس کے سفر میں وہ زیادہ رقم بھی پاس نہیں رکھنا چاہتی تھی مگر بی بی کی محبت ایسی اٹل حقیقت تھی جو ہمیشہ اپنا وزن برقرار رکھتی تھی۔ وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اس کپڑے کے علاوہ اور بھی جو جو کچھ پسند آئے وہ لے لینا۔"

بی بی بڑے پیار سے اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کو تکنے لگیں۔ "پگلی! ابھی تک تکلف کرتی ہے۔

"ستر جانہ! تم خیال رکھنا۔ خود اسے لے کر دینا۔ یہ اپنی ذات کی طرف سے اور اپنی آرزوؤں کی طرف سے ہمیشہ غافل اور بے پرواہ رہتی ہے۔ ماں کے سینے کے اندر کبھی جھانکتی ہی نہیں۔"

مزید کچھ کہنے کی بھی گنجائش کہاں رہ گئی تھی۔ بی بی نے بات ہی ایسی کر دی تھی۔ صاحباں نے چپ چاپ سر جھکا لیا۔

بہت اچھا بیگم صاحبہ! ایسا ہی ہوگا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آج چھوٹی بی بی وہی سب کچھ کریں گی جو آپ کی خوشی ہو گی۔"

"خدا حافظ بی بی ....!" پھر جانے کیا ہوا۔ صاحباں ایک دم ہی انہیں لپٹ گئی۔

"پگلی ....!" بی بی مسکرانے لگیں "تم اس طرح کر رہی ہو جیسے کسی بہت لمبے سفر پہ جا رہی ہو۔"

"اک لمحے کا بھی بی بی! کیا بھروسہ؟ شاید پھر زندگی ...."

"چلو چھوٹی بی بی چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔ صبح صبح ہی چیز اچھی ملتی ہے۔"

ستر جانہ نے اسے بات بھی پوری نہیں کرنے دی۔ ایک دم ہی بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اتنی جذباتی ہو رہی تھی۔ جانے کیا کہہ دیتی۔

"کمال کرتی ہیں چھوٹی بی بی آپ بھی۔" بی بی سے ذرا فاصلہ ہوا تو ستر جانہ بڑبڑائی۔ "آپ کے سینے میں تو کسی چڑیا کا دل ہے شاید۔"

"وہ .... وہ مجھے بس کا حادثہ یاد آ گیا تھا۔ کیا پتہ پھر بی بی کی شکل دیکھ سکوں یا نہیں"۔

"حد کرتی ہیں۔" ستر جانہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"دونوں ہی ماں بیٹی ایک جیسی ہیں۔ ارے چھوٹی بی بی! وہ تو بوڑھی ہو گئیں۔ مگر آپ نے تو ابھی جوانی کی منزل کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے، یہ راستہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ آپ کے دل کا وزن اتنا ہی رہا تو آگے آپ کیا کریں گی ....؟"

"اس میں دل کے وزن کی کیا بات ہے؟" صاحبان نے تیکھی نگاہ سے اسے دیکھا۔

"جوانی کی منزل کو جانے والے جو راستے ہیں ان میں بہت کچھ آتا ہے۔ کچھ محبتیں، کچھ عشق و عاشقی، پھر جدائیاں، ملاپ، بے وفائیاں۔ آپ کا دل اتنا ہی چھوٹا رہا تو آپ ...."

"چل بدتمیز..." صاحباں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "آج کل تو بڑی بے حیا ہوتی جا رہی ہے۔" جانے کیوں ہر وقت بس یہی تمہارے دماغ پر چھایا رہتا ہے۔"

"ہر وقت تو نہیں۔ بس آپ کو دیکھتی ہوں تو ایک دم..." پھر وہ دانستہ چپ ہو گئی۔

"کیا ایک دم...؟"

"دیکھا۔ دیکھی۔ آپ خود بھی سننا چاہتی ہیں۔"

"بکواس..." اور صاحباں کھسیانی سی ہو کر مسکرا پڑی۔

جب گھر سے نکلی تھیں تو صاحباں بے حد خوف زدہ تھی۔ اس کی ڈری ڈری اور سہمی سہمی چال ہی اس کی گواہی دے رہی تھی مگر سنجانہ اس سفر سے بے حد خوش تھی۔ صاحباں کی راز دار بن کر اس مہم کو سر کرنے کی اسے اس سے زیادہ لگن تھی۔ وہ اس معاملے سے اک ایڈونچر کی طرح محظوظ ہو رہی تھی۔

سارا راستہ بھی بہت باتیں کرتی آئی تھی۔ بس میں بہت بھیڑ ہونے کے باوجود جگہ بھی اچھی حاصل کر لی تھی اور پھر گم سم بیٹھی صاحباں کو سفر کے دوران اپنی ڈھیر ساری باتیں سنائیں، اتنے ہنسی کے قصے بیان کیے کہ پنڈی پہنچتے پہنچتے وہ بھی اسی کی طرح ہشاش بشاش اور دلیر ہو گئی۔ اچھا ہی کیا جو صاحباں کو راز دار بنا لیا۔ وہ تو بڑی اچھی مدد گار ثابت ہو رہی تھی۔ صاحباں کی سوچ نے اطمینان کا سانس لیا۔

ڈاکٹر کا پتہ ان کے پاس لکھا ہوا موجود تھا اور کچھ ڈاکٹر نواز نے اتنی تفصیل کے ساتھ اور اتنی اچھی طرح زبانی بھی سمجھا دیا تھا کہ وہاں تک پہنچنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔

ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹر عابد کے نام کی چمکیلے حروف والی تختی پر نظر پڑتے ہی صاحباں بری طرح اچھل پڑی۔ پھر یکایک انداز میں چلاتے ہوئے سنجانہ کے ساتھ لپٹ گئی۔

"سنجانہ! ڈاکٹر عابد مل گئے۔ سنجانہ! وہ دیکھو۔ وہ رہا ان کا بورڈ اور وہ اس دروازے کے ساتھ ان کے نام کی تختی۔ اب حارث ٹھیک ہو جائیں گے۔"

سنجانہ صاحباں کی بے قراری اور جنون دیکھ کر پھر کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

"بدتمیز..." صاحباں کو اس کی ہنسی عجیب سی لگی تو کھسیا کر اسے پرے دھکیلتے ہوئے خود ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں گھس گئی۔ مسئلہ خاصا ٹیڑھا تھا۔ مریض کو ملے یا دیکھے بغیر ہی اس کا علاج کرنا تھا۔ جو کافی دشوار تھا۔ ڈاکٹر عابد نے اس بات کا اظہار کیا مگر۔ صاحباں کے خوب صورت اور حواس باختہ چہرے اور گھبراہٹوں بھرے انداز کو دیکھ کر انہیں اس پر بے حد ترس آ گیا۔

"دیکھیے بی بی! گو یوں علاج کرنا اندھیرے میں تیر پھینکنے کے مترادف ہو گا مگر میں پھر بھی کوشش کروں گا۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ پلیز۔"

"ہاں ہاں بی بی۔!" ڈاکٹر صاحب نے اسے پرسکون کرنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پھر مسکرائے۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ بس آپ یوں کیجیے کہ مریض کے متعلق جتنی زیادہ سے زیادہ تفصیل جانتی ہیں وہ پوری وضاحت سے بیان کر دیجیے۔"

ڈاکٹر صاحب سر جھکا کر بیٹھ گئے اور صاحباں نے بی بی کی سنائی ہوئی اس کی بچپن سے لے کر جوانی تک کی باتیں، پھر باپ بیٹے میں کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر ہو جانے والے جھگڑے کا قصہ، گھر سے فرار اور بیٹے کی جدائی میں ماں کی تڑپ اور بے قراری اور پھر بیٹے کا مرض، جو اکثر اس کے سامنے والدین کا نام لینے سے اس پر دورے کی صورت میں حملہ کرتا تھا۔ پھر دورے کے دوران اس کی کیا حالت ہو جاتی تھی۔ سب کچھ صاحباں نے پوری تفصیل سے بتا دیا۔

حارث کو جو دورہ پڑتا تھا اس کا منظر صاحباں نے کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کا تو پورا نقشہ کھینچ کر اس نے دیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے غور اور پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ صاحباں کی آواز بھرا رہی تھی۔ انہوں نے نگاہ اٹھائی۔

شاید خود صاحباں کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ حارث کی حالت بیان کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کئی ڈاکٹر صاحب اس کی بھیگی بھیگی پلکوں، کپکپاتے تھرتھراتے لبوں اور نم آلود چمکیلے اور شفاف رخساروں کو دیکھتے رہے۔

"بہت دلچسپ۔" ڈاکٹر صاحب مسکرا اٹھے۔ "آپ فکر نہ کریں بی بی! مریض انشاء اللہ بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔"

"سچ؟ سچ ڈاکٹر صاحب...؟" صاحباں جذباتی انداز میں بولی لیکن لہجے سے اب بھی بے یقینی عیاں تھی۔

"ہاں۔" ڈاکٹر صاحب نے پھر مسکراتے ہوئے اس کے مضطرب چہرے کو دیکھا۔ "لیکن اس کے لیے محنت بہت کرنا پڑے گی۔"

"کسے؟ مریض کو...؟" صاحباں نے فکر مندی سے پوچھا۔

"مریض کو نہیں۔" ڈاکٹر صاحب انتہائی باوقار سنجیدگی کے ساتھ بولے۔ "مریض کے سرپرستوں کو۔ مریض کے لواحقین کو۔ نفسیاتی مریض تو بی بی! خود بے چارہ بالکل بے یار و مددگار ہوتا ہے۔ وہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"کچھ بھی ہو ڈاکٹر صاحب! کتنی بھی محنت کرنا پڑے ہم کریں گے۔ میں خود کروں گی۔"

صاحباں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ بولی۔

"سب سے پہلے تو یہ احتیاط برتنا ہو گی کہ مریض کے سامنے کسی ایسی ہستی کا ذکر بالکل نہیں آنا چاہیے، جس سے وہ اس دورے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

"بہت اچھا۔ ایسا ہی ہو گا ڈاکٹر صاحب۔"

"اس کے بعد۔" ڈاکٹر صاحب کچھ سوچنے لگے۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔

"مریض کے ذہن سے پچھلی یادیں مٹانا ہوں گی۔"

"مگر کیسے ڈاکٹر صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"آپ نے بتایا نا اسے بچھڑ جانے والوں سے بہت محبت تھی۔"

"جی ہاں۔ اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔ دونوں ہی فریقین کی طرف سے۔"

"انہی جدائی کا صدمہ ناقابل برداشت ہو گیا اور پھر مریض کو ایسے دورے پڑنے لگے۔ تو بی بی! کوئی ہستی اس سے اتنی محبت کرے، اسے اتنی توجہ دے، اتنا خلوص دے کہ اس کے پہلے سب جذبے، سب احساسات مغلوب ہو جائیں۔ اس توجہ، محبت اور خلوص کا سحر اسے اس طرح سحور کر دے کہ کچھ اور اسے یاد ہی نہ رہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے پوری وضاحت کے ساتھ صاحباں کو سمجھایا۔

"پھر۔ اس کامیابی کے بعد کسی کا بھی نام لینے سے اسے دورہ نہیں پڑا کرے گا۔ ان کا ذکر آئے گا بھی تو اس کی ایسی حالت نہ ہو پائے گی..."

"مگر۔" صاحباں متفکر سی ہو کر بولی۔

"ایسا کس طرح ہو؟" کون اسے اتنا خلوص، اتنی توجہ اور ایسی محبت دے۔ یہ تو بہت مشکل ہے ڈاکٹر صاحب!"

"مشکل کیوں بی بی...؟"

"بھلا ہم کہاں سے ایسی ہستی تلاش کریں گے؟"

"تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے بڑے اچنبھے سے صاحباں کو گھورا۔

"بی بی تم خود جو ہو۔"

"جی؟ میں...؟" صاحباں بری طرح گھبرا گئی۔

"ہاں۔ تم۔ تم اس سے محبت کرو۔"

"میں...؟ میں...؟ ڈاکٹر صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

صاحباں گھبرا گھبرا کر کبھی سنجانہ کو اور کبھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھنے لگی۔ "ہاں ہاں۔ تم بی بی۔ تم..."

اس کے خوب صورت چہرے پر پھیلی گھبراہٹوں کو انتہائی دلچسپی سے تکتے ہوئے ڈاکٹر صاحب مسکرائے۔

"وہی محبت جو دل میں چھپائے ہوئے ہو، اس کا اظہار اس پر کر دو۔"

"لیکن۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! یقین کریں میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

فق چہرے اور پسینے سے بھیگی پیشانی کو رومال سے پونچھ پونچھ کر صاحباں ڈاکٹر صاحب کو کپکپاتے لہجے میں یقین دلانے کی کوشش کرنے لگی...

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کو بتایا نا کہ وہ اس کا کزن ہے۔"

صاحباں نے لرزتی انگلی سے سنجانہ کی جانب اشارہ کیا۔

"اس کا ڈاکٹر صاحب! میں تو ایسے ہی اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔"

تجربہ کار ڈاکٹر عابد بڑے زور سے ہنس پڑے۔

"بی بی! اس کا رشتہ دار ہونے کا ذکر تم پہلے بھی کر چکی ہو مگر حقیقت وہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اس کا تعلق یا رشتہ داری جو کچھ ہے تم سے ہے اس سے نہیں۔ سمجھیں؟"

"ارے!" صاحباں کی تائید یا تردید سے پہلے ہی شرجانہ گھبرا کر بول پڑی۔
"ڈاکٹر صاحب آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"
"میں ماہرِ نفسیات ہوں بی بی! یہاں بیٹھا سبزی ترکاری نہیں بیچ رہا۔"
ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ کے ساتھ شرجانہ بھی کھُل کر ہنس دی۔
"لیکن ڈاکٹر صاحب! یہ آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے۔"
صاحباں کی حالت قابلِ دید تھی۔ آواز حلق میں پھنسی جا رہی تھی۔ اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔
"میرا اس کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! وہ تو، وہ تو"
اور پھر اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی۔
"ڈاکٹر صاحب! وہ تو انتہائی بداخلاق اور بدتمیز شخص ہے۔"
صاحباں نے انھیں یقین دلانے کے لئے اس پہلو سے بات کی۔

"اس جیسے شخص سے تو کوئی وابستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو اک جنگلی سا جانور ہے۔"
"کچھ بھی ہو، بدتمیز یا بداخلاق یا جنگلی سا جانور ہے تو انسان نا؟ اور اک انسان کے لئے اس کی زندگی کے لئے پ
کیا تم خلوص و محبت کا فرضی کھیل بھی نہیں رچا سکتیں؟"
ڈاکٹر صاحب کو شاید اس پر ترس آ گیا تھا۔ وہ بات بدل گئے۔
"لیکن میں ہی کیوں ڈاکٹر صاحب؟"
ڈاکٹر صاحب نے بات بدلی تو صاحباں بھی کچھ سنبھلی۔ "میں ہی کیوں بھلا؟"
"تمھارے دل میں اس کے لئے ہمدردی ہے۔ تم نے اس کے لئے گھر والوں سے چوری چوری ایبٹ آباد سے پنڈی کا
سفر اختیار کیا ہے۔ تمھاری آنکھوں سے اس کے لئے آنسو بہے ہیں۔ لہٰذا تم اس کے لئے سب کچھ کر سکو گی۔ مجھے پورا یقین
تم اس کی خاطر بڑی سے بڑی مشکل سے بھی گزر جاؤ گی۔"
پھر معمر ڈاکٹر نے اپنے لہجے میں بزرگانہ نرمی پیدا کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔
"ایک ڈاکٹر کے سامنے ہمیشہ سچی بات کرنا چاہیے بیٹی!"
"لیکن ڈاکٹر صاحب!" اور کچھ کہے بنا صاحباں کی نظریں جھک گئیں۔
"میں تمھاری اُلجھن کو سمجھ گیا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تم مجھ سے رابطہ قائم رکھنا۔ ہر آٹھ دس دن بعد
کے متعلق گفتگو کیا کریں گے۔"
"لیکن ڈاکٹر صاحب! اب ہم شاید پنڈی نہ آ سکیں۔ آج بھی بڑی مشکل سے..."
"ہاں ہاں، نہ سہی۔ فون پر بھی بات ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر صاحب بڑے مشفق لہجے میں بولے۔
"اوہ! ہاں، وہ قریب ہی میری ایک سہیلی کے گھر میں ہے۔"
"بس پھر، دعا اور دوا جاری رکھنا۔ انشاء اللہ کامیابی قدم چومے گی۔"
"دوا کون سی آپ نے دی ہے ڈاکٹر صاحب؟"
"دی نہیں، بتائی ہے۔ محبت، محبت، بس وہی دوا باقاعدگی سے استعمال کرانا۔"

ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر بڑی شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ صاحباں جلدی جلدی فیس وغیرہ ادا کر کے تیز تیز قدموں سے کرے
باہر نکل گئی۔
صاحباں بڑی چُپ چاپ اور کھوئی کھوئی سی تھی مگر شرجانہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔ بلاوجہ ہی۔ اور مسلسل باتیں کئے جا رہی
"اب تو چھوٹی بی بی مجھے اپنا اُستاد بنا لو۔"
صاحباں بس کی کھڑکی میں سے باہر ہی تکے جا رہی تھی۔ شرجانہ نے اس کا بازو ہلایا۔
"اے چھوٹی بی بی! سُنی میری بات؟ مجھے اپنا اُستاد بنا لو۔"
"کیا مطلب...؟"
شرجانہ نے دوبارہ وہی بات کی تو صاحباں نے مڑ کر غصیلے انداز میں اسے گھورا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"اک کھرو جوان کو پھانسنے کے ایسے ایسے گُر بتاؤں گی کہ..."
"بکواس مت کر شرجانہ!" صاحباں نے اسے ڈانٹا۔
"دیکھو چھوٹی بی بی! یہاں بس میں غصہ نہیں کرو۔ پڑوسی کے گھر جا کر کرنا۔ بہت خوبصورت لگتی ہو۔ اک منٹ میں اس کا
مرض دور ہو جائے گا۔"
شرجانہ کی اس بات نے صاحباں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔
"جانے کیا کیا بکے جا رہی ہو۔ اور وہ ڈاکٹر بھی یقیناً سٹھیا چکا ہے۔ ایک ہی بات بار بار کہے جا رہا تھا۔"
"دوسری کی گنجائش جو نہیں تھی۔"
شرجانہ چھیڑنے سے باز نہیں آئی تو صاحباں نے صرف اک تیکھی نگاہ سے اسے گھورنے کے بعد پھر کھڑکی کی طرف
رُخ موڑ لیا۔
"دیسے چھوٹی بی بی! تجربے کی ایک بات بتاؤں؟"
جانے کیا بتانے لگی تھی۔ شاید کوئی بہت ہی کام کی بات۔ صاحباں سُننے کے لئے جلدی سے گھومی۔
"کیا؟" بے حد اشتیاق و تجسس سے پوچھا۔
"جس نے زندگی میں کسی سے پیار نہیں کیا، عشق نہیں کیا، سمجھو وہ اک بیکار سی زندگی گزار کر اس دُنیا سے چلا گیا۔"
"توبہ شرجانہ! کیسی باتیں کئے جا رہی ہو؟" اب صاحباں کے لہجے میں شعلوں کی لپک کے بجائے شبنم کی ٹھنڈک تھی۔
"سچ کہتی ہوں چھوٹی بی بی! دنیا عشق کو روگ کہتی ہے مگر میں اسے زندگی کی سب سے بڑی نعمت، سب سے بڑی لذّت
سب سے بڑی مسرت کہتی ہوں۔ کسی کی محبت حاصل ہو، اس میں جو مزہ ہے وہ تو ہے ہی۔ مگر کسی سے محبت کی جائے، اس میں اِک
عمدہ، اِک خاص اور اِک انوکھا سا لطف ہے۔"
پھر شرجانہ تقریباً بیسویں بار اپنے اور کبیر خان کے عشق کی داستان کے اقتباسات صاحباں کو سُنانے لگی، جو بے حد دلچسپ تھے
یوں واپسی کا راستہ پہلے سے بھی جلد کٹ گیا۔
گھر پہنچیں تو شام ہو چلی تھی۔ سارا دن نہ اُنھوں نے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ جانے، آنے اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے
کھانے پینے کا ہوش ہی کب رہ گیا تھا لیکن وہ پھر بھی ہشاش بشاش تھیں۔ باتیں کئے جا رہی تھیں اور ہنسے جا رہی تھیں۔
برآمدے میں ہی پریشان حال بی بی مِل گئیں۔ بالکل رونے والی ہو رہی تھیں۔
"کیا ہوا بی بی؟"
صاحباں گھبرا کر، تڑپ کر ان کے پاس چلی گئی۔
"تم نے اتنی دیر لگا دی۔ میرا تو پریشانی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔"
"اور ہمارا بھی بی بی! بُرا حال ہو گیا۔" بی بی کی پریشانی رفع کرنے کے لئے صاحباں انتہائی خوشگوار انداز، لہجے اور آواز میں بولی۔
"کیوں؟ تمھیں کیا ہوا؟" بی بی نے پوچھا۔
"جو کپڑا چھوٹی بی بی لینا چاہتی تھیں وہ کہیں بھی نہیں ملا تو بیگم صاحبہ! ہم پنڈی سے لینے چلی گئیں۔" پاس سے کھی کھی کر
ہنستے ہوئے شرجانہ بولی۔
"پنڈی؟" بی بی پھیل پھیل آنکھوں سے صاحباں کو گھورتے ہوئے چلا پڑیں۔
"تم پنڈی گئی تھیں! دونوں اکیلی؟"
"دونوں اکیلی نہیں بیگم صاحبہ! دونوں دو ہوتے ہیں بلکہ بعض وقت گیارہ۔"
شرجانہ کی شرارت سے صاحباں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اسے ہونٹوں ہی میں دبا کر جلدی سے بی بی سے مخاطب ہوئی۔
"بک رہی ہے یہ بی بی! صرف آپ سے مذاق کر رہی ہے۔ ورنہ آپ کی اجازت کے بغیر ہم بھلا کبھی ایسا کوئی قدم اُٹھا سکتی ہیں؟"
ساتھ ہی صاحباں نے بی بی سے چھُپا کر شرجانہ کو آنکھ ماری۔
"جا زنا۔ کھانے یا چائے کا بندوبست کرو۔ سخت بھوک لگی ہے۔"
"سارا دن کچھ نہیں کھایا؟" بی بی پریشانی سے پوچھنے لگیں۔
"کہاں سے کھاتی؟ میری بی بی میرے پاس تھوڑی تھیں جو وقت پر کچھ نہ کچھ کھلا پلا دیتیں؟"
صاحباں نے بی بی کے گلے میں بازو حمائل کر دیئے۔
"ہائے ہائے شرجانہ! کھڑی دیکھے جا رہی ہے۔ جا جلدی کر۔ سالن وغیرہ گرم کر لے، سب کچھ پکا کر رکھا ہوا ہے۔"

شرجانہ کو حکم دیتے ہوئے بی بی کچھ زیادہ ہی افسردہ ہو گئیں۔
"اور ادھر وہ بھی سارے دن کے فاقے سے ہے۔"
"کیا مطلب؟ کون فاقے سے ہے؟"
"حارث!"
"کیوں؟" صاحباں یکایک گھبرا گئی۔ "وہ کیوں فاقے سے ہے؟ آپ نے کھانا نہیں بھیجا تھا؟"
"میں بھلا بھول سکتی تھی صاحباں! کبیرے کے ہاتھ وقت پر بھیج دیا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آج اسے بھوک
"اوہ! جانے کیا ہو گیا؟ کہیں طبیعت ..." لیکن بی بی کو سامنے دیکھ کر صاحباں جلدی سے چپ ہو گئی۔ پھر اپنی گھبراہٹ
اطمینان و سکون میں بدلنے کے لئے اک طویل سا سانس لیتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔
"میں ابھی معلوم کر کے آتی ہوں نا۔ آپ بی بی بالکل پریشان نہ ہوں۔"
سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔ ابھی سانس بھی نہیں لیا تھا۔ اندر جانے کے بجائے برآمدے سے ہی حارث کے گھر کی طرف چل پڑی۔
"لیکن بیٹی!" بی بی نے پیچھے سے پکار لیا۔
"اگر جا ہی رہی ہو تو پھر اس کا کھانا بھی لیتی ہی جاؤ۔ سارے دن کا بھوکا ہے۔"
بی بی کی آواز بھرا رہی تھی۔
"یہ بھی درست ہے۔ لایئے پھر جلدی سے نکال دیجئے۔"
بی بی باورچی خانے کی طرف لپکیں تو صاحباں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلی آئی۔ کھانا گرم کرنے اور ہاٹ کیس میں نکالنے
نے دو منٹ بھی نہیں لگائے۔ صاحباں ان کے ہاتھوں کی تیزی میں وہی ممتا کا جذبہ دیکھ رہی تھی۔
"خدا آپ کو سکون دے بی بی!" صاحباں نے دل ہی دل میں انھیں دعا دی۔
"لو!" بی بی نے اس کی طرف ہاٹ کیس بڑھایا۔ "اسے ضرور کھلا دینا۔ بے شک زبردستی کرنا پڑے۔"
لہجے میں عجیب سی کپکپاہٹ تھی۔ صاحباں نے ہاٹ کیس ان کے ہاتھ سے لے لیا اور بی بی کے چہرے پر نگاہ پڑنے سے پہلے
تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔
حارث کے گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ صاحباں نے کمرے کے اندر قدم رکھا تو وہ سامنے ہی صوفے پر جانے کن سوچوں میں
ڈوبا چپ چاپ بیٹھا دکھائی دیا۔
اس کے قریب پہنچ کر صاحباں نے سلام کیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ صاحباں نے میز پر کھانا رکھتے ہوئے اس کا حال چال پوچھا
تب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ یہاں تک کہ نگاہ اٹھا کر بھی حارث نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"آج شاید پھر بد مزاجی کا دورہ پڑا ہوا ہے۔"
صاحباں نے اس کے عین سامنے نیچے بیٹھتے ہوئے اور جھک کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔
وہ تب بھی کچھ نہیں بولا۔ مگر اس کے چہرے سے صاحباں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ بد مزاجی کا دورہ نہیں تھا۔ کوئی اور بات
آج پہلے کی طرح اس کا چہرہ بگڑا ہوا نہیں تھا۔ نہ پیشانی پر سلوٹیں تھیں، نہ آنکھوں میں نفرت کے انگارے اور نہ
تلخ کلامی۔
البتہ یہ خاموشی، یہ خاموشی... یہ تو کسی اور ہی انداز کی تھی۔ جانے کیوں اس طرح سوجا پھولا چہرہ لئے بیٹھا اور
نظریں چراتا وہ اسے ہمیشہ سے مختلف اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔
"ناراض ہیں؟"
صاحباں نے پھر پوچھا۔ جواب میں پھر خاموشی ملی۔
"چلو مانا مجھ سے کسی بھول چوک کی وجہ سے ناراض ہیں مگر کھانے سے تو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو کھایئے۔"
حارث نے زبان سے جواب اب بھی کوئی نہیں دیا صرف نفی میں سر ہلا دیا۔
"لیکن کیوں؟ سارے دن کے بھوکے ہیں۔ پھر بھی انکار؟"
"ہاں!" اور اب اس کی پھنسی پھنسی گھمبیر سی آواز حلق سے برآمد ہوئی۔
"اب یہ میرے لئے جائز نہیں رہا۔"
"کیوں؟ کیا ہو گیا اس کو؟ میرے سامنے تو بی بی نے نکالا تھا۔ برتن وغیرہ سب صاف تھے۔" وہ گھبرا گھبرا کر اسے

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"
"پھر...؟"
"آپ کے اور میرے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس لئے اب یہ کھانا بھی میرے لئے ناجائز ہو گیا۔"
"معاہدہ ٹوٹ چکا ہے؟ کس نے توڑا؟"
"آپ نے۔ اور کس نے؟"
"ایمان سے میں نے نہیں۔" وہ انتہائی معصومیت اور خلوص سے قسمیں کھانے لگی۔
"جھوٹی قسمیں مت کھایئے۔"
"جھوٹی قسمیں! ... جھوٹی قسمیں کھا رہی ہوں؟" وہ روہانسی ہو گئی۔
"معاہدہ یہی ہوا تھا نا کہ آپ کھانا خود لایا کریں گی۔ اور آج سارا دن کہاں تھیں آپ؟ ٹوٹ گیا نا معاہدہ؟"
"اوہ!" صاحباں زور سے ہنس پڑی۔
"بس اتنی سی بات پر اتنی زیادہ ناراضگی اور اتنا بڑا فیصلہ؟"
"آپ کے لئے اتنی سی ہو گی مگر میرے لئے، میرے لئے... یہ سارا دن... یہ سارا دن کس اذیت۔" وہ چپ سا ہو گیا۔ پھر لمحہ بھر بعد بولا۔
"لیکن آپ نہیں سمجھ سکیں گی۔"
"مجھے اچانک ایک مریض کی خاطر پنڈی کے ایک ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ گیا تھا۔"
صاحباں بہت نرمی سے اور اسے سمجھانے والے انداز میں بولی۔
"میں نے جان بوجھ کر کوتاہی نہیں کی۔ ایمان سے میرا ارادہ نہیں تھا۔"
غیر ارادی طور پر صاحباں اسے منانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"میں کیا جانوں؟" وہ اسی طرح روٹھا روٹھا بڑبڑایا۔
"یعنی کہ میرے کہنے کا اعتبار ہی نہیں؟"
"آپ نے کون سا میری تکلیف کا احساس کر لیا۔ ایک پرزہ ہی لکھ کر بھیج دیتیں۔"
"مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنی معمولی بات پر آپ اتنے سنجیدہ ہو جائیں گے۔"
"میڈم! اتنا جان لیجئے کہ جب کوئی جانور سنجیدہ ہوتا ہے نا تو وہ انسانوں سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو جایا کرتا ہے۔"
"میں نے بتایا نا مجبوری ایسی تھی کہ اور کچھ بھی یاد نہ رہا۔ ویسے۔"
وہ بڑے انداز سے مسکرائی۔
"میں عجلت اور افراتفری میں بھی آپ کے کھانے کی تو تاکید کر کے ہی گئی تھی۔ پھر بھی یہ غصہ؟"
"کھانا۔ کھانا۔ کھانا۔" صاحباں کی اس بات پر وہ یکدم ہی بھڑک اٹھا۔
"آپ صرف کھانے ہی کو مقصدِ حیات سمجھتی ہیں؟ آپ یہ جانتی ہیں کہ صرف اس کھانے کی خاطر میں آپ کا۔ میں آپ کا انتظار۔ اُوہ!
نہیں۔"
وہ پھر پہلے ہی کی طرح اپنی بات نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ ایک لمحے بعد سر اٹھا کر اسی غصیلے لہجے میں بولا۔
"لے جایئے یہ کھانا۔ میں کمینہ نہیں ہوں۔"
اتنی بڑی بات حارث نے کہہ دی تھی۔ بغیر کسی خاص یا بڑی وجہ کے ہی غصے اور ناراضگی کا اظہار کئے جا رہا تھا۔ اتنے توہین آمیز
میں کھانے کو دھتکار دیا تھا۔ مگر، نا جانے کیوں؟ پھر بھی، صاحباں کو کچھ بھی برا نہیں لگا۔ اک خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ
کے سامنے جھک کر اپنے نازک نازک سفید سفید ہاتھ جوڑ دیئے۔
"آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ معاف کر دیجئے۔"
صاحباں کا مسکراتا، جگمگاتا حسین چہرہ، اتنے پیارے انداز میں جھکا ہوا سر اور اتنی عاجزی سے بندھے ہاتھ۔ حارث کئی لمحے
تا ہی چلا گیا۔ نہ اپنے تن من کا ہوش رہا نہ اس کے بندھے ہاتھوں کا احساس!
"کر دیجئے نا معاف۔ میں تو ہاتھ جوڑے کھڑی کھڑی تھک بھی گئی۔"
"اوہ!" وہ یکایک سٹپٹا اٹھا۔
"میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔" حارث نے گھبرا کر جلدی سے صاحباں کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔
"آپ مجھے گناہگار کر رہی ہیں۔"

"آپ کو کیوں؟ میں تو خود گنا ہگار ہوں اور معافی مانگ رہی ہوں۔ دراصل اس مریض کی حالت ایسی سیریس تھی کہ مجھے کچھ اور سوجھا ہی نہیں۔"

وہ بولے ہوئے، بالکل نامحسوس طریقے سے حارث کے ہاتھوں کی گرفت میں سے اپنے ہاتھ نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔ اس کے سارے وجود میں عجیب سی، انوکھی سی سرسراہٹیں پھیل رہی تھیں۔ اس کے سانس بے ترتیب ہوئے جا رہے تھے۔ مگر حارث کو کوئی احساس ہی نہ تھا۔

"اوہ!" اس کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے اور مزید دباتے ہوئے قدرے ندامت اور پریشانی سے کہنے لگا۔

"میں بھی کیسا بُرا انسان ہوں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں واقعی جانور ہوں۔ آپ کی مجبوری کو جانے بغیر ہی غصّہ کر لیا۔"

"چلیں اب چھوڑیں اس قصّے کو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

صاحبان اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کرانے میں خاصی مشکل سے کامیاب ہو گئی تو جلدی سے دو قدم ہٹتے ہوئے آواز کو ہموار کر کے بولی۔

"میں نے بھی آج صبح کا بس ناشتہ ہی کیا ہوا ہے۔ آپ کھانا کھا لیں تو پھر میں بھی گھر جا کر۔"

"ارے!" حارث نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پکڑ لی۔

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ حد کرتی ہیں آپ بھی۔" بڑا شاکی اور والہانہ سا انداز تھا۔ "مجھے لگتا ہے آپ مجھے کچھ نہیں سمجھیں گی۔"

"نہیں نہیں۔" صاحبان گڑبڑا سی گئی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"میں بہت جھگڑالو ہوں۔" حارث بڑے اشتیاق اور بڑی تمنا سے صاحبان کو دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہنے لگا "جانے کب تک آپ سے جھگڑتا رہوں گا اور آپ سارے دن کی بھوکی ہیں۔ آیئے نا یہیں کھا لیجئے آپ بھی، ہمارا جھگڑا ابھی چلتا رہے گا۔"

"لیکن۔" صاحبان قدرے ہچکچائی۔

"کیا کوئی حرج ہے؟" اس نے بے حد معصومیت اور سادگی سے پوچھا۔

"حرج؛ نہیں تو۔"

"اپنی بی بی کا ڈر ہے؟"

"میری بی بی کو مجھ پر بہت اعتماد ہے۔ رات ہو دن۔ جب اُنھوں نے کبھی مجھے یہاں آنے سے روکا ٹوکا نہیں تو یہاں کھانے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"تو پھر؛ میری خوشی کی خاطر ہی سہی۔"

اس کا لہجہ ملتجی تھا اور انداز میں جھجک کے ساتھ ساتھ شوق، تمنّا اور خواہش۔

"اس سے بہت محبت کرو بی بی! پُوری توجّہ دو۔" ڈاکٹر عابد کا فقرہ صاحبان کے ذہن میں، کانوں میں زور زور سے گونجا۔ اگر اتنی ذرا سی بات سے وہ خوش ہو سکتا تھا تو واقعی وہاں کھانا کھا لینے میں حرج ہی کیا تھا۔ بڑی معصوم اور بے ضرر سی خواہش تھی۔ صاحبان راضی ہو گئی۔

"تو پھر ہاتھ مُنہ تو دھو لوں نا۔ سیدھی اِدھر ہی آ گئی تھی۔"

"ارے ہاتھ تو مجھے بھی دھونا ہیں۔ چلئے، میں بھی چلتا ہوں۔"

بچّوں جیسی خواہش کے ساتھ صاحبان کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ اسے غسل خانے کا راستہ دکھانے چلا۔ جوشِ مسرت میں غیر اختیاری سی حرکات اس سے سرزد ہو رہی تھیں۔ صاحبان کو ساتھ لئے غسل خانے کے بجائے باورچی خانے کے اندر گھس گیا۔

"یہ غسل خانہ ہے؟" وہ مسکرائی۔

"اوہ!" معصومیت سے جھینپ کر، مسکرا کر، اسی طرح مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے، جیسے وہ کوئی بڑی قیمتی چیز تھی ہاتھ سے چھوٹ کر گُم ہو جانے والے نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی انداز میں لئے لئے غسل خانے میں جا پہنچا۔

"اب تو ٹھیک جگہ آیا ہوں نا؟"

"ہاں!" وہ مسکرائی۔ "اور اب دھویئے ہاتھ۔"

"لیڈیز فرسٹ۔"

"لیکن ہم مشرقی اقدار پر چلنے والے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کی عورت، مَرد کو پہلا درجہ، عزّت اور مقام دیتی ہے۔"

"اوہ! شکریہ، آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔"

صاحبان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہ جلد جلد ہاتھ مُنہ دھونے لگا۔ فارغ ہو کر پیچھے ہٹا تو صاحبان کی باری آئی۔ جب تک وہ ہاتھ مُنہ دھوتی رہی حارث تولیہ لئے پاس کھڑا رہا۔ دھو بیٹھی تو جلدی سے بڑھ کر بڑے احترام و عقیدت سے تولیہ پیش کیا جیسے وہ کوئی مہمان خصوصی تھی اور بڑی تگ و دو اور کوششوں کے ساتھ اس کے ہاں پدھاری تھی۔

"ویسے آپ کو آداب تو سارے معلوم ہیں۔" صاحبان تولیے سے ہاتھ اور چہرہ پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔

"ورنہ آپ نے کیا بالکل ہی جانور سمجھ رکھا تھا؟" وہ ہنسا۔

"ہوں؛ آں؟" وہ شوخی سے مسکرا دی۔

"نہ پوچھیں اس کا جواب۔ آپ کا دِل ٹوٹ جائے گا۔"

"سمجھ گیا ہوں خود بخود ہی۔" حارث کی مسکراہٹ کافور ہو گئی اور وہ افسُردگی سے بولا۔

"غلط سمجھے ہیں۔" صاحبان زور سے ہنس پڑی۔

"پھر آپ صحیح بتا دیں؟"

"پہلے تھے مگر اب کچھ کچھ افاقہ ہو رہا ہے۔"

صاحبان کی اس بات پر حارث بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"افاقہ ہو رہا ہے۔ بہت خُوب!" پھر ہنسی تھمی تو قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کی توجّہ شاملِ حال رہی تو شاید بالکل ہی صحت یاب ہو جاؤں۔"

"اِک مکمّل انسان بن جائیں؟"

"یہ تو معلوم نہیں کہ مکمّل انسان بن جاؤں یا کچھ اور۔" وہ اسے اِک گہری نِگاہ سے دیکھتے ہوئے ذو معنی انداز میں بولا۔ "میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میری تکمیل ہو جائے۔"

"ارے!" صاحبان نے گڑبڑا کر موضوع بدل دیا۔ "ہم باتوں میں لگے ہوئے ہیں اور اِدھر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"ہاٹ کیس میں بھی؟"

صاحبان نے جیسے اس کی بات سُنی ہی نہیں۔ جلدی سے جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ حارث بھی اِک معمول کی طرح پیچھے لپکا۔

"اب ہماری مشرقی عورت کھانا نہیں نکالے گی!" صاحبان چُپ چاپ بیٹھی تھی۔ حارث نے اس کے سامنے ہاٹ کیس رکھا۔ "یا اس بار مغرب کا دستور چلے گا اور اب یہ کام مجھے کرنا ہو گا۔"

"نہیں نہیں!" صاحبان خفیف سی ہو کر جلد جلد پلیٹوں میں سالن نکالنے لگی۔

اِک نوجوان مَرد کے ساتھ اکیلے میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا اس کا پہلا اتفاق تھا۔ ہاتھوں میں ہلکا سا جو ارتعاش تھا اسے حارث سے چھُپانے کی کوشش میں اس سے اور بھی غلط سلط حرکات سرزد ہوئی جا رہی تھیں۔ کبھی سالن میز پر گر جاتا، کبھی پانی چھلک پڑتا، کبھی پلیٹ ہاتھ سے ٹکرا کر اِدھر اُدھر لڑھک جاتی۔ اِک غیر مَرد کے ساتھ اکیلے میں بیٹھ کر کھانا کھانے کے اس اتفاق کو شاید اس سے بہتر انداز میں نبھا لیتی مگر یہاں تو ایک کے اُوپر دوسرا ستم یہ ہو رہا تھا کہ حارث کھانا کھانے کے بجائے سامنے بیٹھا ایک ٹک اسے ہی تکے جا رہا تھا۔

"آپ کھانا کھایئے نا۔" آخر صاحبان بہت دیر تک اس کی اپنے وجود پر ٹکی ان نگاہوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔

"میں؟" وہ چونکا۔

"ہاں۔ آپ تو کھا ہی نہیں رہے۔" لال سُرخ ہوتے ہوئے صاحبان نے اس کی توجّہ کھانے کی طرف مبذول کرائی۔

"اوہ!" وہ خجل سا ہو کر مسکرا پڑا۔ "خوشی میں مجھے کھانے کا خیال ہی نہیں رہا۔"

"کس خوشی میں؟" صاحبان نے تعجّب سے اسے دیکھا۔

"آج بہت مدّت بعد، بہت ہی طویل عرصے بعد کھانے پر میں اکیلا نہیں ہوں۔"

حارث بچّوں ایسی خوشی اور سادگی کے ساتھ بولا۔

"یوں لگ رہا ہے جیسے اچانک ہی اس گھر میں بہار آ گئی ہے۔"

اور وہ صاحبان کے حکم کی تعمیل کی خاطر جھُک کر جلد جلد نوالے لینے لگا۔ صاحبان اگر گڑبڑائی ہوئی تھی تو وہ بھی تو جیسے نارمل نہ تھا۔ عجیب انداز میں اُوپر تلے نوالے لئے جا رہا تھا۔ اور اب صاحبان اپنا کھانا بھُول بھال اِک دلچسپی کے ساتھ اسے تک رہی تھی۔

تین چار نوالے لینے کے بعد یکایک حارث کے ہاتھ تھم گئے۔ صاحباں نے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ نہ اسے منع کیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ بھی واپس رکھتے ہوئے وہ چُپ چاپ سا جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"ارے کھائیے نا۔ بس کیوں کر دیا؟"

صاحباں نے بڑے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ یہ یکایک اسے کیا ہو گیا تھا؟

"کھا لیا۔ کھا لیا۔" بڑبڑانے کے انداز میں وہ تیزی کے ساتھ بولا۔

"کھا لیا؟ اتنا تھوڑا سا؟"

صاحباں کی حیرت دو چند ہو گئی۔ یہ اس کا کھانا ختم کرنے کا انداز کیسا تھا؟ پلیٹ میں سالن اسی طرح پڑا تھا۔ نوالہ بھی واپس رکھ دیا تھا؟ سچ مچ ہی جانور تھا وہ تو جیسے۔

"آپ اس طرح کھانا ختم کرتے ہیں؟"

صاحباں حیرت بھری نگاہوں سے اسے گھورے جا رہی تھی۔

"ہاں بس۔" اس نے صاحباں کی حیرت کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ پرے ہٹتے ہوئے تھوڑا سا اُلجھ کر اور اَب، تعجب کے بجائے صاحباں کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ ابھی ابھی حارث کے چہرے پر کہکشاں اُتری ہوئی تھی۔ اَب لگا جیسے کسی نے یکایک نوچ کر پھینک دی تھی۔ زرد زرد چہرے اور پھیلی پھیلی کتنے ہی لمحے کھانے کو دیکھتا رہنے کے بعد اس نے سر صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔

"چائے بنا دوں؟" صاحباں ہمدردی بھری نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"لیکن آپ نے ابھی کھانا شاید سیر ہو کر نہیں کھایا۔"

اس عالم میں بھی وہ صاحباں کو بھولا نہیں تھا۔ اسے اسی کا فکر لاحق تھا۔

"کھا لیا۔" صاحباں کا یہ مختصر جواب اس کی تسلّی نہ کر سکا۔

"میری وجہ سے آپ بھی بھوکی رہ گئی ہیں۔"

وہ آنکھیں میچے میچے بڑبڑانے لگا۔

"میں بہت بُرا انسان ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے کوئی بھی خوشی ملے۔"

"نہیں نہیں۔" یکایک ہی صاحباں کو اس پر بہت ڈھیر سارا ترس آ گیا۔

"بخدا میں اتنا ہی کھایا کرتی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

ترس اور ہمدردی بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ اس کے لئے چائے بنانے کی خاطر اُٹھ گئی۔ چائے بناتے کوئی دوسری سوچ اس کے ذہن میں نہیں آئی۔ بس وہی... اس کی سوچوں کا مرکز بنا رہا۔

جانے کون سا دُکھ تھا اسے؟ والدین کا ذکر آتا تھا تو تب پریشان ہو جاتا تھا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تھا تو تب کبھی سے زیادہ نہیں لیتا تھا۔

اچھا بھلا ہنس بول رہا ہوتا تھا۔ یکایک پھیلی پھیلی آنکھوں سے کھانے کو دیکھ کر ہاتھ کھینچ لیا کرتا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں اس پر ہر خوشی اور ہر لذت حرام ہوئی جا رہی تھی؟ کیوں بھلا؟

اس کی تو عمر تھی خوشیاں منانے اور بہاریں لوٹنے کی۔ اپنے والدین کی عزت اور دولت سے عیش و آرام کر اس گوشۂ گمنامی میں کیوں پڑا تھا؟ وہ ایسے دُکھ، ایسی ذِلتیں کیوں اُٹھا رہا تھا؟ کیوں..؟؟

ان سارے سوالات کے جوابات پانے کے لئے وہ بڑی بے چین و بے قرار تھی۔

وہ اتنا بُرا بھی تو نہ تھا۔ بے شک مزاج کا ذرا تلخ تھا۔ زبان ذرا بدزبان تھی۔ تو کیا ہوا۔ دِل کا تو اتنا بُرا نہیں اس کا مقدر کیوں اتنا بُرا ایسا خراب ہو گیا تھا؟

"پتہ نہیں یہ اللہ میاں بھی کیسا ہے؟"

جب سوچوں نے پریشانی کے سوا اور کچھ نہ دیا تو آخر میں وہ اپنے پروردگار سے ہی شکوے شکایات کرنے لگی۔

"کیوں اس پر اتنے ظلم و ستم ڈھا رہا ہے؟"

"اَب اس بے چارے کی آزمائشیں ختم بھی کر ڈال اللہ میاں!" آخر میں وہ بڑے خلوص سے اس کے لئے لگی۔ "تو اس پر اپنا رحم و کرم کر دے۔"

"کیا تم اِک انسان کے لئے فرضی محبت کا کھیل بھی نہیں رچا سکتیں؟"

نہ کوئی سوچ تھی نہ خیال۔ مگر جانے کہاں سے ہوا کی لہروں کے دوش لہراتا ہوا ڈاکٹر عابد کا یہ فقرہ بار بار کانوں میں اُترنے لگا۔

صاحباں نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ دو تین بار جھٹکا۔ مگر گونج بدستور تھی۔

"ہاں ہاں میں کروں گی۔ میں اس سے محبت کروں گی۔ بہت کروں گی۔"

یکایک کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہ بڑبڑانے لگی۔

"اس کی خاطر کروں گی، بی بی کی خاطر کروں گی۔ سب کچھ کروں گی۔ سب کچھ۔"

شُوں شُوں کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا۔ چائے کا پانی کھول رہا تھا۔ وہ ہوش میں آ گئی۔ جلد جلد چائے بنانے لگی۔

اور ادھر بی بی سارے دن کی بھوکی بیٹھیں صاحباں کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ آتی تو معلوم ہوتا۔ حارث نے کھانا کھایا تھا یا نہیں؟ تبھی تو وہ ممتا کی ماری ماں اپنا روزہ بھی افطار کر سکتی تھی۔ وہ روزہ، جو نہ فرض کے لئے رکھا گیا تھا اور نہ کسی اور منّت یا مجبوری کی خاطر۔ نہ ثواب، نہ قربانی، نہ صلہ!!!

محض اِک فاقہ!

اور ماں ممتا کے جذبے کو تسکین حاصل ہو گئی تھی۔ جیسے پوری عمر کی عبادت کا ثواب مِل گیا تھا۔ سب کچھ مِل گیا تھا۔

وہ اسی طرح خوش تھیں۔ بے حد خوش!!

"آپ چھوٹی بی بی! آپ بس آرام سے بیٹھ جائیے۔ سب کچھ میں خود کر لوں گی۔"

"کیوں؟ میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں؟"

"ہائے ہائے، خدانخواستہ، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں سدا سلامت ہیں۔ کام کرنے کے لئے میں جو ہوں۔"

"مل کر کریں گے تو جلدی نمٹ جائے گا۔"

"اور پھر واپس گھر جا کر میں بیگم صاحبہ سے جوتے کھاؤں۔"

"جوتے کھاؤ؟" صاحباں نے... گھور کر شرجانہ کو دیکھا۔

"پہلے کبھی میری بی بی نے تجھے جوتے مارے ہیں؟ تو خواہ مخواہ ہی انھیں بدنام نہ کیا کر۔"

"میں نے بھی تو پہلے جوتوں والا کام نہیں کیا۔"

"پھر...؟"

"آج آپ زبردستی کرائے دے رہی ہیں۔" شرجانہ نے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی اسی تیزی سے چلائی۔

"بیگم صاحبہ نے مجھے تاکید کی تھی کہ آپ بس بیٹھی نگرانی کریں گی اور کام سارا میں کروں گی۔ اور آپ کام کر کے میرے لئے پکا پکا جوتوں کا انتظام کر رہی ہیں۔ آج میری عزت گئی۔"

"بی بی نے بھی تو مجھے بالکل ہی ہتھیلی کا پھوڑا بنا یا ہوا ہے۔" صاحباں زِچ سی ہو کر کہنے لگی۔

"اَب بھلا تھوڑے سے ہاتھ پاؤں ہلا لوں گی تو کیا ہو جائے گا۔"

پھر ملتجی سے لہجے میں ہولے سے بولی۔

"دیکھ شرجانہ! بی بی کو نہیں بتائیں گے۔ یہ مکڑیوں کے جالے اُتارنے اور فرش وغیرہ دھونے والی صفائی تُو کر لے اور میں یہ اُوپر والی جھاڑ پونچھ کر لیتی ہوں۔ بستر کی چادر اور میزوں والے میزپوش اور تکیوں کے غلاف وغیرہ بدل ڈالتی ہوں۔ یہ تو ذرا بھی تھکانے والے کام نہیں ہیں۔"

"اچھی بات۔" اس کے منّت بھرے انداز سے وہ مسکرائی۔ "اگر آپ کا ضرور اُن کا کوئی نہ کوئی کام کرنے کو جی چاہتا ہے تو شوق

سے کریں، جی جان سے کریں۔ میں منع کرنے والی کون ہوتی ہوں۔"
ساتھ ہی شرجانہ کھل کھل کرکے ہنس پڑی۔
"دیکھ شرجانہ! بدتمیزی نہیں کرنی۔ بس کام کرنا ہے۔" صاحباں نے اس سے آنکھیں چُراتے ہوئے قدرے رُعب
"اچھا جی۔" شرجانہ پھر کھل کھل کرکے ہنس پڑی۔ صاحباں کے رُعب نے اس پر ذرا اثر نہیں کیا۔
حارث کے گھر کی حالت بڑی ابتر ہو رہی تھی۔ کام کرنے والا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ خود اکثر بیمار رہتا تھا۔ سارا
کرتا تھا۔ یوں اس کے پاس گھر کی دیکھ بھال کے لئے وقت ہوتا ہی نہیں تھا۔
صاحباں کو اپنے آپ ہی احساس ہوا تو اگلے ہی دن حارث کے دفتر چلے جانے کے بعد شرجانہ کی کمک لے کر
کے گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے آئی تھی۔ شاید برسوں کا گرد و غبار اور مٹی دھول تھی۔ اکیلی کے بس کا روگ قطعی نہیں تھا۔ ور
یقیناً خود سب کچھ کر لیتی۔ دل میں جذبہ ایسا ہی تھا۔

اور اب۔ دونوں ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ گپ شپ چل رہی تھی۔
"چھوٹی بی بی! مجھے تو پڑوسی پر بڑا ترس آ رہا ہے۔ آپ کو نہیں آتا؟"
"تجھے لاکھ بار سمجھایا ہے کہ اسے پڑوسی نہ کہا کر۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے صاحباں نے اسے فہمائش
"پھر؟" شرجانہ حسبِ عادت زور سے ہنسی۔
"آپ چھوٹی بی بی ہیں تو انھیں چھوٹے میاں جی کہہ دیا کروں گی۔"
"دھت تیری شرجانہ کی بچّی، تجھے خدا سمجھے۔"
صاحباں دانت پیستے ہوئے اسے اک دو ہتھڑ جمانے کے لئے اس کی طرف لپکی۔
"تیری بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔"
"ہائے چھوٹی بی بی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ پڑوسی نہ کہا کروں۔"
"تو اس کے علاوہ تجھے اور کوئی لفظ نہیں ملا تھا۔ حارث بابو کہہ لو، چھوٹے صاحب کہہ لو، چھوٹے مالک کہہ لو۔ بی بی
صاحبہ کہتی ہیں ان کا بیٹا گھر میں ہوتا تو یقیناً ایسا ہی کوئی لفظ کہتیں۔"
صاحباں خاصی بلند آواز میں بڑبڑاتی رہی اور شرجانہ ہنستی رہی۔ دونوں ساتھ ساتھ کام بھی پوری تندہی سے کئے جا رہی
شرجانہ دیواروں اور چھتوں پر سے مکڑیوں کے جالے اُتارنے کے بعد فرش دھو رہی تھی اور صاحباں اس کے بگڑے
فرنیچر کے بے رنگ پالش کو کپڑے سے رگڑ رگڑ کر چمکانے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی۔
"تم بات کیا کرنے لگی تھیں؟" تھوڑا وقت خاموشی میں گزرا تو صاحباں نے خود ہی پوچھا۔
شاید دل سے وہ بھی چاہتی تھی کہ شرجانہ حارث کی باتیں کئے جائے۔ حارث کا نام لے لے کر اسے چھیڑے جائے۔
"کون سی بات؟" شرجانہ شرارت سے انجان بن گئی۔
"وہی، جب کہہ رہی تھیں کہ حارث پر ترس آتا ہے۔ کیوں؟"
اُوہ! ہاں۔" شرجانہ اپنی شرارت بھول گئی۔
"ہاں چھوٹی بی بی! میں تو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں کہ ہمارے میاں جی اور بیگم صاحبہ اتنے امیر ہیں اور یہ ان کا بیٹا
لگتا ہے بڑی غربت میں وقت گزار رہا ہے۔ جیسے ہمارے قبیل، ہمارے درجے کا کوئی آدمی ہو۔"
شرجانہ اس کے گھر کے ساز و سامان کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
"میاں جی نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر کوئی بڑی نوکری کیوں نہیں دلوائی بے چارا کیسی زندگی گزار رہا ہے۔"
"میاں جی نے پڑھایا لکھایا کیوں نہیں۔ پورے بارہ سال انگلستان میں تعلیم دلائی ہے۔ اتنا خرچ کم ہی کسی نے اولاد پر
"پھر؟ پھر یہ سب؟ یہ اس کے حالات؟"
"مقدر۔ اس کے نصیب شرجانہ! ویسے مجھے بھی ترس آتا ہے۔ بے حد دل دُکھتا ہے یہ سب دیکھ کر۔"
"ماں باپ کے پاس ہوتا تو کیسی ٹھاٹھ دار زندگی گزارتا!"
"ہاں..."
"میں تو کہتی ہوں کہ کسی طرح بیگم صاحبہ سے کہہ کر ان کی کچھ امداد کریں۔ گھر کا فرنیچر ہی نیا لے دیں۔ کھانا تو اب مُشکل
ملنے ہی لگا ہے۔"
"توبہ کرو فرنیچر بدلوا دوں۔ بہت خود دار ہے۔ کھانے تک کی بھی قیمت پہلے ادا کی اور کھانے کو بعد میں راضی ہوا۔

طبیعت بڑی عجیب ہے۔"
"عجیب کیا، مجھے تو بہت سنگدل لگتے ہیں۔ ماں تڑپتی دکھی نہیں جاتی اور بیٹے کو کچھ پتہ ہی نہیں۔"
"یہ تو نہ کہو شرجانہ! ماں کی جُدائی کو تو خود اس نے بھی جان کا روگ بنا لیا ہوا ہے۔ سخت دل ہوتا تو تندرست اور ہٹا کٹا
نہ ہوتا!"
"میرا بڑا جی چاہتا ہے انھیں دیکھنے کو۔"

"کوئی ایسی اعلیٰ شخصیت نہیں ہے۔" صاحباں مسکرائی۔
"دل میں شوق ہی رہنے دے۔ اس کا بھی بھرم بنا رہے گا۔"
"کیوں؟ بہت بدصورت ہیں؟"
شرجانہ اپنا کام چھوڑ کر صاحباں کے قریب چلی آئی۔
"نہیں، شکل صورت تو اچھی خاصی ہے۔ بس بنا سنوار کر نہیں رکھی ہوئی۔"
"اب رکھا کریں گے چھوٹی بی بی! دیکھ لیجئے گا۔" صاحباں پورے وثوق سے بولی۔ ساتھ ہی اک معنی خیز سی ہنسی ہنس دی۔
"چل بدتمیز۔"
صاحباں اس کی شرارت سمجھ کر جلدی سے کمرے میں سے نکل گئی۔
"ارے ارے! چھوٹی بی بی! اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔ مت جائیے۔"
"اس کمرے کی صفائی ہو گئی ہے اب سونے والے کمرے کے پھیلے بکھرے کپڑے سمیٹ لوں نا۔"
صاحباں سنجیدگی بھرے لہجے میں بولی۔
"ذرا رُک جائیے نا۔ دونوں اکٹھی اس کمرے میں جائیں گی۔ یہاں میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔"
"کیوں؟ یہاں تمھیں اکیلی کو کوئی بھوت دُوت چمٹ جائے گا؟"
"کسی بھوت میں اتنی ہمت نہیں جو مجھے چمٹے۔ میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ ساتھ ساتھ آپ سے باتیں کرتی جاتی ہوں تو کام جلدی
ہوتا ہے۔ یوں بھی آپ کے بنا میرا اِک لمحے کے لئے بھی کہیں دل نہیں لگتا۔"
"دل تیرے پاس ہے بھی؟ تو تو وہ اپنے کبیر خاں کی بھینٹ چڑھا چکی۔"
"اس کے والا دل علیحدہ تھا چھوٹی بی بی! وہ اسے دے دیا اور باقیوں کے لئے اِک علیحدہ ہے۔ بہت نرم گرم۔"
"اچھا...؟"
"جی ہاں چھوٹی بی بی! کبیر خاں اپنی جگہ پر ہے اور آپ کا، بیگم صاحبہ کا اور میاں جی کا مقام الگ ہے۔ آپ سب سے بھی مجھے
بہت پیار ہے چھوٹی بی بی! بے حد، بے پناہ۔"
اور اب شرجانہ بڑی تیزی سے کام میں معروف ہو گئی۔ صاحباں اس کی خواہش کے مطابق ادھر جانے کے بجائے وہیں رُک کر
اسے دیکھنے لگی۔
"چلو جی! اب دوسرے کمرے کی باری۔"
اک طویل سا سانس لیتے ہوئے شرجانہ صاحباں کے قریب چلی آئی۔ پھر دونوں آگے پیچھے ہی حارث کی **خواب گاہ** میں
داخل ہوئیں۔

"توبہ توبہ۔ کیسی بے ترتیبی ہے!" شرجانہ اِردگرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے بڑبڑائی۔
صاحباں نے اس کی بڑبڑاہٹ سُن لی تھی۔ جلدی سے حارث کی صفائی پیش کرنے لگی۔
"بے چارا بیمار سیمار انسان اور وہ بھی اکیلا۔ زندگی ہی بے ترتیب ہے تو گھر کو وہ بے چارا کیا کرے۔"
"ایک فقرے میں دو بار بے چارا۔" شرجانہ زور سے ہنس دی۔
"بدتمیز!" صاحباں خفیف سی ہو کر میز پر جھک گئی۔
"اتنے دنوں سے آپ روز آ رہی ہیں۔ پہلے ہی مجھے کہتیں۔" شرجانہ اب قدرے سنجیدگی سے بولی۔ "سارا ٹھیک ٹھاک کر دیتی"
"میں اس کے جنگلی پن سے ڈرتی تھی۔"
"اور اب...؟"
"اب تو کافی انسان بن گیا ہے۔" صاحباں مسکرائی۔

"نرمی اور حلیمی سے بات کرتا ہے۔ مسکرا کر بولتا ہے۔ نظروں میں دوسروں کے لئے نفرت نہیں ہوتی"۔
"محبت ہوتی ہے؟" شرجانہ شوخی سے چہکی۔
"خاک محبت ہوتی ہے"۔ صاحباں شرما کر اُلجھ کر بولی۔
"تو شرجانہ بڑی بدتمیز ہے۔ اس موضوع کے علاوہ تیرے پاس بات کرنے کو اور کوئی موضوع نہیں؟"
"ہے کیوں نہیں؟ ایک نہیں، بہت۔ مگر آپ کو دیکھتی ہوں تو باقی سب بھول جاتی ہوں"۔
"مجھے دیکھ کر کیا مطلب؟"
"وہی، جو پنڈی والے ڈاکٹر نے کہا تھا۔ آپ کی بے چینیاں اور بے تابیاں یہی بتاتی ہیں"۔
"چل ہٹ۔ جلدی جلدی کام کر۔ ابھی گھر جا کر دوپہر کا کھانا بھی تیار کرنا ہے"۔
شرجانہ نے لمبا بانس تھام لیا۔ جلد جلد چھت پر سے جالے اُتارنے لگی۔ اور صاحباں حارث کا بستر درست کرنے لگی۔ چادر تبدیل کی۔ تکیئے کا غلاف بدلا۔ اور پھر میز کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"دیکھو نا ذرا! اس جانور نے میز کی حالت کیا بنائی ہوئی ہے؟"
حارث کے خلاف اس شکایت میں جیسے ہزاروں پیار پنہاں تھے۔
"توبہ توبہ چھوٹی بی بی!" شرجانہ کے لہجے میں پھر شوخی اُبھر آئی۔
"میں ہوتی تو ایسی جگہ کبھی دل نہ لگاتی۔ آپ نے نہ جانے کیسے اسے..."
"شرجانہ! تو اپنی بکواس سے باز آ جا"۔
صاحباں اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دباتے ہوئے میز صاف کرنے لگی۔ اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔
"چھوٹی بی بی! اے چھوٹی بی بی!"
بہت سارے لمحات خاموشی میں کٹ گئے تو شرجانہ نے اسے پکارا۔ مگر صاحباں دیوار کی طرف رُخ پھیرے جانے کیا کر رہی تھی۔ "کوئی جواب ہی نہیں دیا؟ کیا کر رہی ہیں؟"
شرجانہ اپنا کام چھوڑتے ہوئے لپک کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔
"ارے!" اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور وہ بڑے غور سے انھیں دیکھ رہی تھی۔
"یہ کس کے خط ہیں؟ پڑوسی جی کے ہیں؟ آپ کے نام لکھے ہیں؟"
وہ بے قرار ہو ہو کر پوچھے جا رہی تھی مگر صاحباں ان میں ایسی مگن تھی کہ جیسے اُس نے شرجانہ کی کوئی بات سُنی ہی نہ تھی۔
"چھوٹی بی بی! ذرا اپنا ایک خط مجھے بھی سُنا نا۔ میں نے بھی تو اپنی ساری باتیں آپ کو سُنائی ہوئی ہیں"۔
صاحباں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی۔ اور شرجانہ اتھل پتھل ہوئی جا رہی تھی بے چین ہوئی جا رہی تھی۔
"سُنا دو نا چھوٹی بی بی! محبت کی باتیں لکھی ہوئی ہیں نا؟"
شرجانہ کی بے قراری حد سے زیادہ بے قرار ہوئی تو اب وہ صاحباں کا بازو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگی۔
"سچی چھوٹی بی بی! مجھے پڑھے لکھے لوگوں کی عشق و محبت والی باتیں سُننے کا بڑا شوق ہے، بہت خوبصورت ہوں گی ہیں نا۔ پھر سُناؤ نا"۔
"بے وقوف"۔ شرجانہ کی اس بات پر صاحباں کی ہنسی چھوٹ گئی۔
"مجھے بے شک بے وقوف کہہ لیں۔ مگر وہ باتیں سُنا دیں۔ دیکھوں بھلا انہوں نے آپ کو کیا لکھا ہے؟"
"پاگل! یہ جو کچھ لکھا ہوا ہے میرے لئے نہیں ہے"۔
"پھر؟ کسی دوسری لڑکی کے لئے؟"
"دیوانی!" صاحباں قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ "کسی لڑکی وڑکی کا چکر نہیں ہے"۔
"پھر...؟"
"دوسرا ہی چکر ہے"۔
"دوسرا ہی چکر؟" شرجانہ گھبرا سی گئی۔ "وہ کیا چھوٹی بی بی؟"

صاحباں نے دو اوراق شرجانہ کی آنکھوں کے سامنے نچائے۔
"اور یہ دو ان دو بیواؤں کے ہیں جن کے یتیم بچوں کی کفالت یہ جانور نظر آنے والا انسان کر رہا ہے"۔
صاحباں نے دو رسیدیں سی اسے دکھائیں۔
پھر صاحباں نے دو رسیدیں سی اسے دکھائیں۔
"یہ ایک تعلیمی ادارے کی طرف سے ہے اور یہ ایک یتیم خانے کی طرف سے"۔
"کیا لکھا ہوا ہے سب نے؟"
"ہر مہینے انھیں خرچ بھیجتے ہیں۔ یہ چاروں تو شکریے کے ہیں اور یہ دو جو چندے دیئے تھے ان کی رسیدیں اور یہ ایک [illegible] کسی ایک والی نے اپنے گھریلو مسائل لکھ کر اس بداخلاق انسان سے مشورہ طلب کیا ہوا ہے۔ نیر سے یہ کام بھی کرتے ہیں"۔
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا چھوٹی بی بی!"
"سمجھنے کی کوشش نہ ہی کرو شرجانہ! تو بہتر ہے۔ ورنہ میری طرح پاگل ہو جائے گی"۔
صاحباں نے حارث کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔
"یہ شخص بہروپیا ہے شرجانہ! خدا کی قسم بہت بڑا بہروپیا"۔
"بہروپیا کیا ہوتا ہے! چھوٹی بی بی؟"
"بہروپیا حارث ہوتا ہے۔ بی بی کا بیٹا"۔
صاحباں قدرے جل کر بولی۔
"بہروپیا، حارث، بی بی کا بیٹا"۔ شرجانہ بڑبڑاتے ہوئے کھڑی ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔
"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"
"یہ دیکھو"۔ اور اب صاحباں نے ایک چیک بُک شرجانہ کے سامنے کر دی۔
"دیکھ رہی ہو اسے؟"
"یہ وہی کاپی ہے نا۔ جس سے بنک میں سے روپیہ ملتا ہے؟" شرجانہ نے سوچ سوچ کر کہا۔
"ہاں۔ تقریباً تین چار ہزار روپیہ مہینہ خرچ کرتا ہے یہ تمھارا بڈھو سی۔ اور اس کی اپنی حالت دیکھو، مفلسوں سے بھی بدتر۔ جیسے کوئی صرف دو اڑھائی سو روپیہ مہینہ بھتہ پانے والا شخص ہو"۔
"تین چار ہزار روپیہ مہینہ خرچ کرتے ہیں؟" شرجانہ پھیل پھیل آنکھوں سے صاحباں کو دیکھنے لگی۔
"مگر چھوٹی بی بی! وہ اتنا روپیہ لاتے کہاں سے ہیں؟"
"اپنے دفتر میں بہت بڑا افسر ہے"۔
"افسر ہیں؟" وفورِ حیرت سے شرجانہ کی زبان بھی لڑکھڑانے لگی۔
"ہاں، یہ دیکھو! یہ سارے کاغذات"۔
"لیکن ان کے حالات سے مجھے تو بہت ترس آتا تھا"۔
"مجھے بھی آتا تھا۔ میں سمجھتی تھی دو تین سو روپیہ ماہوار سے زیادہ تنخواہ تو اس کی کبھی نہ ہو گی۔ تبھی اس طرح گزر اوقات کرتا ہے۔ رہائش، لباس اور خوراک، سب کچھ ہی تو بے حد سادہ ہے۔ سچ مچ جنگلی ہے یہ تو"۔
صاحباں تلملا تلملا کر، دانت پیس پیس کر کہے جا رہی تھی۔ "بہروپیا، دھوکے باز، بے ایمان، کیسا عجیب انسان ہے؟"
"لیکن چھوٹی بی بی! ایسا کیوں کیا اُنھوں نے؟"
"کیوں کیا؟ پتہ نہیں۔ بس بے وقوفی، حماقت"۔
لمحہ بہ لمحہ صاحباں پر زیادہ سے زیادہ جھنجھلاہٹ سوار ہوئی جا رہی تھی۔
"بے وقوفی؟ نہیں چھوٹی بی بی! یہ بے وقوفی اور حماقت نہیں"۔
"پھر...؟" صاحباں گھور کر اس سے ہی جواب طلب کرنے لگی۔
"پھر...؟ پھر...؟ پتہ نہیں... نہ جانے کیا راز ہے؟"
شرجانہ چُپ سی ہوتے ہوئے وہاں سے ہٹ کر اپنا کام کرنے لگی۔
"اپنی بے وقوفی نہیں تو پھر دوسروں کو بے وقوف بنا رہا ہو گا۔ ہیں نا شرجانہ! تُو بھی تو کچھ بول نا۔ مجھے تو بڑا غصہ آ رہا ہے"۔

صاحباں کی تلملاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

"جب کوئی امیر خود کو بھول کر، اپنے لالچ اور خواہشات کو تج کر غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کرے تو چھوٹ
غصہ نہیں کیا کرتے۔"

شرجانہ کی سنجیدگی بھری بات پر صاحباں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد؟"

"آپ نے خود ہی تو بتایا ہے کہ یہ سارے خطوط یہ کاغذات۔"

"اوہ، ہاں لیکن شرجانہ! یہ کہاں کی نیکی ہے کہ اپنا ایسا حال بنا لیا جائے۔"

"یہی تو اصل نیکی ہے چھوٹی بی بی! اور آپ غصہ کرنے کے بجائے دعا کریں کہ خدا ان کی یہ نیکیاں اور قربانیاں قبول کرے۔"
شرجانہ عجب سے جذبے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"مجھے تو آج پڑوسی صاحب بہت اچھے لگے ہیں۔ بہت اونچے، بہت بڑے جیسے میاں جی اور بیگم صاحبہ خود ہیں ...
ہی نیک اولاد پیدا کی ہے۔ شاباش ہے۔"

پھر شرجانہ کا موڈ یکایک بدل گیا۔ سنجیدہ چہرے پر ڈھیر ساری مسکراہٹیں پھیل گئیں۔ آنکھوں میں شوخیوں بھرے
بے شمار ستارے ناچ اٹھے۔

"اب تو چھوٹی بی بی! اس سے ضرور محبت کرنا۔ پڑوسی صاحب اس قابل ہیں۔"

"چل چل۔ پھر بہکی تیری دماغی رو۔"

"سچ کہہ رہی ہوں چھوٹی بی بی! ایسے انسان سے ناطہ بندھ جائے تو سمجھو ساری زندگی عبادت میں گزر گئی۔"

صاحباں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر میز کی چیزیں درست کرنے لگی۔

"چپ کیوں ہو گئیں چھوٹی بی بی! کوئی بات کیجئے نا۔"

"ہوں؟ ہاں، کیا بات کروں؟"

"کوئی..."

"اس وقت کچھ نہیں سوجھ رہا۔"

"ایسی بھی کیا بات ہو گئی؟"

"تمہارے خیال میں ابھی کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

"نہیں..."

"نہیں؟ کمال کرتی ہو شرجانہ!"

"آخر کیا؟"

"کسی انسان کے متعلق جب ایک تصور قائم کر لیا جائے اور وہ پھر ایک دم ٹوٹ جائے تو، تو کیا ذہن گڈمڈ نہیں ہو جاتا
"ہو جاتا ہے لیکن آپ کو کیا ہوا؟"

"پھر وہی بات!" صاحباں جھنجھلائی۔

"آپ چھوٹے میاں جی کی بات کر رہی ہیں نا؟" شرجانہ نے شرارت سے حارث کا ذکر چھوٹے میاں جی کہہ کر کیا۔

صاحباں بڑی سنجیدہ ہو رہی تھی اور شرجانہ صاحباں کی سنجیدگی اور خاموشی کبھی بھی برداشت نہیں کر پایا کرتی تھی۔ خود
بھی ہر وقت ہنستی رہتی تھی، چونچال رہتی تھی اور صاحباں سے بھی ایسی ہی توقع کیا کرتی تھی۔

مگر۔ اس وقت وہ پھر بھی نہیں ہنسی، نہ ذرا سا مسکرائی، نہ شرجانہ پر خفا ہوئی، نہ بولی۔ تب شرجانہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

"چھوٹی بی بی! چھوٹے صاحب اندر سے اتنے نیک دل اور اتنے اچھے انسان ہیں۔ یہ جان کر آپ کو خوشی کے بجائے
افسوس کیوں ہوا؟"

"خوشی کے بجائے افسوس؟ یہ میں نے کب کہا؟"

"آپ خاموش جو ہو گئی ہیں۔ اور میرے ساتھ بھی اچھی طرح بات نہیں کر رہیں۔"

"مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا ہے شرجانہ! ان پر نہیں۔ اس لئے چپ سی ہو گئی ہوں۔"

"اپنے آپ پر؟ وہ کیوں؟"

"ایک اچھے بھلے انسان کو اتنا برا سمجھتی رہی۔ بہت بری ہوں میں۔"
صاحباں اپنے آپ ہی کو کوسنے لگی۔

"بے حد بے وقوف۔ بے حد احمق اور بے حد بری۔"

"ارے ارے! تھم جائیے ذرا ایک منٹ۔" شرجانہ پھر بے تحاشا ہنسنے لگی۔

صاحباں یکایک خاموش ہو کر حیرت سے اسے تکنے لگی۔

"آپ نے کب انھیں برا سمجھا ہے؟"

"برا ہی سمجھتی تھی تو وہاں پنڈی والے ڈاکٹر صاحب کے سامنے ان کی برائی کی۔ پھر تمہارے سامنے بھی کچھ نہ کچھ کہتی ہی رہتی تھی۔"
شرجانہ بڑے ... سے اک قہقہہ لگا اٹھی۔

"نہ چھوٹی بی بی! نہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے ان کی کوئی برائی کی اور نہ میرے سامنے۔ یہ تو آپ صرف اپنے دل کو
بہلاتی تھیں۔ اس دل کو جو انجانے میں چھوٹے صاحب کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔ اور آپ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھیں۔"
وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئی۔ بڑے غور سے صاحباں کی جھکی جھکی آنکھوں میں جھک کر جھانکا۔ اور اب بڑی سنجیدگی سے کہنے
لگی "ورنہ چھوٹی بی بی! کوئی یوں کسی کے لئے نہیں تڑپا ہے۔ کسی نے کسی غیر کے لئے اتنے بڑے بڑے جھوٹ بلا وجہ کبھی نہیں بولے۔
لمبے لمبے راستوں پر بلا مقصد بلا جذبوں کے سفر نہیں کیا۔ کسی کے درد کے بغیر آنکھوں سے آنسو بھی کوئی نہیں ٹپکاتا۔ کئی کئی گھنٹے
بھوکے رہ کر کسی کے لئے ..."

"بی بی کی خاطر شرجانہ۔" صاحباں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔

"حارث بی بی کا بیٹا ہے۔ اس لئے۔ اس لئے یہ سب کچھ ہوا۔"

"صرف بی بی کا بیٹا ہی نہیں۔ آپ کی علیحدہ سے ان کے ساتھ رشتے داری ہو گئی تھی۔ وہ آپ کی محبت ہیں، آپ کی آرزو، آپ
کا سپنا ہیں۔ وہ آپ کے سب کچھ ہیں۔"

"نہیں، نہیں شرجانہ! یہ سب مت کہو۔" صاحباں نے تقریباً چلا کر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہونا چاہیے چھوٹی بی بی! ضرور ہونا چاہیے۔ چھوٹے صاحب بیمار ہیں۔ ایک اتنا اچھا اور اتنا نیک انسان ہولے ہولے
موت کے قریب جا رہا ہے۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ اور جب تک آپ کے دل میں سچا جذبہ نہ ہو گا وہ ٹھیک نہیں ہوں گے
انھیں ٹھیک ہونا چاہیے۔ بہت جلد۔"

"مگر بی بی! میں تو بی بی کو ان کے بیٹے سے ملانے چلی تھی۔ یہ کیا ہو گیا۔؟"
گویا اس نے شرجانہ کے سامنے ہر حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

"کیا ہو گیا؟" شرجانہ بڑے انداز سے مسکرائی۔
"آگ لینے گئی تھیں پیغمبری مل گئی۔ اور جب کچھ ملتا ہے تو اس کی خوشی منایا کرتے ہیں سوگ نہیں۔"
شرجانہ اب سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مگر، بی بی کیا کہیں گی؟" وہ کھوئی کھوئی، سہمی سہمی سی بڑبڑائی۔

"بی بی کیا کہیں گی؟ ارے وہ تو خوش ہوں گی کہ گھر کا مال گھر میں ہی رہ گیا۔"

"کیا مطلب...؟"

"بیٹا مل جائے گا تو ساتھ ہی ایسی بہو بھی جس کو وہ بیٹی کہتی ہیں، جس سے وہ بے انتہا پیار کرتی ہیں۔ اتنا کہ اک لمحے کے لئے
خود سے جدا نہیں کر سکتیں۔ ان کے تو آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام ہو گئے۔"
شرجانہ کام چھوڑ چھاڑ تالی بجا بجا کر ناچنے اور سہاگ کا گیت گانے لگی۔

"بے شرم، بے حیا، بدتمیز۔"
صاحباں نے مسکراتے ہوئے، لال گلال ہوتے ہوئے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔
شرجانہ کی تالی اور بھی لے کے ساتھ بجنے لگی۔ رقص کرتے ہوئے پاؤں اور بھی تیزی سے اٹھنے لگے اور سہاگ کے گیت
اور بھی مدھر اور بھی مترنم ہو گئے۔

صاحباں کھانا لے کر آئی تو حارث جانے کن سوچوں میں ڈوبا چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ نہ کوئی کام کر رہا تھا اور نہ کچھ لکھ پڑھ رہا تھا ورنہ اس
چھٹی کا دن تو بے حد مصروف گزرا کرتا تھا۔
سب کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتا تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی اور ترتیب و آرائش سے لے کر کپڑے برتن دھونے تک
کوئی بھی کام کرنے میں وہ ذرا عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا شلوار کرتہ پہن کر وہ چھٹی کا سارا دن یوں گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں
مصروف رہتا جیسے کوئی بے حد ذمہ دار قسم کی گھریلو خاتون ہو۔
مگر آج دوپہر ہونے کو آئی تھی اور چھٹی کا تقریباً آدھا دن اس نے یوں ہی بیکار بیٹھے بیٹھے گزار دیا تھا۔ سامنے میز پر ایش ٹرے میں
سارے سگریٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے تھے۔
یوں جیسے کئی گھنٹوں سے یہیں بیٹھا تھا اور کسی ایسی سنجیدہ اور متفکر فکر میں گم تھا کہ اتنے ڈھیر سارے سگریٹ پھونک ڈالنے کا بھی اُسے
احساس نہیں ہوا تھا۔
ایسی گم شدگی ...! ایسی بے خودی ...!
صاحباں اندر آئی تو اس کے قدموں کی آہٹ نے بھی حارث کو چونکایا نہیں۔ وہ اسی طرح آنکھیں میچے اور صوفے کی پُشت کے ساتھ
ٹکائے بیٹھا رہا۔
میز پر ہاٹ کیس رکھنے کے بعد صاحباں گم سم اور چُپ چاپ کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔
بعض انسانوں کے ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ شاید زمین اور آسمان سے بھی زیادہ ... اور ایسے ہی انسانوں میں سے ایک
حارث بھی تھا۔
بظاہر اکھڑ، بدتمیز، بدزبان اور بے حد بداخلاق، بالکل ایک جانور نما انسان... کوئی بھی تو ایسی خامی نہ تھی جو اس میں موجود نہیں تھی۔
اور ان سب خامیوں نے کچھ اس طرح اس کی شخصیت کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا کہ اس کی صورت بھی جانوروں اور وحشیوں جیسی دکھا
دیتی تھی۔
لیکن جانے کیا ہو گیا...؟ کیوں ہو گیا...؟ اور کیسے ہو گیا...؟ خود صاحباں بھی حیران تھی۔
آنے والا ہر دن اس کے سامنے حارث کا ایک نیا روپ پیش کر رہا تھا۔ جتنا پست، بھدا اور بدصورت اس کا ظاہر تھا اتنا ہی عظیم، خوشنما
اور حسین اس کا باطن تھا۔
اب وہ بے حد خوش اخلاق تھا... بہت باتمیز اور شائستہ عادات کا مالک تھا۔ ہمیشہ بہت دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرتا تھا۔ جیسے
کی طبیعت کا یہی خاصہ تھا۔
ظرافت کی بعض چھوٹی چھوٹی، خوبصورت خوبصورت باتیں اور فقرے اسے ایک بے حد زندہ دل انسان ظاہر کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ
گفتگو کرنے کا اتنا مزہ آتا کہ گھنٹے بھی لمحے بن کر گزر جاتے اور دل پھر بھی اک تشنگی کا احساس ہی لیے اس کی محفل چھوڑتا۔
سینے میں اتنا دردمند اور حساس دل رکھتا تھا کہ دوسرے کی ذرا سی بھی تکلیف پر یوں تڑپ اُٹھتا جیسے وہ خود اس میں مبتلا ہو۔
جانے پہلی پہلی ملاقاتوں میں اس نے وہ دل کہاں چھپایا ہوا تھا۔ صاحباں پر تو ہر نیا دن اک حیرت ہی لے کر آتا رہا۔
اور... خصوصاً کل کا دن تو اس کے لیے گزری ہوئی زندگی، ایسی مدوجزر والی زندگی کے ہر دن سے انوکھا اور نرالا طلوع ہوا تھا...
طوفانوں سے اس کی حیات گزری تھی مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے بڑا طوفان نہ کبھی آیا نہ آئندہ آنے کا امکان تھا۔
میز صاف کرتے ہوئے اچانک ہی اس کے ہاتھ وہ سب خطوط اور کاغذات لگ گئے تھے جو حارث نے میز پوش کے نیچے چھپا کر
ہوئے تھے۔
صاحباں کا ارادہ اس کی جاسوسی وغیرہ کرنے کا بالکل نہیں تھا لیکن بی بی کی خاطر جس مشن کو اس نے سنبھالا تھا اور جس طرح ماہر نفسیات
ہر ہفتے اس کی مکمل رپورٹ دینے کو کہا تھا، اس کے تحت وہ یہ خفیہ خطوط پڑھنے پر نہ صرف مجبور سی ہو گئی بلکہ اپنے آپ کو حق بجانب بھی
وہ اک نیک مقصد کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔
اور پھر... حیرت اور تعجب کا ہمالہ بھی اس پر آن پڑا تھا۔ وہ کیسے اس ہمالہ کے نیچے سے ریزہ ریزہ ہوئے بغیر نکل پائی تھی۔ یہ تو کچھ

تھی۔
بس اس کا عجیب ہی عالم تھا۔ ہوش و حواس میں تھی اور نہ بیہوش ... نہ استوار اور نہ ٹوٹی بکھری ... بس اک عجیب سی کیفیت تھی ...
دوسروں کی زندگیوں میں زلزلوں کے بڑے بڑے جھٹکے لانے والا شخص خود کیسا پُرسکون اور مطمئن بیٹھا تھا ... صاحباں کی نگاہوں میں اس
عقیدت تھی۔
شاید یہ سکون اس کے باطن کی نیکی اور بلندی کا انعام تھا... یقیناً ... ایسا ہی تھا۔
پہلے دن یہ اسے بے حد بدمزاج اور بدتمیز ترین شخص لگا تھا۔ بالکل اک وحشی جانور... مگر اس کے سینے میں ایسا انسانیت نواز دل تھا کہ انسان
ہونے کے دعوے دار سارے انسان اس کے سامنے اب پست تھے۔
وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ چندوں، وظیفوں اور یتیموں اور بیواؤں کی حاجتیں پوری کرنے میں صرف کر دیا کرتا تھا اور خود کس صبر اور قناعت
سے زندگی گزار رہا تھا۔
چھوٹا سا گھر تھا۔ معمولی سا اس گھر میں سامان تھا ... نئے دور، نئے زمانے کی آسائشوں میں سے ایک بھی تو پاس نہ تھی۔
نہ فرج، نہ ٹی۔وی، نہ قیمتی صوفے اور بیڈ، نہ قالین اور پردے۔ بے نیاز تھا ہر چیز سے۔
یہاں تک کہ تین میل دور دفتر پیدل آتا جاتا تھا۔ کوئی کار، سکوٹر یا سائیکل تک نہیں رکھا ہوا تھا۔
بیمار ہو جاتا، کھانا خود نہ بنا سکتا تو بڑے ٹھاٹھ اور حوصلے سے فاقہ کر لیتا... مگر کسی ملازم یا ملازمہ کا آسرا کبھی نہ لیتا۔
یوں زندگی گزار رہا تھا جیسے دو ڈھائی سو روپیہ ماہانہ بھتہ پانے والا کوئی اک معمولی سا انسان تھا وہ۔ اور مہنگائی اور غربت کی چکی میں پس
پس کر گزارہ کئے جا رہا تھا۔
وہ انسان تھا جو زندگی کی ہر اعلیٰ سے اعلیٰ آسائش اور سارے ٹھاٹھ باٹھ بڑی آسانی سے اپنے لیے مہیا کر سکتا تھا۔
ایسی دوسری مثال صاحباں نے کوئی نہ دیکھی تھی۔ بہت عظیم تھا وہ۔ اگر کسی انسان کے لیے اس نے عظمت و بلندی کا کوئی معیار کبھی قائم کیا تھا
وہ اس سے بھی بلند تر ثابت ہوا تھا...
"بہروپیا... دھوکے باز..."
صاحباں کے ہونٹوں پر پیار بھری جُنبش تھی۔
باطنی کردار کے ساتھ ساتھ حارث کی شکل و صورت اور شخصیت نے بھی صاحباں کی نگاہوں میں اک نیا روپ دھار لیا تھا۔
شکنوں کے بغیر اس کی کشادہ پیشانی آفتاب کی مانند روشن و تابندہ تھی۔
اس کے بھرے بھرے لبوں کی پُرکشش مسکراہٹ حیات میں تجلیاں بکھیرتی تھی۔
اس کی ذہین آنکھوں کی چمک دل کو بڑے انوکھے اور نرالے اُجالوں سے روشناس کراتی تھی۔
اس کی نگاہ کی گہرائی زندگی کے اسرار کھولتی تھی...
اس کے لہجہ کی مٹھاس کا زیر و بم پیار و محبت کی اک نئی منزل کا راستہ بتاتا تھا۔
اور اس کا بلند و بالا قد اس کی پوری شخصیت کو بڑی خوبصورت اور پُراعتماد سی عظمت بخشتا تھا... کچھ ایسی کہ اس کی پناہ میں آنکھیں
موند کر زندگی گزارنے کو دو پل بھی میسر آ جائیں تو اس سے بڑی سعادت جیسے کوئی اور نہ ہو...
اسی ڈوبے ڈوبے عالم میں حارث نے بازو ہلایا تو صاحباں اپنے خیالات کی گہرائیوں سے چونک کر اُبھری۔
"ہائے اللہ...!"
وہ کہیں جان نہ جائے کہ اتنی دیر سے کھڑی وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی... بھلا یہ کوئی شرافت تھی... کیا کیا سوچے جا رہی تھی اس کے متعلق!
پریشانی اور گھبراہٹ کے مارے صاحباں جُھک کر جلدی جلدی ہاٹ کیس کھولنے لگی۔
بازو کو صوفے پر سے اُٹھا کر گود میں رکھنے کے بعد حارث پھر اسی طرح گم سُم اور ساکت ہو چکا تھا۔
"حارث صاحب...!" صاحباں نے اُسے اپنی موجودگی سے باخبر کرنے کے لیے پُکارا۔
مگر جواب کچھ نہیں ملا۔ شاید اس کی آواز اس نے سُنی ہی نہ تھی۔ لیکن کیوں...؟ کیوں وہ اس قدر گم سُم اور خاموش تھا...؟
صاحباں نے بیقرار سی ہو کر آگے بڑھی اور اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔
"حارث صاحب..." اس کے لہجے سے تشویش اور بے چینی نمایاں تھی۔
حارث نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔
"آپ کب آئیں...؟"
اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر انجان بنا پوچھ رہا تھا۔

پھر... اک خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ خود پر جھکی صاحباں کو بڑے غور سے تکتے ہوئے پیشانی پر ٹکے اس کے ہاتھ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا۔

"ابھی دو تین منٹ پہلے... کیا آپ سوئے ہوئے تھے...؟" صاحباں نے سٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو..."

"پھر آپ اپنے اردگرد سے اس قدر بے خبر تھے کہ میرے آنے کا بھی احساس نہیں ہوا...؟"

"آپ مجھ سے کوئی علیحدہ ہیں کہ علیحدہ سے احساس ہوتا۔ آپ تو اردگرد، آس پاس موجود نہ بھی ہوں تو اندر کہیں ہر وقت موجود رہتی ہیں"

حارث کی آنکھوں میں عجیب سی وارفتگی اور جذب و مستی کی کیفیت تھی۔ نہ جانے اس سے یا اپنے آپ سے گھبرا کر صاحباں نے جلدی سے اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"رہنے دیتیں سکون مل رہا تھا..."

اک بے چین سی لہر حارث کی آنکھوں میں لہرا گئی اور زبان پہ ہلکا سا، ننھا سا شکوہ آ گیا۔

"آپ کی پیشانی اس قدر ٹھنڈی کیوں ہو رہی ہے...؟"

صاحباں اس شکوے کا کیا جواب دیتی... اس کے پاس تھا ہی نہیں... جلدی سے بات بدل دی۔

"طبیعت تو آپ کی ٹھیک ہے...؟"

"بس... جیسی بھی ہے دیکھ لیجیے..." وہ بڑی سادگی سے مسکرایا۔

"آپ آ جاتی ہیں تو اچھا ہو جاتا ہوں..." شوخی سے بولا

"اچھا...؟" صاحباں نے اس کی شوخی کا جواب اسی کے سے شوخ انداز میں دیا۔

"تبھی تو میں آتی رہتی ہوں..." صاحباں صوفے کے پیچھے سے ہٹ کر سامنے آئی تو وہ بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اس آتے رہنے والی عنایت، نوازش اور مہربانی کا بہت بہت شکریہ... مگر درمیان درمیان میں چلے جانے والا جو عذاب دے جاتی ہیں اس کے لیے کیا کہوں...؟"

"مجرم ہوں سزا دے لیجئے۔ لیکن میری مجبوری کو ضرور نگاہ میں رکھیے گا" اک بڑی خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ اور بے حد حسین انداز میں صاحباں نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔

"اب بتائیے ایسے محسن قسم کے مجرم کو کون سزا سنائے اور کس دل سے... چلیئے صاف بری کیا..."

"بہت بہت شکریہ..."

اور دونوں معصوم بچوں کی طرح قہقہے لگا اٹھے۔

جانے آج صاحباں کے روپ میں اک انوکھا پن سا کیوں دکھائی دے رہا تھا۔ پیازی ڈھیلے ڈھالے شلوار کرتے میں اس کا تر و تازہ اجلا اجلا چہرہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ حسین تھا۔ اس کے لبوں پر پھیلا شوخ تبسم اور آنکھوں میں جگمگاتے ستارے اس کی خزاں زدہ زندگی کے بہاروں کی نوید تھے گویا...

من ہی من میں اس نے اپنے آپ سے کئی سوال کر ڈالے اور کئی دل خوش کن جواب بھی دے ڈالے۔

"اتنے ڈھیر سارے سگریٹ کیوں پیتے ہیں...؟"

صاحباں کا تحکمانہ انداز حارث کو تاج شاہی پہنا گیا۔ جیسے کئی سلطنتوں کی حکمرانی اسے ایک دم ہی مل گئی تھی۔ آنکھوں میں چراغاں سا اٹھا اور ہونٹوں پر خوشیوں کی کلیاں کھل اٹھیں۔

"کیا کوئی بات ہو گئی ہے...؟"

"ہاں..." وہی دلفریب ہنسی ان کھلتی کلیوں پہ بہار بن کر چھا گئی۔

"کیا...؟" صاحباں نے بڑی دلچسپی سے اس کے ہونٹوں پر پھیلی واضح ہنسی کو دیکھا۔

"نہ آپ کے پوچھنے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ میرے بتانے کا۔"

"کیوں...؟"

"آپ سمجھ نہیں سکیں گی..."

"اور آپ مجھے اتنی کوڑھ مغز کیوں سمجھتے ہیں...؟"

"کیا سمجھتا ہوں آپ کو... بتایا تو..." بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوتے ہوئے وہ کھانے پر جھک گیا۔

"بتائیے نا... تو کیا...؟"

"کھانا تو خیریت سے کھا لوں..." ہنستے ہوئے اس نے نوالہ توڑا۔

"ایسا نہ ہو غصے میں آ کر آپ سب کچھ چھین جھپٹ کر بھاگ جائیں اور میں فاقے سے رہ جاؤں..."

"آپ جیسے غصیلے مزاج کی مالک نہیں ہوں۔"

صاحباں بھی ہنس پڑی... آج اسے آپ ہی آپ بات بے بات ہنسی آئی جا رہی تھی۔ یہ سارا اثر شاید شرجانہ کی باتوں کا تھا۔ جو ابھی ابھی ادھر آنے سے پہلے ہوئی تھیں۔ یا پھر اس کے اپنے دل کے تقاضے... شرجانہ اور وہ ہم نوا بھی تو تھیں... دل جو کہتا تھا جو چاہتا تھا وہی سب اسباق شرجانہ اسے سمجھانے اور رٹانے کی کوشش کرتی تھی۔

کیسی بے وقوف تھی وہ...!

"آپ کیا ہیں... یہ مجھ سے زیادہ یہ کون جانے گا... شاید آپ خود بھی نہیں..." حارث کی مدھم سی آواز سرگوشی کے سے لہجے میں صاحباں کی سماعت سے ٹکرائی... دل نے اک میٹھی میٹھی سی دھڑکن کے ساتھ دھڑکنا شروع کر دیا... مگر...

"اچھا...؟" وہ پھر ہنس پڑی۔

"مذاق اڑاتی ہیں میرا اور..." وہ یکا یک بے حد سنجیدہ ہو گیا۔

"میرے جذبوں کا..."

"نہیں... توبہ توبہ..." صاحباں نے سچ مچ کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

"میں کیوں مذاق اڑاؤں گی..."

اور پھر... شرجانہ نے آج اسے پنڈی والے ڈاکٹر صاحب کی نصیحت اچھی طرح حفظ کرا کے اور اس کے اچھے اچھے نتائج سے باخبر کر کے بھیجا تھا مگر پھر بھی...

حارث کے سامنے آ کر جانے وہ کیوں نروس ہو جاتی تھی۔ آگے پیچھے بہادری والی باتیں سمجھانے اور مچل مچل جانے والا دل بری طرح دھڑکنا شروع ہو جاتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے تھے اور زبان لڑکھڑانے اور ہکلانے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ ایسے ایسے سنگی ساتھیوں کے ساتھ وہ کب کوئی مہم سر کر سکتی تھی... نہ بی بی والی اور نہ اپنے جذبوں اور دل والی... کیا مصیبت تھی...؟

اس لیے... اس لیے اس نے اس موضوع کو بدل دینے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

میری بی بی کو آپ سے اک شکایت ہے..."

"کیا...؟" حارث گڑبڑا سا گیا۔

اس نے تو آج تک صاحباں کی بی بی کی اک جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ پھر شکایت کیسے پیدا ہو گئی...؟ اللہ خیر کرے۔ وہ تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔

"کیا شکایت ہے...؟" سہمے سہمے سے لہجے میں پوچھا۔

"وہ کہتی ہیں آپ کھانا بہت کم کھاتے ہیں..."

"بہت کم...؟"

ابھی اس نے ایک ہی نوالہ لیا تھا۔ سامنے رکھے تو بہت دیر سے بیٹھا تھا مگر دانستہ یا نادانستہ وہ کھانے کی بجائے نوالوں سے کھیل رہا تھا اور بظاہر صاحباں سے باتوں میں مصروف تھا۔

"ہاں... میں کم کھاتا ہوں...؟"

اور واقعی اس ایک نوالے کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ کر وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گیا...

"کیوں... یہی تو وہ پوچھتی تھیں... کیا آپ کو ہمارے ہاں کا کھانا پسند نہیں آتا...؟"

"کیوں کم کھاتا ہوں...؟ پسند نہیں آتا...؟ اس کا جواب شاید میں نہ دے سکوں... ہاں... نہیں دے سکتا..."

اور وہ کھویا کھویا سا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے کھانے کو اور صاحباں کو تکتا رہا پھر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

جانے کس ضرورت سے گیا تھا... صاحباں کچھ دیر وہیں بیٹھی اس کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ لیکن... کھانا ٹھنڈا ہوا جا رہا تھا۔ پہلے ہی وہ کھانا بہت کم کھاتا تھا۔ ٹھنڈا ہو کر بدمزہ ہو جانے پر تو شاید بالکل ہی نہ کھاتا۔

آخر وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اسے آوازیں دینے لگی کہ کھانا ٹھنڈا اور بدمزہ ہونے سے پہلے پہلے پہنچ جائے۔ کئی بار پکارنے پر بھی جب وہ نہیں آیا تو صاحباں جھنجھلاتی، بڑبڑاتی خود اسے بلانے کے لیے چلی۔

حیرت و استعجاب سے اس کے قدم حارث کی خواب گاہ کے دروازے میں ہی تھم کر رہ گئے جب اس نے دیکھا کہ وہ پلنگ پر کہنی میں چہرہ دبائے اوندھا پڑا تھا۔

"کیا ہو گیا حارث صاحب...؟" وہ تیزی سے اس کی جانب لپکی۔
"کیا مجھ سے کوئی ایسی بات ہو گئی ہے جو آپ کو بُری لگی...؟"
"نہیں... بخدا نہیں...؟"
"بس آپ پلیز! کل سے میرے لیے کھانا نہیں لائیے گا..."
"کیوں...؟ کیوں آخر...؟" صاحباں بڑی بے قراری کے ساتھ اس پر جُھک گئی۔ پھر ہولے ہولے اس کے بالوں کو... انتہائی ملائمت اور پیار سے بولی۔
"کبھی کبھی دل کی بات کو چھپانے سے کھول دینا بہتر ہوتا ہے"
"دل کی بات...؟ دل کی بات...؟"
حارث نے کہنی میں سے چہرہ نکالا۔ صاحباں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو تھے۔ رنگ... سے دَرد و کرب مترشح تھا۔
"آپ کونسے دل کی بات پوچھ رہی ہیں...؟" حارث کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھوں میں گھبراہٹ کے آثار... یعنی کہ ایک نہیں بلکہ کئی باتیں دل میں چھپائے بیٹھے ہیں"
"جی...؟ جی...؟" حارث کی آنکھوں میں پھیلی گھبراہٹ دوچند ہو گئی اور زبان بُری طرح ہکلانے لگی۔
"نہیں تو... نہیں تو...؟"
صاحباں کو اس کی حالت دیکھ کر ترس آگیا۔ جانے کونسے راز تھے اور کونسے دُکھ تھے اس کے اندر... ان دُکھوں کو... کرنا نہیں چاہتی تھی۔
لہٰذا بات کو اور اُسے، دونوں ہی کو ہلکا پھُلکا کرنے کے لیے مسکرا کر بولی۔
"میرا خیال ہے کھانا لانے سے آپ اس لیے منع کر رہے ہیں کہ میں یہاں نہ آیا کروں..."
"آپ...؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں...؟"
"آپ تنہا رہنے کے عادی تھے نا اور میرا روز روز کا ہی نہیں بلکہ بار بار چلے آنا آپ کی تنہائی میں مخل ہوتا ہو مگر آپ زبان سے کہہ نہ سکتے ہوں..."
صاحباں کی بات کا کوئی بھی جواب دیئے بغیر حارث اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
یہ اس نے کیسی بات کی تھی...؟ اتنے دنوں سے آ جا رہی تھی اور ابھی تک اس کے جذبوں سے قطعی لاعلم تھی... اِر اسے ذرا کوئی احساس نہیں ہوا تھا... کیسی عجیب تھی وہ...
حارث کی آنکھوں سے گھبراہٹ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ حیرت پھیل گئی۔ اس نے صاحباں کا ہاتھ تھام لیا۔ کئی... ڈوبی گہری گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے انتہائی خفگی سے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔
صاحباں اس جھٹکے کی متوقع نہیں تھی... لڑکھڑا گئی... اور... گرتی گرتی کو حارث نے خود ہی گھبرا کر جلدی سے بازو... صاحباں کا پھولوں ایسا نازک اور معطر وجود اس کے بازوؤں میں تھا... اور پھر... جیسے اسے اپنی کسی حرکت پر کسی... ہی نہ رہا...
"تم نہ آیا کرو...؟ یہاں...؟ اس گھر میں...؟ میرے گھر میں...؟" حارث نے بے اختیار ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔
"یہ میں چاہ سکتا ہوں بھلا...؟ یہ میں سوچ سکتا ہوں بھلا...؟"
صاحباں اس کے بازوؤں میں جکڑی اس کے سینے کے ساتھ لگی تھی اور وہ اس کے بالوں میں چہرہ چھپائے بڑبڑا...
"صرف تمہاری خاطر تو میں اتنے دن یہ اذیت بھی برداشت کرتا رہا ہوں... صرف تمہاری خاطر صاحباں! کہ تم... قائم رہے...؟"
صاحباں اس کے بازوؤں سے نکلنے کے لیے کسمسا رہی تھی مگر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوئی جا رہی تھی:
"اتنے دنوں سے تم جس طرح میرا خیال رکھ رہی ہو پلیز! اسی طرح مجھے اس تکلیف سے بچنے کا کوئی راستہ بھی بتا... نے میرے من کو روشن کیا ہے اسی طرح میری زندگی کی تاریک راہوں میں بھی روشنی کر دو۔ اُجالا بن کر پھیل جاؤ اردگرد کہ... دیتا... جس طرح تمہارے وجود نے، تمہاری شخصیت نے میرے مزاج کو بدلا ہے، مجھ ایسے جانور کو انسانیت سکھائی ہے... کو ہوش و حواس دیئے ہیں اسی طرح... اسی طرح میری سوچوں کو بھی بدل دو... خدارا کچھ کرو... میرے لیے کچھ کرو صاحباں ورنہ میں..."

اور... صاحباں کو محسوس ہوا جیسے اس کے سر کے اوپر کوئی بدلی ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھی۔ اس کے بال گیلے ہو رہے تھے...
اوہ... ! تو وہ رو رہا تھا...
حارث نے انتہائی بدتمیزوں کی طرح بڑے وحشیانہ انداز میں اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا مگر صاحباں کے دل میں اس کے لیے بڑے نازک اور بڑے نفیس و تقدس سے جذبات تھے اور وہ حارث سے بھی ایسے ہی سلوک کی توقع کرتی تھی۔
تب ہی کسی اس غنڈوں ایسی وحشیانہ اور بے حد نازیبا حرکت پر صاحباں کو غصہ آگیا... اور وہ اس کی گرفت سے نکلتے ہی جانے کیسے کیسے غصے کا اظہار کرنے والی تھی کہ...
وہ تو رو رہا تھا... اک مرد ہو کر رو رہا تھا...
جانے کون سا دُکھ تھا اسے... جو وہ نہ تو بتا سکتا تھا اور نہ ہی برداشت کر پا رہا تھا۔
سارا غصہ آپ ہی آپ رحم و ہمدردی کے جذبوں میں ڈھلنے لگا...
کئی لمحے اسی طرح گزر گئے... آہستہ آہستہ حارث کی بڑبڑاہٹ مدھم ہونے لگی اور ساتھ ہی گرفت بھی ڈھیلی پڑنے لگی۔
صاحباں نے قدرے سہولت سے اس کے بازو بھی ہٹا دیے۔ اب وہ آزاد تھی... اطمینان کا سانس لیتے ہوئے پیچھے ہٹی تو... اس نے دیکھا... حارث کے سارے وجود پر اسی طرح کپکپی طاری تھی۔ صاحباں نے گھبرا کر جلدی سے اسے تکیے پر لٹا دیا۔ اور اس کے مانگے بغیر ہی بھاگ کر پانی لے آئی۔
"حارث! یہ پی لیجیے..."
اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو صاحباں نے خود ہی اس کا سر تھوڑا سا اُونچا کر کے پانی کا بھرا گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔
یوں۔ جیسے صدیوں کا پیاسا تھا وہ... پورا گلاس دو تین بڑے بڑے گھونٹوں میں ہی ختم کر ڈالا۔
پانی پلانے کے بعد اس کا سر تکیے پر واپس ڈال کر صاحباں اس کی پسینے سے تر پیشانی کو صاف کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اس کا پورا چہرہ بھگو دیا تھا۔
دوپٹے کے پلو سے اسے صاف کرتے ہوئے صاحباں خود بے قابو ہو گئی...
اس کی جوانی، اس کی وجاہت، اس کی غریب پروری، اس کی نیک عادات و اطوار... مگر ان سب عظمتوں اور رفعتوں پر حاوی اس کے اس روگ نے صاحباں کے سینے میں بے شمار دکھوں کے کانٹے اتار دیے...
تکلیف میں وہ مبتلا تھا دَرد سے صاحباں تڑپ تڑپ اُٹھی... بے کل و بے قرار ہو گئی۔
آنسوؤں سے بھیگے اس کے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔ ٹپ ٹپ اپنے آنسو بھی اسی پر ٹپکنے لگے اور اسے مزید بھگونے لگے۔
بہت ضبط کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ حارث نے آنکھیں کھول دیں۔ صاحباں اس پر جھکی ہوئی روئے جا رہی تھی اور... اور ساتھ ساتھ اس کا چہرہ صاف کیے جا رہی تھی۔
"کیا ہوا...؟ تم رو رہی ہو...؟" حارث کو یکدم ہوش آگیا۔ گھبرا کر لرزتے ہاتھ اُٹھائے اور صاحباں کا چہرہ ان میں تھام لیا۔
"کیوں...؟ کیوں رو رہی ہو...؟"
"یہ... یہ آپ کی حالت...!" وہ روئے ہی گئی...
"میں ٹھیک ہو جاؤں گا..."
اک خوبصورت سی مسکراہٹ حارث کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔
"لیکن یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو...؟" یکایک اس کے زرد چہرے پر اک سُرخی بھری لہر دوڑ گئی۔
"کیا میرے لیے ہیں یہ...؟ سچ بتا نا صاحباں! کیا واقعی تمہارے یہ آنسو میرے لیے ہیں...؟"
ایسے والہانہ انداز میں اور اتنے آرزو بھرے مان کے ساتھ وہ پوچھ رہا تھا کہ صاحباں انکار کر ہی نہ سکی... کچھ اس کے اپنے جذبوں کی بے تابیاں بھی اب مزید دباؤ، گھیراؤ برداشت نہیں کر پا رہی تھیں... صاحباں سب کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔
بھیگی بھیگی پلکوں کو جھپکا جھپکا کر چُپ چاپ اُسے تکنے لگی... خاموشی لاکھ اقراروں کا اک اقرار تھی۔
"میری تکلیف تمہیں دُکھی کر دیتی ہے۔ اتنا زیادہ۔ کہ تمہاری ان حسین آنکھوں سے میرا دَرد ٹپکنے لگتا ہے... یہ حقیقت ہے نا صاحباں...؟"
وہی اقراروں بھری خاموشی اُس کے لبوں پر طاری رہی اور وہ اپنی نمناک آنکھیں جھپکتی رہی...
"کتنے مبارک ہیں تمہارے یہ آنسو جو میرے دَرد نے ٹپکائے ہیں۔ کتنی خوبصورت ہیں تمہاری یہ آنکھیں جو میرے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہیں..."
کتنی ہی دیر اس کی ان بھیگی بھیگی اُٹھتی گرتی پلکوں کو دیکھتے رہنے کے بعد ہاتھوں میں تھاما اس کا معصوم و مقدس چہرہ حارث نے جھکایا اور بڑی عقیدت سے، بڑے احترام سے، بڑی محبت سے اور بڑے پیار سے اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔

"میرے دُرد کو تم نے اپنایا ہے تو میرے باقی سب جذبے بھی تمہارے ہیں صاحباں! صرف تمہارے... اگر خوشی سے قبول کرو
اور اس نے صاحباں کا چہرہ چھوڑتے ہوئے اپنی آنکھیں بھینچ کر رُخ پرلی طرف موڑ لیا۔

"اچھی طرح جانتا ہوں میں اچھا انسان نہیں ہوں۔ تمہارے اسٹینڈرڈ کے مطابق بھی نہیں ہوں۔ اس لیے تمہارے قابل ہوں تو نہیں
پھر بھی..."

اک لمحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔ صاحباں خاموش تھی۔

"پھر بھی یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ خود کو بہت دنوں سے تمہاری نذر کر چکا ہوں..."

صاحباں خاموش تھی اور وہ اسی طرح رُخ موڑے موڑے کہتا جا رہا تھا۔ زبان نے کھُلنے کی ہمت کی تھی تو وہ سب کہ
چاہتا تھا جو اس کے دل میں تھا... اور وہ سب کچھ جان لینا چاہتا تھا جو صاحباں کے دل میں تھا...

"اگر میری کوئی حرکت تمہیں بُری لگی ہو، اگر میری کوئی بات، کوئی عادت تم قابلِ قبول نہ سمجھو تو وہ بھی صاف صاف کہہ دو
سچائی پسند ہے..."

اس کی آواز تھوڑی سی بھر آگئی۔

"اور یہ سچائی گو مجھے دُکھ دے گی۔ میری برباد شدہ زندگی کو مزید برباد کر دے گی مگر... تم اس کی پرواہ نہ کرنا... میں دُکھ سہنے
ہوں اور بربادیوں کو سینے سے لگا کر بھی جینا جانتا ہوں..."

حارث خاموش ہو کر صاحباں کے جواب کا انتظار کرنے لگا... چند لمحے گزرے اور پھر کسی جواب کے بجائے صاحباں کے
کی آہٹ سُن کر وہ چونکا... پھر جلدی سے رُخ پھیر کر دیکھا۔

وہ کمرے سے نکل کر جا چکی تھی... کچھ بھی کہے بغیر... کوئی بھی آس یا اُمید دلائے بغیر... شاید... یہاں پھر کبھی نہ آنے کے
حارث نے بڑے دُکھ اور کرب کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھا اور آنکھوں کو زور سے بھینچ لیا۔ جیسے صاحباں کی طرح آنکھوں میں بسی
شبیہہ بھی کہیں چپکے سے چل نہ دے...

جانے کب تک وہ یوں ہی پڑا رہا... دماغ بالکل سُن تھا۔ سوچیں مفلوج تھیں۔ دل کی دھڑکن جیسے تھم چکی تھی اور ہاتھ پاؤں
تھے...

دوپہر کا کھانا ایک آدھ نوالے سے زیادہ نہیں کھایا تھا مگر پھر بھی نہ بھوک تھی، نہ پیاس، نہ چائے کی خواہش، نہ سگریٹوں کی
...سب سے بے نیاز بس بے سدھ سا پڑا تھا۔

پھر... جانے کیسے اور کیوں حواس یکایک بیدار ہو اُٹھے۔ وہ چونکا۔ اک بڑی دلنشیں سی مہک تھی جو نتھنوں سے گزر کر ا
پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔

ساتھ ہی اسے محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی بے آواز قدموں سے چل پھر رہا ہے۔ جی تو اس وقت بھی آنکھیں کھول کر کچھ بھی
نہیں چاہا مگر...

من کی تاریکیوں میں دُور کہیں اک اُمید کی کرن نے جگمگا کر روشنی کر دی...

اس نے زور سے میچی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا... تو... اسے اس عالم میں پڑے پڑے دوپہر سے رات
تھی۔ اتنے گھنٹے بیت گئے تھے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا تھا...

اپنے وجود کا، اپنی ہستی کا احساس نہیں تھا تو وقت کا کیسے ہوتا...!

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کون ہے...؟" اسی اُمید نے بلند آواز میں پوچھا۔

مگر... جواب میں پھر خاموشی ملی۔ کمبخت نااُمیدی نے اسی کا گھر دیکھ لیا تھا...

حارث نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں مدّھم سا اُجالا پھیل گیا۔

اور... آپ ہی آپ اُس کی نگاہیں اپنے مرکز پر جا ٹکیں... اُمید قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

سفید لباس میں چُپ چاپ سر جھکائے کھڑی وہ اک حیا و تقدّس کا پیکر بالکل سنگِ مرمر کا مجسمہ ہی لگ رہی تھی۔

اس کا نصیب اتنا یاور ہو سکتا تھا...؟ حارث کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔

"صاحباں...! صاحباں...!"

اس نے ہولے ہولے دو تین بار پُکارا...

مگر... نہ اس نے کوئی جواب دیا اور نہ ہی نظر اُٹھا کر اُس کی جانب دیکھا... البتہ اس مجسمے کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی اور

برے ایک دوسرے کو سننے لگے۔

کانچ کی چوڑیاں، جو صاحباں کی بی بی ہمیشہ اسے پہنائے رکھتی تھیں کھنک اُٹھیں... ساتھ ہی اس کی پلکیں اس کے گلابی رُخساروں
پر جو نہ جانے طیش سے تمتما رہے تھے یا شرم و حیا کی زیادتی سے، بڑی تیزی سے اُٹھنے گرنے لگیں۔

تو... وہ رُوٹھ کر ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نہیں چلی گئی تھی بلکہ اپنے حُسن کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔
چوڑیوں کی جھنکار حارث کی زندگی کی جھنکار بن گئی۔ یہ کمرے میں پھیلا ہلکا سا، رومانوی سا اُجالا اور اس کے کھڑے ہونے کا دلفریب
انداز... حارث کے حواس پر مدہوشیاں چھانے لگیں۔

"ناراض ہو...؟"

حارث کے سرگوشی بھرے لہجے میں پیار کی چاشنی تھی اور چاہت کا رنگ تھا۔

"[illegible] ابھی میں تم سے معافی مانگوں گا۔ لیکن نہیں۔ میں اپنی کسی بات کی، کسی سرزد ہو جانے والی حرکت کی معافی مانگ
کر اپنے سچے، کھرے اور خالص جذبوں کو خود ہی جھُٹلا نہیں دوں گا..."

وہ اُٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"تم کچھ بھی نہیں بول رہیں... مجھے بُرا بھلا ہی کہہ لو مگر کچھ کہو تو سہی" حارث نے کندھوں سے تھام کر اس مجسمے کو قریب پڑی اِک
کُرسی پر بٹھا دیا۔ وہ تب بھی نہیں بولی۔

"کیا اب میں تمہارے غصّے کے بھی قابل نہیں رہا...؟"

صاحباں کے سامنے نیچے فرش پر پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے وہ جُھک کر اس کے جُھکے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"تم مجھے بدتمیز، بداخلاق، جانور اور نہ جانے کیا کیا کہا کرتی تھیں۔ وہی سب پھر کہہ لو۔ میرے کسی بھی جذبے کو بے شک قبول نہ کرو مگر خدا
کے لیے یوں... یوں بھی تو خاموشی اختیار نہ کرو..."

وہ اس کے ایک دوسرے کے ساتھ بھنچے ہوئے نازک لبوں کو دیکھ رہا تھا اور بڑے دُکھ اور کرب سے کہہ رہا تھا۔

"میرا دَم گھٹ رہا ہے صاحباں! کچھ کہو... میرے ساتھ جھگڑا کرو... میری زندگی میں پہلے ہی خاموشیوں کے سوا کچھ نہیں... تمہارے وجود
نے جو ہلچل مچائی تھی، وہی ہلچل، وہی ہنگامہ، وہی جنگ و جدل، بھیک کی صورت میں پھر میرے دامن میں ڈال دو... نہ سہی کوئی محبت کا جذبہ صرف
ہی توجہ ہی دے دو"

وہ اتنا ٹوٹا پھوٹا ہوا اور دُکھی تھا کہ اس کے قدموں میں ہی ڈھیر سا ہو گیا۔

"اوہ...!"

صاحباں کے بھنچے ہوئے لبوں سے اک مبہم سی آواز نکلی اور اس کے دونوں بازو پھیل گئے۔ اک لمحہ بھر کے لیے جھجکی پھر دونوں پھیلے ہوئے بازوؤں
میں حارث کا سر بھرا اور کھینچ کر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"نہیں نہیں..." اس کے بالوں میں چہرہ گھسا کر صاحباں ہولے ہولے بڑبڑانے لگی۔

"آپ کے جذبوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے... آپ کی ذرا سی تکلیف مجھے بے قرار و بے چین کر دیتی ہے۔ آپ کے وہ دُکھ، جن سے
میں بے خبر ہوں، وہ بھی مجھے اپنے محسوس ہوتے ہیں مگر..."

مزید کچھ کہے بغیر صاحباں خاموش ہو گئی تو حارث نے بے تاب ہوتے ہوئے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ آنکھوں کی حسرت اور زبان کی خاموشی
جیسے سوال کر رہی تھی۔

"مگر کیا...؟"

اس کی خاموشی کی زبان سمجھتے ہوئے صاحباں مدّھم سے لہجے میں بولی۔

"میری بی بی کیا کہیں گی...؟ انہوں نے تو مجھ پر پورا بھروسہ کیا تھا لیکن یہ سب کیا ہو گیا...؟ انہیں اگر کچھ پتہ چل گیا تو میں ان کا سامنا
کیسے کر سکوں گی... نہیں حارث! نہیں..."

"ان کا بھروسہ ان کا مان قائم رہے گا صاحباں! انشاء اللہ قائم رہے گا... تم اگر شریف والدین کی بیٹی ہو تو میری رگوں میں بھی... اوہ..."

اور یہ بات کرتے کرتے اچانک ہی وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کئی لمحے اسی طرح بیت گئے...

صاحباں چونکی... وہ یکایک چُپ ہو گیا تھا۔ والدین کا ذکر آیا تھا کہیں اسے دورہ تو نہیں پڑ گیا تھا...؟

انہیں دوروں کی خاطر تو وہ جا کر واپس آ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "اس سے محبت کرو..."

وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس سے ملاقات کے چند روز بعد سے ہی یہ جذبے اس کے دل میں اُترنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ انہیں دباتی رہی
تھی۔ آپ ہی آپ انجانے میں جو دوسروں پر ظاہر ہو جاتے تھے۔ ان کی تردید کرتی رہی تھی۔

بہت دن اس نے اپنے دل پر جور و ستم کیے تھے۔ بڑی مشکلات سے اسے گزرنا پڑا تھا بہت تکلیف میں رہی تھی۔

اور… وہ ہمیشہ کے لیے یہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ کچھ بھی گزر جاتا اس پر… وہ پھر بھی اپنے مچلتے تڑپتے دل کی اک بھی نہ سنتی… کبھی نہ… کہ اس پر بی بی نے بیٹی والا اعتماد کیا تھا۔ بیٹی والا مان دیا تھا۔ بیٹی والا پیار دیا تھا۔ محبت دی تھی۔ بھرپور خلوص دیا تھا۔ توجہ دی تھی۔ جو کچھ تھا سب کچھ ہی دے ڈالا تھا۔

وہ ان کے اعتماد کو کسی طرح مجروح کرنا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی… اپنے انکار کو اسے اقرار میں بدلنا پڑا۔

"اگر محبت نہیں تو ڈراما ہی کھیل دو بی بی! اک انسان کی زندگی کی خاطر ناٹک ہی کر دو…؟"

ڈاکٹر کا یہ فقرہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔

بی بی کی خاطر اسے ان کے بیٹے کا روگ دور کرنا تھا اور اس کی بیماری کا یہی اک علاج تھا تو… ناٹک یا ڈرامے کا کیا مطلب… جو کھرا، پرخلوص جذبہ اس کے پاس تھا… وہی کیوں نہ اسے دے دے۔ سچائی کو ناٹک یا جھوٹ کا نام کیوں دے…؟ محبت کرنا کوئی بری… محبت، پاک محبت تو اک ثواب ہے… اک عبادت ہے…

اور پھر اس ثواب یا عبادت سے اک اور عبادت ہو جائے۔ اک مریض کا مرض دور ہو جائے… تو…

اتنی سچائیوں کو، اتنی عبادتوں کو وہ جھٹلائے جا رہی تھی۔ وہ بھی بی بی کی خاطر… یہ بھی بی بی کی خاطر… تو…؟ بات کیسے بنے…؟

تب… وہ واپس حارث کے پاس آگئی تھی… یہ معاملہ تو سلجھے… باقی پھر دیکھا جائے گا… حارث اک بار ٹھیک ہو جائے… اگر اس کے جذبوں کو ناپسندیدگی سے دیکھا تو…

تو اس نے اس کا بھی راستہ سوچ لیا تھا۔ حارث ہی کی نگاہ میں وہ بے وفا بنے گی نا… وہی بری کہلائے گی نا… باقی سب معاملات تو چکے ہوں گے نا۔

تب وہ خود ہی ان کی دنیا سے نکل جائے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے… جیسے کسی اور دنیا سے ان کی دنیا میں آئی تھی اسی طرح ان کی دنیا سے کسی دوسری دنیا میں چلی جائے گی… اس کا کیا تھا…؟ وہ اسی قابل تھی…! اسی لائق…!

آنکھوں میں آنسو بھی ڈھیر سارے آگئے تھے اور انہیں پی بھی بڑے صبر اور حوصلے سے لیا تھا…

حارث کی خاموشی کا وقفہ اور طویل ہو گیا۔ تو… صاحباں کی سوچیں بھی بے قرار ہو اٹھیں… یقیناً حارث کو پھر دورہ پڑ گیا تھا۔

"حارث! حارث!"

اس نے گود میں بھرے اس کے سر کو بیتاب ہو کر جھنجوڑ ڈالا۔

"آپ یکایک خاموش کیوں ہو گئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا…؟"

"ہاں… میں ٹھیک ہوں۔"

حارث نے سر اٹھا کر صاحباں کے گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت نے اسے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ حارث مدہوش سا اسے دیکھے ہی چلا گیا۔

"سچ کہہ رہے ہیں ناکہ بالکل ٹھیک ہیں…؟"

صاحباں کو جیسے اس کے منہ سے نکلے الفاظ کا یقین نہیں آیا تھا… وہ بیتابی سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی پیشانی پر ہتھیلیاں رکھ رکھ کر اس کی حرارت محسوس کرنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے سرد اور لرزتے ہاتھوں میں لے کر دبانے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں صاحباں…!"

حارث نے پیار چھلکاتی نگاہوں سے اس کی ان بیتابیوں کو دیکھا۔ چہرے پر مسرت و شادمانی کے بڑے عجیب اور خوبصورت سے رنگ دوڑ گئے۔

"تم میرے اتنا قریب ہو تو پھر بھلا مجھے کچھ ہو سکتا ہے…؟"

"اوہ…!" صاحباں کو جیسے ہوش آیا۔

"آپ… آپ یہاں نیچے میرے پاؤں میں بیٹھے ہیں؟"

اس نے گھبرا کر حارث کا سر گھٹنوں پر سے ہٹایا۔

"تمہارا مقام تو میرے دل میں، میری آنکھوں میں ہے…" صاحباں کے دل نے کہا۔ "میرے جذبوں کے لحاظ سے بھی اور تمہارے کردار کی بلندی کے لحاظ سے بھی… تم یہاں میرے قدموں میں کیوں ہو… تم تو عظمت کا مینار ہو… اونچا۔ اٹھا ہوا۔ جسے سر اٹھا کر دیکھنا بھی عبادت ہے… تم اپنے مقام پر رہو اور… مجھے عبادت کرنے دو…"

"تو کیا ہوا…؟"

صاحباں کے دل کی باتیں سننے پر تو حارث قادر نہ تھا اس کی گھبراہٹیں ہی دیکھ کر محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا…

"میرے یہاں بیٹھنے سے…"

"اٹھیے نا…" صاحباں نے اس کی بات پوری نہیں سنی "میں کھانا لائی ہوں… کھا لیجیے… رات کے دس بج رہے ہیں۔"

"کھانا…؟ کھانا…!" حارث اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں نہیں… میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گا…؟"

پاس ہی دوسری کرسی پر پڑے ہاٹ کیس کو دیکھتے ہی گھبرا کر حارث یوں دو قدم پرے ہٹا جیسے اس کے سامنے کسی نے زہر رکھ دیا تھا۔ عین اس وقت جب اسے نئی زندگی کی نوید ملی تھی… یہ کیسا غضب تھا…! اس نے اک شاکی نگاہ صاحباں پر ڈالی…

"کیوں… کیا ہوا اس کھانے کو…؟"

صاحباں نے حیرت سے اس کا انداز دیکھا۔ اس کی نگاہ کی شکایت کو پڑھا… اس کے پیچھے ہٹنے والے قدموں کو محسوس کیا… کتنا عجیب انسان تھا… محبت بھی کرتا تھا اور… اور…

"میں تمہارے گھر کا کھانا نہیں کھا سکتا…"

وہ جلدی سے جا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ جیسے اس میں کھڑا ہونے کی بھی سکت نہ تھی۔

"سچ سچ بتاؤں صاحباں! یہ اتنے دن بھی جو میں دو دو، چار چار نوالے کھا تا رہا ہوں تو بڑی مجبوری اور مشکل سے… صرف تمہاری خاطر صاحباں! صرف تمہاری خاطر… کہ ایسا نہ ہو یہ بہانہ درمیان میں نہ رہے تو کہیں تمہارا آنا جانا بھی بند ہو جائے…؟"

حارث نے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے صاحباں… شدید ضرورت… تم آجاتی ہو تو جیسے میرے سارے دکھ دور ہو جاتے ہیں۔ سب درد مٹ جاتے ہیں۔ جیسے مجھے پناہ مل جاتی ہے۔ جیسے مجھے اس دنیا میں سانس لینے کا حق مل جاتا ہے… مگر تمہارا یہ کھانا… پلیز! یہ نہ لایا کرو… نہ لایا کرو۔"

اس کے لہجے سے عجیب طرح کا کرب مترشح تھا اور آواز میں عجیب سا ارتعاش…!

"لیکن کیوں…؟ اب تو یہ آپ پر احسان نہیں… آپ اس کی قیمت ادا کر چکے ہیں…"

"ہاں… لیکن یہ جو تم سے پے انگ گیسٹ والا معاہدہ ہوا تھا تو کھانے کی خاطر نہیں ہوا تھا۔ صرف تمہاری خاطر ہوا تھا… کہ تم یہاں آتی رہو…"

"تو…؟ کیا مطلب…؟"

"مطلب یہ… کہ قیمت ادا کرنے کے باوجود، بھوک ہونے کے باوجود، میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا۔ اور کچھ مجھ سے مت پوچھنا…"

ہنوز وہ اسی طرح سر تھامے بیٹھا تھا… صاحباں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"آپ نے اپنے تمام جذبے میری نذر کیے ہیں…"

وہ بڑی اپنائیت سے، بڑے پیار سے اس کا سر اپنے ساتھ لگا کر اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ اپنے دکھ مجھے نہیں دے سکتے…؟"

"وہ… وہ… نہیں صاحباں! نہیں۔ میرے دکھ مت مانگو۔ تم بھی میری طرح زندہ درگور ہو جاؤ گی… تم بھی میری طرح دنیا سے منہ چھپاتی پھرو گی…"

حارث کا سارا وجود لرزنے لگا۔ اس کی وہی کیفیت ہوئی جا رہی تھی۔ تب اسی عالم میں وہ ڈوبا ڈوبا بڑبڑانے لگا۔

"مجھ سے تو سب کچھ چھینا جا رہا ہے۔ زندگی کی ہر لذت، ہر خواہش یہاں تک… یہاں تک کہ… یہ کھانا… تمہارا لایا ہوا کھانا… جسے کھانا بھی چاہتا ہوں… مگر… مگر… وہی ذائقہ، وہی رنگت، وہی خوشبو… جیسے میری بی بی کے ہاتھ کا پکا ہوا ہو۔ بی بی… میری بی بی… لگتا ہے وہ یہیں کہیں… میرے اردگرد ہی کہیں موجود ہوں… بی بی! آپ کہاں ہیں…؟ کہاں ہیں بی بی…؟ اور میں…؟ میں کہاں ہوں… میں کہاں ہوں…؟"

اور پھر… نڈھال سا ہوتے ہوئے اس نے تکیے پر سر ڈال دیا۔ ساتھ ہی اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہو گئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

اوہ…! تو یہ معاملہ تھا… یہ اس کی پرابلم تھی۔

اس کی بڑبڑاہٹ نے کھانا نہ کھا سکنے کا راز صاحباں پر کھول دیا تھا۔ جو شاید ہوش میں وہ نہ بتاتا۔

جس طرح ماں کا نام یا ذکر آتے ہی اس کی یاد اسے بے کل کر دیتی تھی اسی طرح اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا اسے بے کل کر دیتی تھی۔ اسی طرح اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا اسے ماضی کی طرف لوٹا کر اس کا صبر و چین اور سکون و قرار لوٹ لیتا تھا۔

لیکن… وہ اس کی خاطر… صرف صاحباں کی خاطر اتنے دنوں سے یہ اذیت برداشت کیے جا رہا تھا۔ بی بی کے ہاتھوں کا بنا ہوا

کھانا کھا بھی نہیں سکتا تھا اور اس کی خاطر صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تب... چپکے سے بھوکا ہی رہ جاتا... یوں... اس نے کئی فاقے اس کی خاطر کر ڈالے تھے... اس کی محبت کے لیے... اس کی پ
لیے... اس کی طلب کے لیے... اسے اپنے سامنے، اپنے پاس موجود پانے کے لیے۔

تو... تو گویا ان فاقوں اور کئی دوروں کی ذمہ دار وہ بنی تھی... وہ خود... ہائے ہائے! کیسی زیادتی اور کیسا ظلم ہو گیا جو اسے
اس بات کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ کیسی بے پرواہ اور بے خبر تھی وہ... اور دعوے کرتی تھی پیار کا اور دم بھرتی تھی محبت کا...

جا صاحباں جا! تو بھی بڑی بیوقوف اور احمق ہی نکلی... نہ تجھے پیار کرنا آیا اور نہ پیار کرنے والے جذبوں کو ہی پہچان پائی
ہر معاملے میں تم پر بازی لے گیا... بیوقوفوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے...

"آج کا دورہ تمہارا آخری ہو گا حارث! انشاءاللہ آخری..."

رحم اور ہمدردی سے زیادہ پیار و محبت کے جذبات سے لبریز نگاہوں کے ساتھ حارث کو دیکھتے ہوئے صاحباں پُرعزم
بڑبڑائی۔

"آئندہ تمہیں کوئی فاقہ نہیں کرنا پڑے گا۔ کل سے تمہارے لیے کھانا میں خود بنایا کروں گی... میں تمہاری اتنی خدمت کروں
تم سے اتنی محبت کروں گی کہ تمہارے سب دُکھ دُور ہو جائیں گے۔ تمہارے سب زخم مندمل ہو جائیں گے۔ تمہارے سب درد
گے... حارث..."

وہ سوچتے ہوئے اور آپ ہی آپ سچے دل سے عہد کرتے ہوئے باورچی خانے میں جا پہنچی... حارث کے لیے فٹافٹ چائے
چائے اس کے پاس لے کر جانے ہی والی تھی کہ خیال آگیا... اس نے آج کے سارے دن میں سوائے اک نوالے کے کچھ بھی
مطلب یہ کہ بالکل فاقے سے تھا۔ بلکہ شاید کئی دنوں کی بھوک کا مارا ہوا تھا...

"خالی پیٹ کے لیے جلتی ہوئی چائے بھلا کوئی فائدے والی چیز ہے...؟"

ماڈرن زمانے نے جو بیڈ ٹی کا رواج دیا تھا وہ بی بی کو بھی بالکل پسند نہ تھا۔

"یہ تو اُلٹا انتڑیوں کو نقصان پہنچاتی ہے..."

اس لیے وہ صاحباں کو ہمیشہ علی الصبح چائے کی پیالی کے بجائے دُودھ کی پیالی دیا کرتی تھیں...

بی بی کی بات صاحباں کے دماغ میں گونج اُٹھی۔ وہ خالی پیٹ حارث کو چائے نہ ہی دے تو بہتر ہے...

اب اس کی ہر سوچ نے دوسرا رُخ اختیار کر لیا تھا۔ اس حالت میں تیز گرم چائے اگر وقتی طور پر اس کے دورے کی شدت کو کم
تو ہو سکتا تھا بعد میں نقصان دہ ہی ثابت ہوتی ہو...

چائے وہاں رکھ کر وہ اس کے لیے کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔ گھر سے لایا ہوا کھانا اب وہ کسی صورت اسے دینا نہ چا
لاعلمی میں جو کچھ ہو گیا، ہو گیا۔ اب تو وہ سب کچھ جان چکی تھی۔ اب بے پرواہی کیسے کرتی۔
باورچی خانے میں سے کچھ ہی مل جاتا... مگر... وہ اپنی ذات سے اتنا بے نیاز اور لاپرواہ تھا کہ گھر میں کچھ اور کھانے کو رکھا ہی
تھا۔ کوئی بسکٹ وغیرہ تک نہیں۔

اس کا لایا ہوا کھانا نہیں کھا سکتا تھا تو اس کا ازالہ بھی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جانے اتنی بھوک، اتنے فاقے کیسے برداشت کرتا
اس کی بے پرواہی اور ان حوصلوں اور برداشت پر غصہ بھی آیا، ترس بھی آیا اور پیار بھی ڈھیروں ڈھیر۔ بالکل ایسے، جیسے کسی
بچے پر...

تب اس بچے کو بڑے پیار سے بُرا بھلا کہتے ہوئے جھنجلا جھنجلا کر باورچی خانے میں ایک ایک کونہ دیکھ ڈالا۔
رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اس وقت تو بازار سے بھی کچھ نہیں مل سکتا تھا... اور اگر ملنے کا وقت بھی ہوتا تو دور بہ
دوسرے کون جاتا...

اپنے گھر جا کر کبیر خاں سے کہتی یا گھر سے کوئی بسکٹ قسم کی چیز لے آتی تو بی بی سے پوچھ گچھ کا خدشہ تھا... انہوں نے جو اتنا مزے
روسٹ بنا کر بھیجا تھا۔ اس کے متعلق کیا جوابدہی کرتی... کیسی مجبور تھی وہ...

بے بسی کے مارے آنکھوں میں بہت سارے آنسو آگئے۔

"حارث! تم نے مجھے بہت ستایا ہے۔ بہت رلایا ہے۔ بہت دُکھ دیے ہیں۔ بہت ظالم ہو تم۔ بہت بے دَرد ہو..."

اس سے ڈھیر سارے شکوے شکایات کرنے کے بعد دُعائیں مانگنے لگی۔

"یا اللہ... اس وقت اپنی رحمت سے اس بھوکے کے پیٹ بھرنے کا کوئی انتظام کر دے کل سے انشاءاللہ میں ایسا موقع آنے ہی نہ
گی... آج بس پروردگار کوئی معجزہ دکھا دے۔"

اس نے کچھ ایسے خلوص اور ایسے صدقِ دل سے دُعا مانگی تھی کہ اچانک ہی الماری کے اوپر والے خانے میں ہاتھ ڈالتے ہی جا

کچھ ہوئے چار مرغی کے انڈے پڑے مل گئے۔

یوں خوش ہوئی جیسے انڈے نہیں تھے بلکہ سونے کا انڈا دینے والی مُرغی خود مل گئی تھی یا پھر کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا جس سے
ارث کی مفلسی دُور ہو سکتی تھی۔

خوشی خوشی، جلدی جلدی انہیں توڑا... ہزاروں شکرانے انڈے ملنے پر ادا کیے... کئی ہزار مزید اس لیے ادا کر ڈالے کہ چاروں
کے چاروں ٹھیک ٹھاک آئے تھے۔

دو کی آملیٹ بنائی۔ دو میٹھے بنا لیے۔ اسے بی بی کا سکھایا ہوا ہر طریقہ معلوم تھا۔ مگر اپنی پوری کوشش سے ذرا مختلف طریقے سے بنائے۔
قیمہ اور روسٹ جو گھر سے لائی تھی اسی طرح ہاٹ کیس میں بند رہنے دیا البتہ روٹیاں آملیٹ کے ساتھ کھانے کے لیے نکال لیں۔

"روٹیوں کا کون... ذائقہ ہوتا ہے۔ آملیٹ کا ذائقہ مختلف ہو گا تو وہ بھی مختلف ہی لگیں گی..."

دل کو تسلی دے کر اسی ہارڈ بورڈ کے بنائے ہوئے ٹرے میں لگا کر اس کے کمرے میں آگئی۔
وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔

ارے! وہ اس وقت سے اسی طرح دورے میں پڑا تھا۔ صاحباں نے گھبراہٹ اور پریشانی میں اسے پانی تک نہیں پلایا تھا۔ کیسی
بے وقوف اور پاگل تھی وہ...!

اس نے ٹرے رکھ کر میز پر سے پانی کا گلاس اُٹھایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کا سر اُونچا کر کے اسے پانی پلایا۔ چائے یا پانی پینے
سے وہ قدرے سنبھل جایا کرتا تھا۔ پانی پینے کے بعد وہ ذرا ہوش میں آیا تو صاحباں نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔

"نہیں نہیں..."

سہمی سہمی نگاہوں سے کھانے کو دیکھتے ہوئے وہ پیچھے ہٹا۔ "بس چائے کی ایک پیالی دے دو..."

"چائے بھی بنائی ہے۔ وہ بھی مل جائے گی۔ مگر کھانے کے بعد..."

"نہیں... کھانا میں نہیں کھاؤں گا..."

"ارے بھئی ایک نوالہ تو لے کر دیکھیے۔ وہ، ہمارے گھر والا نہیں ہے۔ یہاں آپ کے باورچی خانے میں بنایا ہے..."

صاحباں نے اپنے ہاتھ سے ایک نوالہ بنا کر زبردستی اس کے مُنہ میں ٹھونس دیا۔

صاحباں نے اپنے ہاتھ سے اس کے مُنہ میں ڈالا تھا۔ اس میں زہر بھی ہوتا تو پھینک نہیں سکتا تھا۔ چپکے سے کھانے لگا۔ پہلا ابھی پوری
طرح اس نے نگلا ہی نہیں تھا کہ صاحباں نے جلدی سے دوسرا بھی ڈال دیا۔ پھر تیسرا۔ اسی عجلت سے۔

"ذرا توقف سے... میں کھا رہا ہوں..."

چوتھے پر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے حارث مسکرا پڑا۔ "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں یہ کھانا کھا سکتا ہوں..."

صاحباں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ اب وہ واقعی بڑے اطمینان سے کھا رہا تھا۔ چہرے پر وہ ہمیشہ والی اذیت
کے بجائے بڑے خوبصورت سے رنگ بکھرے تھے۔ ہونٹوں پر اک معصوم سا تبسم تھا اور آنکھوں میں زندگی کی جوت...!

"یہ کھانا تو ٹھیک ہے نا...؟"

صاحباں نے پیار بھرے مسرور لہجے میں پوچھا۔

"ہاں... مگر یقیناً یہ کھلانے والے ان خوبصورت ہاتھوں کا اعجاز ہے جو ٹھیک لگ رہا ہے... پہلے یہ نسخہ نہیں آزمایا تھا نا..."

"چلیے ان ہاتھوں کا اعجاز ہی سہی..."

اک شرمیلی سی لہر نے صاحباں کے چہرے کو سُرخ بھی کر دیا مگر بظاہر بے پرواہ سی بنی رہی۔ اپنی شرم و حیا کو لے کر بیٹھ جاتی تو اس کا
عزم بے عزم ہو جاتا...

"انہیں ہاتھوں سے خوب پیٹ بھر کر کھا لیجیے... اتنا... کہ پچھلے سب فاقوں کی کسر نکل جائے..."

"ان فاقوں کی کسر نکالنے کے لیے یہ سب تو ناکافی ہو گا"

"یہ ناکافی ہو گا تو کافی کتنا ہو گا...؟"

"یہی کوئی آٹھ دس درجن انڈے چاہئیں اور کئی من آٹا..."

حارث کی زندہ دلی زندہ ہو گئی۔

"اوئی! اتنے پیٹو ہیں آپ...؟"

"اس سے بھی زیادہ..."

صاحباں کے مہربان وجود کو وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ شوخی سے ہنسا۔

"یہ تو میں ابھی ان نازک ہاتھوں کا لحاظ کر گیا تھا ورنہ ...؟"

"لگتی ہے شرط ...؟"

حارث کو باتوں میں لگا کر صاحباں اسے کھلائے جا رہی تھی۔

"بالکل ... لیکن پھر اس شرط کے ساتھ ہی میری بھی ایک شرط ہو گی ..."

"وہ کیا ...؟"

"اسی طرح۔ اپنے ان خوبصورت ہاتھوں سے کھلانا ہو گا"

ساتھ ہی بڑے معصوم، بڑے جذباتی انداز میں مسکرایا۔

"اس لیے کہ اگر کھاتے کھاتے جاں بحق ہو جاؤں تو کسی دُکھ یا افسوس کے بجائے اک حسین، مہربان اور مخلص دوست کے ہا انجام تک پہنچنے کی خوشی اور سعادت ملے"

"توبہ توبہ ... کیسے خود غرض ہیں ..." صاحباں شوخی سے ہنسی۔ اپنی اک ذرا سی خوشی اور سعادت کے حصول کے لیے مجھے تختۂ دار کے سپرد کر دیں گے ...؟"

وہ ایک بچے کی طرح باتوں میں محو کھانا کھائے جا رہا تھا اس لیے صاحباں بھی دانستہ اس بے معنی اور بلا مقصد گفتگو طول دیے جا رہی تھی۔

"ایسے خوبصورت قاتل کو تو دُنیا کا منصف سے منصف جج بھی تختۂ دار کے سپرد نہیں کر سکے گا ..."

"پھر کونسی سزا تجویز ہو گی ایسے قاتل کے لیے ...؟"

"سزا ...؟"

حارث اس کے خوبصورت، دلنشیں اور بے حد شگفتہ چہرے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے اور کچھ سوچتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے بولا "میرا خیال ہے۔ سزا بھی مقتول کو ہی ملنا چاہیئے ..."

"مقتول کو ہی ...؟"

صاحباں نے تعجب بھری سنجیدگی سے حارث کو دیکھا۔

"ہائے وہ کیوں ...؟"

"اس لیے کہ وہ ہلاک کیوں ہو گیا ...؟ ایسے ہاتھ تو زندگی بخشتے ہیں"

اس نے صاحباں کا نرم و نازک ہاتھ تھام کر سہلایا۔

"کیوں ان پر اس کا ایمان اور اس کا اعتماد پختہ نہ تھا جو جان سے گزر گیا ...؟"

"واہ واہ ... خوب فیصلہ ہے۔ بہت مناسب ...؟"

صاحباں زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دی "شکر ہے آپ کسی عدالت میں جج کے عہدے پر فائز نہیں ہیں۔ ورنہ ایسے ایسے ہی انصاف سے بھرپور فیصلے کرتے ...؟"

اس نے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے برتن سمیٹے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا ...؟"

"آپ کھانا کھا چکے۔ اب آپ کے لیے چائے لے آؤں ...؟"

"میں کھانا کھا چکا ...؟"

"جی ہاں ..." صاحباں کی ہنسی چھوٹ پڑی۔

"آپ کو نہیں معلوم کیا ...؟"

"مجھے پتہ ہی نہیں چلا ...؟"

"کیا ابھی اور بھوک ہے ...؟"

"نہیں ... بھوک بھی نہیں ہے ..."

اور وہ بھی زور سے ہنس پڑا۔

"عجیب ہوں میں بھی ..."

"عجیب ہی نہیں بلکہ عجیب و غریب کہیئے"

صاحباں نے اس کا فقرہ دہرایا۔

"ہاں ... عجیب و غریب ..." حارث نے بڑی سعادت مندی سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی "یا میرا خیال ہے عجیب ہٹا دیں۔ خالی غریب ہی رہنے دیں ..."

صاحباں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"بس یہ تہیہ یاد کریں۔ کیسا غریب ہوں میں ..."

"کیسا غریب ہوں میں ...؟"

حارث نے چونک کر صاحباں کی طرف دیکھا۔

"ہاں ... کیا ... غریب نہیں رہیں ...؟"

"غریب ...؟"

"ہاں ہاں ... کیا آپ بنتے ہوئے غریب نہیں ہیں ...؟"

"یہ تم ... کیا کہہ رہی ہو ...؟"

"آپ نہیں سمجھ سکیں گے ..."

صاحباں مسکراتے ہوئے برتن لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔ چائے لے کر واپس آئی تو حارث سر جھکائے سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔

"گرما گرم چائے ..."

صاحباں کی آواز پر وہ چونک کر مسکرا دیا۔

"بڑی شریر ہو ..."

"کیوں ... ؟ کیا ہوا ...؟"

"میرے کاغذات دیکھے تھے نا ...؟"

سنجیدگی بھرے تحکم سے اس نے استفسار کیا۔ جواب میں صاحباں کی زبان تو خاموش رہی مگر سر جُھک گیا۔

"مطلب یہ کہ دیکھے ہیں ..."

اس کی سنجیدگی سے صاحباں قدرے گھبرا گئی۔

"ہاں ... لیکن ... دانستہ نہیں ... میز کی صفائی کرتے ہوئے اچانک ہاتھ لگ گئے تھے ... معاف کر دیں ..."

"معافی کس بات کی ...؟"

"وہ ... وہ آپ کے راز ..." وہ ہکلائی۔

"کھُل گئے ..."

"جی ہاں ..."

"تو کیا محسوس ہوا ...؟"

حارث بڑے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"بہت غصہ آیا ..."

"میں پہلے ہی جانتا تھا۔ تم ایسے اسٹینڈرڈ والے لوگ یہ سب کچھ کبھی پسند نہیں کر سکتے ..."

"میں نے ناپسندیدگی کا کب اظہار کیا ہے ...؟"

"غصے کا مطلب ناپسندیدگی ہی ہوا نا ...؟"

"میرے غصے کا مطلب ناپسندیدگی نہیں تھا بلکہ بے اعتمادی تھا"

"بے اعتمادی ...؟"

"جی ہاں ... وہی بے اعتمادی جو آپ نے مجھ پر کی ... مجھ سے اتنا عرصہ چھپایا کیوں ... کیا میں ایسی بُری تھی کہ کسی کی نیکی کو بُرا جانتی ..."

"اوہ ...!" حارث کے چہرے پر اطمینان و مسرت کی لہریں پھیل گئیں ...

"تو گویا ہمارے ستارے پوری طرح مل گئے ہیں ..." وہ مسکراتے ہوئے بولا "یعنی کہ ہر حال میں، ہر انداز میں اور ہر روپ میں، میں تمہیں قابلِ قبول ہوں"

وہ ایجاب و قبول تک آ گیا تھا اور بی بی ... بی بی انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھیں بیچاری ...!!

"ہائے میری بی بی...؟" صاحباں چونکی "وہ تو کھڑی کھڑی سوکھ کر کانٹا ہو چکی ہوں گی... میں اپنی ماں کو اتنا دکھ دیتی۔ اللہ میاں مجھے معاف کر دینا...؟"

دونوں کانوں کو دونوں ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے وہ یکایک ہی کھڑی ہوئی اور حارث نگاہوں سے اوجھل ہو جانے، اس حسین و نازک پیکر کو من کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"شرجانہ! سو گئیں کیا۔؟"

"ارے!" وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی اونگھتی آنکھوں کو زور زور سے مسلنے لگی۔

"آج تو آپ نے بہت دیر کر دی چھوٹی بی بی۔!"

نگاہوں میں بھرپور پسندیدگی اور ستائش لئے وہ صاحباں کو دیکھنے لگی۔

"وہ۔ وہ۔ میں دراصل۔"

صاحباں بتانے کیا کہنا چاہتی تھی مگر صرف ہکلا کر رہ گئی "دیکھیئے چھوٹی بی بی۔ میرے سامنے بہانے وغیرہ بنانے کی کوشش نہیں کریں" چارپائی پر سے اٹھتے اٹھتے شرجانہ نے صاحباں کو پھر اک نظر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اپنی سالگرہ والے دن اس نے جو لباس، جو زیورات پہنے تھے اور جیسا میک اپ کیا تھا اسی حلیئے میں وہ آج بھی تھی مگر..

اس دن سے کہیں مختلف لگ رہی تھی۔ ان پچھلے چند دنوں میں ہی اس کے چہرے پر حارث کی محبتوں اور چاہتوں نے جو سنگھار کیا تھا وہ اسے کوئی ماورائی مخلوق بنائے دے رہا تھا۔

"آپ بہت خوبصورت ہیں چھوٹی بی بی! اس لباس، ان زیورات اور اس رنگ روپ میں میری نگاہ آپ پر سے نہیں ہٹ رہی تو چھوٹے صاحب کا کیا حال نہیں ہوا ہوگا۔"

"نہیں شرجانہ" صاحباں بری طرح شرما گئیں

"نہیں شرجانہ! دراصل دیر یوں ہوئی کہ... کہ۔"

بات شاید ابھی بھی اس سے نہیں بن رہی تھی۔

"چھوڑیئے۔ آپ کس کے سامنے صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں میں ان سب منزلوں سے گزر چکی ہوں چھوٹی بی بی! سب کچھ جانتی ہوں۔"

"تو پھر تو بھی مجھ سے ایسے سوال نہ کیا کر کہ جن کا جواب مجھ سے نہ بن پڑے اور پھر مجھے بہانے ڈھونڈنا پڑیں، بغلیں جھانکنا پڑیں جھوٹ گھڑنا پڑیں" صاحباں اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اک دلآویز تبسم کے ساتھ بولی۔

"ادھر میرے کپڑے دے جلدی سے۔"

"اب جلدی پڑ گئی ہے۔" شرجانہ نے مسکرا کر صاحباں کا اک سادہ سا روزمرہ والا لباس کھونٹی پر سے اُتارا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ "لیں۔ آپ جلدی جلدی پہنیں اور میں اُدھر جا کر دیکھوں کہ بیگم صاحبہ کدھر ہیں۔ مجھے واپس آنے میں دیر لگے تو آپ پچھلی طرف سے اپنے کمرے میں چلی جایئے گا۔"

"چپکے سے کیوں؟ بی بی کو بھلا علم نہیں کہ میں ادھر گئی ہوئی تھی۔ حارث کے گھر۔"

"مگر ان کے سامنے اس حلیئے میں تو نہیں گئی تھیں۔"

شرجانہ نے صاحباں کے چہرے پر بکھرے معصوم سے مختلف رنگوں کو بڑے غور سے دیکھا۔

"کپڑے تو میں ابھی بدل لیتی ہوں۔"

"اور یہ زیورات اور یہ سنگھار۔"

"یہ بھی یہیں اتار لوں گی۔ اور منہ بھی دھو لوں گی۔"

"مگر آپ کے چہرے پر، آپ کے ہونٹوں پر اور آپ کی آنکھوں میں جو چھوٹے صاحب کی محبت اور پیار نے میک اپ کیا ہے وہ کیسے چھڑائیں گی۔"

"دیکھ۔ دیکھ... تو پھر بکواس کرنے لگی۔"

اک عجیب سی شرمیلی مسکراہٹ اور ادا کے ساتھ صاحباں نے گردن جھکا لی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں چھوٹی بی بی!"

شرجانہ اپنی عادت کے خلاف بے حد سنجیدہ تھی۔

"اس وقت بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے سیدھی بس اپنے کمرے میں ہی جائیں۔ اس وقت کسی اور کو نہیں ملیں۔ آپکا چہرہ سارے راز کھول رہا ہے۔"

شرجانہ یہ کہتے کہتے کمرے سے باہر نکلنے لگی تو صاحباں گھبرا کر بے اختیار اسے پکار اُٹھی۔

"شرجانہ! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم میرے ساتھ ہی ادھر جانا۔"

"اور جب اتنی رات گئے، ایسی تاریکی میں، اس پگڈنڈی پر بھاگی پھرتی ہیں تو اس وقت ڈر نہیں لگتا۔"

"دیکھ شرجانہ! کم از کم تو مجھے طعنے نہ دیا کر۔"

"ارے نہیں۔ میں طعنہ تو کبھی نہیں دیتی چھوٹی بی بی! بھلا ایسی جرأت کر سکتی ہوں۔ میں تو بس آپ کو ہنسانے بہلانے کیلئے شرارت کرتی ہوں صرف۔"

"اچھا پھر تم باہر نہیں جاؤ۔"

"لیکن آپ نے کپڑے بدلنا ہیں۔"

"ایسا کرو۔ بتی گل کر دو اور خود یہیں رہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

صاحباں کے حکم کے مطابق شرجانہ نے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی اور بتی گل کر دی۔

"تمہارا کبیر خاں کہاں ہے۔؟"

تھوڑی سی خاموشی کے بعد صاحباں نے لباس تبدیل کرتے ہوئے شرجانہ سے پوچھا۔

"باورچی خانے کے کسی کونے میں دبکا پڑا ہوگا۔"

"ہائے! میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف دیتی ہوں۔"

"تکلیف کا ہے کی چھوٹی بی بی! یہ تو بڑی چھوٹی بات ہے۔ ہم دونوں تو آپ کے لئے جان بھی دینے کو تیار ہیں۔"

"مجھے تو کبیر خاں سے شرم آتی ہے.. وہ کیا کہتا ہوگا۔"

"بالکل کچھ نہیں۔ سچ جانیں چھوٹی بی بی! وہ تو مجھ سے بھی زیادہ آپکی ہر قسم کی مدد کرنے کو تیار رہتا ہے۔"

"کیا تم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔؟"

"ارے چھوٹی بی بی! آپ شاید ابھی عشق کی اس منزل تک نہیں پہنچیں.. ہم بظاہر دیکھنے میں دو نظر آتے ہیں لیکن..."

آگے جانے شرجانہ نے کیا کہا تھا۔ صاحباں کے کان کھلے تھے مگر سن کچھ نہیں رہی تھی وہ اپنی ہی سوچ کی لہریں ڈوب چکی تھی۔

"کہتی ہے عشق کی اس منزل تک نہیں پہنچی۔ اری پگلی! تم کیا جانو میں کہاں ہوں۔ میرا تو شاید وجود ہی کوئی نہیں رہا اب۔"

"چھوٹی بی بی! یہ آپ ایکدم خاموش کیوں ہو گئیں۔ جواب ہی نہیں دے رہیں کسی بات کا۔؟"

"ہوں۔؟" شرجانہ کی بلند آواز پر صاحباں چونکی۔

"کپڑے بدل لئے۔؟ بتی جلا دوں۔؟"

"ہاں.... ہاں جلا دو۔"

شرجانہ نے بتی جلائی تو ایکدم حیرت کے مارے چلا پڑی۔

"ارے! آپ نے کپڑے کیوں نہیں بدلے...... ؟ اسی طرح کھڑی ہیں۔"

"بدلے تھے۔" صاحباں حیرت سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

"ارے یہ کیا ہو گیا۔؟"

پھر وہ خوفزدہ سی ہو کر یکایک چیخ پڑی۔

"شرجانہ! تمہارے کوارٹر میں یقیناً کوئی آسیب ہے۔ ایمان سے میں نے کپڑے تبدیل کئے تھے۔"

"میرے کوارٹر میں آسیب نہیں ہے چھوٹی بی بی! یہ محبت کا آسیب ہے جو آپ کو چمٹ گیا ہے۔"

"کیا بکواس کیے جا رہی ہو، میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے کپڑے بدلے تھے۔ تم یقین کیوں نہیں کرتیں۔؟"

"تو پھر چھوٹی بی بی! آپ عشق کی اس منزل تک پہنچ چکی ہیں کہ جب دوسرے میں کھو کر انسان خود کو بھول جاتا ہے۔ چھوٹے صاحب کے خیال میں کھوئے کھوئے آپ نے جو تبدیل کرنے کیلئے کپڑے اتارے وہی پھر پہن لئے۔"

"اوہ...!" صاحباں شرمندہ سی ہو کر رحم طلب نگاہوں سے شرجانہ کو دیکھنے لگی۔

"کوئی بات نہیں میں پھر بتی بجھا دیتی ہوں۔ اور اب آپ کے قریب رہوں گی۔ آپ کو یہ پہننے والے پکڑاتی جاؤں گی اور آپ جو اتاریں گی کر علیحدہ رکھتی جاؤں گی۔"

"لو۔ اب تم نے بالکل ہی مجھے بچی بنا دیا۔ لباس بھی تمہاری مدد کے بغیر نہیں بدل سکتی۔"

صاحباں کے چہرے پر خجل سی ہنسی تھی۔ پھر اس نے سر جھٹکا۔

"تمہارا خیال ہے میں پھر وہی غلطی کر بیٹھوں گی۔"

"صرف ایک بار اور۔؟"

شرجانہ سنجیدگی بھرے وثوق کے ساتھ بولی۔

"آپ کی کیفیت تو یہ بتا رہی ہے کہ دوبارہ تو کیا، تیسری بار، چوتھی بار، نجانے کتنی بار یہ غلطی کریں گی اور یوں پوری رات بھی گزر جائے بے شک۔ منظور ہے سب۔ مگر ادھر سے بیگم صاحبہ کا ڈر ہے۔ کبھی آپ کو دیکھتی، ڈھونڈتی پھریں اور کبیر خاں کو باورچی خانے میں پائیں تو ادھر ہی چلی آئیں"

"اوہ...! تب تو ماری جاؤں گی۔"

صاحباں کی گھبراہٹ قابل دید تھی۔

"جلدی سے بتی بجھا دو۔ اب شرجانہ! تم مجھے بچی ہی سمجھ لو تو بہتر ہے۔ مجھے تو اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہا۔"

شرجانہ نے ہنستے ہوئے بتی گل کی اور صاحباں کے کپڑے لے کر اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"چھوٹی بی بی، پھر آج کا دن کیسا گزرا۔؟"

"دن کیسا گزرا...؟"

شرجانہ کا سوال دہرانے کے بعد صاحباں خاموش ہو گئی۔ اور جب کئی لمحے اس خاموشی کی نذر ہو گئے تو شرجانہ عجلت سے اور قدرے گھبرا کر بولی۔

"ارے کیا ہوا چھوٹی بی بی! آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں۔؟"

"تم نے پوچھا ہے کہ آج کا دن کیسا گزرا۔" صاحباں نے ایک طویل سانس لیا۔ "کیا بتاؤں...؟ کیسے بتاؤں۔؟" وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ "میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے شرجانہ! کوشش کروں بھی تو کچھ نہیں بتا سکتی... کچھ نہیں۔"

"اور ادھر آج بیگم صاحبہ کا موڈ کچھ بدلا ہوا ہے چھوٹی بی بی۔!" شرجانہ نے دبی دبی سی سرگوشی میں کہا۔

"کیا...؟ بی بی کا موڈ...؟"

"ہاں...؟"

"کیوں...؟"

"وہ لمبے لمبے دریچوں والے گھر میں رہتی ہیں نا...؟ کیا نام ہے ان کا...؟"

"بیگم خالق...!"

"ہاں... وہ آئی ہوئی تھیں۔"

"تو ان کی آمد سے بی بی کے موڈ کا کیا تعلق۔؟"

"آمد سے نہیں ان کی باتوں سے بی بی کے موڈ کا گہرا تعلق ہے۔"

"ان کی باتوں سے..؟ کیا مطلب...؟ کیسی باتیں انہوں نے میری بی بی کے ساتھ کی تھیں۔؟"

"آپ کے روز روز چھوٹے صاحب کے گھر جانے کے متعلق باتیں تھیں۔"

"کیوں... اس معاملے سے ان کا کیا تعلق... کیا واسطہ۔؟"

"اڑوس پڑوس والوں کا بہت تعلق، بہت واسطہ ہوتا ہے چھوٹی بی بی۔!"

"ہم نے تو کبھی کسی دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیا۔ نہ کبھی کوئی تعلق یا واسطہ رکھا ہے۔"

"یہ آپ کی سمجھ ہے نا۔ لیکن اکثر لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ ان کی فطرت عیب جوئی کرنے والی ہوتی ہے۔ بعض وقت تو کوئی عیب نہ بھی ہو لوگ تب بھی باتیں بنا لیا کرتے ہیں۔"

"اب کیا بات بنی ہے۔؟"

"آپ چھوٹی بی بی! ادھر چھوٹے صاحب کے گھر جانا ذرا کم کر دیں۔" شرجانہ دبے دبے سے لہجے اور نصیحت آمیز انداز میں بولی۔ "یہیں باتیں اور نہ بڑھ جائیں، اور نہ پھیل جائیں۔"

"جانا کم کر دوں...؟ نہیں شرجانہ! یہ نہیں ہو سکتا۔ باتیں بنیں، بہت بنیں، بہت پھیلیں۔" صاحباں نے پرعزم آواز میں کہا۔ "یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا، کسی طور نہیں..."

"لیکن چھوٹی بی بی!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں شرجانہ! میری ساری محنت اکارت جائیگی میں نے اپنی ہستی مٹا دی ہے اور اب... اب آج تم یہ کہتی ہو۔"

"لیکن چھوٹی بی بی! میری بھی تو سنیے۔"

"تمہاری کیا سنوں؟ تم خود سوچو میں اگر وہاں نہ جاؤں تو وہ... وہ کیا کریں گے۔"

"جو پہلے کیا کرتے تھے۔"

"پہلے کی بات اور تھی.. پہلے ان کی زندگی میں میں نہیں تھی۔ نہ انہیں میری عادت تھی۔ اور اب... اب اگر انکی زندگی سے میں نکل گئی تو شرجانہ! بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ سب کچھ غلط ہو جائیگا۔"

"تو پھر سچی بات آپ کو بتاؤں..؟"

باتوں کے دوران صاحباں لباس تبدیل کر چکی تھی، شرجانہ نے بڑھ کر بتی جلا دی۔

"کیا۔؟ وہ بھی بتا دو..." صاحباں قدرے ناراضگی سے بولی۔ شرجانہ تو اس کی ہمراز تھی اور وہی ایسے مشورے دے رہی تھی جو کسی بھی انداز میں اور کسی بھی لحاظ سے قابل قبول نہ تھے۔

"بات صرف پڑوسیوں کی نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ بہت پریشان ہیں۔"

"بی بی بہت پریشان ہیں...؟ وہ کیوں..؟"

اب صاحباں کے پورے حواس بیدار ہوئے۔

"آپ کے لئے۔ بیگم صاحبہ آپ کی طرف سے پریشان ہیں۔"

"میری طرف سے کیسی پریشانی۔؟" صاحباں بوکھلائی گھبرائی جا رہی تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خود ہی تو بی بی نے اسے حارث کے پاس بھیجا تھا۔ اور اب پریشانی کیسی بھلا۔؟

"بتاؤ نا شرجانہ! چپ کیوں ہو گئیں.. آخر بی بی یکایک میرے لئے کیوں پریشان ہونے لگی ہیں۔؟"

"اسلئے کہ آپ جوان ہیں اور آپ، بہت خوبصورت ہیں۔"

"کیا...؟ کیا...؟" صاحباں نے ایک واضح سی حیرت، اور اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"یہ کیا بک رہی ہو...؟"

"دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً بارہ گھنٹے آپ گھر سے باہر آپ نامحرم کے ساتھ گزارتی ہیں۔"

"کیا۔؟" اور اب صاحباں بے اختیار ہو کر چیخ پڑی.. یہ شرجانہ آج کس قسم کی باتیں کر رہی تھی، اس کا دماغ الٹ پلٹ ہوا جا رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو شرجانہ...؟ کیا کہہ رہی ہو..؟"

"میں نہیں کہہ رہی چھوٹی بی بی! یہ میری زبان نہیں ہے۔" شرجانہ نظریں جھکاتے ہوئے بڑبڑائی۔

"تو کیا میری بی بی... میری بی بی... نہیں شرجانہ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ کبھی نہیں شرجانہ! کبھی نہیں۔"

"مگر چھوٹی بی بی! دوسرے لوگ تو ان کے دل میں ایسے ایسے شکوک ڈال ہی سکتے ہیں۔ پچھلے کئی دنوں سے کبھی کوئی پڑوسن انکے پاس آ رہی ہے اور کبھی کوئی.. وہ بھی کب تک کان بند کریں۔"

"اوہ...! یہ تو میں بھولی ہی رہی کہ اس دنیا میں میرے، حارث اور بی بی کے علاوہ اور بھی لوگ بستے ہیں۔"

صاحباں شرجانہ کی چارپائی پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"اور... اور لوگوں نے چھوٹی بی بی! بہت کچھ بیگم صاحبہ سے کہا ہے۔ بہت نازیبا قسم کی باتیں کی ہیں۔"

"تو...؟" صاحباں نے سر اٹھایا۔ خوبصورت آنکھوں میں نمی پھیلی ہوئی تھی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ سچ تو ہے۔ میری بی بی کو دوسروں کے سامنے کتنی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہوگی۔ یہ میں نے سوچا کیوں نہیں۔؟" وہ بڑی نادم سی، شرمسار سی اور پریشان سی شرجانہ کو دیکھ رہی تھی۔ اور شرجانہ جھکی ہوئی بڑی احتیاط سے صاحباں کا

اترا ہوا زرق برق لباس تہہ کر رہی تھی۔

"چلیئے اپنے کمرے میں۔"

شرجانہ نے تہہ کیا ہوا لباس اسی احتیاط اور محبت کے ساتھ ہاتھوں پر اٹھاتے ہوئے صاحباں کے یکایک غمزدہ ہو جانے والے چہرے اور ٹوٹے پھوٹے وجود کی طرف دیکھا۔

"بہت دیر ہو رہی ہے۔"

صاحباں چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی اور شرجانہ کے پیچھے پیچھے گردن جھکائے چل پڑی۔

"میں نے اسی لئے پہلے بات نہیں کی تھی۔"

صاحباں اب بھی خاموش رہی۔ پچھلی طرف سے ہو کر دونوں کمرے میں پہنچیں تو۔۔۔ بی بی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ بات خلاف معمول تھی۔ صاحباں چونکی۔

"شرجانہ! کیا بی بی آج اتنی جلد سو گئیں۔۔؟"

"آپ سے پہلے سویا تو نہیں کرتیں۔ آج معلوم نہیں کیا ہو گیا۔؟"

"لگتا ہے مجھ سے بہت ناراض ہیں۔" صاحباں تھکا تھکا سا سانس لیتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی اور شرجانہ وارڈروب میں اس کے کپڑے رکھنے لگی۔

"یہ تو بہت بری بات ہو گئی۔ میں بی بی کو اب کیسے منہ دکھاؤں گی۔" صاحباں نے بڑبڑاتے ہوئے کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائیں اور پھر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"مجھے تو رونا آ رہا ہے۔ اللہ میاں میں مر ہی جاؤں تو اچھا ہے۔"

آنکھیں بھیگی جا رہی تھیں۔

"جو کام بھی اپنے خیال سے ٹھیک کرتی ہوں غلط ہو جاتا ہے۔ میری نیت نیک تھی لیکن دامن میں ذلتیں اور رسوائیاں پڑنے لگیں۔"

وہ بے حد دکھی ہو کر بڑبڑائے جا رہی تھی۔ شرجانہ کو اس پر بہت ترس آیا۔ بھولی بھالی اس کی چھوٹی بی بی! عاجز اور حلیم سی۔ مزاج میں ذرا غرور اور تکبر نہ تھا۔ خود اسے کبھی ملازمہ نہیں سمجھتی تھی بلکہ ہمیشہ ایک سہیلی کا سا درجہ دیا۔ بی بی کا ہر دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی کوشش کرتی تھی۔ حارث کی بیماری کو اس نے اپنی بیماری سمجھ لیا تھا۔ بغرض ہر ممکن طریقے سے دوسروں کے کام آنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ کچھ ایسا دردمندانہ دل سینے میں تھا۔

اور آج۔۔۔ آج انہی نیکیوں کی بدولت ذلیل و رسوا ہو کر دکھی ہو رہی تھی۔ شرجانہ کا دل اس کے لئے تڑپ سا اٹھا۔

"دیکھئے چھوٹی بی بی! باتیں کرنے والوں کو تو ماریئے گولی۔ پیٹھ پیچھے تو بادشاہوں کے بھی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ اپنا دل برا نہ کریں۔" شرجانہ قریب آ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں ہے۔ بی بی کا خیال آ رہا ہے۔ میری وجہ سے انہیں دکھ پہنچا۔"

"آپ بھی تو یہ سب کچھ انہی کی وجہ سے کر رہی ہیں۔۔۔"

"لیکن انکے سکھ کیلئے نا۔ ان کی خوشی کے لئے نا۔ اور اگر وہی سکھ اور خوشی دکھ بن جائے۔ ذلت و رسوائی بن جائے۔؟"

"نہیں بنتا۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی نیت نیک ہے۔ آپ نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ نہیں کیا نا۔"

"نہیں۔۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ کر ہی نہیں سکتی۔"

"تو پھر پریشان بھی نہ ہوں۔"

اور پھر یوں تسلی دلاسے دینے کے بعد شرجانہ نے اس کا موڈ بدلنے کی خاطر موضوع ہی بدل دیا۔

"آپ یہ تو بتایئے کہ آپ کے مریض کا اب کیا حال ہے۔؟"

"میرے مریض کا۔۔۔؟"

چند لمحات پہلے جو چہرہ ندامتوں، پریشانیوں اور دکھوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ حارث کا ذکر آتے ہی اس پر رنگ سے دوڑنے لگے۔ اس پر سکون و مسرت کے سائے سے لہرانے لگے۔ ساتھ ہی آنکھوں میں کہکشاں سی اتر آئی۔

"بہت اچھا شرجانہ! اب حارث تقریباً ٹھیک ہیں۔ پندرہ بیس دن سے انہیں کوئی دورہ نہیں پڑا۔"

"اب تو کھانا ٹھیک طرح کھاتے ہیں۔؟"

"بالکل۔۔۔ کبھی ان کی صحت دیکھو۔"

پھر یکایک صاحباں چونکی۔

"شرجانہ! کہیں بی بی کو معلوم تو نہیں ہو گیا کہ وہ جو کچھ حارث کے لئے پکاتی ہیں وہ اس تک نہیں پہنچتا اور سیدھا تمہارے کوارٹر میں چلا جاتا ہے۔"

"نہیں۔"

"ذرا سا شک بھی نہیں پڑا۔۔۔۔؟"

"ارے چھوٹی بی بی! جو راز میرے اور کبیر خاں کے سینوں میں ہو گا وہ ہماری جانوں کے ساتھ ہی جائیگا۔ ہم پٹھان لوگ جو دوستیاں اور محبتیں نبھایا کرتے ہیں تو خود ختم ہو جایا کرتے ہیں لیکن۔"

"اچھا۔۔۔۔ اچھا۔۔" صاحباں نے پیار سے شرجانہ کے رخسار پر تھپکی دی۔

"مجھے یقین ہے سب۔۔۔ اعتبار ہے تم پر اپنے سے بھی زیادہ۔۔"

"ویسے سچ کہتی ہوں چھوٹی بی بی۔" شرجانہ نے اک ہلکا سا دبا دبا قہقہہ لگایا۔ "بیگم صاحبہ چھوٹے صاحب کے لئے جو کھانا بناتی ہیں، اتنا مزے کا ہوتا ہے۔ اتنا مزے کا کہ ہم دونوں میاں بیوی انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔"

پھر وہ قدرے سنجیدہ ہو گئی۔

"چھوٹے صاحب اس معاملے میں بڑے بے نصیب ہیں جو ایسا کھانا۔۔۔"

"ہائے ہائے۔۔" صاحباں نے ایکدم اس کی بات کاٹ دی۔ "یوں تو نہ کہو۔ ان کے دشمن بے نصیب ہوں۔"

"اوہ۔ بھول گئی کہ اک محبوبہ کے سامنے اس کے محبوب کو۔۔۔"

"دہت۔۔" صاحباں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی زبان نہیں بولو۔۔۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

"اور جب سارا دن ان کے پاس گزارتی ہیں۔۔۔ اکیلے میں، تنہائی میں۔۔ تب شرم نہیں آتی۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ ایمان سے۔۔۔ بالکل نہیں آتی۔۔"

"عجیب بات ہے۔ میں جب اپنے کبیر خاں سے ملنے جایا کرتی تھی تو۔ تو اس کی باتوں سے مجھے تو بڑی شرم آیا کرتی تھی۔"

"تم دونوں باتیں جو، واہیات کرتے تھے۔"

"اوئی چھوٹی بی بی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، پیار کی باتیں، محبت کی باتیں واہیات ہوتی ہیں۔؟"

"اپنے اپنے انداز ہیں۔"

"کیا مطلب۔۔۔۔۔؟"

"حارث بے حد اچھے، بے حد نیک اور شریف انسان ہیں۔ ہم لوگوں نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔"

"اور وہ اس دن۔۔؟"

"بس وہ پہلی اور آخری بات تھی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔۔؟"

"اری پگلی سچے جذبوں کا اور انکی گہرائیوں کا اظہار اعمال و افعال سے ہوتا ہے۔ زبان سے تو انسان زمین آسمان کے قلابے ملا سکتا ہے۔۔۔ اور وہ جھوٹے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"آپ دونوں ایسی بات بھی کوئی نہیں کرتے پھر آپ گھنٹوں وہاں کیا کرتی رہتی ہیں۔۔۔؟" شرجانہ حیرت سے صاحباں کو تک رہی تھی۔ اس کی فہم سے بالاتر تھیں یہ سب باتیں۔

"وہاں میں گھنٹوں کیا کرتی رہتی ہوں۔؟" صاحباں مسکرائی۔

"کام۔۔۔ اور بس کام۔۔"

"اور چھوٹے صاحب۔۔۔؟"

"وہ کیا ہر وقت وہاں موجود ہوتے ہیں۔ آدھے سے زیادہ دن تو انکا دفتر میں گزر جاتا ہے۔"

"اور باقی وقت۔۔۔؟" شرجانہ نے ہنس کر دیدے گھمائے۔

"باقی ذرا حساب دیجئے نا۔ قسم ہے آپ کو جو آپ نے بیچ میں سے ایک منٹ کا بھی گھپلا کیا۔۔"

"نہیں مجھ پر یقین ہے نا کہ میں جھوٹ نہیں بولتی۔۔؟"

"بیگم صاحبہ اور چھوٹے صاحب والے معاملے کو چھوڑ کر باقی یقین ہے۔"

"اللہ میاں مجھے معاف کر دے۔۔"

بڑی معصومیت سے صاحباں اپنے کانوں کو پکڑ کر کھینچنے لگی۔

"اس جھوٹ نے میرا اعمالنامہ بہت سیاہ کیا ہے۔"

"کوئی نہیں سیاہ کیا.. آپ نے نیکی کی خاطر کیا ہے، جو کچھ کیا ہے.. خدا بھی جانتا ہے.."

"ہاں... یہ درست ہے۔ میری نیت کو تو خدا بھی جانتا ہے۔"

"تو پھر... وہ بات بیچ میں ہی رہ گئی.."

"کونسی...؟"

"آپ کے وقت کا حساب لے رہی تھی۔"

"تو سنو میں وہاں سارا دن کیا کرتی ہوں۔؟"

"سنائیے..." شرجانہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹیک کر سنجیدہ ہوتے ہوتے سننے کا پوز بنا بیٹھی۔

"میں کوئی کہانی تو نہیں سنانے لگی۔"

"کسی کہانی سے زیادہ ہی دلچسپ ہوگا سب کچھ۔"

"کیوں...؟ وہ کیوں۔؟"

"اس لئے کہ یہ والی ہیروئن بھی بہت خوبصورت ہے اور ہیرو بھی بڑا بانکا چھبیلا ہے۔"

"تمہیں کیا پتہ وہ کیسے ہیں؟" صاحباں کے چہرے پر سرخیاں ہی سرخیاں پھیل گئیں۔

"اب تو میں انہیں روز ہی آتے جاتے دیکھتی ہوں۔"

"کیوں دیکھتی ہو۔؟"

"کیا صرف آپ ہی کا حق ہے انہیں دیکھنے کا...؟"

"بے حیا تو بیاہی ہوئی ہے۔ تجھے اک غیر مرد کو دیکھتے شرم نہیں آتی۔؟"

"شرم کی کیا بات ہے...؟ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

"اپنے کبیرے کے ساتھ اچھی وفا نبھاتی ہو۔"

"اسے میں قربان ہو جاؤں اپنے کبیر خان پر سے.. اس جیسا کوئی اور ہو سکتا ہے۔" شرجانہ بڑے جذبے کے ساتھ سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "رہا معاملہ چھوٹے صاحب کو دیکھنے کا تو وہ تو میں انہیں بیگم صاحبہ کے تعلق کی وجہ سے اپنے مالک کی نظر سے دیکھتی ہوں اور آپ کے حساب سے ایک۔" شرجانہ دزدیدہ نگاہوں سے صاحباں کو دیکھتے ہوئے خاموش ہوگئی۔

"ہاں۔ میرے حساب سے کیا۔؟"

"ایک سالی کی نظر سے دیکھتی ہوں۔"

"بدتمیز بے حیا پھر اتبسم صاحباں کے ہونٹوں پر کھیل گیا۔" اپنے آپ ہی سارے رشتے ناطے جوڑ کر بیٹھ گئی۔"

"سچ چھوٹی بی بی...!" شرجانہ کھسک کر اور بھی اس کے قریب ہوگئی۔ "آپ کی اور حارث میاں کی جوڑی ایکدم فرسٹ کلاس ہے۔"

"شرجانہ...!" صاحباں یکایک افسردہ ہوگئی۔ "جوڑی کی بات نہ کر۔ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔"

"ہائیں چھوٹی بی بی! محبت بھی کرتی ہو اور شادی کے متعلق بھی کبھی نہیں سوچا۔" شرجانہ نے حیرت سے پھیلی پھیلی آنکھیں صاحباں کے پژمردہ چہرے پر گاڑ دیں۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں...؟ کیا واقعی آپ دونوں میں اس معاملے پر کبھی بات نہیں ہوئی...؟"

"نہیں..."

"نہیں...؟" شرجانہ کی آنکھیں مزید پھیل گئیں: "کیسے عجیب ہیں آپ دونوں۔ میرے اور کبیر خاں کے درمیان تو دوسری تیسری ملاقات میں ہی شادی کا اقرار ہو گیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے سر پہ ہاتھ رکھ رکھ کر قسمیں کھائی تھیں کہ شادی کریں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ ورنہ ساری زندگی کنوارے ہی گزار دیں گے۔ آپ بھی بس عجیب ہیں۔"

"میں بی بی کی منہ بولی بیٹی ہوں شرجانہ! اور حارث ان کا سگا بیٹا۔ میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"کیوں؟"

"بی بی نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے جانے کونسی اونچے سے اونچے خاندان والی لڑکی سوچ رکھی ہوگی۔ اور میں... میں..."

صاحباں نے ایکدم آنکھیں بھینچ کر گردن جھکالی۔

"میں ان کے قابل نہیں... میں اس عزت کے قابل نہیں۔"

"کیوں آپ کسی قابل نہیں۔؟ آپ تو..."

"چل چھوڑ اس بات کو..."

جانے کونسے دکھ تھے جو اس کی آنکھوں میں، اس کی آواز میں اتر آئے تھے۔ مگر شرجانہ نے نہ سمجھنے کی کوشش کی نہ اس موضوع کو چھوڑا۔

"چھوٹے صاحب نے بھی کبھی اس طرف اشارہ نہیں کیا...؟"

"ارے کس طرف...؟"

شرجانہ کی [illegible] اب صاحباں الجھنے لگی۔

"شادی بیاہ کے معاملے کی طرف۔"

"نہیں.."

"کبھی بھی نہیں...؟" وہ حیرت کے مارے مری جارہی تھی۔

"کئی بار مجھے محسوس ہوا ہے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر جانے کونسے کومپلکس ہیں انہیں کہ بات بدل دیتے ہیں۔" صاحباں ڈری ڈوبی سی، کھوئی کھوئی سی بولے گئی۔ "اچھا ہی ہے نا کل کلاں کو جب ان کی والدین سے صلح ہو جائے گی تو.. ہم دونوں ہی کسی عہد کسی اقرار کے پابند تو نہ ہوں گے۔"

"کیا مطلب...؟" شرجانہ تقریباً چلا سی پڑی۔

"میری بی بی اور میاں جی میرے مستقبل کا جو فیصلہ کریں گے میں وہی قبول کروں گی۔ کیا پتہ میں اپنے اماں بابا کے پاس ہی چلی جاؤں.."

"اور چھوٹے صاحب...؟"

"اصولاً کرنا تو انہیں بھی ایسا ہی چاہیئے.. اتنے عرصے بعد والدین سے میل ہوگا تو کیا جدائی کے دکھ انہوں نے کم اٹھائے ہیں جو اب حارث انہیں نافرمانی کا غم دیں گے۔ انہیں ماں باپ کا حکم ماننا چاہیئے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں چھوٹی بی بی۔؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں شرجانہ...!"

"پھر آپ کو ان سے محبت نہیں ہوگی جو اتنی آسانی سے جدائی کی بات کر دی۔"

"محبت... محبت..." صاحباں نے آنکھیں بھینچ کر تکیئے پر سر ٹکا دیا۔ "ایسی محبت تو شرجانہ! ہیر نے رانجھے سے، سوہنی نے مہینوال سے اور شیریں نے فرہاد سے بھی نہ کی ہوگی، جیسی میں نے کی ہے۔"

وہ آنکھیں میچے میچے ہولے ہولے بولتی رہی اور شرجانہ گم سم اسے دیکھتی رہی۔

"ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور شیریں فرہاد نے تو ایک دوسرے کے حسن اور ان کے جلوؤں کو دیکھ کر دلوں کے تبادلے کئے تھے مگر میں نے... میں نے شرجانہ ان کی بدمزاجی، ان کی بداخلاقی، ان کے دکھوں اور ان کے روگ کو اپنایا تھا۔"

صاحباں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر شرجانہ کے دونوں کندھے تھامتے ہوئے پروقار سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"آج میں تمہارے روبرو اعتراف کرتی ہوں کہ میں بظاہر نہ کرتی تھی مگر پہلے دن سے.. ہاں پہلے دن سے ہی... اوہ۔"

پھر یکایک صاحباں نے اس کے شانے چھوڑ دیئے۔

"اس اعتراف سے بھلا فائدہ بھی کیا.. چلو اٹھو جاؤ شرجانہ! بہت رات ہوگئی... تمہارا کبیر خاں بے آرام ہو رہا ہوگا۔"

"ہونے دیں۔" شرجانہ نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔ "اس وقت تو سوائے اپنی چھوٹی بی بی کے اور کسی کی جیسے اسے پرواہ نہ تھی۔ "مجھے تو آپ نے غم لگا دیا چھوٹی بی بی۔" وہ بڑے دکھ سے صاحباں کے چہرے کو تکنے لگی۔

"ارے کیسا غم...؟" صاحباں ہنس پڑی۔

"آپ کو ہنسی آرہی ہے اور مجھے..."

"اور مجھے رونا..." صاحباں نے اس کی بات مکمل کر دی۔ "بیوقوف۔"

"میں بیگم صاحبہ سے کل ہی بات کرتی ہوں۔"

"نہیں شرجانہ...!" صاحباں یکایک سنجیدہ ہوتے ہوئے انتہائی پرزور اور سخت لہجے میں بولی۔ "کہیں ایسی حماقت نہ کر بیٹھنا۔ بی بی کا مجھ پر جو اعتماد ہے وہ ٹوٹ کر بکھر گیا تو... تو میں تو کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔"

لیکن..."

صاحباں نے شرجانہ کی مزید کوئی بات سنی ہی نہیں۔

"یوں بھی بی بی کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ میں ان کا بدلہ انہیں کسی دکھ کی صورت میں نہیں دینا چاہتی۔"

"پھر کوئی تو راستہ ہونا چاہیئے چھوٹی بی بی..." اب شرجانہ بھی قدرے الجھ پڑی۔

"میری محبت بے غرض ہے شرجانہ! اس نے اپنی کامیابی کے لیئے کبھی کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بس اپنے سے واسطہ رکھا ہے"

"اپنے سے ہی واسطہ رکھا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے..؟"

"جو محبت کچھ طلب کرنے لگے وہ غرض بن جاتی ہے۔ میری محبت صرف محبت ہے۔ انجام کچھ بھی ہو۔ وصل یا جدائی میری محبت ہی رہے گی..... اور...؟"

صاحباں نے بستر پر لیٹ کر کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

"اب تم جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

شرجانہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

نیند کا تو صرف ایک بہانہ ہی تھا ورنہ آج تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ شرجانہ سے پتہ چلا تھا کہ اس کی بی بی ناراض تھیں۔ اس کی بی بی اس سے خفا تھیں۔ تبھی تو دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ اور سونے سے پہلے اس کے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔ اور حق بجانب تھیں ایسا کرنے پر۔ خود صاحباں ہی غلطی پر تھی۔

حارث کی محبت میں ڈوب کر وہ انہیں بالکل ہی بھلا بیٹھی تھی، کئی دن ہو گئے تھے اسے کوئی بات چیت کئے ہوئے۔ صبح جاگ کر نماز اور تلاوت سے فارغ ہوتے ہی اسے حارث کے ناشتہ کرنے کی پڑی ہوتی تھی۔ دفتر جانے کی وجہ سے وہ جلد ناشتہ کیا کرتا تھا۔ تین میل دور دفتر تھا اور وہ پیدل دفتر جاتا تھا۔ اسے تو اپنی کوئی پرواہ نہ تھی مگر صاحباں کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ ناشتہ کئے بغیر دفتر جائے۔ اسی جلدی میں وہ دور سے ہی بی بی کو صرف صبح بخیر ہی کہہ سکتی، اور ادھر بھاگ جاتی۔

اس وقت کی حارث کے گھر گئی وہ دوپہر کو واپس آتی، وہ بھی حارث کا کھانا لینے۔ جو بی بی تیار کرتی تھیں اور جو حارث تک نہیں پہنچا پھر سہ پہر کو آتی۔ اکثر بی بی ظہر کی نماز میں مصروف ہوتیں۔ صاحباں اپنے کمرے میں چلی جاتی، خود نماز پڑھتی پھر تھوڑی دیر کے لئے آرام کی غرض سے بستر پر لیٹ جاتی۔

یہ چند منٹوں کے آرام کی فرض بھی اس کی اپنی نہ ہوتی، حارث ہی کے خیال سے رک جاتی۔ دفتر میں اتنی محنت کرتا تھا اس کیلئے اسے بھی تھوڑا سا آرام بہت ضروری تھا۔ بستر پر پڑی اس کے خیالوں میں کھوئی رہتی، اس کی سوچوں میں ڈوبی کبھی مسکراتی رہتی، کبھی خود بخود شرماتی پڑتی اور کبھی بڑی سنجیدہ ہو کر گم سم سی پڑی رہتی۔

اس کے دل و دماغ، تن من اور ہوش و حواس میں وہی وہ لبا ہوا تھا تو کسی اور کا خیال کیسے آتا۔ عصر کی نماز کے لئے بی بی وضو کرنے خانے سے نکلتیں تو ان کے قدموں کی آہٹ اسے بھی ہوشیار کر دیتی، وہ بھی اٹھ پڑتی۔ جلدی جلدی وضو کرتی اور مصلّے پر جا کھڑی ہوتی۔ اس وقت بھی حارث ہی کا خیال آتا رہتا۔ اب تو وہ نماز بھی بہت جلد پڑھ لیتی تھی۔ اتنی کہ خود فارغ ہو کر بی بی کے کمرے میں جھانکتی تو وہ ابھی پڑھ رہی ہوتیں، بی بی نماز میں بہت وقت لگاتی تھیں، یہ احساس پہلے صاحباں کو کبھی نہ ہوا تھا۔

اب خود اسے ہر وقت اور ہر کام میں جلدی پڑی رہتی تھی اور ایسی ہی توقع دوسروں سے کرنے لگی تھی۔

عصر کی نماز کے بعد حارث چائے پیا کرتا تھا اور بی بی کی عصر کی مختصر سی نماز بھی نجانے کیسے اتنی طویل ہو جایا کرتی تھی۔ تب وہ سا نماز ختم ہونے کا انتظار کرکے اور کبھی صرف شرجانہ ہی کو بتا کر ادھر چلی جاتی۔ پھر رات کے کھانے کے لئے بھی بھاگی آتی اور شرجانہ کے کوارٹر میں پہنچا بھاگی بھاگی پھر چلی جاتی.. رات کا کھانا حارث کو کھلا کر، چائے پلا کر واپس گھر آتی تو بی بی عشاء کی نماز کو بیٹھ چکی ہوتیں۔

یوں اس وقت بھی ان سے ملاقات نہ ہو سکتی کچھ دیر پردہ ہٹا کر دروازے میں کھڑی رہتی پھر اگلی صبح حارث کے ناشتے کی خاطر بیدار ہونے کیلئے جلد سونے کو اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کئی دنوں سے بس اتنی ہی ملاقات بی بی سے ہو رہی تھی۔ ہائے صاحباں! یہ تو نے کیا کر ڈالا۔

صاحباں! تو ایسی احسان فراموش تو کبھی نہ تھی۔ بی بی نے تجھے اتنی آسائشیں دیں۔ تجھے جینا سکھایا۔ دنیا کو صحیح معنوں میں دیکھنے کا شعور انہیں کی تعلیم و تربیت نے بخشا... اور آج... تو انہیں ہی دل و دماغ سے نکال بیٹھی.. انہیں کی عزت سے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔ انہیں کی بدنامی اور رسوائی کا باعث بن رہی ہے۔ بہت بری ہے تو صاحباں! اُف ہے تیری زندگی پر۔

سوچ سوچ کر اور جاگ جاگ کر اس کا برا حال ہو گیا تو آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنی ساری لاپرواہیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کیلئے اس نے ابھی ابھی بی بی سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ نہ کرتی تو ساری رات نیند بھی نہیں آنا تھی۔ اور ان سوچوں نے اسے پاگل ہی کر چھوڑنا تھا۔

بستر سے اتر کر کندھوں پر شال ڈالی، مخملیں سلیپر پاؤں میں اٹکائے اور دبے دبے سے قدم اٹھاتی بی بی کے کمرے تک جا پہنچی بند دروازے کو ذرا سا دھکیلا تو وہ کھل گیا... اندر ہلکی روشنی کا بلب روشن تھا۔ تھوڑا سا سر آگے بڑھا کر دیکھا۔ ان کا بستر خالی تھا۔ اور وہ خود ابھی تک نماز والی چوکی پر مصلّے بچھائے بیٹھی تھیں۔ صاحباں ہلکے ہلکے قدموں سے اندر چلی گئی۔

بی بی کا رخ پرلی طرف تھا، قریب جا کر دیکھا۔ وہ دعا کیلئے ہاتھ پھیلائے تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ صاحباں وہیں ان کے پاس مصلّے پر بیٹھ گئی۔ بی بی بھی محو رہیں اور آنسو بھی اسی روانی سے رواں رہے۔ تب۔ اپنے آنسو اندر ہی اندر پیتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے بی بی کے رخسار پونچھ ڈالے۔

"بی بی! میرے لئے بھی دعا کیجئے گا... بخشش کی دعا... میں نے آپ کو بہت دکھ پہنچائے ہیں۔"

بی بی نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔

"تم ابھی تک سوئی نہیں...؟"

"نیند نہیں آ رہی۔ شرجانہ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ معاف کر دیجئے بی بی..." صاحباں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میری ماں نجانے کہاں ہو گی، کیسی ہو گی۔ وہ تو مجھ سے بچھڑ چکی مگر اب، اب تو بی بی میری جنت آپ ہی کے قدموں تلے ہے۔ کیا میری ان پچھلے دنوں والی کوتاہیوں اور بے پرواہیوں کو معاف نہیں کریں گی۔؟" بی بی کے آنسو اس کی آنکھوں میں آن بسے تھے شاید... اسی روانی سے اس کے شفاف رخساروں پر بہنے لگے۔

"ارے۔ ارے... نہ میری جان....."

صاحباں کے آنسوؤں اور ہاتھ جوڑنے والی معصوم حرکت نے بی بی کو اتھل پتھل کر دیا۔ بے اختیار ہوتے ہوئے انہوں نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

"بی بی! آپ کتنی عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہیں اور میں... میں بہت بری ہوں بی بی.. آپ کی بیٹی کہلانے کے قابل نہیں۔"

"نہیں.. نہیں... ایسا مت کہو۔" بی بی نے اسے سینے کے ساتھ زور سے بھینچ لیا...

"کیسے نہیں کہوں.. آپ کی شفقتوں اور محبتوں کے جواب میں، میں نے آپ کو پریشانی دی، ذلت دی۔ رسوائی دی۔ میرے جیسا بھی بھلا کوئی احسان فراموش ہو گا۔ اس پوری دنیا میں۔"

پھر اس نے چہرہ اونچا کر کے ایک شکایت بھری نگاہ سے بی بی کو دیکھا۔

"لیکن بی بی! مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے.. آپ نے مجھے پہلے احساس کیوں نہیں دلایا۔"

"خود مجھے اب ہوا ہے۔ اب صاحباں! جب ہمسایوں، پڑوسیوں کی باتیں سنیں۔ اور اک جوان بیٹی کی ماں کے ناطے سے سوچا.... میرے اور حارث کے تعلق کا یہاں تو کسی کو کوئی علم نہیں نا...؟"

"جی ہاں..."

"مگر تمہارے متعلق تو سب یہی جانتے ہیں نا کہ تم میری حقیقی اولاد ہو اور تمہیں اس کے ہاں آتے جاتے دیکھتے بھی ہیں، جس کے ساتھ بظاہر ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ سب کی نگاہوں میں حارث ہمارے لئے غیر ہے۔"

"ہاں بی بی! سارے معاملے کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔"

"تو پھر.... اگر کوئی بات نہیں بنتی نا تو تو وہاں جانا بند کر دے۔ ان پڑوسیوں کی نگاہوں میں میں اس وقت صرف ایک خوبصورت اور جوان بیٹی کی ماں ہوں۔"

بی بی نے ایک لمحہ کیلئے رک کر صاحباں کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

"اور ایک باغیرت ماں اپنی بیٹی کو کسی غیر مرد کے پاس یوں بے وقت جانے کی اجازت نہیں دے سکتی" بی بی کی آنکھ میں عزم و ارادے کی چمک تھی۔ "میں حارث کی جدائی ہمیشہ کیلئے قبول کر لوں گی مگر ایک بے غیرت ماں کہلانا پسند نہیں کروں گی۔"

"اوہ بی بی! آپ کتنی عظیم ہیں۔" ان کے سامنے صاحباں کا سر عقیدت و احترام سے جھک سا گیا۔

"جاؤ.. شاباش! اب سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی۔ کل تمہارے میاں جی بھی آنے والے ہیں.."

"میاں جی...؟ کل ہی...؟" صاحباں، یکایک ٹھٹک اٹھی، رنگ پیلا سا پڑ گیا۔ "لیکن بی بی! ایکدم ہی کیوں...؟"

"ایکدم...؟" بی بی نے حیرت سے اسے دیکھا "وہ پروگرام کے مطابق آ رہے ہیں صاحباں.. ابھی پروگرام بنا تھا کہ تین مہینے کے بعد انہیں کاروبار سے دو چار دن کی فرصت ملے گی تو وہ آ جائیں گے۔ پھر مل کر یہاں اردگرد کے علاقوں کی سیر کریں گے۔ آخر میں اکٹھے ہی لوٹ چلیں گے۔"

بی بی نے کچھ حیرانگی سے صاحباں کو دیکھا۔

"خود تمہیں نے تو یہ سارا پروگرام بنایا تھا۔"

"ہاں.. ہاں.. خود ہی بنایا تھا۔" وہ کھوئی کھوئی سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو کیا ہمیں یہاں آئے ہوئے تین مہینے ہو گئے..؟"

"تین مہینے اور چار دن.."

بی بی نے تو شاید دن بھی گنے تھے۔ کیا ایک ایک لمحہ انگلیوں پر گنا ہوا تھا۔

"اوہ..!" وہ ڈوبی ڈوبی سی بڑبڑائی "کل میاں جی نے آنا ہے۔ واقعی مجھے اب سو جانا چاہیئے.. پھر کیا پتہ کل سے ان کے سیروں کے پروگرام بننا شروع ہو جائیں۔"

بی بی کو شب بخیر کہہ کر اور ان کی پیشانی کو چومتے ہوئے وہ پلٹ کر جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ قدم رکھ کہیں رہی تھی، پڑ رہے تھے۔ ٹانگیں لڑکھڑائی جا رہی تھیں.. بڑی مشکل سے اپنے بیڈ تک پہنچی۔ دھڑام سے گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

کتنی ہی دیر یونہی بیٹھی رہی۔ رات گزری جا رہی تھی۔ شال کندھوں پر سے اتار کر وہیں بیٹھے بیٹھے دور پرے کرسی پر پھینک دی۔ ایسا اس نے کبھی نہیں کیا تھا لیکن ذہن اس قدر الجھا بکھرا ہوا تھا کہ احساس بھی نہیں ہو کر وہ کیا کر رہی تھی۔ شال کرسی پر پھینکنے کے بعد خود بھی بستر پر اوندھی پڑ گئی جیسے اسے بھی کسی نے پھینک دیا ہو۔

کل میاں جی آ رہے تھے۔ کل میاں جی آ رہے تھے.. کل میاں جی آ رہے تھے.. ایک ہی فقرہ ہتھوڑے کی طرح دماغ میں ٹھک ٹھک بج رہا تھا۔ اور ہر ضرب ایک گہری چوٹ لگا رہی تھی۔

"اب کیا کرے گی صاحباں... اب کیا کرے گی...؟" کرچی کرچی ہوتا ذہن اس سے پوچھے جا رہا تھا۔

اتنا وقت بھی گزر گیا۔ اور اب.. اب تو حارث بھی تقریباً ٹھیک تھا.. لیکن معاملہ ذہن کا وہیں تھا۔ کتنا اچھا ہوتا میاں جی کے آنے سے پہلے ہی وہ حارث سے بات کر لیتی۔ اب اس سے بات ہو بھی سکتی تھی۔

پندرہ بیس دن سے اسے کوئی دورہ نہیں پڑا تھا۔ اور اس کیلئے صاحباں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہ... وہی جانتی تھی کتنی محنت، کتنی ریاضت مشقت، یہاں تک کہ خود اپنے آپکو، اپنی ہستی کو، اپنے وجود کو، اپنی ہر عادت، ہر بات، ہر حرکت بدل ڈالی تھی۔ جس جس پر بی بی کی چھاپ یا بی بی کے اثر کا تھوڑا سا بھی گمان تھا۔ سب بدل ڈالا تھا۔ بڑی دقت ہوتی تھی، بڑی مشکلیں پڑتی تھیں مگر وہ اپنے عزم و ارادے پر قائم رہی۔ بی بی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا وہ نہیں کھا سکتا تھا تو اس نے خود اس کے گھر میں ہر وقت کا کھانا اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ان ہاتھوں سے جنہیں تین سال تک بی بی نے جیسے پٹیوں میں لپیٹ کر رکھا تھا۔

اسے کچھ بھی نہیں کرنے دیا کرتی تھیں۔ اور اسے عادت بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے حارث کے لئے سب کچھ کیا۔ اس کے کپڑے دھوئے، استری کئے۔ گھر کی صفائی کی، ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی پوری توجہ، لگن اور خوشی سے کیا۔ اسکی پوری گھر گرہستی یوں سنبھال لی جیسے اس گھر کی گھر والی ہی تھی، ہر ذمہ داری اور سب فرائض اس کے تھے۔ اور وہ پوری دیانتداری سے پورے کر رہی تھی۔ وہ دفتر سے آ جاتا تو اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا مگر وہ اس کے گھر میں ہی اسے کام کو بالکل ہاتھ نہ لگانے دیتی۔

"تم مجھے بالکل ناکارہ کر کے دم لو گی صاحباں..!"

"مرد گھر کے کام کاج کرتے مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

"تو پھر... کیا ساری زندگی کا ٹھیکہ لیتی ہو...؟"

"جب تک یہاں ہوں اس وقت تک کا تو لینے کو تیار ہوں.. اس کے بعد.." صاحباں خاموش سی ہو گئی۔

"اس کے بعد..؟" حارث نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا صاحباں.. کہ.." اور اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ چپ ہو گیا۔

"آپ کیا کہہ رہے تھے...؟"

کوئی ڈھونڈنے جو آئے تو ہمیں نہ ڈھونڈ پائے
تو مجھے کہیں چھپا دے میں تجھے کہیں چھپا لوں

وہ گنگناتا ہوا اس کے پاس سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پھر وہ اٹر ہی گنگناتا رہا۔ اور اس کی یہ گنگناہٹیں صاحباں کو جیسے افسردہ کر دیتیں۔ لیکن وہ جلد ہی اپنے آپ کو بحال کر لیتی۔ وہ جس مقصد کے لئے یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اسے وہ مقصد پورا کرنا تھا۔ اسے اس کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کرنا تھی، اپنی پوری توجہ اسے دینا تھی۔ اپنے سارے جذبے اس کے لئے وقف کرنا تھے.. اور... اس نے پوری دیانتداری اور خلوص سے سب کچھ کیا.... مگر....

نتیجے کا دن ابھی آیا نہیں تھا کہ میاں جی آ گئے۔ پہلے بی بی کی پریشانی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی اب میاں جی وجہ بن گئے۔ کیا تھا اگر میاں جی ایک دن اور نہ آتے۔ بے شک بی بی نے اس کو حارث کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا مگر پھر بھی.. انہیں کسی نہ کسی طرح بہلا پھسلا کر وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے حارث کے پاس جانے کی ان سے اجازت لے سکتی تھی۔

لیکن میاں جی... اف..! ان کا رعب، ان کا دبدبہ۔ گو ان سے اسے پیار بھی بے تحاشہ تھا مگر ان کی بارعب شخصیت سے مرعوب بھی بہت تھی۔ ایسی ویسی کوئی بات ان کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔

اب کیا بنے گا...؟ کمند کہاں آ کے ٹوٹی تھی جبکہ لب بام دو چار ہاتھ رہ گیا تھا.. بے وقوفی اس سے بھی بہت بڑی سرزد ہو گئی تھی۔ اب حارث ٹھیک تو تھا ہی.. بات کر لیتی.. میاں جی کے آنے سے پہلے... کیا پتہ سارے حالات درست ہی ہو جائیں..

"کیوں صاحباں...؟ کیوں تو نے یہ بات نہ کرنے کی بیوقوفی کی جبکہ تجھے اچھا بھلا موقع بھی ملا تھا۔

ہاں... آج کا گزرا ہوا دن.. کیسا بہترین موقع تھا۔ جا صاحباں! جا.. آج تک تو نے کوئی بھی کام وقت اور موقع کے مطابق نہ کیا اور پھر بعد میں... تیرے لئے پچھتاوے ہی پچھتاوے رہ گئے.. اب بھی اتنی محنت اور ریاضت کے بعد تو صرف پچھتاووں کے لئے رہ گئی۔"

بے کل سی ہو کر اس نے کروٹ بدلی۔

"صاحباں! اگر میں کل تمہیں یہاں مدعو کروں تو کیا غریب خانے کو عزت بخشو گی..؟" حارث کی اس بات پر صاحباں نے ایک نمایاں سی حیرت اور تعجب سے اسے دیکھا۔

"روزانہ یہیں تو ہوتی ہوں۔"

"روزانہ کی بات چھوڑو.. کل... کل تم میری مہمان ہو گی۔ خاص مہمان۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔"

"یہ گھر تمہارا ہے نا..."

"میرا...؟" صاحباں مزید حیرت میں ڈوب گئی۔

"جس گھر کا تمام نظم و نسق جو سنبھالتا ہے، ساری ذمہ داری جس پر ہوتی ہے۔ ہر قسم کی دیکھ بھال جو کرتا ہے وہ گھر اسی کا ہوتا ہے۔"

"اچھا جی میرا ہے۔" وہ مسکرا اٹھی۔ "اب آگے کہیئے۔"

"اور میں روز تمہارا مہمان ہوتا ہوں۔"

ٹھیک یہ بھی مان لیا

"یہ تمہارا گھر اگر کل کے لئے میں ادھار مانگوں تو دے دو گی..؟"

"ضرور دے دوں گی۔" ایک مترنم سا قہقہہ صاحباں کے ہونٹوں سے پھسل گیا۔

"اور پھر کل کے دن تم میری مہمان ہو گی.. صرف مہمان... میزبان میں ہوں گا.. سب کام میں کروں گا.. میں خود.."

"لیکن کیوں...؟"

"کل میری سالگرہ ہے۔"

"سچ ...؟"

"ہاں.. اور پورے چھ سال بعد کل میں اپنی سالگرہ منا رہا ہوں.. اور میرا جی چاہتا ہے.. کچھ نہیں.. کچھ نہیں..." وہ کہتے کہتے رک سا گیا۔

"کچھ نہیں کیا ہوا.... جو کہنے لگے تھے کہہ ڈالیئے نا.."

"تم شاید میری یہ خواہش پوری نہ کر سکو.."

"کیوں نہ کر سکوں..؟"

اتنی ترنگ میں تھا۔ اتنے خوبصورت انداز میں ہنس رہا تھا.. اتنے پیارے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کا دل نہیں ٹوٹنا چاہئیے تھا.. کم از کم صاحباں کی طرف سے تو نہیں...

"آپ کی جو خواہش ہو گی جیسی بھی ہو گی حارث! میں ضرور پوری کروں گی..."

"وہ... وہ..." پہلے لمحہ کے لئے وہ گو مگو کی کیفیت میں مبتلا ہکلاتا رہا پھر ہمت کر کے آخر کہہ ہی دیا۔ "میرا دل چاہتا تھا کہ تم اسی حلیے میں، اسی رنگ، اسی روپ میں آؤ جیسے اپنی سالگرہ کے دن آئی تھیں۔ وہی ستاروں بھرا سوٹ اور زیورات پہن کر..." حارث بڑے والہانہ انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہتا چلا گیا۔ "بالکل دلہن کے روپ میں... تم اس دن بے حد اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ پہلا دن تھا جب میرا جی چاہا تھا کہ ساری عمر کے لئے تمہیں یہیں رکھ لوں۔ آؤ گی نا... میری خواہش پوری کرو گی نا..؟"

حارث نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے، ہولے سے دباتے ہوئے کچھ اس قدر وارفتہ انداز میں کہا کہ صاحباں اسے ٹال ہی نہ سکی.. اس کی یہ معصوم سی خواہش ماننے بنا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔

اگلا دن چھٹی کا نہیں تھا لیکن حارث نے دفتر سے چھٹی کر لی۔ جانے سارا دن کیا کرتا رہا تھا۔ صاحباں کا دیکھنے کو جانے کو دل تو بڑا مچلا تھا.. من میں بسے تجسس نے بار بار ابھارا بھی.. کچھ دل کے تقاضوں سے بھی مجبور ہوئی۔

اور... بے خیالی میں دو تین بار گھر سے نکل کر پگڈنڈی پر قدم بھی دھر دیئے مگر ہر بار حارث کی تاکید یاد آ جاتی۔

"روز کی طرح صبح ہی صبح ادھر نہیں آ جانا... بس سہ پہر کو پورے چار بجے اسی روپ میں، اسی حلیے میں آنا میں انتظار کروں گا۔"

تین ساڑھے تین بجے تک کا وقت اس کا کیسا گزرا۔ یہ تو وہی جان سکتا تھا جس نے بغیر پانی کے مچھلی کو تڑپتے دیکھا ہو... کیفیت اس کی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا اپنا محبوب ترین مشغلہ مطالعہ لے کر بیٹھی تو وہ نہ کر سکی.. ریڈیو لگایا تو کوئی پروگرام اچھا نہ لگا۔ ٹیپ ریکارڈر پر اپنی پسندیدہ کیسٹ چلائی تو اس کا بھی مزہ نہیں آیا۔

غرض معمول کے مطابق حارث کے گھر نہیں گئی تو یوں ویران ویران اور اجڑی اجڑی سی سارا وقت رہی جیسے یکدم ہی گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ بے وطن اور بے یارو مددگار ہو گئی تھی۔ گھر میں تھی تو بی بی کو بھی وقت نہیں دیا۔ شرجانہ سے بھی گپ نہیں لگائی.. وہ اس کے پاس آئی بھی۔ باتیں کرنے کی کوشش بھی کی مگر صاحباں غیر حاضر ہی رہی۔ وہ کچھ اس قسم کے گم شدگی کے عالم میں تھی کہ شرجانہ کی باتیں اسے تلاش نہ کر پائیں تو...

وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے عجیب عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے و شارے کرتی ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

ناشتہ بھی صرف چائے کی اک پیالی کا کیا تھا اور دوپہر کے کھانے کیلئے بھی کمرے میں سے ہی شرجانہ کو جواب دے دیا کہ اسے بھوک نہیں..... دل میں بار بار یہی خیال آتا رہا کہ حارث نے جانے ناشتہ بھی کیا تھا یا نہیں.. پھر دوپہر کا کھانا بھی کھایا تھا یا نہیں۔ بڑا لاپرواہ تھا اپنی ذات کی طرف سے... جانے کیا کیا سارا دن سوچتی رہی کبھی متجسس ہو کر، کبھی پریشان ہو کر، کبھی مسرور ہو کر اور پھر... تین بج گئے۔

کلاک کی آواز نے اسے ایکدم چونکا دیا۔ صرف اسے ہی نہیں... سارے ہی حواس یکایک بیدار ہو اٹھے۔ بڑی مشکل سے تین بجے تھے۔ اک اک لمحہ گن گن کر، چھان چھان کر، پھٹک پھٹک کر... توبہ توبہ... تو اسے محبت کہتے ہیں۔ کسی کا ہو جانا اسے کہتے ہیں۔ کسی میں فنا ہو جانا اسے کہتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کا کوئی اپنا وجود، کوئی ہستی رہ ہی نہیں جاتی۔

حارث نے پورے چار بجے پہنچ جانے کی تاکید کی تھی۔ اور جس انداز میں جس رنگ و روپ میں اس نے اسے بلایا تھا اس کیلئے اسے ابھی سے تیاری شروع کر دینا چاہئیے تھی تا کہ وہ پورے وقت پر پہنچ سکے۔ حارث کو ایک منٹ کے بھی انتظار کی تکلیف نہ ہو۔

جلدی جلدی اٹھ کر وارڈروب میں سے اپنا لباس نکالا۔ لیکن... یہ جگمگ جگمگ چمکتا لباس اور زیورات.. بی بی نے اسے اس روپ میں حارث کے ہاں جاتے دیکھ لیا تو...

کیا پتہ انہیں حارث کی سالگرہ یاد ہی ہو۔ لیکن انہوں نے اس کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔ یقیناً بھول ہوئی تھیں۔ پھر... پھر اب کیا کیا جائے..؟ کیا انہیں بتائے کہ یہ ساری سج دھج اس کی سالگرہ کے لئے تھی۔ نہیں.. نہیں.. بی بی اگر بھولی ہوئی تھیں تو انہیں بھولا ہی رہنے دینا چاہئے تھا۔ بتا کر، یاد دلا کر ان کے زخم کھولنے والی بات تھی، آج کے دن بیٹے سے اتنا قریب ہو کر پھر بھی اتنی دوری اور جدائی نے انہیں اور دکھی کر دینا تھا۔

اس کے علاوہ دل میں جو چور آ چھپا تھا، حارث کی محبت کا چور اس نے بھی بی بی سے یہ بات چھپانے پر مجبور سا کر دیا۔ کسی بھی طرح ان کے علم میں یہ لباس پہن کر حارث کے گھر جانا اسے مناسب نہ معلوم ہوا، تب وہ جلدی سے جا کر شرجانہ کو بلا لائی۔

"شرجانہ! آج حارث کی سالگرہ ہے۔"

"وہ تو آپ نے کل رات ہی بتا دیا تھا۔"

"سنو تو.... انہوں نے... انہوں نے..." جانے کیوں آج شرجانہ سے بھی شرمائی جا رہی تھی۔

"ہاں... بتایئے بھی تو... لگتا ہے ریکارڈ کی سوئی اٹک گئی۔" شرجانہ اس کی حالت دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"نہیں بھئی ہنس نہیں شرجانہ! مجھے اس طرح اور شرم آتی ہے۔"

"مجھ سے چھوٹی بی بی...؟"

"ہائے اللہ دیر ہو رہی ہے۔"

"آپ خود ہی دیر کر رہی ہیں.. بتایئے نا کیا کہنا ہے۔"

"وہ... حارث نے کہا تھا ان کی سالگرہ میں، اپنی سالگرہ والا لباس پہنوں۔"

"ضرور پہنیں... وہ آپ کو سجتا بھی بہت ہے۔ اس میں تو آپ سچ مچ کی شہزادی لگتی ہیں۔"

"اری بس نا... بات مختصر کر.. دیر ہو رہی ہے۔"

"ہائے چھوٹی بی بی.. آپ خود ہی تو دیر کر رہی ہیں۔"

صاحباں چونکی۔ شرمائی.. مسکرائی۔

"ارے ہاں... تو معاملہ یہ ہے کہ میں نہیں چاہتی بی بی مجھے اس لباس میں حارث کے ہاں جاتے دیکھیں۔"

"وہ کیوں...؟"

"وہ کیا سوچیں گی...؟ اور پھر وجہ معلوم ہونے پر مزید دکھی نہ ہو جائیں گی۔؟"

"ہاں یہ تو آپ نے ٹھیک بات سوچی..!"

"پھر تم ایسے کرو میرے یہ کپڑے اور زیورات وغیرہ اپنے کوارٹر میں لے جاؤ.. میں ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں وہیں لباس تبدیل کروں گی اور وہیں سے چلی جاؤں گی..!"

"ٹھیک ہے اس طرح بیگم صاحبہ کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔"

"کبیر خان کہاں ہے..؟"

"ہے تو کوارٹر میں ہی اس وقت۔ مگر میں اسے ابھی بیگم صاحبہ کے پاس بھیج دیتی ہوں۔ وہ انہیں باتوں میں لگائے رکھے گا تا کہ وہ کھڑکی سے بھی نہ دیکھ سکیں۔"

"بالکل مناسب..." صاحباں نے اک طویل سا اطمینان کا سانس لیا۔

"شرجانہ! میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم میرے بہت کام آتی ہو۔"

"ارے چھوٹی بی بی! احسان کیسا..؟" شرجانہ نے سارے کپڑے اٹھا لئے... "محبت اک عبادت ہے۔ اور پھر آپ کا مقصد نیک ہے۔ آپ کی مدد کر کے ہم بھی اگر تھوڑا سا ثواب لے لیں گے تو اسے احسان تو نہ کہیئے۔"

شرجانہ اس کے کپڑے لیکر صاحباں کے کمرے کے پچھلے دروازے کی طرف سے نکل کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ صاحباں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا۔ چہرے کو تھوڑا سا میک اپ سے سنوارا، بالوں کو سلجھایا اور بعجلت تمام چند منٹوں بعد ہی وہ بھی وہاں جا پہنچی۔ شرجانہ کبیر خان کو بی بی کے پاس بھیج کر اس کی منتظر دروازے میں ہی کھڑی تھی.. تب... صاحباں نے لباس تبدیل کیا۔ زیورات پہنے، شرجانہ نے زیورات وغیرہ پہنانے میں مدد کی۔ ساتھ ہی اس سے مذاق کرتی رہی، چھیڑتی رہی۔ صاحباں شرمائی۔ مسکرائی اس کی چھیڑ سے محفوظ ہوتی ہوئی تیار ہو گئی۔

"بس... اب بالکل ٹھیک ہے ناں؟"

شرجانہ اسے سر سے پاؤں تک تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے مطمئن ہوگئی تو صاحباں کو بھی اطمینان ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا جس رنگ، جس روپ میں اسے حارث نے دیکھنے کی خواہش کی تھی، وہ بالکل اسی طرح اس کے روبرو پیش ہو۔ اس کی ہر خواہش پوری خوبصورتی اور خلوص کے ساتھ پوری ہو۔ کوئی ذرا سی بھی کمی کہیں رہ نہ جائے۔

"ارے..." جاتے جاتے صاحباں پھر تھم گئی۔ "ایسے مجھ سے جایا نہیں جائے گا۔"

"کیا مطلب...؟"

"اس حلیئے میں حارث کے گھر تک جانا بہت مشکل ہے شرجانہ۔"

"مگر اس دن بھی تو گئی تھیں۔" شرجانہ شوخ انداز میں مسکرائی۔

"تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ اس دن رات کا وقت تھا۔ اندھیرا تھا ہر طرف... اور آج تو... دن کا وقت ہے شرجانہ۔"

"پھر اب...؟"

"اپنی چادر دے دو... وہ اوپر اوڑھ لوں گی..."

"لیں... مخمل پر ٹاٹ ڈال لیں گی، ساری سج دھج ختم ہو جائے گی۔"

"اری پاگل! صرف راستے کیلئے کہہ رہی ہوں۔" پھر صاحباں بڑے پیارے انداز میں شرمائی۔ "وہاں جا کر تو اتار ہی دونگی۔"

"اچھا... میں سمجھی تھی اوڑھے رکھیں گی۔" شرجانہ نے جلدی سے بڑھ کر اپنے بکس میں سے اپنی چھینٹ کی چادر نکالی۔ جو وہ کسی کے گھر مہمان جانے کے وقت اوڑھا کرتی تھی... ہاتھوں میں لیکر کئی لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"لاؤ نا..."

"نہیں چھوٹی بی بی! خدا نہ کرے آپ ایسا گھٹیا کپڑا پہنیں۔ میں آپ کے کمرے سے آپ کی چادر لا دیتی ہوں۔"

"ارے جا پاگل...!" صاحباں نے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے چادر چھین لی۔ "اتنا اچھا پرنٹ ہے اور پھر..." چادر اوڑھتے ہوئے اس نے باقی فقرہ زیر لب بڑبڑایا۔ "میں اپنی اوقات بھولی نہیں ہوں۔ کبھی ایسا بھی میرے نصیب میں نہیں ہوا تھا۔ اس میں تو تیرے خلوص اور پیار کی جو قیمت ہے وہ میرے تن پر سجے ان زیورات اور اس لباس سے کہیں زیادہ ہے۔"

سر سے لیکر پاؤں تک اچھی طرح چادر اوڑھ کر صاحباں اس کے کمرے سے نکل گئی۔ چند قدم چل کر واپس مڑی تو شرجانہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"رات کو جلدی نہ سو جانا... مجھے پھر یہیں آکر لباس تبدیل کرنا ہے۔"

"بہت اچھا چاہے کتنی بھی دیر ہو جائے میں انتظار کروں گی۔"

"فکر نہ کرو... دیر نہیں کروں گی۔"

"وہ تو مجھے پتہ ہے چھوٹی بی بی! آپ نہیں بھی کریں گی تب بھی دیر ہو ہی جائے گی۔ یہ نہ آپ کے بس کی بات ہے اور نہ چھوٹے صاحب کی۔"

"چل بدتمیز..." صاحباں مسکرا کر، لجا کر، جلدی سے مڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے حارث کے گھر جا پہنچی، برآمدے میں ہی اس نے چادر اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ پھر... دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ حارث کے دل ہی کی طرح کھلا ملا... اور... اس لباس میں، اس سنگھار میں، اس رنگ روپ میں حارث کا ارمان بن کر پہلے دن کی دلہن کی طرح شرماتی لجاتی اندر داخل ہوئی تو وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی... خود اس کے اپنے وجود کی طرح آج حارث کے اس کمرے کا بھی حلیہ بدلا ہوا تھا۔

"آؤ... آؤ... خوش آمدید..." جانے کونسے کونے سے نکل کر حارث سامنے آ گیا۔ کمرے کے حلیے سے بھی زیادہ حیران وہ حارث کا حلیہ دیکھ کر حیران ہوئی۔ شہزادوں ایسے لباس میں وہ ایسا وجیہہ، اتنا بانکا، سجیلا لگ رہا تھا کہ صاحباں نے اپنی پوری زندگی میں مردانہ وجاہت اور پُرکشش شخصیت کا ایسا مکمل نمونہ کوئی نہ دیکھا تھا۔

وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ ہاتھوں میں سے شرجانہ کی چادر گر پڑی مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔

"کیا ہوا...؟" اس حسن و حیرت کے مجسمے کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے حارث نے بڑھ کر اسکے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"یہ... یہ آپ... حارث آپ ہی ہیں نا...؟" وہ اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکے ہی گئی۔

"اور اگر میں بھی یہی سوال کروں...؟" حارث نگاہوں میں پسندیدگی، محبت، پیار، وارفتگی اور جانے کیا کیا بھرے مسکرا رہا تھا۔

"کیا...؟" صاحباں اپنی ہی حیرتوں میں ڈوبی ہوئی تھی سمجھ ہی نہ سکی۔ "کہ تم صاحباں ہی ہو...؟"

"میں تو یقیناً ہوں لیکن آپ...؟"

"اور میرا بھی یہی جواب ہے صاحباں! کہ میں تو یقیناً حارث ہوں لیکن... تم... تم...؟" وہ اس حسین اور جگمگ جگمگ کرتے سراپے کو نگاہوں میں بساتے ہوئے بولا۔ "آج تو تم اس دن سے بھی مختلف لگ رہی ہو۔ بخدا تمہارا ہر رنگ، ہر روپ نرالا ہے۔ تم کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔"

اس کے جسم کا ہر رواں ایک آنکھ بن جاتا تو شاید تب بھی وہ اس کے حسن کے تمام جلووں کو پوری طرح دیکھ نہ پاتا۔

"کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں..."

"میرا...؟"

"ہاں... تم نے میری خواہش کو اتنی خوبصورتی، اتنے پیار اور اتنے خلوص سے پورا کیا۔" حارث اس کے دونوں ہاتھ تھامے تھامے اسے صوفے تک لے آیا۔

صبح سے اب تک کے چند گھنٹوں میں جانے اس نے یہ سارا انتظام کیسے کر لیا تھا۔ الہ دین کے چراغ قسم کی کوئی چیز بھی صاحباں نے اس کے گھر میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ شاید حارث جادوگر بھی تھا...!

پورا کمرہ رنگ برنگے کاغذوں کی جھنڈیوں، فانوسوں اور قندیلوں سے سجا ہوا تھا دیواروں پر چھت پر دروازوں اور کھڑکیوں پر ننھے ننھے سے بلب جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ پرے میز پر اک بہت بڑا کیک پڑا تھا۔ اردگرد اور بھی کھانے والی بے شمار چیزیں بڑی نفاست اور قرینے سے دھری تھیں... اتنی ڈھیر ساری... جیسے ابھی یہاں کوئی درجن بھر مہمان آنے والے تھے۔

"اور بھی کوئی آ رہا ہے...؟" صاحباں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اور حیرت کی دلدل میں مزید دھنستے ہوئے پوچھنے لگی۔ "مجھے تو آپ نے کل نہیں بتایا تھا..."

"تو کب کوئی اور آ رہا ہے...؟"

"پھر یہ سارا انتظام....؟"

"میری مہمان کے لئے ہے۔" وہ اک لگاوٹ سے، اک وارفتگی سے، اک جذبے سے اسے دیکھنے لگا۔

"اکیلے کے لئے...؟"

"تم اکیلی نہیں ہو صاحباں! تم میرے لئے دونوں جہان ہو۔ تم میرے لئے سب کچھ ہو۔" حارث نے اسے بڑے آرام سے، بڑے آہستہ سے صوفے پر بٹھا دیا۔ جیسے وہ ادھ کھلی کلیوں کی ایک بے حد نازک ڈالی تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی ہونے پر ٹوٹ سکتی تھی۔ کلیاں کھلنے سے پہلے مرجھا سکتی تھیں، بکھر سکتی تھیں۔

"اوہ...!"

یہ پیار، یہ چاہت، یہ انداز، یہ جذبے، صاحباں سب کچھ دیکھ کر بوکھلائی جا رہی تھی... وہ اس قابل تھی...؟ وہ کھوئی کھوئی سی سوچے جا رہی تھی۔ حارث نے اسے جس مقام پر پہنچا دیا تھا.. وہ اس کی اہل تھی بھی..؟

"میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بارہ سال کی عمر تک میری ماں میری اسی طرح سالگرہ منایا کرتی تھی۔" حارث اسکے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ "ایسی ہی رنگ برنگی جھنڈیاں اور فانوس لگا کرتے تھے۔ ایسا ہی بڑا سا کیک آیا کرتا تھا۔ ایسے ہی ساتھ دوسری لوازمات بہت ڈھیر ساری ہوتی تھیں۔ ایسا ہی لباس میرے لئے ہر سال نیا تیار ہوتا تھا۔"

وہ اپنے ماضی میں گم ڈوبا ڈوبا سا بول رہا تھا۔ صاحباں نے سہم کر حارث کا ہاتھ تھام لیا۔

"ماضی کو یاد نہیں کیا کرتے حارث۔" وہ اس کی کیفیت سے ڈر گئی تھی۔

"میرے ماضی میں میری ماں ہے صاحباں...! میں اسے نہیں بھول سکتا۔" وہ مسکرایا... ماں کے نام پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تھی گو اس مسکراہٹ کے پیچھے ہلکی سی درد کی لہر تھی مگر دوسروں کو بھی زخمی کر دینے والا وہ دکھ نہ تھا، وہ کراہ نہ تھی۔

"کاش! میں اپنی ماں تمہیں دکھا سکتا... تمہیں اس سے ملا سکتا۔ ایسی مشفق اور مقدس کم ہی کسی کی ماں ہوں گی جیسی میری بی بی تھیں۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں حارث! اس کی گواہی تو میں بھی دوں گی۔ بی بی جیسی ماں اور کوئی نہیں ہو سکتی..." اس کا دل حارث کی ہر بات کی تائید کر رہا تھا۔

"میں اپنا ہر سالگرہ کا دن ضرور منایا کرتا ہوں، اپنی ماں کو خراج تحسین دینے کیلئے۔" وہ ماضی میں ڈوب گیا۔ "میں بارہ سال کا تھا جب میرے باپ نے اچھی قسم کی تعلیم کیلئے مجھے انگلستان بھیج دیا۔ وہاں بھی یہ دن اسی طرح گزارتا تھا۔ یہ میری ماں کی خواہش تھی... اور پھر بھی... عمر کے مطابق میرے لباس کا ناپ جس جس طرح بدلتا تھا ویسا ہی بنوا کر ہر سال بی بی مجھے بھیجا کرتی تھیں۔ وہاں انگلستان میں۔"

صاحباں اس کے انداز سے سہمی جا رہی تھی۔ ماضی کو اتنا ڈوب کر یاد کر رہا تھا کہیں دورہ نہ پڑ جائے۔

"پھر جس طرح بچپن میں فوٹوگرافر کو بلوا کر پوری تقریب کی تصویریں اتروائی جاتی تھیں اسی طرح میں وہاں سے ہر سال اپنی بی بی کو تصویریں بھیجا کرتا تھا۔

"ہائے اللہ! رحم کر..." صاحباں کا دل بیٹھا جا رہا تھا مگر... وہ مسکرا رہا تھا اور مخمور نگاہیں صاحباں کے وجود پر جمائے بیٹھا ہوا جا رہا تھا۔

"پھر... جب سے میں ان سے بچھڑا ہوں... پھر میں نے اپنی سالگرہ منائی تو ضرور... لیکن... لیکن..." وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ صاحباں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"لیکن کیا...؟"

"لیکن وہ سالگرہ تو نہ ہوئی نا..."

"کیا مطلب...؟"

کرتا اسی طرح تھا سب کچھ۔ ایک بار ایسے ہی سب کچھ سجا کر خدا کو گواہ بنا کر اپنی بی بی کی خواہش پوری کرتا ضرور تھا مگر نہ کوئی مہمان ہوتا تھا اور نہ ہی..." لمحہ بھر کیلئے خاموش ہو کر اس نے حلق میں کچھ اٹکا ہوا نگلا۔ شاید اندر ٹپکنے والے آنسو تھے۔ مگر اس کے بھرے لبوں پر اب بھی مسکراہٹ ہی پھیلی ہوئی تھی۔ "نہ ہی کیک کٹتا تھا... سب کچھ اسی طرح یتیم خانے کے بچوں کو بھیج دیا کرتا تھا اور... آج... آج...!"

یکایک ہی اس کے چہرے پر بڑے خوبصورت سے رنگ بکھر اُٹھے۔ آنکھوں میں ہلکا سا دکھ کا سایہ تھا اس کی جگہ خوشی اور مسرت کی قندیلیں روشن ہو اٹھیں۔

"پانچ سال بعد... آج پھر... آج پھر ویسے ہی سب کچھ ہو گا۔ میرے دل کا خلا بھر گیا ہے صاحباں! آج پھر کیک کٹے گا، تصویریں اتریں گی..."

"تصویریں...؟" صاحباں سراسیمہ سی ہو گئی۔

"ہاں...!"

"فوٹوگرافر بلوایا ہوا ہے...؟" اس کی پریشانی حد سے سوا ہو گئی۔ بی بی سے چوری یہ سب کچھ کر رہی تھی.. اور... تصویریں دیکھ کر وہ کیا کہیں گی...؟ ہائے ہائے یہ تو بہت بُرا ہو گیا۔

"فوٹوگرافر کی کیا ضرورت ہے...؟"

پریشانی اور خوف کی وجہ سے مزید خوبصورت ہو جانے والی صاحباں کی آنکھوں میں تکتے ہوتے حارث کہنے لگا۔

"تمہاری ان خوبصورت آنکھوں سے بہتر تصویر کوئی کیمرہ لے سکے گا...؟"

"اوہ...!" صاحباں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ساتھ ہی حیا بھری سرخی پورے چہرے پر بکھر گئی اور اسے رنگ و نور میں نہلا گئی۔

"میں تمہارے اس حسین و نازک پیکر کی تصویریں اپنی آنکھوں میں اتاروں گا۔"

"ہاں... ہاں..." صاحباں نے چونک کر حارث کی طرف دیکھا..

اچھی عادات، اچھی صورت، اچھے لباس اور اتنی پیاری پیاری محبت بھری باتیں کرنے والا یہ شہزادہ آنکھوں میں کیا یہ تو دل میں چھپا لینے کے قابل تھا۔ دل کے ایسے نہاں خانوں میں جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے، کوئی نہ چھین سکے.. وہ صرف اسی کا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

"میری بی بی کیک کے گرد بتیاں روشن کیا کرتی تھیں۔ آج تم..."

"میں...؟" صاحباں ڈوبی ڈوبی سی ابھری

"ہاں صاحباں! تم.. عورت ماں ہو، بہن ہو، بیٹی ہو یا محبوبہ وہ کسی ایک بھی روپ میں مرد کے دل میں محبت بن کر اتر جائے تو اس کی زندگی کا خلا پُر ہو جاتا ہے اور پھر تم ایسی، تم ایسی محبوبہ.. تمہاری محبت، تمہارے پیار نے تو مجھے زندگی دے دی ہے ایک نئی زندگی.. جس نے میرے سارے خلاء پُر کر دیئے ہیں۔ میرے ویرانوں کو نہ صرف آباد کر دیا ہے بلکہ اسے بڑے خوبصورت اجالوں سے منور بھی کر دیا ہے۔ میرے ارد گرد روشنیاں ہی روشنیاں ہیں۔" حارث نے اٹھ کر صاحباں کے دونوں ہاتھ تھام لئے

"آؤ صاحباں! اپنے ان مبارک ہاتھوں سے میری اس روشن اور منور زندگی میں مزید چراغاں کر دو۔"

اس کے سہارے سے صاحباں اٹھی.. میز تک آئی۔ کیک کے گرد موم بتیاں روشن کیں۔ عجیب کیف و سرور کا سا عالم تھا۔ حارث اس کے کندھوں پر ہاتھ دھرے کھڑا تھا۔ اس کے معطر وجود کی خوشبو اور مضبوط ہاتھوں کا لمس اسے ہوش و خرد سے بیگانہ بنائے دے رہا تھا۔

اور پھر ان روشنیوں میں، سجاوٹوں میں، خوبصورتیوں میں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں اترتے ہوئے ایک دوسرے کے دل میں بستے ہوئے دونوں نے مل کر کیک کاٹا۔ حارث کی سالگرہ تھی، لیکن حارث کا وجود ایک اکیلا نہیں تھا۔ وہ اور صاحباں مل کر ایک بنتے تھے۔

ہر روز صاحباں حارث کو کسی ننھے بچے کی طرح کھلایا پلایا کرتی تھی آج وہ حارث کی مہمان تھی۔ حارث نے اپنے ہاتھوں سے اسے ہر چیز پیش کی۔ بڑی معصومیت سے، بڑے پیار سے خود اس کے منہ میں بھی ڈالتا رہا۔ صاحباں مدہوش مدہوش سی اسے دیکھتی رہی۔ کھاتی رہی... پھر حارث نے چائے بنائی۔

"ارے...!" صاحباں اس وقت چونکی..

"آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا..."

"تم نے کھایا میں نے کھایا ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات ہے نا..." صاحباں نے بڑھ کر اس کیلئے پلیٹ بھر لی... "اب کھائیں گے آپ اور سمجھئے گا میں کھا رہی ہوں۔"

وہ اسی طرح اسے کھلانے لگی... یوں دونوں ساتھ ساتھ ہنستے رہے.. کھاتے پیتے رہے۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ اسے ساتھ ساتھ لگائے لئے پھر صوفے پر آن بیٹھا۔

"آج میرا جی چاہتا ہے صاحباں! تم سے بہت ڈھیر ساری باتیں کروں..."

"روز آپ کے پاس ہی ہوتی ہوں..."

"کام میں لگی رہتی ہو۔ آج بڑی مشکل سے فارغ ملی ہو۔ مجھے بھی آج فرصت ہے..." وہ اسے سامنے بٹھائے اس کے خوبصورت پیکر کو گھنٹوں دیکھتا رہا اور اپنے بچپن کی، اپنے ماضی کی، اپنے گھر کی، اپنی ماں کی بے شمار باتیں کرتا رہا۔

چہرے پر فرشتوں ایسی معصومیت اور پاکیزگی چھائی تھی۔ آنکھوں میں طمانیت اور تسکین کی ہزاروں شمعیں فروزاں تھیں گزرے دنوں کی کسی درد کی لہر یا کسی دکھ کی پرچھائیں کا شائبہ تک نہ تھا۔

موقع اچھا تھا.. وہ بہت خوش تھا۔ ڈاکٹر عابد کی نصیحت کے مطابق صاحباں کی خدمت اور محبت اسے اس مقام تک لے آئی ہوئی تھی کہ جہاں اب اس پر ماضی کی کسی بات یا ذکر کا اثر ہو کر دورہ نہیں پڑ سکتا تھا۔ لیکن یہ اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہوئے بھی صاحباں نے باپ بیٹے کے جھگڑے کا قصہ نہیں چھیڑا۔

یوں سامنے بیٹھ کر اس والہانہ انداز میں اس سے باتیں کرتے ہوئے، ایسے پیارے انداز میں اس کی خاطر و مدارت کرتے ہوئے، اس شہزادوں ایسے اپنے آج کے روپ میں وہ اسے اس قدر محبوب اور اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ صاحباں کا اپنا ہی دل، ڈانواں ڈول ہو گیا۔

باپ بیٹے کے جھگڑے کا ذکر چھڑتا تو نہ جانے کیسی بات نکل آتی... کوئی بڑی بھیانک، کوئی بے حد روح فرسا۔ کوئی انتہائی دل شکن اور تکلیف دہ..

کچھ اس قسم کی بھی... کہ میاں جی کے تعلق سے خود اس کا اپنا تعلق ٹوٹنے کا خطرہ پڑ جاتا۔ اس کی محبت میں کوئی دراڑ آ جاتی اس کے لئے حارث کی جدائی سے بچنا ناگزیر ہو جاتا... تو...؟ تو...؟ ان ساری سوچوں نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ گو یہ اس کی خود غرضی تھی... مگر محبت کا اپنا ایک اتنا خوبصورت جہاں آباد کر کے وہ بی بی کی مامتا کو تھوڑی دیر کیلئے بھول گئی۔ اس کی اپنی زندگی میں بھی تو ایسی خوشی، ایسی خوبصورتی ایسی توجہ، ایسی محبت کبھی نہ آئی تھی۔ حارث اس کی زندگی کی واحد تمنا، واحد آرزو اور واحد ارمان تھا۔ کیا وہ اسے چھوڑ سکتی تھی...؟ کسی دوسرے کی خاطر... میاں جی کی خاطر... بی بی کی خاطر...!!

بتا صاحباں! کچھ بول... کچھ کہہ...

اور وہ دل ہی دل میں سوچتی ہی رہ گئی۔ اپنے آپ سے پوچھتی ہی رہ گئی.. کہ... رات کے گیارہ بج گئے۔

"اوہ...!" صاحباں چونکی.. یکایک اسے بی بی کا خیال آ گیا... "بہت دیر ہو گئی..." وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں... ابھی نہیں..." حارث نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور کچھ اس انداز سے اس کی طرف دیکھا کہ صاحباں کا دل واپس بیٹھ جانے پر مجبور سا ہو گیا اور وہ بیٹھنے ہی لگی تھی کہ...

اب اسے شرجانہ کا خیال آ گیا۔ اس کے کوارٹر میں ہی جا کر تو اس نے اپنا لباس تبدیل کرنا تھا اور پھر اپنے گھر میں داخل ہونا تھا۔

"بس حارث! میں مزید ایک منٹ نہیں رک سکتی۔"
سنڈریلا کی طرح حارث شہزادے کو اپنے پیچھے لپکتے پا کر بھی وہ اسے شب بخیر کہتے ہوئے بھاگ نکلی۔

* * *

اس نے بے چینی سے کروٹ لی۔
اور اب... چند گھنٹوں بعد میاں جی آ رہے تھے۔
یہ کیا کیا صاحباں تو نے...؟
اتنا اچھا موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔
وہی گھڑی تھی۔ وہی ساعت تھی۔ وہی لمحہ تھا...
اسے پکڑ لینا چاہیئے تھا۔ اسے کھونا نہیں چاہیئے تھا...
پل بھر کی خود غرض بھری سوچ نے اسے احسان فراموش اور نمک حرام بنا ڈالا تھا۔
اس نے اپنی محبت کو نگاہ میں رکھا اور اپنی محسن بی بی کی ممتا کو فراموش کر دیا۔
خود اسے حارث کا قرب حاصل تھا وہ اس کی نگاہوں کی گرمی سے من کو گرماتی رہی اس کی توجہ اور پیار کی خوشیاں سمیٹتی رہی اور بی بی بیٹے کی جدائی کی آگ میں جلتی رہیں جھلستی رہیں۔ ایک ماں کی ماممتا بیٹے کو ایک نگاہ دیکھنے اور سینے سے لگانے کی پیاس میں پیاسی تڑپتی رہی اور صاحباں نے ان کا دکھ درد جانتے سمجھتے ہوئے بھی... موقع ملا۔ تب بھی کچھ نہ کیا۔ اپنی خاطر خاموش رہی۔
صاحباں! یہ تو نے کیا کیا؟
وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور اب... اب تو شاید وہ حارث کے گھر کبھی نہ جا سکے۔ اس نے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ یہ کیا ہو گیا؟
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔
ان ہی سوچوں میں کھوئے کھوئے وہ پوری رات نہیں سو سکی۔ دور مسجد سے اذان کی آواز آئی تو چونکی۔
"جب بھی کوئی مشکل درپیش ہو تو فکر مند یا پریشان ہونے کے بجائے خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ وہ ہمیشہ اپنے بندے کے لیے بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکال دیتا ہے۔"
بی بی کا کہا ہوا فقرہ اس کے کانوں میں گونج اٹھا۔
جلدی سے اٹھی۔ وضو کیا اور جانماز پر جا بیٹھی۔
نماز تو وہ ہمیشہ ہی پڑھا کرتی تھی مگر آج اس نے نماز کے بعد دعا تو پورے دل کی گہرائیوں سے مانگی۔ بڑی طویل دعا تھی۔ اس میں اس نے اپنی کل والی بے پرواہی اور کوتاہی کی معافی مانگنے کے بعد اللہ میاں سے آئندہ خود کو بھلا کر صرف دوسروں کے لیے جینے کا پکا وعدہ کیا۔
بی بی اور میاں جی کے احسانات کے آگے اس کی محبت تو کیا اس کا وجود بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے سب کچھ ان پر قربان کر دینے کے متعلق سوچتے ہوئے خدا سے اپنے عزم و ارادے کے استحکام اور استقلال کی استدعا کی۔
مشرقی دریچے سے چپکے سے اندر آنے والے ہلکے سے اجالے نے اسے چونکا دیا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے جانماز تہہ کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
سورج کی پہلی اجلی سی کرن کے ساتھ اس کے دماغ میں ایک روشنی سی ابھری۔
گو بی بی نے اسے آئندہ حارث کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا لیکن اسے ایک بار اس سے ضرور ملنا چاہیئے تھا۔ بی بی اور میاں جی کی خاطر۔ اپنی محبت، اپنا پیار، اپنا وجود۔ وہ اس وقت بھول چکی تھی۔ سب کچھ فراموش کر چکی تھی
اس وقت اگر اسے کچھ یاد تھا تو وہ بی بی اور میاں جی کے احسانات تھے۔ اور وہ مقصد تھا۔ جس کے لیے تین مہینے پہلے اس نے کام شروع کیا تھا۔
میاں جی کے آنے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ ان کے آنے سے پہلے پہلے وہ مقصد پایۂ تکمیل تک پہنچ جانا چاہیئے تھا۔

مدھم اجالا آہستہ آہستہ اپنی پوری آب و تاب سے پھیلنے لگا تھا۔ صاحباں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ بال درست کیے۔ اور ایک عزم کے ساتھ بڑے مضبوط سے قدم اٹھاتی بی بی کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔
رات تنی دیر سے سوئی تھی۔ علی الصبح پھر سامنے موجود تھی۔ لباس اور انداز سے لگ رہا تھا جیسے کہیں جانے کو تیار تھی۔ بی بی متحیر سی رہ گئیں۔ ساتھ قدرے غصہ بھی آیا۔
"کیا بات ہے؟"
اس کے جانے کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے بی بی نے اس کی گلابی گلابی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ جو اس کے رات بھر جاگتے رہنے کی داستان...
"میاں جی کس وقت پہنچ رہے ہیں؟"
صاحباں نے ان سے اپنی شب بیداری کی وجہ سے سرخ ہو جانے والی آنکھیں چھپانے کی کوشش میں نظریں چرا لیں۔
"سہ پہر تین چار بجے کے قریب۔"
"تو پھر... پھر بی بی...؟"
حارث کے ہاں جانے پر حکم امتناعی جاری ہو چکا تھا اس لیے حرف مدعا زبان پر لاتے ہوئے وہ ہچکچا رہی تھی۔
"ہاں ہاں... کہو نا...؟"
بی بی نے اس کے سراپے پر بھرپور نظر ڈالی ہمسائے پڑوسی ٹھیک ہی باتیں بناتے تھے۔ صاحباں حسن و رعنائی کا مکمل نمونہ تھی۔ نہ کوئی قد بُت میں کسر تھی۔ نہ رنگ روپ میں اور نہ ہی نقش میں۔
جو لباس پہن لیتی، جو انداز اختیار کر لیتی لگتا اسی کے لیے بنا تھا۔ اسی کے لیے معرض وجود میں آیا تھا۔
"بی بی... بی بی...!"
وہ بڑبڑا کر منمنا کر پھر چپ ہو گئی۔
"کہو نا؟"
"وہ... میں... حارث کے گھر چلی جاؤں؟"
بڑی مشکل سے حلق میں اٹکے الفاظ اس نے باہر نکالے۔
"تمہارے میاں جی آنے والے ہیں۔"
بی بی نے نہ روکا نہ ٹوکا بس ذومعنی سا فقرہ کہہ کر نگاہیں جھکا لیں۔
"ان کے آنے سے پہلے آ جاؤں گی۔"
"کیا جانا بہت ضروری ہے؟"
اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والا بی بی کا انداز ایسا تھا کہ وہ سٹپٹا گئی۔
"وہ بی بی! جس مقصد کے لیے ہم لوگ ایبٹ آباد آئے تھے اسی...؟"
"چھوڑو اس معاملے کو...؟"
بی بی نے اس کی بات بھی پوری نہیں سنی۔ کٹیلے سے لہجے میں بولیں۔
"تین مہینوں میں کچھ نہیں ہوا تو چند گھنٹوں میں کیا ہو جائے گا؟"
یہ بی بی کا انداز، یہ لہجہ... تو گویا انہوں نے بھی اسے پڑوسیوں کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔
او صاحباں! یہ کیا ہو گیا...؟
تو نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔
نہیں نہیں... ایسا نہیں ہونا چاہیئے... تیری کوئی بات نہیں صاحباں! کم از کم ماں بیٹے والا معاملہ تو سدھر جانا چاہیئے تین مہینوں کی محنت اکارت نہیں جانا چاہیئے۔
یہ کیا ہوا ذلتیں اور رسوائیاں بھی دامن میں ڈلوائیں اور مراد کوئی نہ پائی۔
بی بی کے اس رویے کے ساتھ وہ واپس جانے لگی تھی لیکن پھر تھم گئی ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ نہیں ہونا چاہیئے۔
"بی بی! ایک مجبوری تھی تبھی ان سے اتنا عرصہ بات نہیں کر سکی۔"
مگر اب اس کی آواز میں لرزش کی بجائے ایک ٹھہراؤ ایک مضبوطی تھی۔

"اور اب وہ مجبوری کہاں گئی ؟"

بی بی کو اس کی یہ بحث و تکرار اچھی نہ لگی۔ وہ تو ان کے ایک ذرا سے اشارے پر بھی ہمیشہ سر تسلیم خم کر دیا کرتی تھی۔ آج یہ کیسا جذبہ جس نے اسے سرکشی پر آمادہ کر دیا تھا۔

"دور ہو گئی بی بی ...!"

صاحباں اسی مستحکم لہجے میں بولی۔

"پھر جاؤں ...؟"

وہ اسی طرح جانے کی ضد پر قائم تھی۔ بی بی کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار پھیل گئے۔

"دیکھو صاحباں! میں تمہیں جنم دینے والی ماں بے شک نہیں ہوں۔ نہ تمہیں پالنے والی۔ لیکن ...!"

اور بی بی کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ محبت سب سے بڑی مجبوری ہے۔ صاحباں سے انہیں محبت تھی۔ اور اسی مجبوری نے اپنا لہجہ نرم کرنے پر مجبور کر دیا۔

"گزرنے والے پچھلے تین سالوں کی محبت نے ذہنی اور روحانی طور پر مجھے تمہاری حقیقی ماں بنا دیا ہے بیٹی ...!"

انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی دوپٹے کے پلّو سے خشک کی "میری مجبوری کو بھی سمجھو۔ مجھ پر تمہاری عزت و ناموس کی [illegible] کرنا فرض ہے۔ حارث کی ممتا سے کہیں زیادہ بڑا فرض۔ اس کی جدائی میرے لیے بے شک بڑی تکلیف دہ ہے۔ میں مر مر کر جی رہی مگر تمہارے والے فرض کی طرف سے مجھے خدا کو جواب دہی کرنا پڑے گی۔ دُنیاوی تکلیفیں سہی جاتی ہیں۔ عاقبت کی ذلت و رسوائی نہ دو"

"نہیں بی بی! نہیں ...!"

صاحباں نے جلدی سے ان کے پاس بیٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"آپ کی صاحباں آپ کو کبھی کوئی ذلت و رسوائی نہیں دے گی۔ وہ آپ کا سر ہمیشہ بلند رکھے گی"

اس نے بی بی کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لئے۔

"تو پھر اس کی طرف نہ جاؤ"

"اور بی بی! مجھ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان سے منہ موڑ کر آپ کی صاحباں کو جہنم میں جھونک دوں"

"تم پر جو فرائض ...؟ تم نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی"

"آج اگر حارث کے پاس نہ گئی تو ہو جائے گی۔ میرا مشن ناکام ہو جائے گا بی بی ...! میرے فرائض تکمیل تک نہ پہنچ سکیں گے"

اور پھر صاحباں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ بی بی کو ہر بات، ہر معاملے سے باخبر کر دیا جائے۔ وہ اس کی طرف سے مشکوک تھیں۔ ان کی ساری غلط فہمیاں دُور کر دینا چاہیئے تھیں۔ خود اس کی پریشانی بھی تو بی بی کو تکلیف پہنچاتی تھی۔

سُنیئے بی بی! میں اب آپ کو مزید کسی اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ یہ جو آج تک میں نے حارث سے میاں جی کے اور ان کے جھگڑے کی بات نہیں کی نا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ حارث بہت بیمار رہتے"

"کیا ... کیا ...؟"

بی بی نے ایک دم چھاتی پر دونوں بازو کس کر باندھ لیے جیسے وہ تڑپتے مچلتے دل کو سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے سے روک لینا چاہتی تھیں۔ رنگ یکا یک یوں پیلا پڑ گیا جیسے پورے جسم سے کسی نے خون کی ایک ایک بوند نچوڑ لی ہو

"ہمت اور حوصلے سے میری بات سُنیئے بی بی! آپ نے اتنے سال جُدائی کے، اتنا کٹھن وقت گزار لیا اور اب تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے"

تب صاحباں نے ان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے، ان کے بازو دباتے ہوئے، ان کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے۔ ساری داستان انہیں سُنا دی۔

کس طرح اسے دَورے پڑتے تھے۔ کیسے وہ بی بی کے نام پر اُلٹ پلٹ جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا وہ نہیں کھا سکتا تھا۔ فاقے کرتا تھا۔ نحیف و نزار تھا۔ رنگ رُوپ کھو چکا تھا اور پھر ...

اپنے سارے جھوٹ، سارے فریب، جو کچھ اس نے بی بی کی خاطر بی بی کے ساتھ کیا تھا۔ چوری چوری جھگیوں کا بہانہ کر کے ڈاکٹر کے پاس بھاگی پھرنی۔ انہی کے بیٹے کی خاطر۔ پھر اس کے سارے کام کرتی رہی۔ اس کے لیے ایک ملازمہ بنی، اس کے لیے جمعدارنی کی طرح گھر کی صفائی کی۔

غرض ... غرض ... اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا ... سوائے ... سوائے اپنے جذبوں کے ... دل کا چور وہ چوری کھول ہی نہ سکا۔

[illegible] دوڑتی بی بی ایک دم ہی موم کی طرح پگھل کر بہہ گئیں۔ صاحباں کو بے اختیار سینے سے لگا لیا۔ ایک بار ... دو بار ... زور زور سے بھینچا

"اور اب ... اب صاحباں! میرا بچہ کیسا ہے ...؟"

"بی بی ٹھیک ہی ہو گئے ہیں تو آپ کو بتایا بھی ہے۔ ورنہ شاید ابھی بھی زبان نہ کھولتی ..."

"آفرین ہے صاحباں تم پر۔ تم نے تو سگی بیٹیوں کو مات کر دیا"

اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کتنی دیر دیکھتی رہیں۔

"نہیں کسی ماں نے ایسی بیٹی جنی ہو گی"

"ہاں ... نہیں ... ماں نے ایسی بیٹی کو جنم دیا ہو گا"

صاحباں کی بھیگی بھیگی آنکھیں جُھک گئیں۔ وہ اپنے جنم پر خود ہی شرمسار تھی لیکن بی بی ... دوسرے ہی جذبوں میں سرشار اسے پیار کیے جا رہی تھیں۔

پھر ... یکا یک ہی ان پر بے قراریاں سوار ہو گئیں۔

"جاؤ ... ابھی جاؤ حارث کے پاس۔ کیا پتہ تمہارے میاں جی جلد ہی آ جائیں"

پھر وہ جھولی پھیلا کر اوپر چھت کی طرف دیکھنے لگیں۔

"اللہ! کوئی اچھی اچھی خبر ٹھنڈے پانی کی طرح اس ماں کے جلتے ہوئے سینے پر ڈال دے۔ چھ سال کی جلتی آگ کو اب بُجھا دے میرے مولا ...!"

"ہاں بی بی! آپ دُعا کیجئے کہ اب ماں بیٹے کی جُدائی کی یہ آخری گھڑیاں ہوں"

بی بی پھیلے ہوئے دامن کو سمیٹ کر وہیں سجدے میں گر گئیں اور خدا کے حضور گڑگڑانے لگیں۔

صاحباں چند لمحے کھڑی انہیں دیکھتی رہی پھر ہولے ہولے قدم اُٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔

بی بی نے حارث کے پاس جانے کی اجازت دے دی تھی اور شاید یہ اس کے ساتھ اس کی آخری ملاقات تھی۔

نہ جانے کیا بات نکل آئے اور معاملہ کہاں تک جا پہنچے۔ مصالحت کی کوئی صورت نہ نکلی تو وہ تو بہرحال بی بی اور میاں جی کا ساتھ دے گی۔

یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

کئی آنسو اس کے رُخساروں پر سے ہوتے ہوئے دامن میں جذب ہو گئے۔

دل نے آنکھوں سے ٹپکتے آنسو دیکھے تو ہولے سے بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صلح صفائی ہو جائے۔ آخر باپ بیٹے ہیں حقیقی باپ بیٹے۔ کوئی سوتیلا پن بھی درمیان میں نہیں ... اور چھ سال کی جُدائی نے دلوں کے پتھروں کو موم کر دیا ہو۔ خون میں ایسی طاقت یقیناً ہوتی ہے ... تب ..."

آس اور یاس کی گڈمڈ ہوتی ہوئی کیفیتیں چہرے پر، آنکھوں اور ہونٹوں پر، لئے حارث کے گھر تک جا پہنچی۔

دروازہ ہمیشہ ہی کی طرح کھلا ہوا تھا مگر حارث کمرے میں موجود نہیں تھا۔ سیدھی خواب گاہ میں پہنچی۔

"ارے!" حیران ہی تو رہ گئی۔ وہ ابھی تک سویا پڑا تھا۔

"حارث ...!"

وہ بڑھ کر اسے جھنجھوڑنے لگی۔

"آج دفتر نہیں جانا ...؟"

"کیا ہے ...؟" وہ آنکھیں ملتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"اتنا دن چڑھ آیا ابھی تک سوئے پڑے ہیں"

"تو تم نے جگایا کیوں ...؟"

"اتنے مزے کا خواب دیکھ رہا تھا"

حارث نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے پاس ہی پہلو میں پلنگ پر بٹھا لیا۔ پھر مخمور نگاہوں سے اسے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد آنکھیں میچ لیں۔

"میں نے دیکھا جیسے تم ہو اور میں ہوں اور ہم دونوں ...؟"

"وہ خواب تھا حارث ...!"

صاحباں نے اس کا خواب پورا ہونا ہی نہیں۔

"میں یہاں سچ مچ ہوں۔ بس اُٹھ جائیے اب۔"

"ارے ہاں۔"

حارث نے صاحباں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر دھر لیا۔

"یہ زیادہ خوبصورت خواب ہے۔"

بڑی خوبصورت مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی، کچھ اس طرح کہ ہونٹوں سے ہو کر پورے چہرے پر پھیل گئی۔

"بس اب تم چپ چاپ یوں ہی بیٹھی رہنا اور مجھے جی بھر کر یہ خواب دیکھنے دو۔"

"میں پوچھ رہی ہوں دفتر نہیں جانا؟"

"تم کہو تو نہیں جاؤں گا۔"

"ہاں۔ آج مت جائیے۔"

"کیا...؟"

حارث چونک کر اس کا ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں...!" یکایک ہی ایک عجیب سا تاریک سایہ صاحباں کے رُخِ روشن پہ لہرا گیا۔

"لیکن کیوں؟"

حارث غور سے اسے دیکھتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"خیریت تو ہے...؟"

اس لمحے اسے صاحباں کا چہرہ کچھ افسردہ سا لگا۔

"آج کا دن شاید ہماری ملاقات کا آخری دن ہو حارث!"

"نہ... صاحباں نہ..."

حارث نے ایک تڑپ، ایک بے قراری کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا مت کہو... میں۔ میں... اوہ کچھ نہیں...!"

حارث نے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"میں کسی کو کیا دے سکا ہوں آج تک۔ جواب کسی سے طلب کروں۔"

وہ بڑبڑایا۔ کتنی ہی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ ہونٹ کپکپاتے رہے۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا پھر نے کپکپاتے تھرتھراتے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا۔

"لیکن کیوں؟"

بڑی دیر بعد اس نے سر اُٹھا کر پوچھا "آج کی ملاقات آخری کیوں ہو گی؟"

آج میرے والد آ رہے ہیں۔ پانچ سات دن وہ رہیں گے اور پھر ہمیں ساتھ لے کر واپس چلے جائیں گے۔"

"یہ ان پانچ سات دنوں میں بھی تم مجھ سے نہیں ملو گی؟"

"وہ مجھے ایک پل کے لیے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔"

"تو... تو... سب کچھ ختم ہو گیا؟"

"ختم...؟ شاید ہاں۔"

اور صاحباں نے دیکھا۔ حارث کی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں کے گوشے کانپ رہے تھے آنکھوں میں کچھ افسردگی تھی، کچھ بے بسی اور کچھ نمی سی تیر رہی تھی... اور وہ ایک ٹک صاحباں کو تکے جا رہا تھا۔

"ارے! یہ کیا کر ڈالا صاحباں تو نے...؟ تو نے تو اس سے محبت اسی لیے کی تھی کہ اس کی زندگی میں پھیلی تاریکیاں دُور ہو جائیں پیار کی یہ روشنی اس کے روگ کا علاج بن جائے۔

مگر... اب تم خود ہی اس محبت کے خاتمے کا اعلان کر کے اس سے تمام روشنیاں چھین رہی ہو۔ اس کی زندگی کو پھر تاریکیوں دھکیلنے جا رہی ہو۔

کیا وہ یہ مرگ برداشت کر پائے گا؟ کیا وہ پھر انہی اندھیروں میں نہ ڈوب جائے گا۔ جن سے تو نے اسے نکالا تھا۔

پہلے ماں کی جدائی کے غم نے اسے بیمار کر دیا تھا اب کیا تمہاری جُدائی اُسے توڑ پھوڑ نہ دے گی۔ ریزہ ریزہ کر دے گی... شاید س سے بھی زیادہ...

پھر...؟ پھر تو کیسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکے گی؟ اس ٹوٹے پھوٹے انسان سے کیسے کوئی راز دریافت کر سکے گی؟ س نے اپنا ننھا سا، خوبصورت سا سر جھٹکا۔

اوہ صاحباں! تو واقعی بڑی احمق ہے۔ تجھے زندگی میں کچھ بھی نہ کرنا آیا۔ نہ پیار کرنا آیا نہ قربانی دینا آئی۔

وہ اپنے آپ پر خود ہی ہنس پڑی۔

پھر... ایک دم ہی کوئی سوچ ذہن میں اُبھری تو حارث کا ہاتھ تھامتے ہوئے دلفریب سے انداز میں ایک چھوٹا سا قہقہہ لگا اُٹھی "بس اب مذاق ختم۔ چلیئے اُٹھیئے۔"

"کیا...؟" حارث نے چونک کر ہاتھوں میں سے سر نکالا۔

"ہم انشاءاللہ ہمیشہ ملتے رہیں گے حارث!"

"تمہارے والد نہیں آ رہے؟"

"آ تو رہے ہیں۔ مگر وہ بھی میری بی بی ہی کی طرح نیک، فراخ دل اور فراخ حوصلہ ہیں۔"

"مجھے ان سے ملواؤ گی؟"

"ضرور..."

"اپنی بی بی سے بھی ملواؤ گی...؟"

"ضرور... لیکن یہ آج اچانک ہی ان سے ملنے کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

ابھی ابھی ایک احساس ہوا ہے۔ اس کے تحت۔"

"احساس...؟ کیسا احساس؟"

"کہ تمہارے بغیر۔ میں۔ میں... کیا کروں گا۔ یہ میری زندگی۔ یہ میرا وجود۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ کھویا کھویا سا بڑبڑاتا رہا۔ پھر یکایک مسکرا پڑا۔

"بھئی بس کہہ دیا ہے نا کہ میں تمہارے والدین سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اور وہی میں پوچھ رہی ہوں۔ کیوں...؟"

"ہے ایک بات۔ لڑکیاں نہیں پوچھا کرتیں۔"

حارث نے مسکراتے ہوئے صاحباں کی خوبصورت ناک پکڑ کر ہلکی سی مروڑ دی۔

"اور لڑکے بھی کوئی ایسی ویسی بات خود سے نہیں کیا کرتے۔"

حارث کے اس دلفریب انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے صاحباں شرما کر، لجا کر، بہت سُرخ ہو کر جُھکی جُھکی پلکوں کو مزید جُھکا کر ہولے سے ب۔ل "اپنے والدین کو بھیجا کرتے ہیں۔"

"عقلمند ہو بہت۔"

کسی سوچ میں ڈوبی تھی۔ حارث کی تعریف کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کھوئی کھوئی سی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں چلیں؟"

"پہلے ناشتہ کر لیں پھر باتیں کریں گے۔"

وہ من ہی من میں ان نعروں، ان سوالوں کو ترتیب دے رہی تھی، مناسب الفاظ مجتمع کر رہی تھی۔ ابھی ابھی جنہوں نے نہ صرف دل اور میاں جی کا زندگی کا بلکہ خود اس کی زندگی کا بھی ایک اہم ترین فیصلہ کرنا تھا۔

"اوہ محترمہ! میرا دفتر...!" وہ عجلت سے پلنگ پر سے اُترا۔ "باتیں دفتر سے آ کر ہوں گی انشاءاللہ! بہت ڈھیر ساری باتیں۔ یہ کان ری صرف تمہاری باتیں سُننے کے لیے ہیں۔"

مسکرا کر ایک پیار بھری نگاہ سے صاحباں کو دیکھتے ہوئے پاؤں میں سلیپر اڑسے اور جلدی سے غسل خانے میں گھس گیا۔

دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر باہر آیا تو صاحباں ناشتہ لیے بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ جلد جلد کھڑے کھڑے ہی انڈا اور توس کھانے لگا۔

"اور جناب نے فاقہ کرنا ہے کیا؟"

آدھا توس کھا چکا تھا۔ باقی آدھا سوچوں میں کھوئی بیٹھی صاحباں کے مُنہ میں ٹھونس دیا۔

"ہائے اللہ یہ کیا کر رہے ہیں ؟"

بھرے مُنہ کی وجہ سے پھنسے پھنسے حلق اور بگڑی بگڑی آواز سے صاحباں نے دہائی مچائی۔

"ناشتہ کر رہا ہوں"

"آپ کا مُنہ وہ والا ہے جناب حارث صاحب"

"میرا تو خیال ہے یہی ہے"

چمچ میں آدھے سے زیادہ انڈا بھرا اور اب وہ اس کے مُنہ میں گھسیڑ دیا۔

"اتنے سویرے میرے سر پر آدھمکی تھیں۔ صاف ظاہر ہے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہوگا"

"کیا تو واقعی نہیں تھا"

صاحباں نیپکن سے ہونٹوں کے اردگرد لگ جاتے والا انڈا صاف کرنے لگی۔

"لیکن خواہش بھی نہیں تھی"

"صاحباں...؟"

اس کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے حارث بھی سنجیدہ ہو کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"سچ سچ بتاؤ آج کوئی گڑبڑ ہے نا...؟"

صاحباں خاموشی سے اسے تکتی گئی۔ ہنستا کھلکھلاتا، ہوا، اس طرح شرارتیں اور چھیڑ چھاڑ کرتا ہوا کتنا اچھا کتنا شاندار لگ رہا تھا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر بھینچ لیے۔ جانے جی کو کیا ہوا جا رہا تھا۔

"ارے بولو نا... اپنے حارث سے بھی کچھ چھپاؤ گی؟"

"مگر آپ تو دفتر جا رہے تھے"

"گولی مارو دفتر کو"

وہ اُلجھ سا پڑا۔ صاحباں کے چہرے پر ہمیشہ والی مسکراہٹیں آج نہیں تھیں۔ وہ کچھ پژمردہ سی تھی۔

"میں آج دفتر نہیں جاؤں گا"

اس کی نگاہیں صاحباں کے افسردہ چہرے پر جمی رہیں۔

"چھٹی...؟"

"ہاں آج چھٹی"

حارث نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے سر ہی سے نکالتے ہوئے پرلی کرسی پر پھینک دی۔

"لیکن خواہ مخواہ چھٹی کر لینا بھی تو مناسب نہیں"

اچانک اسے حارث کے اصولوں کا خیال آ گیا۔

"فکر نہ کرو۔ میں حق حلال کی کھانے کا عادی ہوں کہ اگر ایک دن بلاوجہ چھٹی کر لوں گا تو اگلے چار دن اتنا کام کروں گا کہ کفارے جرمانے سمیت کسر پوری ہو جائے"

پھر اس نے صاحباں کو شانوں سے پکڑ کر اپنی جانب موڑ لیا۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے؟ اڑنے کی کوشش نہ کرنا"

"پَر ہی نہیں ہیں۔ کس بل بوتے پر اُڑنے کی کوشش کروں گی"

بلاوجہ آپ ہی آپ صاحباں کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

"صاحباں! میرے صبر کا امتحان نہ لو۔ میں بہت کمزور ہوں۔ اپنا بڑے سے بڑا دکھ سہہ سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھ کا ایک ننھا آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بتاؤ... کیا بات ہے؟"

"ایک شرط پر بتاؤں گی"

"ہر شرط منظور"

"آپ پہلے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ جو پوچھوں گی وہ ضرور بتائیں گے۔ بالکل اپنا سمجھتے ہوئے چھپائیں گے کچھ نہیں"

صاحباں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"خواہ کیسی بھی بات ہو"

"کیا...؟"

حارث کا رنگ یکایک پیلا پڑ گیا اور آنکھوں کی چمکتی چمک ماند پڑ گئی۔

"تم صاحباں! کیا پوچھنا چاہ رہی ہو؟ کسی نے تم سے میرے متعلق کچھ کہا ہے؟ میرے ماضی کے متعلق؟"

صاحباں حارث کی بدلتی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ بے حد سرد ہو رہے تھے۔ ...دبا کر اپنے ہاتھوں سے ہولے ہولے سہلانے لگی۔ جیسے بات کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیار اور اپنی توجہ کا اسے سہارا دینا چاہ رہی تھی۔

"آپ کا اپنے گھر والوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا ہوا ہے۔ تبھی آپ اکیلے رہ رہے ہیں"

صاحباں نے بہت نرم اور دھیمے سے لہجے میں پوچھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بغور دیکھا۔

"جھگڑا؟ گھر والوں کے ساتھ میں اکیلا؟"

حارث کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

اس کے لب کپکپا رہے تھے اور ہاتھ ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ صاحباں کے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ تھے۔ ٹھنڈک محسوس ...کرتے ہی اس نے اس کے یکایک سرد ہو جانے والے ہاتھوں کو زور سے دبا کر اپنے رُخساروں کے ساتھ لگا لیا۔ پھر بڑے پیار سے ...دیکھتی ہوئی مسکرائی۔

"کسی نے بھی... لیکن آپ اتنا پریشان کیوں ہو گئے ہیں؟"

اس نے اس کے حواس کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی محبت اور لگاؤ کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں ...سے لگا لیا۔

"میری نگاہوں میں حارث! آپ کا جو مقام بن چکا ہے وہ اب ایسی منزل پر ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی بھی بات ہو جائے تو ...وہ وہیں کا وہیں رہے گا"

صاحباں کی آنکھیں اس کی پھیلی پھیلی آنکھوں میں کچھ ایسے مرکوز تھیں جیسے وہ ان ہی کے راستے اس کے پورے کے پورے وجود کو ...اپنے میں سمو کر دنیا کی ساری آفات سے بچا لینا چاہتی تھی۔

"بلکہ... حارث: بلکہ اگر آپ نے مجھ پر اعتماد کر لیا تو شاید نہیں۔ یقیناً آپ کا یہ اعتماد میری نگاہوں میں آپ کی یہ قدر و منزلت کچھ اور بڑھا دے ...گا کہ آپ نے مجھے اتنا اپنا جانا۔ ایسا درجہ دیا"

کئی لمحے پھیلی پھیلی نگاہوں سے صاحباں کے ہر خلوص، ہر محبت اور مہربان وجود کو تکتے رہنے کے بعد کسی معصوم بچے کی طرح حارث نے ...اس کی آغوش میں چہرہ چھپا لیا۔

"تم نے کیسی بات مجھ سے پوچھ لی؟ یہ آج تم کیسا ذکر لے بیٹھیں؟ کیا یہ جانے بغیر میرا تمہارا، تمہارا اور میرا دوستی کا بھی تعلق باقی نہیں ...رہ سکتا"

اس کی آواز میں کرب تھا اور دنیا جہاں کے دُکھوں کی فریاد۔

"کیوں نہیں۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ صاحباں اب آپ کی ہو چکی، دنیا کی کوئی طاقت، کوئی بات، کوئی واقعہ اب اسے آپ ...سے جدا نہیں کر سکتا"

صاحباں نے آغوش میں چھپے ہوئے اس بچے ایسے معصوم چہرے کو اوپر اُٹھایا۔ اس کی آنکھیں دُھندلا سی تھیں اور وہ عجیب سی ...بے بسی سے اسے تک رہا تھا۔

اس لمحے، عین اس لمحے بی بی کی خاطر جس قربانی کے جذبے کو لے کر حارث کے پاس آئی تھی وہ جانے کہاں کھو گیا۔ اس کا خیال ...کا موہوم تک ذہن میں دُور دُور نہ تھا۔

اندر باہر، اردگرد، صرف حارث اور اس کی دو دُھندلائی ہوئی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں، محسوس ہو رہی تھیں، اور کسی ...دُکھ کی کہانی سُنا رہی تھیں جو زبان تک لانے سے قاصر تھیں۔

"نہیں نہیں صاحباں! تو حارث کے زخم نہیں کریدے گی۔ وہ پہلے ہی بہت دُکھی ہے تو اسے مزید دُکھ نہیں دے گی۔ تو نے ...اس سے محبت کی ہے اور جس سے محبت کی جائے اسے صرف خوشی دی جا سکتی ہے اور سکون پہنچایا جا سکتا ہے۔ بس..."

کئی لمحے گزر گئے۔ حارث کا چہرہ ہنوز اس کے ہاتھوں میں تھا اور اس کی دُھندلائی آنکھیں اس پر یوں جمی تھیں جیسے رحم ...کی التجا کر رہی ہوں۔

"نہیں۔ نہ بتائیے حارث!"

ایک بے قراری کے ساتھ صاحباں نے اس کی پیشانی کو، اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔ پھر بڑے جذباتی انداز میں اس کے چہرے

کو وہیں اپنی آغوش میں چھپاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

"میں آپ کو دُکھ دینا نہیں چاہتی کبھی نہیں۔ کبھی نہیں حارث!"

"اوہ...!" حارث نے سر اُٹھایا

صاحباں کے پیار کا یہ انداز اور اس کی ہستی کے لیے یہ بھرپور اعتماد، حارث کو اُلٹ پلٹ کر گیا۔

اس کے چہرے پر بکھرے خلوص و محبت کے اَنمٹ رنگوں کو دیکھتے ہوئے یکایک بولا۔

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

وہ جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ نگاہیں صاحباں کے روشن چہرے پر جمی تھیں۔ چہرے سے متضاد قسم کی کیفیت عیاں ہو رہی تھی۔

"نہیں حارث! نہیں... میں کچھ نہیں پوچھنا چاہتی۔ کچھ نہیں جاننا چاہتی۔"

صاحباں اس کی ان کیفیات میں ڈوبتی اُبھرتی سہمی سہمی سی بولی۔

"کبھی بھی نہیں جاننا چاہوں گی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

"کیوں...؟ غلطی کیوں؟"

حارث نے اس کے شانے بڑی مضبوطی سے تھام لیے۔

"تمہیں حق ہے میرے متعلق سب کچھ جاننے کا۔ اور..."

پھر اس نے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک والہانہ انداز سے دیکھا۔

"آج کے ان لمحوں کے بعد، جبکہ تم نے اپنے پیار اور محبت کے اتنے بڑے اعزاز سے مجھے نوازا ہے تو میں تم سے... گا تو میرا ضمیر ہی مجھے ملامت کرے گا۔"

ایک بے حد خوبصورت تبسم اس کے ہونٹوں پر لہرایا تو صاحباں کا پورا وجود اس کی روشنیوں میں نہا گیا۔

"ہماری کوئی بات ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تم ہوں صاحباں اور تم میں ہو۔"

اوہ! صداقت، خلوص اور محبت کے اتنے ڈھیر سارے جذبے۔ صاحباں کہیں تم پاگل نہ ہو جاؤ۔

"ہاں صاحباں! سُنو۔ میں کون ہوں اور...؟"

"حارث...!"

اس کا لہجہ بکھرا بکھرا سا تھا۔ صاحباں نے ڈر کر، سہم کر، یکایک ہی اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ کہنے سے...

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے...؟"

"ہاں" وہ مسکرا دیا۔

"ہمیشہ سے بہت زیادہ ٹھیک ہوں۔"

پھر وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا اور اس کی فکر و تشویش بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مدھم سے لہجے میں بولا۔

"میرے متعلق سب کچھ جاننے کے بعد اگر مجھ سے نفرت ہو جائے اور مجھ سے تعلق توڑنا چاہو تو زبان سے کچھ نہ... چُپ چاپ اُٹھ کر چلی جانا...!"

صاحباں آنکھیں جھپکے جا رہی تھی اور اس کی بات بڑے غور سے سُن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جھانکنے والے سائے معدوم ہو چکے تھے اور ان کی جگہ ایک گھمبیر سی سنجیدگی پھیل گئی تھی۔

"جس مُنہ سے میں محبت کے پھول جھڑتے دیکھتا رہا ہوں شاید وہاں سے نفرت کے انگارے برستے برداشت... میری ہستی جل کر ایسا سُلگتا کوئلہ بنے کہ جو نہ راکھ ہو سکے اور نہ حدت دے سکے۔"

صاحباں نے بے کل سی ہو کر جواب میں کچھ کہنا چاہا تو حارث نے اس کے ادھ کھلے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ...

"سُنو صاحباں! بات دراصل یہ ہے...!"

وہ جو ابھی کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا، کپکپا رہا تھا، اب اس کے لہجے میں ایسی پختگی تھی کہ صاحباں بھی سامنے... طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

"میں ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہوں!"

میاں جی اور بی بی کا خاندان کیسا تھا۔ یہ اس سے زیادہ صاحباں خود جانتی تھی۔ حارث کے اس مذاق پر وہ... قہقہہ لگانے لگی تھی کہ وہ جلدی سے مزید بول پڑا۔

"اچھے سے میرا مطلب ہے۔ شریف خاندان"

"شریف خاندان...؟" اور اب صاحباں اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

"کیا ہوا...؟ یہ ہنسنے والی بات ہے؟ میں تو اسے دُکھ کی بات سمجھتا ہوں۔"

وہ اسی طرح سنجیدہ تھا اور اس کی سنجیدگی دیکھ کر صاحباں کی ہنسی ٹوٹ سی گئی۔ بکھرے بکھرے سے لہجے میں بولی۔

"شریف خاندان سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"باپ سے خاندان بنتا ہے نا اور میں ایک غلط باپ کا بیٹا ہوں صاحباں! ایسے باپ کا جو عورتوں کا کاروبار کرتا ہے۔ ایک بردہ فروش کا بیٹا ہوں میں۔"

اور اپنا تعارف اور فقرہ مکمل کرتے کرتے اس کا لہجہ ایک چیخ سا بن گیا۔

"ہاں... میں... ننگِ انسانیت باپ کا بیٹا ہوں۔ میں... میں حارث..."

...

آواز کے ساتھ ساتھ حارث پر گڑی صاحباں کی آنکھیں بھی یوں پھٹیں جیسے ابھی باہر آ جائیں گی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں صاحباں! یہ سچ ہے۔ ایک ایسی تلخ حقیقت، کہ یہ جب سے مجھ پر آشکار ہوئی ہے میں دُنیا سے مُنہ چھپاتا پھر رہا ہوں۔ میرا باپ لڑکیوں کا کاروبار کرتا ہے اور یہی میرے اور اس کے درمیان جھگڑے کا باعث ہے۔"

"نہیں نہیں"

صاحباں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"والدین کے نام پر ایسا مذاق نہیں کیا کرتے؟"

"مذاق...؟ تم اسے مذاق سمجھ رہی ہو...؟"

ایک زہر خند حارث کے لبوں پر نمودار ہوا۔

"تم ایک شریف خاندان کی لڑکی ہو نا۔ اس لیے اس سچائی کو بھی مذاق یا جھوٹ سے ہی تعبیر کرو گی۔ یہ ایسی گھناؤنی بات ہے کہ تم یقیناً یقین کرنے سے کتراؤ گی لیکن یہ حقیقت ہے صاحباں! بالکل سچ ہے۔ ورنہ ایک دولت مند باپ کا، ایک صاحبِ جائیداد باپ کا مجھ ایسا اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹا یوں گمنامی کے ایک گوشے میں پڑا اپنی ہستی کو یوں جلا نہ رہا ہوتا۔"

"نہیں... نہیں... نہیں"

صاحباں ہذیانی انداز میں چلائی۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

میاں جی کی شان میں وہ ایسی ایسی گستاخیاں کئے جا رہا تھا... کیسا ناخلف اور کمینہ تھا وہ... ان جیسا عزت دار، باوقار اور شریف انسان تو رُوئے زمین پر کوئی اور نہ ہو گا۔

غصے سے تھرتھراتے اور بے قابو سا ہوتے ہوئے صاحباں نے پوری قوت سے حارث کے مُنہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا... دفورِ طیش سے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

"تم اپنے کسی گناہ کا الزام ان کے سر دے رہے ہو۔ وہ ایسے نہیں ہیں اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں۔"

حارث متحیر سا ہوتے ہوئے چوٹ کھائے رخسار کو ملنے لگا۔ یہ صاحباں کو ایکا ایکی کیا ہو گیا تھا...؟ بات اس کے باپ کی تھی اور غصے میں وہ یوں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

"تم خود کمینے ہو۔ ذلیل ہو۔ اپنے اتنے نیک اور پارسا باپ پر ایسے بہتان باندھتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیئے؟"

وہ جنونی انداز میں چلائے جا رہی تھی۔ ہمیشہ حارث سے بڑی عزت اور احترام کے ساتھ ہم کلام ہوا کرتی تھی مگر اس رات سب لحاظ اُٹھ گئے تھے۔ جانے کیوں...؟

صاحباں... صاحباں...!

حارث نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا ہو گیا...؟ تم نے میری پوری بات سُنی بھی نہیں اور..."

"میں کچھ سُننا نہیں چاہتی"

صاحباں اس کی بات قطع کرتے ہوئے اسی انداز میں چلائی۔

مزید ایک لفظ نہیں... ایک حرف نہیں!"

"بس اسی محبت کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ یہی تمہارا خلوص تھا کہ میں جیسا بھی ہوں، میرا ماضی جیسا بھی ہو گا تم ہر حال اسے قبول کرو گی۔"

"میں نے تمہارے متعلق کہا تھا۔ صرف تمہارے متعلق۔ مگر یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارا اخلاق و کردار ہو گا کہ اپنی صفائی کی خاطر اپنے باپ پر۔ توبہ... توبہ..."

صاحباں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھی

"جس شخص کی نگاہ میں بزرگوں کا کوئی احترام یا عزت ہی نہ ہو وہ کسی بھی دوسرے کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتا اور ایسے شخص کے گھر میں ایک پل نہیں ٹھہر سکتی۔"

"مگر صاحباں! ایک منٹ کے لیے میری بات تو سنو۔"

حارث نے چلتی چلتی کا بازو تھام کر اسے روک لیا۔

"نہیں نہیں..." صاحباں دانت پیستے ہوئے آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے مزید زور سے چلائی

"میں نہیں سنوں گی۔"

حارث کے والد، جن پر وہ الزام لگا رہا تھا، وہ صاحباں کے میاں جی تھے اور میاں جی نے صاحباں کے لیے جو کچھ کیا تھا، جو کچھ دیا تھا وہ ایک لمحے کے لیے فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بے فیض نہیں تھی۔ وہ نمک حرام نہیں تھی۔ وہ محسن کش نہیں تھی۔

"تمہیں میری بات سننا پڑے گی۔"

وہ خواہ مخواہ ہی غصے میں آئی جا رہی تھی۔ حارث کو بھی غصہ آ گیا۔

"میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا تم زبردستی مجھ سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ زبردستی میرے گھر میں گھس آئی تھیں۔"

حارث نے اس کے بازو کو جھٹکا دے کر اسے صوفے پر گرا دیا۔

"اور آج میں منت کر رہا ہوں اور تم میری ایک بات نہیں سن رہیں۔"

"ایک نہیں میں تمہاری سو باتیں سنتی مگر میں اپنے میاں جی کے متعلق کوئی بات نہیں سن سکتی۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی نہیں..."

صاحباں اسی انداز میں گرجی۔

"تم جو کچھ کہو گے وہ غلط ہو گا۔ مجھے ان پر اتنا اعتماد ہے۔"

"کن پر...؟"

حارث کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہیں آئی۔ تعجب سے اسے گھورنے لگا۔"

"یہ تم کن کی بات کر رہی ہو...؟"

"اپنے میاں جی کی۔ جن کے متعلق تم ایسی گندی باتیں کر رہے ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو صاحباں؟ بخدا میں نے تمہارے میاں جی کو تو کچھ نہیں کہا۔ میں تو اپنے میاں جی کی بات... ارے..."

وہ ایک دم چونکا۔ پھر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے صاحباں کے غصے میں کپکپاتے ہونٹ اور تمتماتے چہرے کو دیکھنے

"بی بی... میاں جی... بی بی... میاں جی... میری ماں اور باپ اور... اور تمہاری بھی بی بی اور میاں جی..."

چند لمحوں کے لیے وہ سوچوں میں کھویا کھویا اسے گھورتا رہا اور بڑبڑاتا رہا پھر یکایک بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام

"یہ سب کیا ہے؟ تم کون ہو؟ مجھے سچ سچ بتاؤ تم کون ہو...؟"

تجسس نے اسے بے قرار سا کر ڈالا۔ اس کی ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔

"میں کوئی بھی ہوں۔"

صاحباں نے اپنے کندھے اس سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اتنے مضبوط اس نے تھامے ہوئے تھے کہ اپنی کوشش پر بھی رہی اور اس سے خوفزدہ بھی ہو گئی۔ سہمی سہمی سی بولی۔

"کوئی بھی ہوں لیکن... لیکن آپ کو میاں جی کی شان اور عزت کے خلاف کچھ بھی کہنے کا حق نہیں دوں گی۔"

"عجیب معاملہ ہے۔ میں اپنے باپ کی بات کر رہا ہوں اور آگ بگولہ تم ہوئی جا رہی ہو۔"

حارث نے مشکوک نگاہیں اس کی خوف سے سہم کر مزید خوبصورت ہو جانے والی آنکھوں میں مرکوز کر دیں۔

"یہ معمہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔"

پھر وہ قدرے توقف کے بعد نرمی بھری سنجیدگی سے بولا۔

"تم نے قسم ڈال کر مجھ سے جھگڑے کی وجہ پوچھی تھی نا۔ وہ میں نے ایمانداری سے بتا دی۔"

"نہیں ایمانداری سے بتائی نا۔"

حارث کا لہجہ دھیما پڑا۔ صاحباں کے کندھوں پر اس کی سخت گرفت نرم پڑ گئی تو اس کا خوف بھی دور ہو گیا۔ وہ پھر بکھری۔ میاں جی کی عزت اور احترام اور پاکبازی کا تقاضا یہی تھا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"میری قسم پر اعتبار کرو گی...؟"

اور... قسم پر اعتبار نہ کرنے والا کافر ہوتا ہے... صاحباں کو میاں جی کی نصیحت یاد آ گئی۔ خدا کے نام پر کوئی جھوٹ بھی بول دے تو سننے والے کو سچ مان لینا چاہیے۔

"ہاں..."

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ اپنے سے بھی زیادہ۔ تمہارے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے..."

حارث نے صاحباں کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"میں اگر ایک لفظ بھی غلط کہوں تو اس عزیز ترین ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤں۔ اب تو میری بات کا یقین کرو گی...؟"

یقین... یقین بہت چھوٹا لفظ تھا۔ حارث کی آنکھوں میں سچائی تھی اور الفاظ میں صداقت کا وزن۔

میاں جی کی نصیحت تو جھوٹ کو سچ مان لینے کی تھی مگر اس وقت تو حارث کا پورا وجود ایک مجسم سچائی اور حقیقت نظر آ رہا تھا۔

صاحباں نے سر جھکا لیا۔ جیسے وہ جو کچھ کہے گا، اس کے لیے پتھر پر لکیر ہو جائے گا۔

"اتنا عرصہ میں اپنے والدین کے متعلق کچھ بھی بتانے سے گریز کرتا رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا باپ ایک بردہ فروش ہے۔ کسی سے میل جول نہیں رکھتا تو اسی لیے کہ میں ایک غلط باپ کا بیٹا ہوں۔ کسی کو میری اصلیت کا علم نہ ہو جائے۔"

ایک طویل سا دکھوں سے پر، سانس لے کر حارث نے صوفے کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

"دنیا تو دنیا میں تو خود اپنے آپ سے منہ چھپانے کی کوشش میں رہتا تھا۔ میں اسی لیے بداخلاق اور بدمزاج بن چکا تھا کہ کوئی خود ہی میرے قریب نہیں آئے۔ نہ کوئی میرے قریب آئے گا اور نہ ہی یہ جان سکے گا کہ... کہ..."

دکھ کی انتہا سے حارث نے آنکھیں میچ لیں۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے۔ جیسے وہ نہیں چاہتا تھا... مگر... صاحباں نے، اس کی قسم نے، اس کے وجود نے اس کے سارے زخم ننگے کرنے پر اسے مجبور کر دیا تھا۔ اس کے سارے ٹانکے ادھیڑ ڈالے تھے۔

صاحباں نے حارث کا ٹھنڈا ٹھنڈا لرزتا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت، اسے اس کی محبت کے سہارے کی ضرورت تھی... یہ وہ لمحہ تھا۔ صاحباں نے اس کے ہاتھوں کو سہلانا شروع کر دیا۔

"یہی میرا سب سے بڑا دکھ تھا صاحباں!"

حارث نے صاحباں کے ہاتھوں کا گرم گرم لمس محسوس کرتے ہی آنکھیں کھول دیں۔

"اسی دکھ نے مجھے روگ لگا ڈالا تھا۔ مجھے اپنی بی بی سے بڑا پیار تھا صاحباں!"

حارث نے اس کے ہاتھوں کو اپنے سرد کپکپاتے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ آنکھوں میں وہی جوت پھر اتر آئی۔

"اسی وجہ سے، اپنے باپ کے اس ذلیل دھندے کی وجہ سے میں اپنی اتنی پیاری ماں سے جدا ہو گیا۔"

"حارث! آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔"

یہ سب سن کر صاحباں کا اپنا وجود ٹوٹنے بکھرنے لگا تھا۔ تب کچھ اپنی خاطر کچھ حارث کے لیے وہ مجبور سی ہو گئی... شاید... شاید... اے کاش! صاحباں تیرے اس سوال کا جواب مثبت ملے۔ تو ریزہ ریزہ ہونے سے بچ جائے۔

"غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے...؟"

"حارث ہاں کہہ دو... حارث ہاں کہہ دو۔" صاحباں کا رواں رواں جیسے اس سے التجا کر رہا تھا۔

"میرے باپ کا معاملہ تھا صاحباں! نہ صرف حقیقی باپ کا بلکہ ایک آئیڈیل باپ کا... صاف ظاہر ہے اس بت کو کسی بہت ثبوت کے وزنی ہتھوڑے نے ہی توڑا ہو گا۔ کہ جس کے ساتھ ساتھ میں خود بھی ٹوٹ کر بکھر گیا۔"

حارث نے سر جھکا یا اور ہاتھوں میں اسے تھام لیا۔

"میں بارہ سال کا تھا جب مجھے میرے والد نے اپنے سے، ماں سے اور وطن سے جُدا کر دیا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو۔ صرف اسی لیے کہ میں جب سنِ شعور کو پہنچوں تو باپ کے کاروبار کا مجھے علم نہ ہو سکے۔ مگر... مگر۔"

"حارث! مجھے آپ کی ہر بات کا یقین ہے۔ بس کریں اب۔"

صاحباں بھرائی اور تھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کاش تم نے اس موضوع کو نہ چھیڑا ہوتا اور اب... مجھ سے میری ذلّت کی داستان تم نے سُننا چاہی ہے تو پوری سُنو اور تفصیل سے سنو۔"

"نہیں حارث! مجھ میں ہمّت نہیں ہے۔ مزید کچھ بھی مت کہیئے۔"

"سُننے کی ہمّت نہیں ہے۔ اور میں... میں تو تن من پر سہتا رہا ہوں۔"

حارث کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بولے چلا گیا۔

"میں سمجھتا تھا مجھ ایسا خوش نصیب انسان دُنیا میں کوئی اور نہ ہوگا میرے پاس انجینئرنگ کی سب سے اعلیٰ ڈگری تھی، میرے پاس جوانی تھی۔ وجاہت تھی۔ بانکپن تھا۔ مزاج کی زندہ دلی تھی۔ ذہن کی تازگی تھی۔ میرے پاس نیک والدین تھے اور ان کی بے شمار محبتیں اور خلوص تھا اور سب سے بڑھ کر باپ کی نیک کمائی سے بنائی ڈھیروں ڈھیر جائیداد تھی جس کا میں واحد وارث تھا۔"

"حارث...!"

صاحباں نے ڈوبی ڈوبی آواز میں اسے پُکارا مگر وہ خود ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آواز اس تک پہنچ ہی نہ سکی۔

بڑے فخر اور سر بلندی کے ساتھ میں نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ میرے حوصلے، میرے ارمان پورے شباب پر تھے۔ والدین کے لیے، وطن کے لیے، اپنے لئے، آنے والی نسلوں کے لئے بہت کچھ کرنے کی تمنّا دل میں مچل رہی تھی... مگر..."

"حارث! ایک بات تو سُنئے۔"

"مگر... ان سب کے ساتھ ساتھ میں جو سیاہ تختی اپنی پیشانی پر سجالایا تھا اسے کہاں لے جاتا۔ مجھے یہ کامرانیاں، یہ شادمانیاں راس نہ آئیں۔ تقریباً دو مہینے بعد ہی مجھے اپنے والد کے ایک شریکِ کار سے پتہ چلا کہ وہ مل کر لڑکیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں سے معصوم، کم عمر اور خوبصورت لڑکیاں اغوا کرتے ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں، قبائلی علاقوں میں اور سرحد پار فروخت کر دیتے ہیں۔"

"شاید حارث! اس آدمی نے الزام تراشی کی ہو۔"

صاحباں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی سُرخی غائب تھی اور وہ کپکپا رہے تھے۔ اس کے رخسار زرد تھے اور پلکیں بھیگی جا رہی تھیں۔

"میں نے بھی اپنے دل کو یہی کہہ کر تسلی دی تھی۔ مگر بہلاوے بہلاوے ہی ثابت ہوئے۔ میں نے چوری چھپے تحقیق کی سب سچ تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ دلائل کے ساتھ درُست تھا۔ ثبوت موجود تھے۔ میری یہ آنکھیں... ہاں۔ میری یہی گنہگار آنکھیں عینی شاہد ہیں... کچھ بھی غلط نہ تھا... پھر... پھر...؟"

حارث نے ہاتھوں میں تھاما ہوا سر اونچا کیا۔ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ صاحباں کی طرف دیکھا... اس کا وجود اس کا چہرہ بھی صاف دکھائی نہیں دیا۔ دُھند ہی دُھند تھی ہر طرف...

"ایک دن میری بی بی گھر میں نہیں تھیں۔ تب میں نے میاں جی سے بات کی۔ کمرے کے اندر گھُس کر۔ سارے دروازے کھڑکیاں بند کر کے... اپنے سے بھی چھپا کر۔ شرم آ رہی تھی مجھے... لیکن۔ مجھے بات کرنا پڑی۔ یہ صرف میرا اور ان کا معاملہ نہ تھا۔ پوری قوم کا تھا۔ انسانیت کا تھا۔ عزّتوں اور عصمتوں کا تھا۔ پورے وطن کا تھا۔"

حارث نے آنکھیں جھپکیں۔ دُھند چھٹے تو وہ صاحباں کو ایک نظر دیکھ پائے۔ وہ اس کے لیے کر تو کچھ نہیں سکتی تھی مگر اس کی نگاہوں کی تسلی ہی اس خاناں برباد کے لیے بہت تھی اور اس کا وجود سامنے، قریب ہی صوفے پر موجود تو تھا مگر نظریں اس کی تسلّی تک نہ پہنچ پائیں۔ اس کا سر صوفے کی پُشت کے ساتھ ٹکا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

"میری بات میاں جی نے سُنی۔ پہلے تو مانے ہی نہیں۔ اور پھر میں نے ان کی اکلوتی اولاد کی جب انہیں قسم دی تو... تو صاحباں

انہوں نے میری بات کا اعتراف کر لیا اور نہ صرف اعتراف بلکہ مجھے بتایا کہ یہ سب کچھ وہ میری ہی خاطر کر رہے تھے۔ صرف میری خاطر... میری زندگی کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے۔ میرے لیے دُنیا کی ہر نعمت اور آسائش مہیا کرنے کی خاطر... تو اس ناکردہ گناہ کا گنہگار میں تھا... سُن رہی ہو صاحباں...!"

اس نے دم بخود پڑے صاحباں کے وجود کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"ایسا کبھی کہیں ہوا ہوگا جو میرے ساتھ ہوا۔ پھر میں نے میاں جی کو یہ کاروبار چھوڑ دینے کو کہا۔ مجھے کسی آسائش کی ضرورت نہیں۔ مجھے دولت نہیں چاہیئے۔ میں نے بڑی منتیں کیں۔ واسطے دیئے۔ مگر وہ نہیں مانے۔ دولت کی ہوس نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ میرے لیے نعمتیں اور آسائشیں مہیا کرتے کرتے وہ خود لالچ کی دلدل میں اس بُری طرح پھنس چکے تھے کہ نکلنا چاہتے تو نکل نہیں سکتے تھے۔"

حارث نے ایک طویل سانس لیا۔ جیسے اتنا لمبا اور کٹھن سفر صدیوں سے طے کر رہا تھا کہ اب اس میں مزید ایک قدم چلنے کی سکت نہ تھی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن پھر... ایک لمحے کے بعد ہی پھر اس کی زبان چل پڑی۔

آج وہ اپنے سارے دُکھ اپنی صاحباں کے سامنے کھول کر رکھ دینا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے دُکھ بانٹنے کی قسم کھائی تھی۔ اس نے ہر حال میں اس کا ساتھ دینے کو کہا تھا۔ گو اس کے زخموں کے ٹانکے کھُل رہے تھے مگر وہ تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جس کی اسے توقع تھی۔ وہ ایک ہلکا پن سا محسوس کر رہا تھا۔

"نہ صرف میاں جی نے میری کوئی التجا ماننے سے انکار کر دیا بلکہ انہوں نے مجھے بھی اس کاروبار میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ میری جوانی اور وجاہت ان کے کاروبار کو ترقی بخش سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے کئی قسم کے لالچ دیئے۔ مگر میں نہیں مانا۔ میں..."

حارث نے پھر نظر اُٹھا کر صاحباں کی طرف دیکھا وہ اسی طرح گم سُم بیٹھی تھی۔ ہوں ہاں تک نہیں کر رہی تھی۔ کسی قسم کی حیرت یا تعجب کا اظہار بھی نہیں۔ ایک بے جان لاشے کی طرح ساکت تھی۔

"میں، جو بالکل مختلف قسم کا انسان ہوں۔ میرا بچپن بی بی کی مقدس گود میں گزرا تھا۔ وہ خاصی مذہبی قسم کی عورت تھیں۔ اس لیے میری تربیت بھی مذہبی انداز و اقدار کی روشنی تلے ہوئی تھی۔ نیک و بد اور حلال و حرام سے اچھی طرح آشنا تھا۔ گو بارہ سال کی عمر میں گھر سے دُور انگلستان ایسے ماحول میں بھیج دیا گیا تھا۔ شاید اسی لیے کہ بی بی کی تربیت کا اثر زائل ہو جائے اور میں میاں جی کے کام کا آدمی بن جاؤں مگر... مگر صاحباں...!"

صاحباں اسی قدر خاموش کیوں تھی۔ وہ شاید اس کی کوئی بھی بات سُن نہیں رہی تھی۔ کوئی بھی تو تاثر اس کے چہرے سے عیاں نہیں ہو رہا تھا۔

"صاحباں! سُن رہی ہو نا؟" حارث نے اس کا گھٹنا ہلایا۔

"ہاں..."

جیسے کسی کنوئیں کی گہرائی سے آواز اُبھری۔ اتنی مدّھم تھی۔ چلو جیسی بھی تھی۔ اس کے کان تو اس پر ہی لگے تھے۔ وہ پوری طرح اس کے دُکھ میں شریک تو تھی... حارث پھر بولنے لگا۔

"یہ میری بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی۔ میں انگلستان میں دس سال رہنے کے بعد بھی میاں جی کی مرضی کے مطابق انسان نہیں بن سکا تھا۔ تب میرے انکار پر انہوں نے مجھے عاق کر دینے کی دھمکی دی۔ انہوں نے تو دھمکی دی تھی مگر میں خود اب ایسے ذلیل دھندے سے کمائی ہوئی روٹی کا ایک نوالہ نہیں توڑنا چاہتا تھا اور نہ ان آسائشوں میں زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ میرے من میں مذہب کی روشنی تھی اور بی بی کی نیک تربیت کا اثر۔ میں نے باپ کا گھر چھوڑ دیا۔"

ایک بار پھر حارث کی جوشیلی آواز پر آنسوؤں کی دُھند چھانے لگی۔

"باپ کا گھر چھوڑنے کا مجھے ذرا افسوس نہیں ہوا نہ کوئی دُکھ۔ ہاں البتہ بی بی..."

اس نے ایک طویل سانس لیا۔ دو آنسو آنکھوں سے ڈھلک کر رُخساروں پر بہہ گئے۔

"بی بی سے جدائی ایک ناقابلِ برداشت اذیت تھی اور وہ میں نے بی بی کی خاطر سہی۔ اس نیک اور مقدس عورت کو شوہر کے کاروبار کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ جیسی خود تھی ویسا ہی اسے سمجھتی تھی۔ اس نے جو ذہن ہی ذہن میں ایک نیک پرہیزگار اور کئی اعلیٰ صفات سے مزیّن شوہر کا بُت تعمیر کیا ہوا تھا میں نے اسے قائم رکھنے کے لیے باپ کے متعلق بھی پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی۔ کرانا چاہتا تھا مگر... میں ایسا نہ کر سکا۔ جانتا ہوں یہ بھی ایک گناہ ہے۔ کسی کا جُرم چھُپانے والا بھی مجرم ہوتا ہے مگر

یہاں اس معاملے میں میں بہت کمزور ثابت ہوا۔ مجھے یقین تھا جس دن بی بی کو سب کچھ معلوم ہوا تو وہ زندہ نہ رہ سکیں گی۔ وہ مر جائیں گی اور ماں کی موت ... نہیں ... نہیں ... خدا کرے میری بی بی سدا سلامت رہیں۔"
ہاتھوں میں تھاما جھکا سر نکال کر اس نے اونچا کیا۔
"سنا صاحباں! یہ میرا ماضی ہے۔ یہ میرا حال ہے اور یہی میرا مستقبل ہے۔ کیسا ذلت آمیز، کتنا گھناؤنا اور کتنا ... باپ کے گناہوں کا کفارہ کس کس طرح میں نے ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔"
اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ بھرائی ہوئی آواز کو کھنکار کر صاف کرنے کی ناکام سی کوشش کی۔
"میرے پاس انگلستان کی اعلیٰ ڈگری ہے۔ میری تنخواہ پانچ ہزار روپیہ مہینہ ہے۔ مگر میں نے دنیا کی ہر آسائش ... حرام کی ہوئی ہے۔ میں اپنا سب کچھ کفارے کے طور پر تقسیم کر دیتا ہوں۔ غلط ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت ... پرورش پائی ہے، اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اس لیے میرا اپنی کمائی پر بھی کوئی حق نہیں اور اپنے وجود کو ان سب آسائشوں ... نوازنے کا بھی کوئی حق نہیں مجھے تو شاید تم سے محبت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں مگر وہ میں نے اس من کے ساتھ کی ہے جو بی بی کی نیک تربیت نے ... پتہ نہیں یہ بھی غلط ہوا ہے یا درست اس کا فیصلہ ... اس کا فیصلہ ... صاحباں! میں تمہارے اختیار میں دیتا ہوں۔"
اس نے صاحباں کے سامنے سر خم کر دیا۔ کئی لمحات گزر گئے، صاحباں خاموش رہی تو حارث نے چونک کر اسے دیکھا۔
"ارے! تمہیں کیا ہوا ...؟"
جانے کب صاحباں اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ لیکن حارث نے دیکھا۔ اس کا پورا وجود لرز رہا تھا چہرے کا رنگ اتنا پیلا پڑا ہوا تھا کہ حارث پریشان سا ہو گیا۔
"میری داستان سن کر تمہاری ایسی حالت ہو گئی ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ ..."
"حارث ... حارث ... پانی ...؟"
وہ ایک قدم چلی۔
"اوہ ... مجھے سہارا دیجئے۔"
اس کے بازو پھیلے ... مگر ... جب تک حارث کچھ سمجھتا، وہ چکرائی، لڑکھڑائی، اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
"کیا ہوا صاحباں ...؟"
حارث نے جلدی جلدی بازو بڑھائے مگر اس سے پہلے ہی صاحباں کا بے ہوش وجود اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔
"صاحباں ... صاحباں ...؟"
پریشانی سے، فکر سے، حیرت سے اور تشویش سے حارث کی اپنی حالت غیر ہونے لگی۔
اس کے دکھ نے صاحباں کو دکھی کر دیا تھا وہ تب بے ہوش ہوئی تھی ...؟
اس کی داستان، اس کا ماضی ایسا گھناؤنا تھا اس کا صدمہ اسے پہنچا تھا۔
اسے حارث سے محبت تھی اور اس کا ماضی جان کر وہ اپنے گھر والوں کی نگاہوں میں ذلیل و رسوا ہونے کے خیال سے پریشان ہو گئی تھی؟
یا ... یا ... یا ...
اور ... مزید کچھ بھی سوچنے سے اس کا ذہن قاصر تھا۔ کوئی ایک بھی تو بات اس کے اپنے حق میں نہیں جاتی تھی۔
"ہائے صاحباں! تو کیوں میرے دکھ بانٹنے چلی آئی۔ یہ تو نے کیا کر ڈالا اور یہ میں نے تیرے لیے مستقبل کے کونسے گہرے کنوئیں کھود ڈالے۔ تو کس کس سے بچے گی ...؟ میری کمینگی ہے۔ سب میری خود غرضی اور کمینگی ... پھولوں کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ ... لڑکی کو کیسے کیسے غم، الجھنیں اور پریشانیاں دے ڈالیں ...؟"
سوچوں میں کھوئے کھوئے خود کو لعن طعن کرتے ہوئے حارث نے اس متاعِ عزیز کو قدموں میں سے اٹھا کر صوفے پر ... دیا۔ دکھ اور رنج سے خود اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔
کاش! اسے کچھ نہ بتاتا ... کاش! اسے اپنے دکھ نہ دیتا۔ خود ہی ان میں جل کر راکھ ہو جاتا۔ لیکن اس بے گناہ کو تو نہ جلاتا ... اس ہمدرد وجود کو تو اس حالت تک نہ پہنچاتا۔
بہت سارے پچھتاوے دل میں اتارے جا کر پانی کا گلاس لے آیا۔
اس کے مرجھائے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے۔ اس کے حلق میں چند بوندیں ٹپکائیں۔ اس کی ہتھیلیوں اور تلووں کو ... ساتھ ساتھ سوچے جا رہا تھا۔

صاحباں کتنی حساس تھی۔
صاحباں کتنی ہمدرد تھی۔
صاحباں کتنی مخلص تھی۔
صاحباں کتنا پیار اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔
صرف اس کی کہانی نے ہی اسے ایسا متاثر کیا کہ پریشانی اور دکھ کے مارے اسے غش پڑ گیا۔
کیا وہ اس قابل تھا کہ ایسا ماضی رکھتے ہوئے بھی ساری زندگی کے لیے اس کے ساتھ، اس کی سنگت کی تمنا کرتا ...؟
حارث اس کے سفید چہرے پر جھکی لمبی لمبی پلکوں کو بغور دیکھ رہا تھا سوچ رہا تھا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔
آخر بڑی مشکل سے، بڑی تگ و دو کے بعد صاحباں کے بے ہوش وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔
"آپ ... آپ ..."
کئی لمحات وہ حارث کو ایک ٹک دیکھتی رہی اور آنکھیں جھپکتی رہی۔
"شکر ہے تیرا پروردگار ..."
اس کی جھپکتی پلکوں اور اس کے ہلتے لبوں کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے حارث نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنا پریشان ہو جاؤ گی تو بخدا میں اپنے ماضی کے رخ پر سے کبھی نقاب نہ اٹھاتا۔ مجھے معاف کر دو صاحباں! میں نے تمہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے۔"
"نہیں۔ آپ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔"
اور ... وہ مزید کچھ کہے بغیر اسی کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔
"کیا ہوا صاحباں ...؟"
حارث کی سمجھ میں اس کے رونے کی وجہ نہ آ سکی۔
"حارث ... حارث ... آپ مجھے ... آپ مجھے ..."
اس نے ایک لمبی سسکی لی تو اس کی بات ادھوری رہ گئی۔
"ہاں ہاں۔ کہو۔"
"آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں ...؟"
"کیا مطلب ...؟" حارث نے حیرت سے اسے دیکھا۔
وہ کیسے سوال کر رہی تھی۔ دماغی طور پر تو ٹھیک تھی ...؟
"اچھا سمجھتے ہیں یا برا ...؟"
بے شک اس کے دماغ پر کوئی اثر ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق سب کچھ جاننے کے بعد بھی وہ اپنے متعلق اس سے پوچھ رہی تھی۔ جو ہر طرح ... لحاظ سے کم از کم اس سے تو بہتر ہی ہو سکتی تھی۔ پھر ... حارث کو اسے ذرا سا بھی برا سمجھنے کا کیا حق تھا بھلا ...؟
"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"
آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے پوری روانی سے رواں تھے اور وہ حارث کی طرف کسی متوقع امید کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔
"پگلی ...!" حارث اس کی سادگی پر مسکرا پڑا۔
"اس سوال کا جواب مجھ سے پوچھنے کی بجائے تمہیں اپنے دل سے پوچھنا چاہیے تھا۔"
حارث نے اس کا سسکیوں سے لرزتا کپکپاتا وجود بازوؤں میں بھر کر سینے کے ساتھ لگا لیا۔
"کاش! میں تمہیں بتا سکتا کہ تم مجھے کیسی لگتی ہو۔ لیکن ..."
"لیکن کیا ...؟"
صاحباں نے چونک کر گھبرا کر چہرہ اونچا کیا۔
"لیکن ایسی روتی ہوئی صاحباں نہیں، بلکہ مسکراہٹیں بکھیرتی اپنی باتوں سے، اپنی گھاتوں سے میرے سارے دکھ سمیٹتی۔"
"حارث ... حارث ..."

اس کی پوری بات سُنے بغیر اس نے اس کے سینے میں چہرہ گُھسا کر پھر رونا شروع کر دیا۔

"بات کیا ہے ...؟"

حارث اب چونکا۔ یقیناً اس سے علیحدہ کوئی معاملہ تھا۔ اس کے اپنے ماضی سے الگ کوئی صاحباں کی اپنی پرابلم تھی۔ وہ بہت بُری طرح رو رہی تھی۔ وہ بہت عجیب شاید رحم طلب نظروں سے اُسے دیکھ بھی رہی تھی۔

"آپ اگر مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو ... تو ...؟"

صاحباں ہچکچا کر جھجک کر خاموش ہو گئی اور پھر مزید کچھ کہے بنا رونے لگی۔

"تم۔ جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو بلا خوف و خطر کہہ ڈالو صاحباں۔!"

"تو آپ ...؟" صاحباں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے جکڑ لیے۔

"آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیجئے۔ میں اب واپس نہیں جاؤں گی؟"

"یہ ... یہ کیا کہہ رہی ہو صاحباں تم ...؟"

حارث نے اس کے ہاتھوں میں جکڑے اپنے ہاتھوں کو ایک زور کا جھٹکا دے کر چھڑا لیا۔

کیسی عجیب اور اَنہونی سی بات اس نے کی تھی۔

شک ہی نہیں اب اسے اس کی دماغی صحت بگڑنے کا بھی یقین سا ہو چلا تھا۔

"تم اپنے گھر کو چھوڑ رہی ہو۔ اپنے والدین کو چھوڑ رہی ہو۔ ایسی غلط حرکت کی میں نے تم سے کبھی توقع نہیں کی تھی؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے حارث! میرے والدین نہیں ہیں؟"

صاحباں کے وجود میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ پہلے وہ صرف سسکیوں سے رو رہی تھی۔ اب ساتھ اس کی چیخیں بھی بلند ہونے لگیں ...

"میں تو ایک کٹی پتنگ ہوں۔ کبھی اس ہاتھ میں۔ کبھی اُس ہاتھ میں ..."

"کیا مطلب ...؟"

حارث یوں چلّایا جیسے صاحباں کے اندر والا طوفان اس میں سما گیا ہو۔

"صاحباں! مجھے تفصیل سے بتاؤ بات کیا ہے۔ ورنہ... ورنہ...؟"

اس نے صاحباں کو کندھوں سے تھام لیا۔

میرا دماغ پھٹ رہا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گا؟"

اپنی کہانی سُناتے ہوئے اس کی حالت ایسی نہ ہوئی تھی جیسی صاحباں کے لیے ہو رہی تھی۔

"حارث! آپ نے ابھی ابھی بتایا ہے نا کہ میاں جی کا کاروبار بردہ فروشی ہے۔ تو... تو حارث میں شاید ان کے کاروبار ہی کا ایک حصّہ ہوں؟"

"صاحباں ...!"

حارث نے چیختے ہوئے اس کے کندھے جھنجھوڑ ڈالے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو... یہ کیا کہہ رہی ہو تم صاحباں ...؟"

"یہ سچ ہے حارث! دُنیا بھر میں جھوٹ بولتی پھروں لیکن آپ کے سامنے میری زبان سے سچ کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا!"

صاحباں نے اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔

"وہ۔ جو سامنے گھر ہے نا۔ جہاں میں رہتی ہوں۔ وہ گھر اصل میں آپ کے والدین کا ہے۔ آپ کی بی بی اور میاں جی کا؟"

"بی بی کا...؟ میاں جی کا ...؟"

حارث کی آواز جیسے پاتال سے اُبھری۔

"بی بی تو تقریباً تین مہینے سے یہاں ہیں اور میاں جی آج آ جائیں گے ہمیں واپس لے جانے کے لیے ...؟"

"اور تم ... صاحباں! تم مجھے اپنے متعلق کچھ بتاؤ۔ تم ان کے ساتھ کیوں رہتی ہو؟ تم کون ہو...؟"

"آج تک اب سے چند منٹ پہلے تک تو میں خود کو ان کی بیٹی ہی سمجھتی تھی مگر اب ... آپ کی داستان سُننے کے بعد... شاید ان کا کاروبار ہوں؟"

"نہیں صاحباں! نہیں ...؟"

حارث نے ہاتھوں میں یوں اپنا سر تھام لیا جیسے وہ سب کچھ ہار بیٹھا تھا۔

"یہ مت کہو۔ ایسا مت کہو...؟"

وہ دَرد سے کراہا۔

"یہ حقیقت ہے حارث! میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی؟"

"تو کیا صاحباں ...! تم اس حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر سکتی ہو؟"

اب اس کا لہجہ دھیما اور ڈوبا ڈوبا سا تھا۔

"مجھے پوری تفصیل بتا سکتی ہو کہ تم ... تم میرے میاں جی کے ہاتھ کس طرح لگیں ...؟"

"جی ... حارث! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اس کے انداز سے صاحباں خوفزدہ سی ہو گئی۔ اپنے آنسو، سسکیاں بھول بھال کر وہ پوری توجہ سے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کاش! نہ ہوتی۔ یہ سب سننے سے پہلے مجھے اسی طرح دَورہ پڑ جاتا اور وہ میری زندگی کا آخری دَورہ ہوتا، آخری سانس۔ لیکن...؟"

اس نے سُرخ سُرخ اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ایک نظر صاحباں کو دیکھا۔

"تمہاری توجہ، ہمدردی، بے غرض اور بے لوث محبت اور خدمت نے مجھ سے یہ آس بھی چھین لی ہے۔ میں یہ گھاؤ سہنے کے لیے ٹھیک ہی رہوں گا؟"

"حارث! پہلے چائے کی ایک ...؟"

"نہیں؟" حارث نے چیخ کر، سسک کر اس کی بات کاٹ دی۔

"میری زندگی کا سب سے بڑا زخم پہلے مجھے لگا دو صاحباں! میں تیار ہوں ... بتاؤ ... تم کیسے میرے بردہ فروش باپ کے چنگل میں پھنسیں ...؟"

تصور آباد اس کا چھوٹا سا اور بہت خوبصورت سا گاؤں تھا۔ خوش باش اور مطمئن لوگوں کی پُرسکون بستی۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت آباد تھی دُشمنی نہیں۔

کوئی دُکھ سکھ ہوتا سب مل کر بانٹتے۔ نہ وہاں کوئی اکیلا ہنستا نظر آتا تھا نہ روتا۔

کسی گھر میں موت ہو جاتی تو سارا گاؤں غم میں اور آنسوؤں میں ڈوب جاتا۔ کسی گھر میں شادی ہوتی تو پورے گاؤں میں خوشیوں کا سیلاب آ جاتا۔

اور۔ وہ دن وہی تھے۔ گاؤں خوشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ صاحباں کی سب سے پکی سہیلی زرینہ کی بہن کی شادی تھی۔

یوں تو اس کی ہم عمر گاؤں کی ساری لڑکیاں ہی اس کی سہیلیاں تھیں۔ لیکن زرینہ کا مقام کچھ اس لیے اس کی نگاہ میں علیحدہ تھا کہ والدین کا بھی آپس میں کچھ زیادہ میل جول تھا اور کچھ شاید دُور کی رشتہ داری بھی تھی۔ اس لیے ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا زیادہ دونوں دُکھ سُکھ میں شراکت بھی زیادہ تھی۔

حالانکہ دونوں گھرانوں میں اسٹینڈرڈ کا فرق نُمایاں تھا۔ زرینہ کے والدین خاصے خوشحال تھے۔ باپ کے ساتھ دو جوان بیٹوں کی کمائی ہوتی تھی اس لیے۔ لیکن پھر بھی میل ملاقات میں کبھی فرق نہ آیا تھا۔

پورے گاؤں کا دستور تھا۔ کوئی ایک، دوسرے کو کسی بھی وجہ سے حقیر نہ جانتا تھا۔ ورنہ صاحباں، شاید سب سے زیادہ حقیر جانی جاتی۔ اس کے باپ کا نہ کوئی جوان کماؤ بیٹا تھا، نہ دھن دولت، نہ اچھا سُتھرا گھر بار۔ البتہ مفلسی ہمیشہ ساتھ رہی۔

اس کے باوجود صاحباں کو سب حقیر جاننے کی بجائے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ معصوم، بھولی بھالی سی سولہ سترہ سالہ لڑکی کو ابھی زمانہ تو کیا ابھی پوری طرح گاؤں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

زرینہ کی بہن کی شادی میں سب سے زیادہ، سب سے بڑھ چڑھ کر وہی حصّہ لے رہی تھی۔ پچھلے پندرہ دن سے روز رات کو پوری

بستی کی لڑکیاں زرینہ کے گھر اکٹھی ہوتی تھیں۔
آدھی آدھی رات تک ڈھولک پیٹی جاتی۔ لڑکیاں خوبصورت گیت گاتیں۔ لُڈی، بھنگڑا، جھومر ناچتیں۔
گاؤں میں ہونے والی ہر شادی میں گاؤں کا ہر فرد پورے خلوص اور محبت سے حصہ لیا کرتا تھا۔ یہ وہاں کا رواج تھا۔ تو صاحباں کیسے پیچھے رہتی۔ زرینہ کی پکی سہیلی کے ناطے اس کی بہن کے ساتھ بھی اسے بڑا پیار رہتا تھا۔ خود ایک اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے ہر ایک سے محبت لینے دینے کو ہر لمحہ تیار رہتی۔
پندرہ دن سے سارے گاؤں کی لڑکیاں اکٹھی ہو رہی تھیں اور صاحباں نے تو مزید پندرہ دن پہلے سے اس گھر کو اور اپنے گھر کو ایک کیا ہوا تھا سارا سارا دن زرینہ کے پاس ہی گزر جاتا
اور آج ان ہنگاموں کی اور خوشیوں کی آخری رات تھی۔ کل زرینہ کی بہن کی برات آنے والی تھی اور اسے رخصت ہونا تھا اور یہ رات آج اپنے پورے شباب پر تھی۔ بہت سارے مہمان دوسرے دیہاتوں سے بھی آئے ہوئے تھے۔
زرینہ کے بھائی کاروبار کرنے شہر بھی جایا کرتے تھے۔ وہاں سے ان کے میل ملاقات والے لوگوں کے گھروں سے بھی عورتیں خاص طور پر گاؤں کی شادی دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ کچھ ان کی آگے میل ملاقات والیاں تھیں۔
یوں یہ شادی گاؤں میں ہونے والی دوسری شادیوں سے زیادہ ہنگامہ خیز اور پُر رونق ثابت رہی تھی۔
زرینہ کا گھر کافی بڑا تھا۔ تصور آباد کے ملک جی کی حویلی جتنا بھی نہیں لیکن دوسرے نمبر پر ضرور آتا تھا۔ ڈھیر سارے کمرے تھے۔ جو مہمانوں سے بھرے پڑے تھے۔
کمروں کے آگے صحن اتنا وسیع و عریض تھا کہ اس نے اس سارے ہنگامے کو بڑی سہولت اور خوبصورتی سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔
لڑکیوں بالیوں کی مختلف ٹولیاں بنی ہوئی تھیں۔ کہیں ڈھولک پیٹی جا رہی تھی۔ کہیں جھومر کی تال پر پاؤں اُٹھ رہے تھے۔ کچھ لڑکیوں کی ایک ٹولی لُڈی رقص میں مصروف تھی۔
اس رات صاحباں کی طبیعت قدرے خراب تھی۔ بے شمار راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ سارا دن زرینہ کے ساتھ کام کرتی تھی۔ تھکن کی وجہ سے کچھ حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔
کسی اور گھر کا معاملہ ہوتا تو آج شاید وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس ہنگامے میں آتی ہی نہیں اور گھر میں ہی پڑی رہتی تاکہ پوری رات آرام کرنے کے بعد۔۔۔ برات والے دن کے لیے تازہ دم ہو جاتی۔ مگر۔۔۔
معاملہ زرینہ اور اس کی بہن کا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے وجود کے باوجود وہ مہندی میں شامل ہونے سے خود کو نہ روک سکی۔ اس کے لیے مر بھی جاتی تو پرواہ نہ تھی۔
مہندی کی رات کی مناسبت سے اس نے سبز رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ گو سوٹ کا کپڑا بے حد گھٹیا تھا اور دوپٹہ بھی ململ کا تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔
صاحباں کا اپنا وجود اتنا قیمتی، ایسا نایاب تھا کہ وہ اس لباس کو بھی سب سے بڑھیا، سب سے اعلیٰ بنائے دے رہا تھا۔ سادہ سوٹ تھا اور ململ کے دوپٹے کے کنارے کنارے گوٹہ لگا ہوا تھا۔ اس کی غربت اس گوٹے کے علاوہ شادی کے لیے کوئی اہتمام کر ہی نہ سکی تھی۔
اور یہی دوپٹے کے کناروں پر لگا گوٹہ اس کے افشاں جیسے چمکیلے چہرے کا ہالہ کیے اسے سونا زیوروں اور سولہ سنگھار سے سجائی گئی دُلہن کا سا روپ بخش رہا تھا۔
تھکن اور حرارت کی وجہ سے آنکھوں میں گلابی گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ رتجگوں نے خوبصورت آنکھوں میں خمار بھر دیا ہوا تھا۔ اور وہ جھپکتی اُٹھتی پلکوں کے ساتھ معصوم سا چہرہ اُٹھائے بڑی دلچسپی سے لُڈی رقص دیکھ رہی تھی۔
زرینہ بھی پاس ہی بیٹھی تھی۔ بڑے مزے مزے کی باتیں کیے جا رہی تھی۔ صاحباں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر کبھی کبھی سر میں ہونے والے درد کی ٹیس اتنے زور سے اُٹھتی کہ اس کے پورے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو کر ایک سایہ سا آ جاتا اور اس وقت اس کی ستاروں کی طرح ٹمٹمانے والی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بند ہو جاتیں۔
"جھونکیں لیے جا رہی ہو۔۔۔" زرینہ نے ایک بار اسے اس عالم میں دیکھا تو بڑے زور کا ٹہوکا دیا۔
"آج کی رات ہی تمہیں نیند نے ستانا تھا"
"نہیں۔ نیند تو نہیں آ رہی"

وہ جلدی سے پوری آنکھیں وا کر کے اور چوکس ہو کر بیٹھ گئی۔
"دراصل آج کچھ طبیعت خراب ہے"
"تھوڑی دیر کے لیے گھر چلی جاتیں۔ ایک گھنٹہ بھی آرام کر لیتیں نا تو طبیعت سنبھل جاتی"
"کل آپا نے وداع ہو جانا ہے اور میں آج آرام کروں؟ وہ کیا صرف تمہاری ہی بہن ہے"
"نہیں بھئی صرف میری ہی کیوں۔ تمہاری مجھ سے زیادہ"
"تو بس پھر اب مجھے آرام کرنے کے لیے نہ کہنا"
"تو پھر تم بھی یوں بیٹھ کر افیمیوں کی طرح اب لہرانا نہیں"
زرینہ نے اس کا بازو ہلا کر ایک طرف اشارہ کیا۔
"وہ۔ اُدھر سامنے دیکھ رہی ہو اس عورت کو؟"
"میں تو لُڈی دیکھ رہی تھی۔ کیوں۔ کیا ہوا اُسے؟"
"اُسے کیا ہونا ہے۔ تجھے کچھ ہوا ہے"
"مجھے۔۔۔؟" صاحباں کی آنکھوں سے نیند کا خمار غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک خوبصورت سی حیرت نے لے لی۔
"مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔۔۔"
"کچھ ہوا ہی ہو گا نا جو وہ عورت گھنٹہ بھر سے مسلسل تمہیں ہی دیکھے جا رہی ہے"
صاحباں گھبرا کر جلدی سے سیدھی ہو کر اپنا دوپٹہ وغیرہ ٹھیک کرنے لگی۔
"کیا غلطی ہے مجھ میں۔۔۔؟"
صاحباں پریشان سی ہو کر زرینہ سے پوچھنے لگی۔
"مجھے کیا پتہ۔۔۔؟" زرینہ زور سے ہنس پڑی۔
"یہ تو اب اسی سے پوچھو۔۔۔؟"
"یہ ہے کون۔۔۔؟"
صاحباں نے آنکھیں ذرا سی ٹیڑھی کر کے اسے دیکھا۔ وہ واقعی صاحباں ہی کو تک رہی تھی۔ اتنا خوبصورت لُڈی رقص تھا۔ ہزرات سے زیادہ جوش، لگن کے ساتھ لڑکیاں کر رہی تھیں مگر۔۔۔
وہ عورت جیسے اس فن سے بے پرواہ تھی۔ ایک اچٹتی سی بھی نظر ان پر نہیں ڈال رہی تھی جبکہ ہر کسی کی نگاہ اس ٹولی پر جمی تھی۔ وہ بس آنکھ جھپکے بنا صاحباں ہی کو دیکھے جا رہی تھی۔
صاحباں پریشان سی ہو گئی۔
"زرینہ! مجھے تو اس عورت سے ڈر لگنے لگا ہے"
"کیوں۔ ڈر کس بات کا۔ پاگل۔!"
پھر زرینہ مسکرائی۔
"تو اسے اچھی لگ رہی ہو گی؟"
"مجھ میں اچھا لگنے والی کون سی بات ہے؟"
صاحباں ابھی اپنے وجود کی خوبصورتیوں سے ناواقف تھی، اپنے گھٹیا سے لباس کو بھی دیکھ کر بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولی
"تو نہیں جانتی بے وقوف"
زرینہ اس کے پُرکشش چہرے اور پُرشباب وجود کو بنظرِ غائر دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔
"تو دیکھنے دو"
صاحباں نے لاپرواہی سے کندھے جھٹکے۔ نہ وہ اس وقت کوئی لمبی بحث چھیڑنے کے موڈ میں تھی، نہ اسے کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے دلچسپی تھی۔ طبیعت لمحہ بہ لمحہ زیادہ خراب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔
"میں کہتی ہوں منہ ادھر کر لو"
زرینہ نے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔
"لیکن کیوں۔۔۔؟"
"جس طرح ندیدوں کے سے انداز میں وہ تمہیں دیکھ رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے نظر نہ لگا دے"

"خواہ مخواہ ہی"

صاحباں زرینہ کی بات پر زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ زرینہ ہمیشہ ایسے جذبات کا اظہار کرتی ہی رہا کرتی۔ صاحباں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ اسے اپنی خوبصورتی کا یقین نہیں تھا تو ایسی باتوں کا کیسے ہوتا۔ ویسے کبھی کچھ نہیں ہوا تھا۔

"اس میں یوں ہنسنے کی کیا بات ہے"

زرینہ نے اس کی ہنسی کا بُرا منا لیا۔

"میں غلط تھوڑا کہہ رہی ہوں"

"زرینہ... اے زرینہ... ذرا جلدی سے ادھر آ..."

زرینہ کی ماں دُور کھڑی اسے بلا رہی تھی۔

"تمہاری چاچی کے مُنّو نے رو رو کر بُرا حال کیا ہوا ہے۔ جا کر چاچی کو بُلا لاؤ صرف اسی سے بہلتا ہے"

"یہ چاچی بھی عجیب عورت ہے"

زرینہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔

"بچّے دھڑا دھڑ پیدا کئے جاتی ہے مگر سنبھال آج تک ایک بھی نہیں سکی"

زرینہ کی بڑبڑاہٹ سُن کر صاحباں بے اختیار ہنس دی۔

"جھوٹ تھوڑا کہہ رہی ہوں"

زرینہ پاؤں پٹخ پٹخ کر ماں کی طرف جاتے ہوئے بُرا سا مُنہ بنا کر بولی۔

"پانچویں یا چھٹی بار چاچا کو بلوانا پڑ رہا ہے۔ کبھی چُنّو کے لیے تو کبھی مُنّو کے لیے۔ توبہ توبہ..."

زرینہ چلی گئی تو صاحباں نے پھر لُڈی رقص کرتی لڑکیوں کی طرف رُخ پھیر لیا۔

آج اس کی طبیعت ہی خراب تھی ورنہ وہ بھی ان میں ضرور شامل ہوتی۔ لُڈی رقص میں وہ پورے گاؤں میں سب سے ماہر سمجھی جاتی تھی۔

"اے بیٹی...!"

ایک اجنبی آواز نے اس کی محویت کو توڑ دیا۔

"ہوں" اس نے رُخ پھیرا۔

زرینہ کی جگہ پر بیٹھی اسے مخاطب کرنے والی وہی عورت تھی جس کے متعلق کچھ دیر پہلے وہ اور زرینہ گفتگو کر رہی تھیں۔

صاحباں چونک سی پڑی۔ وہ اتنی محویت سے رقص دیکھنے میں محو تھی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کب وہ عورت وہاں آکر بیٹھی۔

"تم دُلہن کی بہن ہو...؟"

"میں...؟ ہاں... نہیں..."

اس کی نگاہیں اب بھی اس پر گڑی ہوئی تھیں، صاحباں گھبرائی۔ بقول زرینہ وہ تو سچ مچ اسے نظر لگانے کی کوشش میں تھی...

"پھر کون ہو تم...؟"

"میں... میں، میں ہوں..."

صاحباں کے گھبراہٹ بھرے اس سادہ سے جواب نے اس عورت کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

"پیاس لگی تھی" وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔

"پانی پلوا سکتی ہو...؟"

اس کا لہجہ بے حد نرم و ملائم تھا۔

"جی اچھا..."

"تھکن، بے خوابی اور حرارت کی وجہ سے صاحباں کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اور اس وقت اپنی پیاس کی خاطر بھی اسے پورے صحن کے ادھر پانی والے گھڑوں کے پاس جانا پڑتا تو کبھی نہ جاتی۔

مگر۔ اس عورت کی خاطر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا بات کرنے کا انداز بڑا شائستہ تھا اور لہجہ بے حد نرم اور ملائم تھا جو ان کے ہاں کی عورتوں میں بہت کم ہوتا تھا۔

اُٹھتے اُٹھتے صاحباں نے اس عورت کے پورے سراپا کا جائزہ لیا، وہ لباس بھی بہت صاف ستھرا اور شہریوں ایسی طرز کا پہنے تھی اور چہرے پر بے تکلفی بھری ایک مسکراہٹ رقصاں تھی۔

وہ اسی کے متعلق سوچتے ہوئے پورا صحن پار کر کے باورچی خانے کے باہر گھڑونچی پر رکھے گھڑوں تک جا پہنچی۔ گلاس اُٹھایا۔ کا جیسے صاف نہ تھا۔ اس اجنبی عورت کے لباس اور مسکراہٹ کی طرح چمک دمک نہ رہا تھا۔

وہیں کھڑے کھڑے گھڑے میں سے ہی پانی نکال کر اسے دھونے لگی۔ صاف ہو گیا تو مطمئن ہوتے ہوئے اس میں پانی انڈیلنے لگی اور غیر ارادی طور پر ہی اس کی خاطر صاف ستھرا گلاس پانی سے لبالب بھر کر سیدھی ہوئی تو...

"میں نے سوچا، ہاں تمہیں اتنی تکلیف دوں۔ کہ اتنے فاصلے پر پھر گلاس بھی واپس لانا پڑے۔ خود ہی آکر کیوں نہ پی لوں"

صاحباں چونک کر ٹھٹھک کر وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی بات بھی معقول تھی اور انداز بھی انتہائی مشفقانہ اور چہرے پر بھری مسکراہٹ کچھ اور گہری...

صاحباں نے وہیں کھڑے کھڑے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"بڑی سگھڑ اور سلیقے والی ہو"

گلاس پکڑتے پکڑتے اس نے صاف ستھرے گلاس کے حوالے سے صاحباں کی تعریف کر ڈالی۔

"میں جھوٹے یا گندے گلاس میں پانی پیوں تو بیمار پڑ جاتی ہوں"

تعریف کے ساتھ ساتھ اس نے تعریف بھری نگاہوں سے صاحباں کو دیکھا اور پانی کا گلاس ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔

صاحباں پاس کھڑی اسے پانی پیتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ عورت اجنبی تھی لیکن اپنے انداز و اطوار سے اسے اچھی لگ رہی تھی۔ جانے کون تھی...؟ کچھ اپنی سی بھی لگ رہی تھی۔

شاید زرینہ کی کوئی رشتہ دار۔ لیکن زرینہ کے تو کوئی بھی رشتہ دار شہر میں نہیں رہتے تھے اور پھر اس سوچ کے ساتھ وہ اپنے آپ ہی مسکرا پڑی۔ اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ عورت شہر سے آئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

پانی پی کر گلاس واپس دیتے ہوئے اُس عورت نے پوچھا۔

"صاحباں"

"صاحباں...؟" اسے غور سے دیکھتے ہوئے وہ ایک بے تکلفی بھری مسکراہٹ سے بولی۔

"صورت سے تو بالکل مرزے والی صاحباں ہی لگتی ہو منگنی ہو چکی تمہاری؟"

صاحباں نے ایک نمایاں سی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ ایسی بات آج تک اس کے کانوں نے نہیں سُنی تھی۔ اس انجان عورت نے بھلا یہ حق کیسے لے لیا تھا کہ اس سے اتنا بے تکلف ہوئی جا رہی تھی۔

صاحباں نے اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک قدم بڑھ کر گلاس رکھنے کے لیے جُھک گئی۔ جُھکی ہوئی گلاس رکھ رہی تھی نگاہ اس کے قدموں پر جا پڑی۔ اس نے پاؤں میں بڑے خوبصورت، سنہرے سینڈل پہنے ہوئے تھے۔

وہ گلاس رکھنے کے بہانے کتنی ہی دیر جھکی رہی اور جھکی جھکی ہی اس کے سینڈلوں کو دیکھتی رہی۔ ایسی جوتی اس کے گاؤں کی کسی عورت نے کبھی نہ پہنی تھی۔ یہ یقیناً شہر سے ہی آئی تھی۔ اس کی سب چیزیں ہی اچھی تھیں۔

لباس بھی۔ جوتی بھی اور گفتگو کا انداز اور مسکراہٹ بھی... صاحباں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے کچھ متاثر سی ہو گئی۔

ویسے وہ بہت کم لوگوں سے متاثر ہوا کرتی تھی۔ مغرور بھی نہیں تھی۔ بس ابھی متاثر ہونے کا شعور ہی نہیں آیا تھا۔ خوبصورتی اور بدصورتی کے فرق کا اسے ابھی اچھی طرح علم ہوا تھا اور نہ غریبی اور امیری کا۔

ابھی تو بس وہ گاؤں کی کھلی فضاؤں اور ہواؤں میں صرف طیور کی طرح اُڑنا چُگنا ہی جانتی تھی۔ گاؤں کے لوگ بھی سیدھے سادے تھے اور وہ ان سے بھی زیادہ سیدھی سادی اور معصوم تھی۔

"میرا نام بالی ہے۔ میں شہر سے آئی ہوں"

گلاس واپس رکھ کر صاحباں چلنے لگی تو اس عورت نے اپنا تعارف کرایا۔

"تم نے کبھی شہر دیکھا ہے...؟"

صاحباں رک کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگی۔

"نہیں..."

اس کا سر تو نفی میں ہل گیا لیکن نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ "ہاں۔ تمہیں دیکھ کر لگتا ہے شہر دیکھ لیا۔ اچھا ہی ہو گیا۔"

آج پہلی بار اس کے ذہن نے کسی دو چیزوں میں فرق محسوس کیا تھا۔

"شہر دیکھنے کا شوق بھی نہیں۔۔۔؟"

"کیوں۔ شہر میں ایسی کیا بات ہے جو ہمارے تصور آباد میں نہیں ہے۔"

صاحباں کے ماتھے پر ہلکے سے بل پڑ گئے۔ وہ عورت اس سے ایسی باتیں کیوں کر رہی تھی جو ناممکنات میں سے تھیں۔ اسے دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر گاؤں سے اچھا ہوتا ہے اور اس کے وسائل و ذرائع شہر جانے اور اسے دیکھنے کے نہیں تھے۔ پھر ایسی ناممکن بات سوچنے کا بھلا مطلب بھی کیا تھا۔ وہ ایسی سوچ ذہن میں لانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

صاحباں رُخ پھیر کر واپس چلدی۔

"سُنو۔"

اس عورت کی آواز پر چند قدم چلنے کے بعد وہ پھر رُک گئی۔

"میری کوئی بات بُری لگی ہو تو معاف کر دینا۔"

"جی۔ نہیں۔ نہیں تو۔۔۔؟"

صاحباں اس سے کہیں چھوٹی تھی بیٹیوں کے برابر اور وہ کس انداز میں بات کر رہی تھی اور وہ کس انداز میں۔

اسے اپنے رویّے پر بے حد ندامت محسوس ہوئی۔ جو دو قدم اس سے پرے ہٹی تھی۔ وہی دو قدم اُٹھا کر واپس اس کے نزدیک آن کھڑی ہوئی۔

"مجھے دراصل تم اچھی لگی تھیں۔ اس لیے میں تم سے باتیں کرنے لگ گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔" صاحباں اور بھی شرمندہ سی ہو گئی۔

"تمہاری آواز بھی تمہاری صورت کی طرح خوبصورت ہے۔ شاید اسی لیے۔۔۔"

"اوہ نہیں۔۔۔"

صاحباں کو جواب دینے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ اس کی بے تحاشا تعریف سے بُری طرح شرمائی جا رہی تھی اور گھبرائی جا رہی تھی۔

اس کا شعور جیسے آج ہی باشعور ہوا تھا۔ وہ بوکھلائی جا رہی تھی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے پورے شہر میں نہ ہو گی۔۔۔ اور ہمارا شہر بہت بڑا ہے۔ بہت بڑا۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔"

"تم اگر ہمارے شہر میں پیدا ہوتیں، وہیں پرورش پاتیں، وہاں جیسے لباس پہنتیں تو پھر شاید ساری دُنیا میں تم جیسا کوئی نہ ہوتا۔۔۔"

"اوہ۔۔۔!"

صاحباں نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ جیسے اس میں مزید کچھ سُننے کی تاب نہ تھی اور۔۔۔ اور۔۔۔ لمحہ بھر کے بعد اس نے پھر کانوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔

یہ سب کچھ سُننا اسے اچھا بھی تو لگ رہا تھا۔ اندر سے جی چاہ رہا تھا وہ عورت، جس نے اپنا نام اسے بالی بتایا تھا، جو خود اتنا اچھا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اتنے خوبصورت سینڈل پہنے ہوئے تھی۔ اتنے اچھے انداز میں باتیں کرتی تھی۔ وہ گفتگو اس کے متعلق ایسی باتیں کیے جائے اور وہ سنے جائے۔ سُنے جائے۔ اس انداز میں کبھی کسی نے اس کے ساتھ نہیں کی تھی۔

شہر میں اتنی نعمتیں، اتنی اعلیٰ اعلیٰ چیزیں، اتنی دولت اور اتنی آسائشیں ہوتی ہیں کہ معمولی سے معمولی لڑکی بھی وہ سب پاکر بہت خوبصورت ہو جاتی ہے۔"

پھر اس نے نگاہوں میں تحسین و ستائش کے بے شمار رنگ بھر کر صاحباں کو دیکھا۔

"اور جو پہلے ہی خوبصورت ہو۔ تم جیسی۔ وہ تو بالکل ہی حوروں کو بھی مات کرنے لگے۔"

صاحباں مسحور سی کھڑی اس کی من کو موہ لینے والی باتیں سُن رہی تھی۔

پھر اس نے بڑھ کر صاحباں کا ہاتھ پکڑا اور صحن کے پرلے گوشے میں لگے نیم کے درخت کی طرف چلی۔ صاحباں چُپ چاپ

سحر زدہ سی اس کے ساتھ قدم اُٹھاتی رہی۔

صحن کی نسبت وہاں روشنی کم تھی۔ درخت کی اوٹ میں جہاں نیم روشنی، نیم تاریکی تھی وہ وہاں رُک گئی۔ وہ رکی تو صاحباں کے قدم بھی تھم گئے۔

رقص اپنے پورے شباب پر تھا۔ دُور سے تالی کی آواز کی گونج بڑی اچھی لگ رہی تھی مگر۔۔۔ اس عورت کی باتوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ صاحباں کو وہ سب کچھ اب اپنی طرف متوجہ کر ہی نہیں رہا تھا۔

"تمہارے ماں باپ ہیں؟"

"ہاں۔ میرے بابا یہاں کے منصف ہیں۔"

صاحباں قدرے فخر سے بولی۔ وہ اپنے شہر کی اتنی تعریفیں کر رہی تھی تو وہ اپنے بابا کے متعلق کیوں نہ بتاتی جن کی تعریفیں پورا گاؤں کیا کرتا تھا۔

"اور میری اماں۔ وہ بیٹھی ہیں۔"

صاحباں نے اُنگلی کے اشارے سے بتایا۔

"وہ۔ دُلہن کی امی کے پاس۔"

"کونسی؟ وہاں تو اور بھی بہت سی عورتیں ہیں۔"

"وہ۔ جس نے میرے جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔"

"وہی جو دوپٹے کو کرن لگا رہی ہے۔۔۔؟"

"ہاں ہاں۔ وہی۔"

جوشِ مسرت میں صاحباں کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

"یہ میرا دوپٹہ ہے۔ ریشمی ہے۔"

وہ بالکل بچوں ایسی خوشی سے بولے جا رہی تھی۔

"کل اوڑھوں گی۔ جب برات آئے گی۔ آج ہی بابا خرید کر لائے ہیں۔ تبھی اماں اب گوٹہ لگا رہی ہیں جلدی جلدی۔"

"تم یہ دوپٹہ کل نہ اوڑھنا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"اتنے سارے لوگ ہوں گے۔ اتنی ساری نگاہیں تم پر اُٹھیں گی۔ نظر لگ جائے گی۔"

"ہمارے تصور آباد میں کوئی نظر نہیں لگاتا۔"

وہ بے حد معصوم تھی۔ بالی اس کی معصومیت کو بڑی دلچسپی سے تک رہی تھی اور اسی دلچسپی اور توجہ سے اس کی باتیں بھی سُن رہی تھی۔

"یہاں سب مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"سب۔۔۔؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ہاں سب۔" صاحباں اسی سادگی سے بولی۔

"اس بستی میں جوان جوان لڑکے بھی بہت ہوں گے؟"

نجانے اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا لیکن صاحباں نہ چونکی، نہ گھبرائی سٹپٹائی۔ اسی بھولپن اور سادگی سے جواب دیا۔

"ہیں۔۔۔ بہت ہیں۔"

اس نے تفصیل بھی نہیں پوچھی تھی۔ صاحباں خود ہی اپنی نالج کا اظہار فر فر کرنے لگی۔

"اپنی زرینہ ہی کے دو بھائی ہیں۔ گھبرو، جوان۔ ایک میری سہیلی دلاری کا بھائی ہے۔ چاچا غلام محمد کے ایک جیسے جوان چار لڑکے۔ تین فدا حسین بزاز کے ہیں۔"

وہ بلا سانس لیے بتائے جا رہی تھی۔

"وہ تینوں دکان پر باری باری بیٹھا کرتے ہیں۔ ہماری بستی میں کپڑا بڑا سستا ہوتا ہے۔ بلیک کرنے والے یا زیادہ منافع لینے والوں کو بابا کوڑوں کی سزا دیتے ہیں نا۔ تبھی۔ سب کچھ یہاں سستا ہوتا ہے۔ اور ہاں یاد آیا فضل تانگے والے کے بھی تو پانچ لڑکے ہیں۔"

بالی بے اختیار ہنس دی تو صاحباں چونک پڑی۔ پھر یوں ایک دم چپ ہوئی۔ جیسے یکا یک ہی چلتی گاڑی کو بریک لگا دی

جانے ... راتھا۔ وہ تعجب کے ساتھ نیم وا ہونٹوں اور پھیلی پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کے انداز اور نگاہ نے نجانے بالی کو کیا سمجھا دیا کہ وہ بھی یکدم خاموش ... اس کی ہنسی تھم نہیں رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں کو بڑے زور سے دانتوں میں بھینچ لیا تھا۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں پھر بالی نے ہی بات آگے بڑھائی۔

"میں ہنسی اس لیے تھی کہ تم نے تو پورے گاؤں کے لڑکوں کا شمار کر ڈالا۔"

وہ جیسے اپنے ہنسنے کی معافی مانگ رہی تھی۔ اسے محسوس ایسے ہوا تھا کہ صاحباں کو اس کی ہنسی اچھی نہیں لگی تھی۔ نجانے ... صاحباں کو ناراض کرنا نہ چاہتی تھی۔

"اور میں نے تو صرف اس لیے پوچھا تھا کہ تمہیں کوئی اچھا لگتا ہے۔"

"کیا...؟ سبھی اچھے ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔"

"تم میرا مطلب اب بھی نہیں سمجھیں۔"

بالی نے بڑے مشفقانہ اور دوستانہ سے انداز میں اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"اچھے تو بے شک سب ہوتے ہیں۔ لیکن اس عمر میں۔ تمہاری عمر میں کوئی ایک جو گبھرو ہو، بانکا سجیلا ہو، وہ علیحدہ سے لگتا ہے۔"

بالی نے تھوڑا سا جھک کر بڑی اپنائیت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"علیحدہ سے کیسے...؟"

"یوں... جیسے... جیسے۔"

اس کا خیال تھا کہ صاحباں اشارے کنائے سے ہی اس کا مدعا سمجھ لے گی مگر وہ عمر کی نسبت سے زیادہ سادہ اور بھو...

"جیسے کیا...؟"

"میرا مطلب تھا جس کے ساتھ تیرا شادی کرنے کو دل چاہے۔"

آخر بالی نے صاف لفظوں میں وضاحت کر دی۔

"ہائے اللہ...!"

شادی کے نام پر سبھی لڑکیاں شرمایا لجایا کرتی تھیں۔ اسی طرح صاحباں بھی حسب معمول شرما کر، سرخ ہو کر، چونک گرد دیکھتے ہوئے وہاں سے چل دی۔

"صاحباں...؟" بالی نے اسے دبے دبے سے لہجے میں پکارا۔

صاحباں نے سنا... رکی نہیں... لیکن۔ رفتار سست پڑ گئی۔ بالی نے کیسے شادی والی بے شرمی کی بات پٹاخ ... تھی۔ ان کے ہاں تو یوں کھلم کھلا اس عمر کی لڑکیوں سے کوئی شادی کی بات نہیں کرتا تھا۔

"صاحباں... صاحباں...؟" دوبارہ اس نے پکارا۔

صاحباں کے سست قدم اور سست ہو گئے۔ اس کی باتیں اسے اچھی بھی لگ رہی تھیں۔ وہ رک گئی تھی لیکن اس ... بالی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"پھر... تم نے بتایا نہیں...؟"

اس کے قریب آتے ہوئے اسی عجیب سے انداز میں اور مسکرا کر اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے نہیں پتہ..."

"کیوں نہیں پتہ...؟"

بالی نے بڑھ کر اس کا شرم سے سرخ سرخ چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کیا۔

"تم تو میری سہیلی ہو۔ مجھے نہیں بتاؤ گی...؟"

صاحباں پھر لجا کر چپ سی ہو گئی۔ بالی نے بڑے پیار سے اس کی ٹھوڑی ہلائی۔

"تم اتنی خوبصورت ہو میں مان ہی نہیں سکتی کہ تم سے کسی نے شادی کی بات ہی نہ کی ہو۔"

"نہیں نہیں... ایمان سے۔" وہ سٹپٹا کر، گھبرا کر بول اٹھی۔

"ہمارے گاؤں میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"کسی کو کسی سے پیار نہیں ہوتا...؟"

"کیوں نہیں پیار ہوتا سب کو سب سے ہوتا ہے۔"

جوان ہوتے ہوتے وہ پھر بچپن کی طرف لوٹ گئی تھی۔ اسی معصومیت اور سادگی سے بولے گئی۔

"مجھے اماں اور بابا سے ہے۔ زرینہ سے ہے۔ آپا سے ہے۔"

"میں اس پیار کی بات کر رہی ہوں جو ایک لڑکی اور لڑکے کا آپس میں ہوتا ہے اور پھر شادی کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"نہیں۔ اللہ کی قسم میری ایسی کوئی بات نہیں۔"

وہ پھر چونکی اور گھبرا کر ارد گرد دیکھنے لگی۔

"صاحباں...! اے صاحباں...؟"

"ارے! میری اماں مجھے بلا رہی ہے۔"

وہ ماں کی طرف چلنے لگی تو بالی نے عجلت سے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

"... تمہارے اور ... درمیان جو باتیں ہوئی ہیں وہ کسی اور کے ساتھ نہ کرنا۔"

"اماں کے ساتھ بھی نہیں۔"

"نہیں۔"

"لیکن میں تو اس سے ہر بات کر لیا کرتی ہوں۔"

"شادی والی اور پیار والی باتیں بھی؟ ماں کے ساتھ...؟"

"نہیں نہیں... یہ تو ماں کے ساتھ کرنے والی بات نہیں ہے۔"

وہ جیسے اپنے آپ سے بولی اور بالی نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی

"ہاں۔ ایسی باتیں ماں سے نہیں کرنا چاہئیں۔"

بالی نے اسے سمجھایا۔

"زرینہ سے کر لوں...؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہ نہ..." بالی گھبرا گئی۔ "اس سے بھی نہیں..."

"تو پھر... تم میرے ساتھ ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔"

"میں تو تمہاری سہیلی ہوں۔"

"زرینہ بھی میری سہیلی ہے۔"

"ایسی باتیں وہ بھی تم سے کیا کرتی ہے...؟"

"نہیں۔ کبھی نہیں... ہمارے گاؤں میں ایسی باتیں کوئی بھی نہیں کرتا۔"

"تو پھر..." بالی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ تھوڑا سا مسکرائی۔

"تم بھی کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ البتہ مجھ سے جب جی چاہے کر لینا۔ میں کسی کی بات کسی سے نہیں کیا کرتی۔"

"میرا بازو چھوڑ دو..."

صاحباں نے سہمے سہمے سے انداز میں اسے دیکھا۔

"میری اماں مجھے بلا رہی ہے۔"

"میں تین چار دن یہاں رہوں گی۔ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ پھر آنا میرے پاس۔"

بالی نے اس کا بازو چھوڑ کر ساری کی ساری کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"کاش تم میری بیٹی ہوتیں۔"

اور اس نے اس کے رخسار اور پیشانی پر کئی پیار کر ڈالے۔

یوں ٹوٹ کر تو اماں بھی اسے پیار نہیں کرتی تھی۔ صاحباں اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی۔ ایک بڑی عجیب انوکھی اور سہانی سی مہک بالی کے وجود میں سے آ رہی تھی۔

صاحباں نے جلدی جلدی تین چار لمبے لمبے سانس لے ڈالے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے معطر وجود کے لمس نے اسے بھی معطر کر ڈالا تھا۔ اس کے ڈھیروں ڈھیر پیار نے اسے عجیب سی گرمی اور لذت بخشی تھی۔ بالی کی نگاہوں میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت اور اچھی تھی اس لیے وہ سب سے علیحدہ تھی اور سب سے ممتاز...!

ابھی ابھی اس کی طبیعت بڑی خراب تھی۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ کئی راتیں جاگنے کی وجہ سے آنکھوں میں شدید جلن

تھی مگر اب ...

اب جانے کیا ہوا۔ اسے اپنا آپ بے حد ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔

"صاحباں ..."

اماں کی آواز پر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ بالی کے سینے سے علیحدہ ہوئی اور ماں کی طرف بھاگی۔ پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔

بالی وہیں کھڑی مسکرا مسکرا کر اس کی ڈولتی، اُڑتی چال کو دیکھ رہی تھی۔

◆◆

شادی کی گہما گہمی اور نفسا نفسی کے عالم میں کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان تین دنوں میں صاحباں اور بالی کے تعلقات کتنے استوار ہو چکے تھے اور وہ کس قدر ایک دوسرے سے گھل مل گئی تھیں اور ایک دوسرے کے قریب آ چکی تھیں۔

وہ ایک دوسرے کی دوست بھی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی ہمراز بھی تھیں۔ ان کے درمیان پنپنے والی محبت نے دو رشتوں کو جنم دیا تھا اور عمر کے تفاوت نے انہیں خالہ بھانجی بنا دیا تھا۔ بالی سگی خالہ سے بھی کچھ اونچا، بلکہ بہت اونچا مقام لے گئی تھی اور صاحباں ...

وہ تو بالی کو بھانجی ہی نہیں اپنی بیٹی ہی لگتی تھی۔ وہ بیٹی جس کی شکل صاحباں سے بہت ملتی تھی اور وہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھی اور وہ صاحباں کو جب بھی دیکھتی تھی تو اس کے سینے سے محبت کے سوتے پھوٹ نکلتے تھے۔

اپنی مرحوم بیٹی کے ذکر سے جو خالہ بالی کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے تھے انہوں نے صاحباں کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی لہریں موجزن کر دیں۔ کیسی دُکھی تھی بیچاری ...!

ایک اور رشتہ پیدا ہو گیا۔ ہمدردی اور ترس کا بھی۔ اور اس کے بعد تو صاحباں کچھ زیادہ ہی اس پر توجہ صرف کرنے لگی۔

بالی کے ایک اکیلے وجود نے اسے کیا کچھ نہیں دیا تھا۔ ان تین دنوں کے تجربات بڑے انوکھے تھے۔ ماں کی طرح پیار۔ ایک چاہنے والے کی طرح بات بے بات تعریفیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک کی اور چلنے پھرنے سے لے کر پہننے اوڑھنے تک کی۔ ایک سہیلی کی طرح رازدارانہ گفتگو۔ کچھ اس کے متعلق، کچھ اپنے متعلق، کچھ زمانے کے متعلق۔

وہ شہر کی رہنے والی تھی۔ اس نے شہر کی بڑی عجیب و غریب اور پُر لطف باتیں سُنائیں۔ قصّے کہانیوں سے بھی زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز ... اور ... اور ...

پھر اس نے اسے بے شمار تصاویر بھی دکھائیں۔ شہر کی بلند و بالا عمارات کی۔ مشہور مشہور مقامات کی اور خوبصورت اور فیشن ایبل عورتوں کی اور وجیہہ و جمیل اور بانکے سجیلے مردوں کی ...

اس نے تو ان تین دنوں میں اس پر ایسے انوکھے راز کھولے تھے، ایسے ایسے اسرار و رموز سے اسے روشناس کرایا تھا کہ بالی اسے ایک عورت لگتی ہی نہ تھی۔ وہ تو جیسے ایک تجربہ تھی، ایک دُنیا تھی ... زندگی کی پہچان تھی ... اور روشنی کا مینار تھی۔

سولہ سال کے شب و روز گزارنے کے بعد بھی صاحباں اتنی سمجھدار اور اتنی تجربہ کار نہیں ہوئی تھی [illegible] بالی نے [illegible] اسے کر دیا تھا۔

جتنے دن شادی کا ہنگامہ رہا اس نے ایک ایک پل زرینہ کے ہاں ہی گزارا تھا۔ اماں بابا کو بھی معلوم تھا۔ ایک دو بار اماں نے کہا بھی کہ اب تو ... اسے گھر آ جانا چاہیئے تھا مگر صاحباں نے زرینہ کے ساتھ اپنی گہری دوستی اور تعلق کا بتا کر انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

یوں بھی۔ تصوّر آباد ایسی بستی تھی کہ وہاں کسی جوان لڑکی کی چڑھتی جوانی کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ گاؤں کے کسی جوان مرد میں ایسی جرأت نہ تھی کہ کسی جوان لڑکی کو چھیڑ دیتا۔

یوں بابا کا گھر یا بستی کا دوسرا کوئی گھر ایک ہی بات تھی اس لیے اماں اور بابا نے گھر سے اس کی اتنی طویل غیر حاضری کو نہ تجسس کی نگاہ سے دیکھا نہ تشویش کی۔

صاحباں کا دل بڑا مچل رہا تھا کہ بالی کی بتائی ہوئی انوکھی انوکھی باتوں اور دکھائی ہوئی اتنی مزے مزے کی تصاویر کا ذکر اماں سے نہیں تو کم از کم زرینہ سے تو ضرور کرے۔ آخر وہ اس کی سہیلی تھی۔ بالی کے چلے جانے کے بعد وہی تو اس کو سب سے زیادہ عزیز تھی۔ لیکن زرینہ کو تو اس کا علم ہی ہونا چاہیئے تھا کہ ان تین دنوں میں اس نے کیا کچھ دیکھا تھا اور ایسے ہی علم نہ ہو کہ وہ اتنے دنوں میں کیا کچھ دیکھ اور سیکھ چلی تھی اور ... کیا سے کیا بن گئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ باتوں سے سمجھ آ چکی تھی اور اس کی عزیز ترین سہیلی کے ناطے اسے بھی اس جتنا ہی باعلم اور سمجھدار ہونا چاہیئے تھا۔

مگر بالی نے اپنی جان اور اس کے ایمان کی قسمیں دے دے کر اسے منع کر دیا تھا۔ کسی سے بھی اس کی کوئی بات کرنے کو ... یہاں تک کہ زرینہ سے بھی۔

نجانے کیوں ... ؟ عجیب ہی اس کی ضد تھی نا۔ صاحباں نے سوچنا چاہا بھی مگر نہ موقع ملا اور نہ وقت۔ بالی کے پاس تو بے، باتوں کے اور قصّوں کے خزانوں کے خزانے بھرے پڑے تھے۔

ایک ایک لمحہ ایسا مصروف گزرا کہ خود صاحباں کو اپنا بھی ہوش نہ رہا۔

"میرے ساتھ شہر چلو گی ...؟"

خالہ بالی کا یہ فقرہ عجیب سے ترنّم کے ساتھ اس کے کانوں میں شہد کی سی مٹھاس گھول گیا۔

"میں ...؟"

حیرت سے اس کی خوبصورت آنکھیں پھیل گئیں اور وہ بالی کے پُر خلوص و مشفق چہرے کی طرف تکنے لگی۔

"ہاں تم ..."

بالی کے وہاں قیام کا آخری دن تھا اور دونوں ہی ایک دوسرے سے جدا ہونے کے غم میں مبتلا تھیں۔

"تمہارا مقام یہ نہیں ہے۔"

بالی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر پیار کی موسلادھار بارش نگاہوں ہی نگاہوں سے کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتی ہوں تم غلطی سے تصوّر آباد میں پیدا ہو گئی ہو۔ تمہیں تو کسی بادشاہ کے گھر میں جنم لینا چاہیئے تھا۔"

"میرے بابا کسی بادشاہ سے کم ہیں۔"

صاحباں کے لبوں نے یہ فقرہ تو ادا کر دیا مگر اس کے کانوں کو اپنے ہی الفاظ کھوکھلے اور بے معنی سے لگے۔ کیونکہ اس کی خالہ بالی نے ایک بادشاہ کا جو عکس الفاظ کے ذریعے ہی پیش کیا تھا وہ ابھی تک بغیر دیکھے ہی اس کی آنکھوں میں محفوظ تھا اور اس عکس کے ساتھ بابا کی کوئی بھی بات یا انداز یا ادا میل نہیں کھاتی تھی۔

اپنے فقرے کے کھوکھلے پن کو دُور کرنے کے لیے وہ دوبارہ جلدی سے بولی۔

"میرے بابا مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ اتنا تو کوئی بادشاہ بھی اپنی بیٹی کو نہیں کر سکے گا ...؟"

"تم کیا جانو بادشاہ کیسے اپنی بیٹیوں کو پیار کرتے ہیں۔ جو وہ ایک بار منہ سے نکال دیتی ہیں وہ پُورا کرتے ہیں۔"

بالی کا یہ کہنا بھی دُرست تھا۔ شہر کی ایک عام عورت، خالہ بالی میں اتنے گن تھے۔ پیار وہ کرنا جانتی تھی۔ باتیں وہ بے حد دلچسپ کرتی تھی۔ تعریف کرنے کے ڈھنگ سے وہ واقف تھی۔ راز و نیاز سے مکمل طور پر وہ آشنا تھی تو ...

ایک بادشاہ کی شخصیت تو سچ مچ بہت ہی انوکھی اور بہت ہی نرالی ہو گی۔ اس میں تو اس سے بھی کہیں زیادہ خصوصیات ہوں گی۔

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے ...؟"

صاحباں کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔

"اب تو میں اپنے بابا کے گھر پیدا ہو گئی اور میرے بابا بادشاہ بن نہیں سکتے ...!"

اپنی دانست میں اس نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

"اب تو میں جو کچھ ہوں اسی پر قناعت کرنا پڑے گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کہ اب تمہارے بابا بادشاہ نہیں بن سکتے مگر ..."

بالی بڑے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"مگر کیا ...؟"

صاحباں نے ایک نمایاں سی بے صبری سے پوچھا تو بالی جھٹ سے بول پڑی۔

"قناعت کرنے والی بات میرے دل کو نہیں لگی۔ انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ بننے کی کوشش تو کر لینی چاہیئے ... تقدیر نے جو مقام

نہیں دیادہ تدبیر سے حاصل کرلینا چاہیئے ...؟
"تقدیر نے جو نہیں دیا وہ تدبیر سے ... مگر کیسے ...؟
بالی کی بات صاحباں کی سمجھ میں نہیں آسکی۔
"تم بادشاہ کے گھر پیدا نہیں ہوسکتیں مگر تمہاری شادی تو کسی بادشاہ یا شہزادے کے ساتھ ہوسکتی ہے"
"ہائے خالہ کیسی باتیں کرتی ہو...؟"
اس نے شرم سے گلنار ہوتے ہوئے یکلخت سر جھکا لیا۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں"
بالی نے اس کا جھکا ہوا لال گلال چہرہ ٹھوڑی پکڑ کر اونچا کیا۔ نظروں ہی نظروں سے پیار کی بارش کرتے ہوئے بولی
"جب تمہاری طرف نگاہ اُٹھتی ہے، دل چاہتا ہے کسی محل میں تمہیں لے جاکر اطلس و کمخواب میں تمہارا یہ ریشمی سا بدن لپیٹ کر مخملیں گدوں پر بٹھا دوں"
"خالہ! ایسی باتیں چھوڑو...!"
وہ بے حد دل گرفتہ سی ہوتی ہوئی حسرت بھرے لہجے میں بولی۔
"شہر کی اور شہر والوں کی کوئی اور بات سناؤ"
"وہی تو کہہ رہی ہوں۔ شہر کی باتیں سُننے کے بجائے خود شہر کیوں نہیں چلتیں۔ کانوں سُنی کا وہ مزہ نہیں جو آنکھ دیکھی کا ہوتا ہے...!"
"لیکن یہ ممکن جو نہیں۔ اس لیے اس ذکر کو چھوڑ ہی دو"
"کیوں ممکن نہیں...؟"
بالی نے ایک جذبے کے ساتھ سینے پہ ہاتھ دھرا اور انتہائی جوش سے بولی۔
"تم میرے ساتھ چلو... اور نہ صرف یہ کہ میں تمہیں شہر لے کر جاؤں گی بلکہ وہاں جاکر تمہاری شادی بھی ایک بڑے خوابوں اور بانکے سے شہزادے کے ساتھ کراؤں گی"
"ہائے خالہ"
وہ پھر شرم سے سرخ سی ہوگئی۔
بار بار ایسی بات نہ کرو مجھے لاج آتی ہے"
"لاج واج چھوڑو اور پکّی بات بتاؤ۔ چلوگی میرے ساتھ...؟"
"خالہ، کہا نا میری اماں اور بابا کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ میرے بابا کو اس بستی کے ذرّے ذرّے سے بہت پیار ہے وہ صرف تصورآباد کی ہواؤں میں ہی سانس لے کر زندہ رہ سکتا ہے"
"تو بابا کو یہیں رہنے دو نا۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ اسے بھی ساتھ لے چلو"
بالی کو اس کی کج بحثی پر اُلجھن سی ہونے لگی مگر اس نے بڑے صبر سے چہرے پر مسکراہٹ کی ردا تانتے ہوئے اس اُلجھن کو صاحباں سے چھپا لیا۔
"اور اماں بھی تو نہیں رہ سکتی"
"ٹھیک ہے تم اکیلے چلو"
"اکیلی...؟" صاحباں نے اتنی سمجھدار اور عقلمند خالہ بالی کو یوں گھورا جیسے یکایک اور اچانک ہی اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا جس کی اسے قطعی توقع نہ تھی۔
"تو اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا بات ہے"
بالی نے اس کے تعجب کو اس کی بے وقوفی پر محمول کیا۔
"تمہاری جب شادی ہوگی تو تم اکیلی ہی سسرال جاؤ گی۔ اماں اور بابا ساتھ تھوڑی جائیں گے"
پھر خالہ بالی نے اس کے بہت قریب کھسکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں انتہائی آہستگی سے کہا۔
"ہمارے شہر کا بادشاہ ہے نا۔ اس کا ایک بیٹا ہے۔ جوان، خوبصورت گبھرو۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے بالکل جیسی کسی انتہائی خوبصورت لڑکی کے ساتھ... اور میں اسی کے لیے دُلہن تلاش کرتی پھر رہی ہوں"
"کیا...؟" صاحباں نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے بالی کو بغور گھورا۔

"ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں کوئی عام شام عورت نہیں ہوں"
"کیا مطلب...؟"
"یہ دیکھو..."
خالہ بالی نے اپنی بات کی تصدیق کرنے کے لیے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی گتھلی نکالی۔ پھر وہ کھول کر اس میں سے سفید نگینے والی ایک بے حد چمکدار اور خوبصورت سی انگوٹھی نکال کر صاحباں کو دکھائی۔
"یہ ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ پانچ ہزار روپے اس ذرا سی انگوٹھی کی قیمت ہے۔ اور ایسی قیمتی چیزیں صرف بادشاہوں کے ہاں ہی ہوتی ہیں"
صاحباں دم بخود اس انگوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے نگینے کی چمک نے اس کی آنکھوں میں چڑھتے سورج کی کرنیں سی روشن کردی تھیں۔
"میں اپنے بادشاہ کے کام پر نکلی ہوئی ہوں... بادشاہ جیسی بہو چاہتا ہے ویسی لڑکی جہاں کہیں بھی مل گئی مجھے یہ انگوٹھی اسے پہنانا ہے"
"تو... تو تم..."
خالہ بالی ایک عام عورت نہ تھی۔ صاحباں کو یہ معلوم ہوا تو وہ اس کے سامنے بات کرتے ہوئے گھگھیانے لگی۔ اس کے رُتبے کے مطابق اب وہ اسے تم کہہ کر بھی مخاطب کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔
"میرا مطلب ہے۔ آپ... آپ زرینہ کے بھائی عارف کے کاروبار میں شریک ممتاز کی خالہ نہیں ہیں...؟"
"میں یہاں کسی کی بھی کچھ نہیں ہوں۔ نہ میری کسی سے رشتے داری ہے نہ کوئی اور تعلق۔ بس ممتاز سے ایک دو بار سودا لیا تھا پھر اسی سے پتہ چلا کہ یہاں تصورآباد میں عارف کی بہن کی شادی ہے"
خالہ بالی بڑے انداز سے مسکرائی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک بھر کر بولی۔
"یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ شادیوں میں بہت سارے لوگ شریک ہوتے ہیں اور پھر تم ایسی عمر کی لڑکیاں تو پورے شوق اور جوش و خروش سے حصّہ لیتی ہیں... ہیں نا...؟"
صاحباں ساکت بیٹھی بس اسے دیکھے جارہی تھی۔
"میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں...؟"
اس نے صاحباں ہی کی گواہی لی۔
"نہیں...؟"
"تو بس پھر... اسی دُلہن والے انتخاب کے سلسلے میں یہاں چلی آئی۔ یہ دسواں گاؤں ہے جہاں میں ایک نایاب اور انمول سی لڑکی کی تلاش میں آئی ہوں۔ سینکڑوں لڑکیاں میں نے دیکھی ہیں مگر...!"
بالی دانستہ خاموش ہوئی تھی یا نادانستہ لیکن صاحباں کو اس لمحے اس کی خاموشی بڑی کھلی۔ ایک دم بے تابی کے ساتھ بول پڑی۔
"مگر کیا...؟"
"مگر یہ کہ ابھی تک انگوٹھی میرے پاس ہے۔ مجھے کوئی بھی ایسی لڑکی دکھائی نہیں دی جو ہمارے بادشاہ کی بہو بننے کے قابل ہو۔ جو ہمارے شہزادے جیسے من موہنی اداؤں اور حوروں جیسی صورت شکل کی ہو"
"کوئی ایک بھی نہیں...؟"
صاحباں کا تجسّس معصومیت بھری دلچسپی سے بولا۔
"کئی سو میں سے ایک بھی نہیں۔ عجیب بات ہے"
"عجیب کیوں...؟ تم اگر ہمارا وہ شہزادہ دیکھ لیتیں نا تو عجیب بھی نہ کہتیں۔ چاند سورج اس کے سامنے مات ہیں"
"اچھا...؟"
صاحباں کی آنکھیں مزید کھلیں۔ تجسّس مزید اُبھرا۔
"پھر...؟ خالہ پھر تم... اوہ...!
وہ آپ ہی آپ ندامت کے گڑھے میں گرتے گرتے اُبھری۔ اتنی بڑی ہستی کو وہ پھر تم کہہ رہی تھی۔
"میرا مطلب ہے آپ"

بالی جہاندیدہ عورت تھی۔ صاحباں کے ذہن کی سوچوں تک کو سمجھ رہی تھی۔ ایک دم اُسے کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"میں بے شک بادشاہ کی بھیجی ہوئی عورت ہوں مگر تم مجھے اپنی سہیلی ہی سمجھو اور اُسی بے تکلفی سے میرے ساتھ بات کرو... ہاں... کیا کہہ رہی تھیں...؟"

"میں... میں پوچھ رہی تھی اگر کوئی ایسی لڑکی نہ ملی تو پھر... پھر کیا بادشاہ تمہیں سزا دے گا...؟"

"کیوں نہ ملی ایسی لڑکی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ایک فاتحانہ سا تبسم اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔

"بالی نے آج تک جس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے وہ ہمیشہ کر کے رہی ہے۔"

"پھر تو خالہ! تمہارے لیے میں بھی دعا مانگوں گی۔"

"ہاں ضرور مانگنا... مگر یہ کہ میں نے اپنے شہزادے کے لیے جس لڑکی کا انتخاب کیا ہے وہ میرے ساتھ چلنے کو راضی ہو جائے۔"

"کیا...؟ کیا...؟"

صاحباں نے ایک واضح سی بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

"تم نے لڑکی ڈھونڈ لی...؟"

"ہاں۔" بالی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے فتح مندانہ بولی۔

"سچ...؟" صاحباں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بالکل سچ..."

"کیسی ہے وہ...؟"

"بس۔ جیسی میرے بادشاہ نے کہی تھی۔ جیسا میرا شہزادہ ہے۔ ویسی ہی ہیروں اور موتیوں میں تُلنے کے قابل ہے وہ۔"

"مجھے دکھاؤ گی...؟"

صاحباں آنکھوں میں عجیب سی چمک لے کر اس کے قریب کھسک آئی۔

"ہاں... لیکن ایک شرط پر۔"

"وہ کیا...؟"

"وہ شہر نہیں جانا چاہتی۔"

"کیسی پاگل ہے...؟" صاحباں پوری بات سُنے بغیر بڑبڑائی۔

"دیکھو نا کیسی حماقت کر رہی ہے۔ یہی میں تم سے کہنا چاہتی تھی کہ کسی طرح تم بھی سمجھاؤ اسے۔ ایسا موقع پھر زندگی بھر اسے نہیں ملے گا۔"

"تم مجھے بتاؤ وہ کون ہے۔ میں اسے ضرور سمجھاؤں گی۔"

پھر وہ یکایک خود ہی چونک پڑی۔

"مگر میں اسے کیسے سمجھاؤں گی۔ وہ نجانے کہاں ہو گی۔"

"یہاں تصوّر آباد میں ہی ہے۔"

بالی کے ہونٹوں پر معنی خیز تبسم تھا۔

"یہاں۔ تصوّر آباد میں ہی...؟"

صاحباں تعجب سے، مسرت سے اُچھل سی پڑی۔

"اگر وہ واقعی تصور آباد ہی کی ہے تو پھر منہ میٹھا کرو خالہ...!"

وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکراتے ہوئے ایک تیقن کے ساتھ بولی۔

"ہماری بستی کی ہر لڑکی میری اور میرے بابا کی بات بہت مانتی ہے۔ تم مجھے اس کا نام بتاؤ۔"

"اسے راضی کرنے کا وعدہ پکا ہے نا...؟"

"ہاں ہاں... بالکل پکا خالہ...! ایک بادشاہ کی بہو بننا اور شہر میں جا کر محلات میں رہنا۔ اس سے زیادہ مزے کی بات اور کیا ہو گی اور اس سے اچھی زندگی اور کیسی ہو گی؟"

صاحباں کے الفاظ میں اس لڑکی کے لیے خلوص بھی تھا اور تھوڑی سی حسرت بھی۔

"کیسے نہیں مانے گی وہ... میری نہ مانی تو میں بابا سے کہہ کر اس کا دماغ درست کراؤں گی... پاگل سارے جہاں کی۔"

"تو پھر لو...!"

بالی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ ہیرے کی انگوٹھی اسے پہنا دی۔

"یہ رہی وہ لڑکی۔ جس کی شادی شہر کے ایک خوبصورت شہزادے کے ساتھ ہو گی۔"

صاحباں کی کھلی کھلی پھیلی پھیلی آنکھوں میں بالی بغور جھانکتے ہوئے بولی۔

"اب اسے راضی کرنا تمہارا کام ہے۔ تم وعدہ کر چکی ہو...!"

"میں... میں...؟"

پہلے تو کئی لمحے صاحباں کو کچھ ہوش نہ آیا پھر ذرا سنبھلی تو عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے...؟"

وہ کبھی اپنے وجود کو دیکھتی کبھی اُس ہاتھ کو جس میں بالی نے ایک جھلکتی، دمکتی انگوٹھی پہنا دی تھی... صاحباں نے خواب و خیال میں بھی یہ ایسی قیمتی اور نایاب چیز نہ دیکھی تھی۔ وہ بار بار گھبرا گھبرا کر بالی کو دیکھنے لگتی۔

"لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔"

وہ اپنی ہستی کی کم قیمتی کو انگوٹھی کی قیمت کے برابر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہر سوچ اور ہر خیال اس کے والا پلڑا اُونچے سے اونچا ہی لیے جا رہا تھا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا...؟"

"ہم غریب لوگ ہیں خالہ اور... اور... نہیں خالہ! ہمیں ہمارے درجے پر ہی رہنے دو۔"

"اپنے درجے کا علم تو تمہیں شہر جا کر ہی ہو گا۔ وہاں ہیرے موتیوں کی قیمت نہیں لگتی انسانوں کی قیمت ہوتی ہے اور تمہاری قیمت کیا ہے۔ یہ تم تصور آباد میں رہ کر جان بھی نہیں سکتیں۔"

"مگر...؟"

"اگر مگر کچھ نہیں...؟" بالی نے اس کی بات سُنی ہی نہیں۔

"مجھے تو بس اتنا علم ہے کہ لاکھوں لڑکیاں میں نے پچھلے چند دنوں میں دیکھی ہیں اور ان سب میں سے اگر کوئی شہزادے کی ملکہ بننے کے قابل دکھائی دی ہے تو وہ تم ہو۔ صرف تم صاحباں...!"

بالی نے اس کا حسرتوں میں اور پریشانیوں میں ڈوب کر مزید خوبصورت اور معصوم ہو جانے والا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر کئی لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"میرا بادشاہ تمہیں دیکھے گا نا تو مجھے یقین ہے وہ میرے انتخاب کی داد دے گا اور تمہارے حسن کی یہ دولت مجھے بھی دولتوں اور نوازشات سے نوازے گی۔ تم تو اتنی امیر ہو کر میں تمہاری محتاج ہوں۔ تم سے بھیک مانگ رہی ہوں۔"

"نہیں نہیں...؟"

صاحباں نے بالی کے ہاتھوں سے اپنا چہرہ نکال کر اپنے ہاتھوں میں ڈھانپ لیا۔ اس کا سارا وجود کپکپا رہا تھا۔ بالی کی باتیں اُسے ڈانواں ڈول کر رہی تھیں۔

ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپا تو اسے محسوس ہوا کہ انگوٹھی ابھی تک اس کی اُنگلی میں تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چہرے پر سے ہٹائے۔ انگوٹھی کے سفید ہیرے کی چمک کچھ ایسی تیز، ایسی آبدار تھی کہ صاحباں کی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔

وہ جلدی جلدی انگوٹھی اُتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ہاتھ لرز رہے تھے۔

"مت اُتارو۔ یہ اب اُترے گی بھی نہیں۔"

ایک عجیب سی، فاتحانہ سی مسکراہٹ بالی کے ہونٹوں پر تھی۔

"کیوں...؟"

"اس لیے کہ تمہارے نصیب میں ملکہ بننا لکھا ہے۔"

"تم نے میرا نصیب کیسے دیکھ لیا...؟"

صاحباں کی پوری ہستی ابھی تک طوفان کی لپیٹ میں تھی لیکن بالی کی اس بات نے اُجالے کی اُبھرتی ایک ننھی سی کرن کی طرح ہنسی کی ایک ہلکی سی لہر اس کے ہونٹوں پر بکھیر دی۔

"تمہارا نصیب تمہارے خوبصورت چہرے پر لکھا ہے۔ سورج کی طرح چمکتی تمہاری حسین پیشانی کہہ رہی ہے کہ ایک دن تم بہت مشہور عورت ہو گی۔"

پھر بالی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہتھیلی کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔

"خالہ تمہیں ہاتھ کی لکیریں دیکھنا آتی ہیں...؟"

صاحباں کسی معصوم بچّے کی طرح اس مسئلے کو فراموش کر کے اسی طرف چل نکلی۔

"ہماری بستی میں ایک جوگی بابا تھا۔ وہ لوگوں کا ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتایا کرتا تھا۔ بستی کے لوگوں کو اس پر بڑا یقین تھا۔ ذرا سا بھی کوئی دُکھ سکھ ہو جاتا جھٹ اس کے پاس جا پہنچتے۔"

"تمہارا ہاتھ دیکھ کر اس نے یقیناً کہا ہو گا کہ تم ملکہ بنو گی..؟"

"میرا ہاتھ دیکھ کر...؟"

صاحباں نے انتہائی معصومیت سے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"اس وقت تو خالہ میں تھی ہی نہیں۔"

پھر صاحباں بہت دیر ہنستی ہی گئی اور بالی اس کی آنکھوں میں چمکتے ستاروں کو اور ہونٹوں سے پھوٹتے ہنسی کے فواروں کو دیکھے گئی۔ صاحباں کی ہنسی تھمی تو بالی کا سحر بھی ٹوٹ گیا۔

"تو اب وہ کہاں ہے...؟ اب چل کر دکھالو ہاتھ۔ نہ اس نے یہی بات کہی تو میرا نام بدل دینا۔"

"وہ تو اب ہے ہی نہیں۔"

"کیوں... کہاں چلا گیا...؟"

"جب میرے بابا یہاں کے قاضی بنے تو انہوں نے ملک جی سے کہہ کر اسے یہاں سے نکلوا دیا تھا۔"

"گاؤں سے ہی...؟"

"ہاں۔"

"وہ کیوں...؟"

"بابا کہتے تھے قسمت کا حال جاننے کی کوشش کرنا جائز نہیں ہے۔ لوگوں کا اللہ پر سے ایمان اُٹھنے لگتا ہے... اور سچ بھی ہے خالہ! لوگ قرآن اور حدیث سے زیادہ جوگی کی بات کا یقین کرتے تھے۔ لوگوں کو بہت سمجھایا۔ مگر نہ لوگ فال نکلوانے سے باز آئے اور نہ جوگی بابا ہاتھ دیکھنے سے۔"

ایک ننھا منّا سا قہقہہ پھر صاحباں نے لگایا۔ آنکھوں میں شوخ سی چمک لہرائی۔

"بابا بھی بھلا کس طرح باز آتا۔ لوگ اُسے بہت پیسے دیتے تھے اور وہ بہت امیر ہو گیا تھا۔"

وہ بولتی رہی اور بالی اس کی کھلی ہتھیلی کو دیکھتی رہی۔

"ارے چھوڑو اس کی بات۔ تم یہ دیکھو۔ یہ..؟"

بالی ایک دم چلّائی۔

"یہ لکیر ہے ملکہ بننے کی... کتنی صاف اور واضح ہے۔ یہ دیکھو۔"

"کونسی...؟" صاحباں بھی جھک کر دیکھنے لگی۔

"وہ جوگی بابا تو ہو گا کوئی فراڈ۔ مگر میں نے لکیروں کا علم شہر میں سیکھا ہے۔ یہ دیکھو... یہ لکیر..."

"مگر خالہ...!" صاحباں نے غیر دلچسپی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں شہر نہیں جا سکتی۔" جیسے اس نے اپنا آخری فیصلہ سُنا دیا۔

"کیا...؟" بالی حیرت میں ڈوب گئی۔

اس نے تو اپنی دانست میں اسے پوری طرح شیشے میں اُتار لیا تھا۔

"مجھے اپنا تصوّر آباد اچھا لگتا ہے۔"

"ملکہ بننے کو دل نہیں چاہتا...؟ خوبصورت خوبصورت کپڑے اور قیمتی اور جگمگ جگمگ کرتے زیورات پہن کر محلوں میں گھومنے پھرنے کا ارمان نہیں ہے...؟"

"ایسی زندگی گزارنے کو کس کا دل نہیں چاہے گا خالہ! کمال کی باتیں کرتی ہو تم بھی..."

وہ اسی بھولپن اور سادگی سے بولی۔

"مجھے تو جب سے تم نے شہر کی باتیں سُنائی ہیں اور تصویریں دکھائی ہیں میرا شہر دیکھنے کا شوق کئی گُنا بڑھ گیا ہے۔ میں تو سوتے جاگتے میں شہر ہی کے سپنے دیکھنے لگی ہوں۔"

"تو پھر چلو نا میرے ساتھ..... کیوں انکار کرتی ہو...؟"

"میں اپنے بابا اور امّاں کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ہمیشہ کے لیے تو نہیں چھوڑ کر جا رہیں۔ مہینے ڈیڑھ بعد میں خود تمہیں ان سے ملانے لایا کروں گی۔"

"تو پھر خالہ! بابا سے بات کرو نا..؟"

اس نے شرما کر گردن نیچے جُھکا لی۔

"بابا اور امّاں کو بھی تو میرے ملکہ بننے کی خوشی ہو گی۔"

"نہ نہ... تمہارے بابا نے ملک جی کو بتا دینا ہے۔

بالی کی بات سُن کر صاحباں سوچ میں پڑ گئی۔

اسے سوچوں میں کھوئے دیکھ کر بالی نے ایک دُکھ بھری آہ کھینچی۔

"ہائے! کتنا ارمان تھا میرے شہزادے کو خوبصورت دُلہن کا۔ کئی شہر، گاؤں اور دیہات چھان مارے۔ تب کہیں جا کر اُس جیسی، اس کے ارمانوں جیسی ایک لڑکی ملی۔"

بالی بے حد غمزدہ تھی۔ بے حد پریشان تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی سی تھی اور رنجیدہ سی کہے جا رہی تھی۔

"وہ بھی شہر چلنے کو راضی نہیں ہو رہی۔ مجھے لگتا ہے میرے شہزادے کے نصیب ہی کھوٹے ہیں۔ اس کے مقدّر میں اچھی اور خوبصورت دُلہن لکھی ہی نہیں گئی۔ وہ اسی حسرت اور انتظار میں ایک دن اس دُنیا سے ہی..."

"ہائے خالہ...!" صاحباں چونک کر، سٹپٹا کر یکایک بول اُٹھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو...؟"

"غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں...؟" دانستہ بالی بھی کچھ تیز ہو گئی۔

"تم مان نہیں رہیں تو آخر ایسا ہی کچھ انجام ہوتا ہے نا... ہائے بے چارہ... جوان مرگ..."

صاحباں نے بالی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چُپ چاپ اُٹھی۔ کھوئی کھوئی سی، ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی۔

انگوٹھی ہنوز اس کی اُنگلی میں تھی بالی نے وہ بھی نہیں اُتروائی۔ چُپ چاپ اُسے جانے دیا۔

صاحباں کی ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ذرا کے ذرا آنکھ لگ جاتی تو خواب میں یہی دیکھتی کہ وہ ملکہ بنی تاج پہنے ایک نوجوان اور خوبصورت مرد کے ساتھ کبھی کسی خوبصورت باغ کی روشوں پر ٹہل رہی ہے تو کبھی...

ایک خوبصورت اور عالیشان محل میں پہلو سے پہلو ملائے خوبصورت منقش تخت پر جلوہ افروز ہے۔ سامنے دربار لگا ہے وہ خوبصورت اور وجیہہ مرد اس کی آنکھ کے ایک ایک اشارے پر احکامات صادر کر رہا ہے۔

پھر کبھی دیکھتی ہے وہ عروسی ملبوسات میں ہیرے جواہرات کے جگمگ جگمگ کرتے زیورات پہنے اسی بانکے سجیلے مرد کی بانہوں میں بانہیں ڈالے پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہے۔ بڑی پیار بھری محبت بھری باتیں ہو رہی ہیں عجیب سا نشہ اس کے ہوش و حواس پر چھایا جا رہا ہے۔

خواب اور بے خوابی کی کیفیات میں ڈوبے ڈوبے یونہی ساری رات سپنوں کے تانوں بانوں میں اُلجھے اُلجھے گزر گئی۔

ان سوچوں اور سپنوں کے ساتھ ساتھ اسے امّاں اور بابا کا بھی خیال آئے جا رہا تھا۔ دن ہوتے ہوتے وہ بے خوابی سے تھکن سے اور اعصاب کے تناؤ کی وجہ سے نڈھال سی ہو چکی تھی۔

مرغ کی بانگ کے ساتھ حسبِ معمول صاحباں بستر پر سے نہیں اُٹھی تھی۔

جانے کیا وجہ تھی...؟

بابا اس پر جھکے اس کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں بابا! بس ذرا شادی کے دنوں میں سوئی کم تھی اس لیے نیند نہیں کھلی..."

اور... اپنے اوپر جھکے ہوئے اور سر پر انتہائی شفقت و محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکیں مارتے ہوئے بابا اسے اتنے اچھے لگے کہ صاحباں نے اسی لمحے دل میں پکا ارادہ کرلیا۔

آج یہ انگوٹھی، جس پر اس وقت اس نے یوں پٹی باندھ رکھی تھی جیسے بہت بڑا زخم تھا۔ یہ انگوٹھی اور اس کی چمک دمک بھی تو اسے ایک زخم کی مانند ہی کسک دے رہی تھی۔ یہ آج ابھی ابھی جاکر خالہ بالی کو واپس دے دے گی۔

گھر کے سارے کام اکثر اس کی اماں خود ہی کرتی تھی۔ اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی سے وہ بہت کم کام کرایا کرتی تھی۔ لہٰذا اس وقت اسے اور کوئی مصروفیت نہ تھی۔

اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ اماں نے کھانا سامنے لا رکھا۔ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر اماں کی خاطر دو تین نوالے زبردستی حلق سے اتار کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہو...؟"

اماں نے اس کا کہیں جانے والا ارادہ بھانپ لیا تھا۔

"زرینہ کے ہاں"

"اب تو شادی کو ختم ہوئے بھی دو روز ہوگئے"

"وہ... وہ ذرا مٹھائی وغیرہ سب گھروں میں تقسیم کرنا تھی"

گوان کے گاؤں میں جھوٹ کوئی نہیں بولتا تھا مگر اس وقت سوائے جھوٹ کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اماں نے ہمیشہ سچ بولنے والی کے جھوٹ کا سچ ہی کی طرح یقین کرلیا۔

"تو پھر یہ لسی تو پیتی جاؤ۔ تمہاری خاطر میٹھی بنائی ہے"

کس پیار سے اماں نے کہا تھا۔ دل بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن انکار بھی نہ کر سکی۔ کھڑے کھڑے ہی لسی کا گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

"آج بھی سارا دن وہیں نہ گزار دینا"

"کیوں... کوئی کام ہے...؟"

"کام...؟"

اماں بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے ہنسی۔

"تجھ سے میں کون سے ہر وقت کام کرواتی رہتی ہوں..."

"پھر...؟"

"پگلی...!" اماں نے سر ہلایا۔

"اتنا بھی نہیں جانتی کہ اولاد کا وجود ہی ماں کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ کام وام کی کوئی بات نہیں۔ کچھ... دیر تم نظر نہیں آئیں تو اپنے ہی گھر میں جی نہیں لگتا"

"بس ماں! ابھی گئی۔ ابھی آئی۔ آج سارا دن نہیں رہوں گی وہاں..."

ماں کے پیار میں بھیگی بھیگی اور گہرائی میں ڈوبی ڈوبی وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی زرینہ کے گھر چل دی۔ بالی کی ہدایت کے مطابق زرینہ کے گھر کے پچھواڑے کی طرف سے چھوٹی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئی۔

وہیں کونے میں بنا وہ کمرہ تھا جس میں شہر سے آنے والی سب سے معزز مہمان بالی کو ٹھہرایا گیا تھا۔ نہ اس کی ان سے کوئی رشتے داری تھی، نہ میل ملاقات اور نہ اتنی جان پہچان۔ بس اس کے لباس، زیورات، رکھ رکھاؤ اور گفتگو کے انداز نے اسے سب کی نگاہوں میں معزز اور قابلِ احترام بنا دیا تھا۔

اس کا جب جی چاہتا وہ کمرے سے نکلتی۔ جب جی چاہتا سو جاتی۔ جب گاؤں کی سیر یا ہواخوری کی خواہش ہوتی اور وہ خواہش دوپہر میں پیدا ہوتی یا آدھی رات کو، وہ نکل پڑتی۔

کسی کو اس کے معاملات میں دخل دینے یا ذرا سا بھی اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس کی ہستی، اس کی شخصیت نے آپ ہی آپ سب سے خود کو منوا لیا تھا اور سارے حق حقوق لے لیے تھے۔ نہ اسے کچھ کہنا پڑا تھا، نہ اسے کچھ مانگنا پڑا تھا،

جس عورت سے، جس لڑکی سے، جس بچے سے اس کا دل چاہتا وہ بات کرتی تھی کسی اور میں اپنے آپ ہمت یا جرأت نہ تھی اس سے بات کرنے یا اس کے سامنے بولنے کی۔

صرف ایک صاحباں تھی جو اس سے اتنی بے تکلف بھی تھی۔ رات دن اس کے ساتھ بھی رہتی تھی۔ اس سے روٹھتی منتی بھی تھی۔ اس سے پیار بھی کراتی تھی اور ناز نخرے بھی اٹھواتی تھی مگر...

ان کی یہ دوستی اور میل ملاپ سب سے چھپ کر تھا۔ کوئی بھی ان کے تعلقات سے واقف نہ تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کمرے کے اندر بالی گھنٹوں اکیلی نہیں ہوتی تھی بلکہ صاحباں اس کے پاس ہوتی تھی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب وہ گاؤں کو دیکھنے یا ہواخوری کے لیے دوپہر یا سہ پہر یا آدھی رات کو نکلتی تھی تو اس سے ذرا فاصلے سے ایک صاحباں کا سایہ ساتھ ہوتا تھا۔

یہ ساری رازداریاں اور چوریاں صاحباں کی سمجھ سے بالاتر تھیں مگر پھر بھی وہ بالی کی ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور تھی نہ چاہنے پر بھی مجبور... دل کے ہاتھوں مجبور... وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ اسے انوکھی لگتی تھی۔

اپنے پورے گاؤں میں، اپنے رشتے داروں میں، اپنے ملنے جلنے والوں میں اس نے ایسی عورت کبھی نہ دیکھی تھی۔

پچھواڑے والی دیوار پر سے اتر کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ویسے بھی اس طرف کوئی کم ہی آیا کرتا تھا۔ وہ دبے دبے سے مگر تیز قدم اُٹھاتی بالی کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

"یہ لو خالہ! یہ تمہاری انگوٹھی"

نہ کوئی معافی مانگی۔ نہ کوئی صفائی پیش کی اور نہ کوئی حیلہ بہانہ تراشا۔ سیدھی سادی خود تھی اسی طرح بغیر لگی لپٹی کے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"میں یہ نہیں لوں گی اور نہ شہر جاؤں گی"

"کیوں...؟"

"بس۔ میں نے اپنے دل سے فیصلہ کرلیا ہے"

"لیکن تم نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا...؟"

"کون سا وعدہ...؟"

"کہ اس لڑکی کو شہر جانے کے لیے راضی کروں گی۔ بڑی بے زبان ہو"

"بے زبان نہیں خالہ! میں نے بڑی کوشش کی تھی"

صاحباں شکست خوردہ سے لہجے میں بولی۔

"اپنی پوری کوشش کی تھی۔ مگر وہ اپنی اماں اور بابا کو نہیں چھوڑ سکتی"

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اتنی آسائشیں، دولتیں، اتنی اعلیٰ زندگی اور... اور... ایک لڑکی جو کچھ چاہے، وہ پاکر بھی... اتنا حسین و جمیل دُلہا اور..."

"ہاں... ہاں..."

صاحباں ایک دم سے کپکپاتی ہوئی سی آواز میں بڑے زور سے چلا دی۔ بالی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی۔

"بس کہہ رہی ہوں۔ ہاں"

مگر بالی کی نقطہ شناس نگاہوں نے اس کے دل کا حال جان لیا تھا کہ اس کی باتوں اور گھاتوں نے صاحباں کے بچپن کو پچھاڑ دیا تھا اور اب وہ ایک پوری جوان لڑکی بن چکی تھی۔

شباب اور جذبات سے بھرپور...!!

جن باتوں کے متعلق اس نے آج تک سوچا نہیں تھا وہ اب سوچنے لگی تھی۔ جو خواب اس نے کبھی نہ دیکھے تھے وہ اب کھلی آنکھوں اور پورے ہوش و حواس سے دیکھنے لگی تھی۔

بالی اسے کچھ اور کہتی شاید... مگر... صاحباں نے دانستہ موقع ہی نہیں دیا۔ وہاں سے بھاگ اُٹھی۔ مبادا بالی کی ہستی کا جادو اور باتوں کی کشش اسے پھر ڈانواں ڈول کردے۔

بالی اسے پکارتی ہی رہی مگر اس نے سُن کر بھی ان سُنی کردی۔ مڑ کر پیچھے دیکھا بھی نہیں۔ کہ وہ پتھر کی نہ بن جائے۔ پھولی ہوئی سانس لے کر وہ اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سانس بے ترتیب تھے۔

اور قدم غیر ہموار پڑ رہے تھے۔

اپنی چال اور اپنی سانسوں کو ہموار کرنے کے لیے وہ وہیں اندر داخل ہونے والے دروازے کی اوٹ میں رک گئی۔

"میں تو کہتی ہوں زہراں کی بات مان لیں۔ لڑکا اگر صورت شکل کا معمولی ہے تو کیا ہوا۔ سُنا ہے اس کی دکان بہت بڑی ہے ...؟"

صاحباں کی ماں کی آواز تھی۔ بڑی مشکل سے سانس ہموار کرکے چُنری وغیرہ ٹھیک طرح اوڑھ کر اندر جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پھر تھم گیا۔ غیر ارادی طور پر ہی وہ سُننے پر مجبور سی ہوگئی۔

بالی ہی نہیں کہتی تھی وہ تو اب اپنے والدین کی نظروں میں جوان ہوگئی تھی۔ اتنی کہ وہ بھی اب اس کی شادی کے لیے لڑکا ڈھونڈنے کی فکر میں لگ گئے تھے۔

"اور پھر نہ ماں نہ باپ اور نہ کوئی بہن بھائی۔ پیسہ کافی۔ فتنے داری کوئی نہیں۔ میری صاحباں راج کرے گی وہاں۔ نہ غریبی کا دُکھ نہ سُسرال والوں کی چھوٹی موٹی پریشانیاں۔ عیش ہی عیش۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے بھلی لوگ..." یہ بابا کی آواز تھی۔

"مگر مجھے خیال آتا ہے تو یہ کہ ایک ہی ایک اولاد ہے۔ وہ بھی نظروں سے دُور چلی جائے گی؟"

"لو۔ لگتا ہے تم سچ مچ بڈھے ہوگئے ہو۔ حسن پورہ کو نسا یہاں سے سو ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ صرف بیس کوس ہی تو پرے ہے۔"

"بیس کوس...؟"

بابا نے لمبا کرکے بیس کوس کہا۔ پورے بیس میل جتنا ہی۔

"اور میری صاحباں صرف میری نظروں سے دُور ہو جائے، خواہ ایک اینٹ کی دیوار سے پرے ہی ہو، تو میں بے چین ہو اٹھتا ہوں اور تم میلوں کی بات کر رہی ہو۔"

"اسی لیے بابا! اسی لیے میں تمہیں چھوڑ کر شہر نہیں گئی۔ صرف تمہاری اور اماں کی خاطر۔ تمہاری اسی محبت نے مجھے بہت کچھ چھڑا دیا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔"

صاحباں نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔ اپنے شہر نہ جانے کے فیصلے پر جیسے سُرخرو بھی ہوگئی۔ اندر سے دل جو دیران ہو اُٹھا تھا۔ اتنی نعمتیں ٹھکرا کر، ایک پریشانی سی جو من میں اُتر گئی تھی۔ وہ سب دُور ہو گیا۔ آپ ہی آپ سکون و طمانیت بھرا سانس حلق سے نکلا اور جیسے پوری فضا میں خوشی بن کر پھیل گیا۔

"مگر لڑکی تو کبھی بادشاہ نے بھی گھر میں نہیں بٹھائی۔"

ماں اور باپ کی گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اُٹھا ہوا قدم ماں کی بات سُن کر پھر وہیں پیوست ہوگیا۔

"بیٹی نے تو والدین سے ہر صورت میں جدا ہونا ہوتا ہے۔"

"ہاں...؟" بابا نے ایک طویل سی ٹھنڈی آہ بھری۔

"واہ مولا۔ ایک اولاد دی اور وہ بھی لڑکی ذات۔ کہ ذرا سر نکالے تو اسے گھر سے رخصت کرکے پھر بے اولاد بن بیٹھو۔"

"ہائے ہائے۔ اللہ نہ کرے ہم بے اولاد ہوں۔ کیسی باتیں مُنہ سے نکالتے ہو۔"

اماں نے بابا کو جھڑکا۔

وداع ہو جائے گی تو کیا ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی۔ آتی جاتی تو رہا کرے گی۔"

"ہاں..." بابا کی آواز میں دکھ ہی دکھ تھا۔

"سال چھ مہینے بعد ایک پھیرا ڈال جایا کرے گی۔ مگر پیاسی کھیتی ایک چھینٹے سے کبھی سیراب ہوئی ہے؟ سدا کے پیاسے ہو جائیں گے۔"

"اچھا اچھا۔ اب ایسی باتیں چھوڑو۔ فراق کی آہیں پھر بھر لینا۔"

اماں کی ہنسی بھرائی ہوئی تھی۔

"اس وقت کوئی فیصلہ کرو۔"

"ابھی...؟"

"تمہیں بتایا ہے کہ آج زہراں نے جواب لینے آنا ہے۔ ہاں یا نہیں۔"

"تم اگر تُلی ہی گئی ہو تو پھر کر دینا ہاں۔"

"تم تو ایسے ہاں کر رہے ہو جیسے کوئی بہت مجبوری ہے۔ صرف ایک صورت شکل میں ہماری صاحباں کے ساتھ سجتا نہیں ہے نا۔ باقی تو سارے گن پورے ہیں۔ کوئی عیب یا نقص اس کے مزاج یا عادات میں نہیں ہے۔"

"اری بھاگوان، صورت شکل کی کون بات کر رہا ہے۔ مرد کی بھی کبھی کسی نے صورت شکل دیکھی ہے۔"

"تو پھر...؟ صاف صاف بتاؤ نا۔"

"صاف صاف تو کہہ دیا کہ ہاں کر دو۔"

اب بابا قدرے تیز آواز میں اُلجھ کر بولے۔

"رہی بات میرے انداز کی تو وہ تو جس سے بھی رشتہ ہوگا اور جب بھی ہوگا میرا انداز ایسی مجبوری ہی لیے ہوگا۔ اس مجبوری کا نام ہے اکلوتی اولاد کی جُدائی۔ سمجھ گئیں۔"

"تو جی۔ فیصلہ ہوگیا صاحباں! تیری قسمت کا۔ اماں اور بابا بھی تجھے گھر سے رخصت کرنے کا سوچ رہے ہیں۔"

پل بھر میں بجلی کا ایک کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا۔

اماں ابا سے اگر جدائی ضروری تھی تو... تو حسن پورہ کے ایک دکاندار کے بجائے شہر کا وہ شہزادہ بہتر نہ تھا؟

حسن پورہ پھر بھی ایک گاؤں تھا اور گاؤں کی ایک دُکان کتنی بڑی ہو سکتی تھی۔ اسی لحاظ سے اس کا گھر بار بھی بس عام سا ہوگا۔ اماں بابا کی غربت کی نگاہ میں تین وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کو دو سے چار جوڑے کپڑے ہی بہت بڑی امیری تھی۔

لیکن۔ صاحباں کا معیار اب اماں بابا کا معیار نہیں رہ گیا تھا۔ بالی نے شہر کی باتیں سُنا کر، تصویریں دکھا کر صاحباں کی جا و بے جا تعریفیں کرکے، اس کا معیار بہت بلند کر دیا تھا۔

وہ تو غربت کی گود میں پلی تھی۔ کسی کھاتے پیتے خوشحال گھرانے کی ایک لڑکی سے بھی اب تو اس کا معیار بہت، بہت بلند ہو چکا تھا۔

روٹی، کپڑا اور مکان کے بجائے وہ انواع و اقسام کے کھانوں، قیمتی سے قیمتی ملبوسات اور ہیرے جواہرات کے زیورات اور وسیع و عریض محلات کے خواب دیکھنے لگی تھی۔

اس کے علاوہ۔ عمر کی جس دہلیز پر اس نے قدم رکھا تھا وہ بڑی جذباتی تھی، وہ بڑی جوشیلی تھی۔ وہ بڑی نازک تھی جب تک کوئی خیال دل میں نہیں آیا تھا تو نہیں آیا تھا۔ اور اب۔ بالی نے احساس دلایا تو...

عمر نے سب کچھ طلب کرنا شروع کر دیا۔ ہیرے جواہرات اور قیمتی ملبوسات کے ساتھ ساتھ ایک نوجوان اور خوبرو مرد کے ساتھ سپنوں میں وقت گزارا تو وہ دل کی سب سے بڑی خواہش، سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی آرزو بن گیا۔ اس شہزادے کے خواب انگ انگ میں سما کر رہ گئے۔

اپنی حیثیت کا، اپنے مقام کا، اپنے درجے کا خیال ہی نہ رہا۔ مقابلہ دُکاندار اور شہزادے کا ہو گیا۔ اور معمولی سی شکل و صورت والے ایک دُکاندار کا ایک خوبرو اور بانکے سجیلے شہزادے کا بھلا مقابلہ ہی کیا؟

صاحباں کی عمر، جوانی، شباب اور دل کی امنگوں نے ایک منٹ میں شہزادے کی چوکھٹ پر پیشانی ٹیک دی۔ وہ اس کی وجاہت اور بانکپن کے قدموں میں سجدہ ریز ہوگئی۔

اور... اور... ایک آخری سوچ جس نے اس کا فیصلہ اٹل کر دیا۔

اس کے ہاتھ میں ملکہ بننے کی لکیر بھی تو تھی۔

بس اسے قدرت کو بھی یہ منظور تھا۔ نصیب میں ہی یہ لکھا گیا تھا تو پھر چُوں و چرا کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔

وہ یک لخت پلٹی اور گھر کے اندر داخل ہونے کے بجائے خالہ بالی کے در پر جا پہنچی۔ اتنے تیز قدم اس نے زندگی میں کبھی نہیں اُٹھائے تھے جتنے آج۔

خدشہ تھا۔ خالہ بالی واپس نہ چلی گئی ہو۔ اس کی تو زندگی اندھیروں میں ڈوب جاتی تھی۔ سانس چڑھا ہوا تھا۔ سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"خالہ... خالہ..."

بالی جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔ واپس جانے کی تیاری تھی۔ صاحباں کی بے ترتیب آوازوں پر گھبرا کر جلدی سے مڑی۔

وہ عجیب سے حلیے کے ساتھ دروازے میں کھڑی تھی:

"میں تمہارے ساتھ شہر جاؤں گی۔ میں تمہارے ساتھ شہر جاؤں گی۔"

وہ وہیں سے بلند آواز اور ہذیانی سے انداز میں چلائی۔
بالی یہ سُنتے ہی بلا کی برق رفتاری سے اس کی طرف لپکی۔ قریب پہنچتے ہی ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

"آہستہ بولو۔"

بالی سرگوشی میں بولی۔ پھر اسے کھینچتے ہوئے بند دروازے سے بھی دُور ہٹا لے گئی۔

"زرینہ کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں میں تو سیدھی ادھر ہی آگئی تھی۔"

"کسی نے تمہیں آتے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"کسی کو بتایا ہے کہ تم میرے ساتھ شہر جا رہی ہو؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔"

"اچھا..." بالی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "بہت اچھا کیا۔"

پھر ہولے سے پوچھنے لگی۔

"اب شہر جانے کا ارادہ کیوں کر لیا...؟"

"اس لیے خالہ! کہ..."

اور صاحباں اسی سادگی، اسی معصومیت اور بھولپن کے ساتھ آماں اور بابا کی گفتگو کا ایک ایک حرف بلاکم و کاست اسے بتانے لگی۔

صاحباں کے اس فیصلے نے بالی کے چہرے پر عجیب سے رنگ بکھیر دیئے تھے۔ وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ کھل کھل ہنسے جا رہی تھی۔

"آخر میں نے سوچا خالہ! جب آماں اور بابا سے جُدا ہی ہونا ہے تو شہر ہی کیوں نہ چلی جاؤں۔"

پھر وہ اپنی چُنری کے پلّو کو مروڑتے ہوئے گردن جُھکا کر ایک شرمیلی سی ادا کے ساتھ بولی۔

"مجھے وہ ہیرے کی انگوٹھی بہت خوبصورت لگی تھی۔ ایسی ہماری پوری بستی میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ ملک جی کی لڑکی کے پاس بھی نہیں۔"

پھر اس نے اور بھی گردن جھکا کر اور بھی شرما کر... مدھم آواز میں کہا۔

"اور خالہ! مجھے وہ شہزادہ بھی بہت اچھا لگا ہے جس کی تصویر تم نے دکھائی تھی۔ جب سے تصویر دیکھی ہے ایک منٹ کو بھولا نہیں۔"

"اوئے میں صدقے واری جاؤں۔ یہ فیصلہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔"

بالی نے نہال ہوتے ہوئے ایک وارفتگی کے ساتھ اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر اس کی چٹاچٹ بلائیں لینے لگی ڈھیروں ڈھیر پیار کر ڈالے۔

"تم ایسی عمر کی اتنی عقلمند لڑکی میں نے اور کوئی نہیں دیکھی۔ واقعی میرا شہزادہ بڑا خوش قسمت ہے جسے تم جیسی زہرہ والی ہے۔ صورت شکل کا بھی کوئی ثانی نہیں اور عقل سمجھ میں بھی سب سے اعلیٰ۔"

"پھر میں بھی جا کر تیاری کروں۔"

صاحباں نے اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے اس کے بکس کی طرف دیکھ کر مسرور سی آواز میں کہا۔

"اور تم اماں اور بابا سے مل کر خود بات کر لو۔"

"نہیں نہیں..." بالی یکدم سٹپٹا گئی۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"اماں اور بابا سے بالکل بات نہیں کرنی۔"

لہجے میں قدرے سختی تھی۔

"تو پھر کیا چوری چوری جاؤں گی...؟"

"ہاں۔ اماں بابا کو بتاؤ گی تو اپنے شہزادے کو کبھی نہ پا سکو گی۔ وہ تمہیں شہر نہیں جانے دیں گے۔"

"کیوں نہیں جانے دیں گے...؟ خود ہی تو وہ مجھے گھر سے رخصت کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔"

"وہ تو کر رہے تھے مگر اس دُکاندار کے ساتھ۔ بادشاہ زادے سے تیرا رشتہ کرنے کو کبھی راضی نہ ہوں گے۔"

"کیوں...؟ کیوں نہ راضی ہوں گے...؟"

صاحباں قدرے جھنجھلا کر بولی۔ خالہ کی بھی منطق اسے عجیب سی لگ رہی تھی۔

"ذات برادری مختلف ہے نا۔"

بالی نے اسے اس زاویے سے سنبھالنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح ماں اور باپ سے بات کرنے سے باز آ جائے۔

"اوہ ہاں..." صاحباں نے بڑے زور سے سر ہلایا۔

"یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔"

پھر وہ اپنے ذاتی تجربے کی باتیں بالی کو بتانے لگی۔

"آپا کے بھی دو رشتے آئے تھے۔ ایک حالانکہ بہت امیر تھا۔ صورت شکل کا بھی زیادہ اچھا تھا۔ گھر بار بھی اپنا تھا۔ غرض ہر معاملے ہر لحاظ سے دوسرے سے اچھا تھا۔ مگر خالہ! اس کے ساتھ صرف اس لیے رشتہ نہ ہوا کہ وہ ان کی ذات کا نہ تھا۔"

"بس ایسا ہی معاملہ یہاں ہو جائے گا۔ اسی ڈر سے میں تمہارے ماں باپ سے بات نہیں کرتی۔"

"کیا وہ... کیا وہ..."

صاحباں پھر اسی بھولی سی ادا کے ساتھ شرماتے ہوئے بولی۔

"بہت چھوٹی ذات کے ہیں...؟"

"تو... پگلی کی بات سُنو۔"

بالی نے ایک قہقہہ لگا کر اس کا تمسخر اڑایا۔

"ارے وہ چھوٹی ذات کے نہیں وہ تو بڑے اونچے خاندان کے ہیں۔"

"تو پھر بابا کیوں نہیں مانیں گے؟"

"اسی طرح جیسے آپا کا امیر کے ساتھ نہیں کیا۔ چھوٹی ذات کر کے نہیں۔ ذات مختلف ہونے کی وجہ سے۔ گاؤں کے لوگ چھوٹی اونچی نیچی نہیں دیکھتے۔ بس غیر ذات نہ ہو۔ یعنی کہ دوسری ذات۔ ان میں صرف ذات کا اختلاف ہی بہت بڑا عیب بن جاتا ہے خواہ دوسری ہر خوبی موجود ہو اور نقص کوئی نہ ہو۔"

بالی کی وضاحت نے جیسے اسے ساری اونچ نیچ اچھی طرح سمجھا دی تھی۔

"پھر خالہ! پھر کیا کیا جائے...؟ میں تو شہر ضرور جاؤں گی۔"

شہر اور شہر میں رہنے والے لوگوں کو دیکھنے کا اشتیاق پہلے ہی بہت تھا اور اب۔ اس شوق کی تکمیل میں رکاوٹیں پڑنے لگیں تو وہ اور تیز ہو گیا۔ اوپر سے والدین کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے قید میں گھٹ گھٹ کر چند دن میں ہی ختم ہو جائے گی۔

بالی چپ بیٹھی تھی۔ وہ بھی کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

"بتاؤ نا خالہ! اب کیا کریں...؟"

ایک ایک لمحہ بڑی بے چینی سے کٹ رہا تھا۔ اس کے شوق کو جنون کی حدوں تک پہنچا کر اب وہ خاموش بیٹھی تھی۔

"تم کچھ بول کیوں نہیں رہیں...؟"

بے صبری انتہا کو پہنچ چکی تو صاحباں نے بالی کے گھٹنے پکڑ کر اسے یوں جھنجھوڑا جیسے خود اس کے اندر جو طوفان اس نے اٹھا دیا تھا اس کے جھٹکے اسی کی ہستی کو دے کر اسے احساس دلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"بس پھر... وہی ایک آخری ترکیب ہے۔"

بالی بڑے پُرسکون انداز میں بولی۔ اس احساس کے باوجود کہ صاحباں کے اندر آتش فشاں کھول رہے تھے۔ اس کے چہرے پر اطمینان و سکون تھا۔

"اس وقت بابا اور اماں کو بتائے بغیر چپکے سے شہر چلی جاؤ۔"

"اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں...؟"

"نہ... ویسے پریشان ہونے کی بات نہیں۔ تمہاری آماں اور بابا تم سے سدا کے لیے چھٹ نہیں جائیں گے۔"

"کیسے نہیں...؟"

"شہر جاتے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی اور شادی کے بعد جب تمہارا دل چاہے گا اماں بابا سے ملنے کے لیے...
شادی کے ذکر سے صاحباں کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ دوڑ گئی... لیکن...
ہی لمحے ایک سوچ نے اسے پریشان کر دیا۔
"لیکن... لیکن خالہ پھر کس منہ سے انہیں ملنے آؤں گی۔ ان کی اجازت کے بغیر جب گاؤں چھوڑ جاؤں گی تو پھر
ان سے کیا ناتا رہے گا۔ کیا وہ مجھ سے ناراض نہ ہوں گے...؟"
"ناراض ہوں گے... ضرور ہوں گے.... ماں باپ جو ہوئے۔"
"پھر...؟ پھر تو وہ میری شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کریں گے۔"
اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ ابھی وہاں ایک شوق و تمنا کی دنیا آباد تھی اور وہ اب آنسوؤں
ڈوبی جا رہی تھی۔ بالی اس کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ جلدی سے بولی۔
"وہی تو کہہ رہی ہوں۔ پریشان ہونے کی بات نہیں۔ تم واپس آؤ گی تو وہی نہیں سارا گاؤں تمہیں گلے لگانے کو...
ہو گا۔"
"آخر کیسے...؟"
"تمہاری دولت، تمہاری شان اور آن بان، تمہارا سنگھار، تمہارا لباس، تمہاری ہستی اور سب سے بڑھ کر تمہارا
دولہا ایک وجیہہ و شکیل شہزادے کو دیکھ کر سب ایسے مرعوب ہوں گے کہ تمہارے چپکے چپکے گھر سے چلے جانے والی خطا کو خطا ہی نہیں سمجھیں گے
بلکہ فخر کرے گا پورے کا پورا گاؤں کہ یہاں کی ایک لڑکی کو ایسا عروج ملا۔ وہ شہر کی ملکہ بن گئی۔"
"خالہ! تمہیں پکا یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔"
بالی کی باتیں مدلّل تھیں۔ پُریقین تھیں۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ تو صرف اس نے اپنے دل کی خاطر پھر پوچھ لیا تھا
نجانے کیوں۔ یہ اتنا اچھا فیصلہ کرتے ہوئے بھی کمینہ دھڑکے جا رہا تھا۔ دھڑکے جا رہا تھا۔
"بالکل پکا یقین... ایسے کہ جیسے آسمان پر خدا ہے۔"
اتنی بڑی قسم خالہ بالی نے کھالی تھی۔ اسے اطمینان ہو گیا۔
"تو پھر تم جیسا کہو گی ویسا کروں گی۔"
اس نے اپنی زندگی کی باگ ڈور بالی کے ہاتھوں میں تھمادی۔
"بس ٹھیک ہے۔ میں اب اس وقت جا رہی ہوں۔"
"اور میں...؟" صاحباں بے تابی سے بولی۔
"سنو بھی تو۔" بالی اس کی بے قراری پہ مسکرائی۔
"تم پرسوں آدھی رات کو گھر سے نکل کر شہر جانے والی سڑک کے اس پار گنّے کے کھیت میں پہنچ جانا۔"
"مگر میں اکیلی...؟"
"اکیلی کیوں؟ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔"
"اور تم تو ابھی جا رہی ہو۔"
"وہ تو جانا پڑے گا۔"
"تو پھر پرسوں رات کو کھیت میں کیسے آؤ گی؟ نہیں خالہ! تم مجھے چھوڑ جاؤ گی۔"
"بس خالہ پر اتنا ہی اعتبار ہے؟"
"اعتبار تو بہت ہے خالہ! لیکن یہ سارا معاملہ بھی تو عجیب سا ہو رہا ہے۔ آج تم چلی جاؤ گی تو پھر پرسوں رات کو مجھے اُس
کھیت میں کیسے ملو گی؟"
"یہ سب کچھ دوسروں کو دکھانے کے لیے ہے پگلی... ہمیں اکٹھا یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔"
"لیکن کیوں...؟"
"اس لیے کہ شہر پہنچنے کے بعد تمہاری شادی فوراً تو نہیں ہو جائے گی۔ بادشاہ کے بیٹے کی شادی ہو گی۔ بہت سارے
انتظامات ہوں گے... اور پھر دلہن...؟"
"دلہن...؟" صاحباں نے شرما کر گردن جھکا لی۔
"خالہ! تم تو ابھی میرا نام ہی لو...؟"
بالی ہنس پڑی۔ اس کی معصومیت بھری ادا پر سے مجھے اسے پیار آ گیا۔

"بہت بھولی ہو۔"
وہ اس کے جھکے ہوئے شرمیلے چہرے کو اونچا کر کے کئی لمحے تکتی ہی گئی۔
"تمہارا مل جانا واقعی ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔"
بے ساختہ بالی کے ہونٹوں سے نکلا۔
"ہائے خالہ! بس کرو نا مجھے شرم آ رہی ہے۔"
صاحباں نے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے تو بالی چونک پڑی۔
"ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ گڈّے گڑیا کا کھیل نہیں۔ بادشاہ زادے کی شادی ہونا ہے۔ تمہیں بھی تو ایک شہزادی کا
روپ اپنا ہو گا۔ تمہارے ناپ کے کئی ڈیزائنوں کے ملبوسات تیار ہوں گے۔ زری کمخواب کے نیچے گوٹے کے۔ سلمے ستارے
اس کے علاوہ زیورات۔ ہیرے، زمرد، یاقوت وغیرہ کے۔ ان سب کے لیے وقت درکار ہو گا۔ شادی بہت جلد بھی ہوئی تو
مہینے لگ ہی جائیں گے۔"
صاحباں کھوئی کھوئی، ڈوبی ڈوبی سب کچھ سن رہی تھی۔ کہنے والی بالی تھی... کوئی اور ہوتا تو ایک لفظ کا بھی اعتبار نہ کرتی اور
وہ ساتھ ہی ساتھ خود کو ان محلات میں چلتے پھرتے دیکھ بھی رہی تھی... وہ زیورات اور ملبوسات اپنے جسم پر جگمگ جگمگ کرتے
بھی کر رہی تھی۔
"اور تم یہاں سے کل نکلیں تو پرسوں گاؤں کے لوگ تمہاری کھوج میں چل پڑیں گے۔ میرے ساتھ گئیں تو میں شہر کی ایک
عورت ہوں۔ میری وجہ سے دو تین دن میں ہی وہ تم تک پہنچ جائیں گے۔ پھر کہیں دنگا فساد نہ کر دیں۔ شادی سے پہلے ہی
فساد، بدشگونی ہو جائے گی۔ گاؤں کے لوگ اکھڑ ہوتے ہیں۔ نفع نقصان کو سمجھنے کی بجائے عزت و غیرت کے پیچھے پڑ جاتے
ہیں..."
"ہاں... بات تو ٹھیک ہے۔"
"میں دو دن پہلے گئی۔ تم بعد میں جاؤ گی تو کسی کو یہ شک نہیں ہو گا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ پھر وہ تمہیں کہیں اور ڈھونڈیں گے
اور ہمیں اطمینان اور سکون سے شادی کرنے کا وقت مل جائے گا۔ پورے ارمان اور حسرتوں کے ساتھ میری صاحباں اور
شہزادے کی شادی ہو گی۔ اس کے بعد بے شک اگلے ہی دن ہمارے گاؤں کے لوگ ہمارا کھوج لگا لیں۔ پھر کچھ نہیں ہو گا۔"
"ہاں... یہ بالکل ٹھیک ہے۔"
صاحباں اس سے پوری طرح متفق ہو گئی اور نہ صرف متفق بلکہ مزید معتقد بھی۔ بالی جیسی عقلمند عورت دنیا میں اور کوئی
ہو سکتی تھی۔ صاحباں نے تعریف و ستائش بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔
اس کے علاوہ اس کی نگاہوں میں احسان مندی کی جھلک بھی تھی۔ اس نے اتنا بڑا اعزاز صاحباں کو بخشا تھا۔ صرف اور صرف
صاحباں کو...
"خالہ! تم میرے لیے کتنا کچھ کر رہی ہو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"
"احسان کیسا...؟ تم ایسا ہیرا اپنے کے لیے تو بلکہ...؟"
اور بالی کچھ کہتے کہتے یکایک خاموش ہو گئی۔ پھر ایک دم سٹپٹا کر بولی۔
"احسان تو تمہارا ہے ہم پر۔ ہم سارے شہر والوں پر۔ ہمارے بادشاہ کو اتنی خوبصورت اور ایسی اچھی بہو مل جائے گی...
سارے شہر میں جشن ہو گا۔ خوشیاں ہی خوشیاں... سب تمہاری وجہ سے۔ بس اب پرسوں رات کی بات پر پکّی رہنا۔ پوری
رازداری کے ساتھ۔"
"تو پھر میں چل کر تیاری کروں...؟"
صاحباں بالی کی باتوں کے سحر میں ڈوبی ڈولتی ہوئی سی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تمہیں کیا تیاری کرنا ہے...؟" بالی پھر چونکی۔ جانے کیسی تیاری کرنے لگ جائے۔ سارے راز فاش نہ ہو جائیں کہیں۔
"ایک اپنا ریشمی جوڑا اور دو دوسرے ہیں۔ وہ ٹھیک ٹھاک کر کے گٹھڑی باندھ لوں گی۔"
"وہ جوڑے...؟" بالی زور سے ہنسی۔
"ارے پگلی! تمہیں کتنی بار سمجھاؤں کہ وہاں ایسے کپڑے بادشاہ کی نوکرانیاں اور کنیزیں بھی نہیں پہنتیں۔ تمہیں کون پہننے
دے گا۔ ہونے والی ملکہ کو۔ نئی دلہن کو۔"
"پھر...؟" صاحباں شرمندہ سی ہو گئی۔
"پھر کچھ نہیں۔ بس رات کو سب کے سونے کا انتظار کرنا اور خود جاگتی رہنا۔"

"جاگتی رہوں... ؟ مجھے تو لگتا ہے خالہ... ! مجھے اب نیند آئے گی ہی نہیں۔"

"نہیں آئے گی تو اچھی بات ہے نا۔ دو چار راتوں کی بات ہے اس کے بعد سکھ سے ساری عمر سونا۔ راتیں تو کیا بلکہ دن بھر بھی پڑی سویا کرنا، نرم و گرم بستروں پر۔"

"ہائے! بس کرو خالہ... !"

صاحباں پھر واپس بیٹھ گئی۔ جیسے اس سے چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جذبات نے اُسے اِتنا ہلا ڈالا تھا کہ ساری قوتیں سلب ہو جا رہی تھیں۔

"ارے بیٹی! سنبھالو خود کو۔"

بالی نے اس کی کیفیت دیکھی تو سمجھانے لگی۔

"میری ساری بات کی سمجھ آ گئی ہے نا۔ تیاری کوئی نہیں کرنی۔ کوئی کپڑا نہیں لینا۔ جُوتے بھی نہیں پہننا۔ بس اسی طرح بس سے اُتر کر گنّے کے کھیت میں پہنچ جانا۔"

"جُوتے بھی نہیں؟" صاحباں نے تعجّب سے اسے دیکھا۔

"آواز کوئی نہ ہو، اس لیے۔ نہ کپڑوں کی سرسراہٹ، نہ جوتوں کی چرچراہٹ۔ ذرا بھی بے احتیاطی ہو گئی تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔ بس ہمّت کی ضرورت ہے۔"

بالی اسے پوری طرح پکّا اور مضبوط کرنے کے لیے بار بار سمجھا رہی تھی۔

"پرسوں کی رات تم نے ہمّت کر لی تو بس ساری زندگی سنور جائے گی۔ آج ایک چور کی طرح جاؤ گی۔ کل اپنے راجہ کے ساتھ مہارانی کی طرح لونڈیوں باندیوں کے ساتھ آ کر سب کو حیران کر دینا۔"

بالی اسے ہپناٹائز کر رہی تھی اور وہ ہوئی جا رہی تھی۔

"اوہ! کتنا مزہ آئے گا۔ سب تمہارے نصیب پر رشک کریں گے۔"

اور یوں دو، تین، چار، پانچ، سات بار بالی نے آنے والے وقت کے حُسن و خوبصورتی کا نقشہ اس کے سامنے کھینچا۔ مستقبل کی شادمانیوں کا ذکر کیا۔ کامرانیوں کی جھلک دکھائی۔ ساتھ ساتھ ہر بار مکمل رازداری کی تاکید کرتے ہوئے آخر اسے اس کے گھر پہنچا کر اور خود شادی والے گھر سے سب کو مل ملا کر رُخصت ہو گئی۔

وہ دو دن صاحباں کے عجیب سی کیفیت میں گزرے۔ کبھی شہر کی رونقیں، ہنگامے، آسائشیں، ایک شہزادے کے ساتھ شادی کی اُمنگیں اور جذبات بھری کشش اپنی جانب کھینچتی تو وہ آنے والی آدھی رات کا بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگتی اور کبھی امّاں اور بابا کی محبت، اسے اپنے گھر سے فرار ہونے والے فیصلے کو بدلنے پر مجبور کرنے لگتی۔

اس مجبوری سے جب وہ مجبور، بالکل مجبور ہونے لگتی تو وہ دُکاندار، معمولی سی شکل و صورت اور معمولی سے گھر بار والا خیالوں میں آ جاتا۔

وہ ایک دم بدک اٹھتی۔ جیسے کانٹوں بھرے راستے پر قدم دھر دیتی۔ وہاں وہ بانکا سجیلا شہزادہ دھن و دولت کی مالائیں لیے کھڑا ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی وہ مالائیں اس کے گلے میں پہناتا۔ دونوں بازوؤں کے حصار میں اسے سمیٹتا اور سفید براق جیسے گھوڑے پر اپنے ساتھ اسے بٹھا لے اُڑتا۔ پُر فضا وادیوں میں...

ایک ایک لمحہ اس کا انہی سوچوں میں کھوئے گزرا۔ اور پھر آخر جوانی کو دولت، حکومت اور محبت کی کشش نے کھینچ لیا جو اسے بالی نے بتایا تھا۔

مقررہ رات کو وہ سوئی نہیں۔ جاگتی رہی... جاگتی رہی۔ امّاں، بابا سو گئے۔ رات آدھی ہو گئی، چاند بھی پُوری طرح ڈوب گیا تھا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

بہت احتیاط سے وہ اُٹھی۔ جوتی بھی نہیں پہنی۔ دبے دبے سے قدم اُٹھاتی صحن کی دیوار تک پہنچی۔ دروازے کی طرف سے کُنڈی کھول کر بھی باہر نہیں نکلی۔ مبادا کُنڈی ہی کی آواز گُونج جائے۔

دیوار بہت اُونچی نہیں تھی۔ بڑی آسانی سے پرلی طرف کُود گئی۔ دل دھک دھک بھی کر رہا تھا مگر بالی کے دکھائے ہوئے خواب اتنے خوبصورت تھے کہ کوئی بھی مشکل، مشکل محسوس نہ ہوئی۔

گنّے کے کھیت میں واقعی بالی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جُھک جُھک کر اور چھُپ چھُپا کر گنّے کا کھیت، دونوں نے پار کیا تو آگے ایک مالٹوں کا باغ تھا۔

اس طرف پہلے صاحباں کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ تھک چکی تھی اور آگے پتا نہیں اور کتنا پیدل چلنا تھا مگر اس نے کم ہمّتی کا اظہار نہیں

کیا۔ بالی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ بڑی مضبوط گرفت تھی... اور یہی مضبوطی اس کے لیے تسلّی اور سہارا تھی۔ اس سے کہیں زیادہ عمر کی تھی... اور وہ بھی تو پیدل ہی چل رہی تھی، اس کی خاطر۔ صاحباں کو نئی زندگی اور خوشیاں دینے کی خاطر...

باغ کی حد ختم ہوئی تو سامنے پکّی سڑک تھی اور چند لمحوں کے لیے یہاں رک کر سانس لینے کے متعلق صاحباں بات کرنے ہی والی تھی کہ دائیں طرف سے ایک موٹر گاڑی ان کے قریب آ کر تھم گئی۔

بالی نے صاحباں کا ہاتھ چھوڑا۔ آگے بڑھی۔ موٹر کی کھڑکی میں جھک کر چلانے والے کے ساتھ کوئی بات کی۔ کیا بات کی... وہ پہلے سے جانتی تھی یا انہیں اس وقت یہاں کھڑے دیکھ کر گاڑی رُکی تھی۔

صاحباں کو یہ کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ دو تین منٹ باتیں کرنے کے بعد بالی نے واپس آ کر پھر صاحباں کا ہاتھ اسی مضبوطی سے پکڑا اور اسے لیے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

سارا راستہ گاڑی چلانے والے کے ساتھ، بالی کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ رات ختم ہو گئی۔ دن نکل آیا۔ بڑا اُجلا اور روشن دن تھا۔ شاید وہ کسی شہر میں سے گزر رہے تھے۔

بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ دُکانیں تھیں، تانگے، موٹر اور سائیکلیں آ، جا رہی تھیں۔ اچھے اچھے اور عجیب و غریب قسم کے کپڑے پہنے مرد اور عورتیں پیدل چل رہے تھے کچھ مختلف قسم کی سواریوں پر تھے۔

صاحباں کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ سب کچھ اسے بہت اچھا، بہت دلچسپ اور بہت خوبصورت لگ رہا تھا... اس کے گاؤں سے سب کچھ کتنا مختلف تھا۔ وہ خوش تھی۔ بے حد خوش...

روشن روشن دن تھا اور اس کے روشن چہرے پر دن ہی کی طرح اُجلی اُجلی مسکراہٹیں بکھری تھیں۔

❀

وہ کھُلی کھُلی، حیرت سے پھیلی پھیلی آنکھوں سے احمقوں کی طرح اِردگِرد دیکھ رہی تھی۔ ایسا عالی شان، وسیع و عریض اور آراستہ گھر پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا یقیناً ان خوابوں میں بھی نہیں جو اسے بالی نے دکھائے تھے۔

صاف ستھرے دَر و دیوار، آئینے کی طرح چمکتے فرش اور اتنے خوبصورت سامان سے سجے کمرے تھے کہ وہاں اسے اپنا وجود بڑا عجیب گندا سا لگ رہا تھا۔ اسے اس دُنیا میں نہیں آنا چاہیے تھا۔

یہ سوچ ابھی پوری طرح اس کے ذہن میں اُتری بھی نہ تھی کہ بالی نے اس کے احساس کو بھانپ لیا۔

"صاحباں! کسی سے ملنے سے پہلے تم نہا کر کپڑے بدل لو۔"

بالی کی اس پیشکش نے اسے گرتی گرتی کو سنبھالا۔

"کپڑے... ؟ مگر خالہ میرے پاس تو... ؟"

صاحباں نے کبھی اسے اور کبھی اپنے وجود کو دیکھتے ہوئے کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ بالی نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"تمہارے پاس پہنے ہوئے ان کپڑوں کے سوا اور کوئی نہیں ہیں؟"

بالی بڑے انداز سے مسکرائی۔

"میں جانتی ہوں تم یہی کہنے والی تھیں... لیکن... اگر ہوتے بھی تو وہ اس قابل تھے کہ یہاں پہنے جاتے... ؟"

"ہاں... یہ بات تو خالہ تم نے ٹھیک کہی ہے۔"

ایک بار پھر اس نے اردگرد دیکھا۔ اپنی طرف دیکھا۔ کمتری کا احساس رگ و پے میں پھیل کر اپنے آپ سے نفرت دِلا رہا تھا مگر بالی نے جلد ہی اس کے اس احساس کو دُور کر دیا۔

"پگلی! فکر مت کرو۔ تمہیں یہاں بہت اچھے شہزادیوں جیسے کپڑے ملیں گے بالکل ایسے، جیسی تم خود ہو۔ ایک شہزادی۔"

صاحباں مسکرا پڑی۔ ایک دم سے ہی پھر اپنا وجود اہم محسوس ہونے لگا۔

"چلو تم غسل خانے میں چلو۔ میں ابھی تمہارے لیے کپڑے لے کر آتی ہوں۔"

"مگر خالہ! میرے ناپ... ؟"

"تم دیکھنا تو سہی"۔

بالی اس کی بات پوری سُنے بنا ہی سمجھتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسی کمرے سے ملحقہ، جس ملا ہوا وقت تھیں، غسل خانے میں لے گئی۔

غسل کے لیے بہت ساری ہدایات اسے دیتے ہوئے بالی باہر نکل کر صاحباں کی نگاہوں سے رُوپوش بھی ہوگئی اسی طرح سکتے کے عالم میں غسل خانے کے بیچوں بیچ کھڑی رہ گئی۔

جس جگہ بالی اسے نہانے کا کہہ کر گئی تھی وہاں تو اسے اپنے غلیظ سے پاؤں رکھتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی تو وہ اپنے جسم کی میل اور غلاظت وہاں کیسے اُتارتی۔

سنگِ مرمر کی سفید سفید اینٹوں کا بنا ہُوا وہاں کا فرش، چمکتی ٹونٹیوں والے کئی نلکے، ایک بڑا سا سفید ٹب، سفید براق تولیہ اسٹینڈ پر دھرا ہوا یہ بڑا سا تولیہ، سفید بے حد تیز اور سہانی سی خوشبو والا صابن...

یہ سب... یہ سب، وہ کیسے استعمال کرتی۔ وہ اس قابل تھی...؟ وہ اس قابل تھی...؟

پھر کمتری کے احساسات اس پر غالب آ رہے تھے۔ اسے اپنا وہ کوٹھریوں اور کچے صحن والا چھوٹا سا گھر یاد آ گیا، جہاں اس کی زندگی کی سولہ سترہ بہاریں خزاؤں کی طرح گزری تھیں۔

چھوٹا سا گھر یاد آیا تو اماں اور بابا یاد آ گئے۔ یوں تو سارا راستہ وہ اسے یاد آتے رہے تھے ——— مگر اس وقت اس خوبصورت جگہ پر کچھ اتنی شدّت سے یاد آئے کہ وہ نہانے کی بجائے وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔

اماں بابا کو ساتھ لے آتی تو کتنا اچھا تھا۔ یہ اتنا خوبصورت گھر تھا، اتنی اعلیٰ اعلیٰ چیزیں تھیں۔ وہ بھی دیکھتے۔ استعمال کرتے۔ زندگی کا لطف اُٹھاتے۔

اور اب... اب کاہے کو اُسے کسی چیز میں مزہ آنا تھا۔ وہ تو اماں بابا کی جدائی نے سارا کرکرا کر دیا تھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے روئے گئی۔

اس کا اپنا ارادہ تو انہیں ساتھ لانے کا تھا مگر خالہ بالی نے خُدا کی قسم دے کر اسے بے بس کر ڈالا۔ یہ مصلحتیں بھی انسان کو کتنا کر دیتی ہیں۔ تب اسے اکیلے اور چوری چوری ہی آنا پڑا۔ کیسا ظلم ہو گیا۔

"ہائے بابا... ہائے اماں...؟"

اس کی سسکیوں کی آواز خاصی بلند تھی۔ بین ڈالنے کے انداز میں وہ ان کا نام لے لے کر رو رہی تھی۔ مجھ سے یہ سب نہیں اماں بابا کی یاد کی سینے میں جو ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں، اُن کا درد ناقابلِ برداشت تھا۔ پہلے کبھی بھی وہ ان سے ایک پل جدا ہوئی تھی۔

"صاحباں! ابھی تک نہائی بھی نہیں!"

بالی کی تیز اور جھنجھلائی ہوئی آواز اس کے کانوں میں اُتری تو اس نے گھٹنوں میں سے چہرہ نکالا۔

"ارے! تو نے تو رو رو کر اپنی آنکھوں کا ستیاناس کر لیا!"

اس نے صاحباں کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے کھڑا کر دیا۔

"یہ کیا حماقت ہے...؟"

"مجھے اماں اور بابا یاد آ رہے ہیں۔ میں ابھی واپس جاؤں گی!"

وہ پھر رونے لگی۔

"خالہ! میں یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے واپس لے چلو!"

"اگر ایسی ان کی محبت تیرے دل میں تھی تو وہیں بتانا تھا، میں تجھے لے کر ہی نہ آتی!"

بالی نے تیز نگاہوں سے اسے گھورا۔ پھر قدرے سرد مہری سے بولی۔

"مجھ سے غلطی ہوئی جو تمہاری صورت پر مر مٹی اور پھر تمہاری غربت پر ترس کھایا۔ میں نے تو سوچا تھا محلوں میں رہو گی عیش کرو گی۔ مگر تمہارے نصیب میں شاید یہ قیمتی کپڑے اور زیورات نہیں ہیں!"

بالی نے کھلے دروازے سے باہر پلنگ پر پھیلے خوبصورت پیازی رنگ کے ریشمی ملبوسات اور قریب ہی پڑے سُرخ سُرخ والے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو آؤ نکلو باہر، تمہیں نہانے، یہ لباس اور زیورات پہننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کل ہی تمہیں واپس تمہارے پہنچا آتی ہوں!"

بالی نے اس کا بازو پکڑ کر باہر نکالنے کے ارادے سے کھینچا۔

نہیں... خالہ نہیں!"

صاحباں کی آنکھیں پلنگ پر پھیلے ان ملبوسات پر ٹکی تھیں۔ آنسو خشک ہو چکے تھے۔ سسکیاں تھم چکی تھیں اور وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں ان ریشمی ملبوسات کی ملائمت اور نرمی کو محسوس کر رہی تھی۔ ساتھ ہی غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ پہنے ہوئے کھدر کے کُرتے پر پھیر رہی تھی۔

بالی نفسیات کی ماہر تھی۔ اس کی نگاہوں کی بھوک اس وقت بھی بھانپ لی تھی۔ اس کا بازو چھوڑتے ہوئے قدرے نرمی سے بولی۔

"واپس بھی نہیں جانا پھر کرنا کیا ہے آخر۔ نہ نہاتی ہو، نہ کپڑے بدلتی ہو، کچھ تو بتاؤ!"

"میں نہاتی ہوں خالہ! کپڑے بھی بدلتی ہوں۔ دراصل مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا ہے نا... اور جب عجیب لگتا ہے تو اماں بابا یاد آ جاتے ہیں!"

صاحباں جلدی جلدی اپنی آنکھوں کو، اپنے چہرے کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔

"کچھ دن تو یہ سب عجیب لگے گا ہی۔ پھر جب اس زندگی اور ان آسائشوں کی عادی ہو گئیں تو سب درست ہو جائے گا... پھر...!"

بالی نے مَردوں جیسے انداز میں ایک آنکھ دبائی۔

"اپنے شہزادے سے ایک ملاقات ہو گئی تو باقی ساری دُنیا بھول جاؤ گی۔ اماں اور بابا کو بھی!"

اماں اور بابا کے نام پر پھر سے بے چینیاں سینے میں اُترنے لگیں مگر اب اس نے آنکھوں سے کوئی آنسو نہیں ٹپکنے دیا۔ جلدی بڑھ کر صابن دانی بیسن پر سے اُٹھالی۔

جس کا مطلب تھا وہ نہانے کے لیے تیار تھی اب۔ بالی مسکراتے ہوئے غسل خانے سے باہر نکل گئی۔

صاحباں کپڑے اُتار رہی تھی کہ غسل خانے کے دروازے پر دستک ہوئی... وہ گھبرا کر مُڑی۔

"نہانے کے بعد تولیہ لپیٹ کر باہر آ جانا!"

بالی تھوڑا سا دروازہ کھول کر سر گھسیڑے اسے ایک اور ہدایت دے رہی تھی۔

"کیا...؟" اس کی اس ہدایت نے صاحباں کو بوکھلا سا دیا... کپڑے نہ پہنے صرف تولیہ لپیٹ لے۔ کیسی بات خالہ نے کہی تھی؟

بالی اس کی بوکھلاہٹ پر بڑے زور سے ہنس دی۔

"میرا مطلب تھا۔ یہ کپڑے یہاں کمرے میں آ کر پہن لینا۔ جب بال خشک ہو جائیں گے۔ گیلے بالوں سے یہ پہن لیے تو پانی کے قطرے ٹپکیں گے اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جائے گا!"

"مگر... مگر... خالہ... خالی تولیہ!" وہ گھبرائی جا رہی تھی۔

"بہت بڑا ہے تولیہ!" بالی نے لاپروائی سے کہا۔

"اور یوں بھی فکر نہ کرو۔ تمہارے اور میرے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ کوئی آیا بھی تو تصور آباد جیسی جاہلوں کی بستی کی طرح منہ اُٹھائے اندر نہیں گھُسا آئے گا۔ بلکہ دروازے پر دستک دے کر، اندر آ جانے کی اجازت ملنے پر آئے گا!"

"اچھا...!"

"ہاں۔ یہاں شہر میں تو سگی ماں بہن بھی بغیر دستک دیے ایک دوسرے کے کمرے میں نہیں آتیں!"

کتنے اچھے طور طریقے تھے یہاں کے۔ صاحباں یہی کچھ سوچتے ہوئے نہا کر باہر نکلی۔ بالی کی ہدایت کے مطابق اس نے تولیہ اوپر سے نیچے تک اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔

کیسا چادر جیسا لمبا چوڑا تولیہ تھا۔ تصور آباد میں اس کے تو خیر اپنے گھر میں سرے سے تولیے کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ ملک جی کی بہو کو اس نے نہانے کے بعد بالوں کے نیچے پھیلائے دیکھا تھا۔ مگر وہ بھی ایسا لمبا چوڑا اور نرم نرم ریشوں والا نہ تھا۔ وہ اس کی خوشگوار نرمی اور ملائمت کو جسم پر محسوس کرتے ہوئے باہر نکلی تو بالی کمرے میں ہی موجود تھی۔

"ارے...؟" اسے دیکھ کر بالی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

کندھوں سے لے کر گھٹنوں تک اس کا وجود تولیے میں لپٹا ہوا تھا... اور باقی۔ ننگی پنڈلیاں۔ ننگے بازو۔ بالی نے جتنی بار صاحباں کو دیکھا تھا، کھدر یا چھینٹ یا گھٹیا سے کسی بھی ڈھیلے ڈھالے کپڑے نے اس کے وجود کو یوں ڈھکا ہوا تھا کہ اس کے جسم کی کوئی بھی

خوبصورتی کبھی بھی نہ دکھائی دی تھی۔

صاحباں کے چہرے کا معصومیت بھرا حسن تو ایک قیامت تھا ہی مگر بالی کو اب احساس ہوا کہ ان موٹے جھوٹے کے اندر کیا قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔ کون کون سی حشر سامانیاں تھیں۔

اس کی پنڈلیاں کیسی سڈول اور خوبصورت تھیں۔ اس کے بازو کیسے گول گول متناسب اور مرمر کی طرح سفید تھے عورت ہو کر اس کا جی چاہ رہا تھا انہیں تھامے، انہیں چھوئے، ان کی خوبصورتی کو محسوس کرے۔

"کیا ہوا خالہ...؟"

وہ ایک ٹک اس کے سراپا کو تکے جا رہی تھی۔ صاحباں گھبرا سی گئی۔

"ہوں...؟ کچھ نہیں۔"

بالی نے سر جھٹک کر نگاہیں اس کی پنڈلیوں، اس کے بازوؤں سے ہٹا کر اس کی طرف دیکھا... اس کے چہرے کی طرف اور اب وہیں اس کی نگاہیں جمی کی جمی رہ گئیں۔

وہ گاؤں سے جو کچھ اٹھا لائی تھی۔ یہ وہ چیز تو نہ تھی۔ بالی کی ہدایت کے مطابق دو تین بار صابن مل کر بہت اچھی طرح نہانے سے اس کا رنگ کیسا نکھر آیا تھا۔ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ بالی نے بار بار آنکھیں جھپکیں۔

اس مجسم خوبصورتی پر نگاہ بھی نہیں ٹک رہی تھی مگر... اس کی ہستی میں، اس کے وجود میں کوئی ایسا مقناطیس بھرا تھا جو نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے ہی لیے جا رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو خالہ...؟"

صاحباں کو پھر اس احساس نے بوکھلا دیا کہ اس سے ضرور کوئی غلطی سرزد ہو گئی تھی جو بالی اسے یوں گھور رہی تھی۔

"بتا دو نا مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے۔ تمہاری نظریں مجھے پریشان کر رہی ہیں۔"

"نہیں بچی! پریشان کیوں...؟ میں تو اللہ کی قدرت دیکھ رہی تھی۔ ماشاءاللہ کیا صورت پائی ہے۔ کیسا سانچے میں ڈھلا جسم ہے۔ کیسا رنگ روپ ہے۔ ایسا سب کچھ تو شہزادیوں کے نصیب میں بھی کم ہی ہوتا ہو گا۔"

بالی کی ڈھیروں ڈھیر تعریف نے صاحباں کے معصوم چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھیر دی۔

"اب کپڑے پہن لوں خالہ؟"

لجائی ہوئی سی آواز میں جھکی جھکی نگاہوں سے پوچھنے لگی۔

"اتنے لمبے اور گھنے بال ہیں۔ ابھی کہاں سوکھے ہوں گے۔"

بالی نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کے بالوں کو چھوا۔

"لاؤ برش کر دوں۔ جلد خشک ہو جائیں گے پھر پہن لینا۔"

"برش...؟ برش کیا ہوتا ہے خالہ! ہم تو وہاں کنگھی بالوں میں پھیرا کرتے ہیں۔"

"سب پتہ چل جائے گا ہولے ہولے۔ برش کیا ہوتا ہے اور... اور کیا کیا کچھ ہوتا ہے شہروں میں تو جیسے جادو کی سی چیزیں ہوتی ہیں۔"

بالی نے اسے بڑے آئینے والی سنگھار میز کے سامنے لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر اس کے بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی نصیحتیں بھی کیے جا رہی تھی۔ محلوں میں رہنے کے آداب بھی بتلا رہی تھی۔

اور... صاحباں دم بدم حیرتوں میں ڈوبی جا رہی تھی۔ تصور آباد تو اس شہر کا نام ہونا چاہیے تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جہاں کی ہر چیز انوکھی اور نرالی تھی اور تصوراتی تھی۔

بال خشک ہو گئے تو بالی نے اسے کپڑے پہننے کو کہا۔ صاحباں نے وہ جھلمل کرتا جوڑا پہن لیا۔ ریشمی، نرم، ملائم۔ عجیب سکون بخش سا اس کا لمس تھا۔ جسم کو تو جو محسوس ہو رہا تھا ہو ہی رہا تھا۔ وہ اس کے اوپر ہاتھ پھیر پھیر کر مزید خوش ہو رہی تھی۔

بالی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے جذبات و احساسات کو بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

"آؤ اب میک اپ بھی کر دوں۔"

"میک اپ...؟"

صاحباں نے نیم وا ہونٹوں اور پھیلی پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"وہ کیا ہوتا ہے...؟"

"ابھی جو کچھ کروں گی وہ وہی ہوتا ہے۔"

بالی کو اس کی سادگی اور بھولپن اچھا بھی لگ رہا تھا۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ آنکھوں سے پیار بھی چھلک رہا تھا۔

اس نے پھر اسے آئینے کے سامنے بٹھا دیا۔ بڑے خوبصورت انداز میں بال بنانے کے بعد چہرے پر ہلکا ہلکا پاؤڈر لگا دیا۔ اس کا رنگ روپ کسی چیز کا محتاج ہی نہیں تھا۔ بالی خود حیران سی ہو رہی تھی۔

پاؤڈر تو بلاضرورت ہی لگایا تھا۔ البتہ آنکھوں کے میک اپ نے اس کی صورت میں خوشگوار سی تبدیلی ضرور پیدا کر دی۔ پھر ہونٹوں پر کپڑوں کے ہم رنگ پیازی سی لپ اسٹک لگائی۔ گو اس کے ہونٹ پہلے ہی پیازی سے تھے مگر لپ اسٹک نے جو چمک پیدا کر دی اس سے وہ حسین تر نظر آنے لگے۔

میک اپ کے بعد بالی نے اسے زیورات پہنائے۔ کانوں میں، گلے میں، باہوں میں۔ انگلیوں میں جب انگوٹھیاں پہنیں تو ہاتھوں کے حسن میں بھی ایک نمایاں فرق پڑ گیا۔

گاؤں میں بھی عورتیں زیورات پہنتی تھیں مگر یہاں کا انداز مختلف تھا۔ نفیس اور نازک سے زیورات انسان کی ہستی کو بھی نفیس اور نازک بنا دیتے تھے۔

اس کے کانوں میں بڑے بڑے دیہاتیوں جیسے جھمکوں کی بجائے ایک ایک پیازی رنگ کا موتی والا بندہ جب لہرایا تو وہ حیرت سے کبھی اپنی صورت دیکھتی اور کبھی آئینے میں سے بالی کو۔

"ہائے خالہ! یہ تو میں... یہ تو میں، میں لگ ہی نہیں رہی۔"

لمبی سی گردن میں ایک زنجیر میں اسی طرح پیازی رنگ کا لٹکا ہوا خوبصورت سا موتی انگلیوں میں تھام کر وہ کئی لمحے دیکھتی رہی۔ کیا اس کی گردن اتنی خوبصورت تھی...؟

وہ حیرتوں میں ڈوبی تھی... اور خود کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر جب کوشش بسیار کے بعد پہچان نہ پاتی تو خالہ بالی سے پوچھنے لگ جاتی۔

"نہیں خالہ! اس آئینے میں بیٹھی ہوئی لڑکی تصور آباد کی صاحباں نہیں ہے۔ کوئی اور ہے۔ کوئی اور...؟"

"ہاں... یہ صاحباں نہیں ہے۔ یہ ایک شہزادی ہے۔ جس نے اب اپنا آپ پہچان لیا ہے۔ تبھی اپنی اصل جگہ پر آ پہنچی ہے۔ یہی تیری اصلیت ہے صاحباں اور یہی تیرا مقام ہے۔"

❀

کئی دن ہو گئے تھے اسے بالی کے ساتھ اس اتنے بڑے محل میں آئے ہوئے۔ یہاں کی تصویریں دیکھ کر اور باتیں سن کر وہ اتنا حیران نہیں ہوئی تھی جس قدر اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ کر ہوئی۔

خالہ بالی نے تصور آباد میں اسے جو کچھ بتایا تھا اس سے کئی گنا زیادہ یہاں آ کر پایا۔ اس کی تو حیرتیں بھی گم سم رہ گئی تھیں۔ وہ تو خواب کی سی کیفیت میں سے گزر رہی تھی۔

اپنے بے حد نرم بستر پر جب وہ رات گزار کر صبح کو بیدار ہوتی تو ایک بار پھر یقین کرنے سے قاصر رہ جاتی کہ وہ تصور آباد کی صاحباں ہے...

جھوٹا موٹا پہننے والی۔ روکھی سوکھی کھانے والی اور گرمیوں میں کھری اور سردیوں میں ایک پتلی ایسی توشک پر سونے والی، جس سے بان چبھتا ہی رہتا تھا مگر وہ اتنا عادی ہو گئی تھی کہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ صاحباں تھی وہ...

جو اب ایک ملکہ کی سی زندگی گزار رہی تھی۔

جو کسی بادشاہ کی اکلوتی بیٹی کے سے انداز اور ناز نخروں سے رہ رہی تھی۔

صبح جس انداز میں خالہ بالی اسے جگاتی تھی یوں تو اس کی اماں نے بھی اسے کبھی نہ جگایا تھا۔ اس کے نرم و ملائم شیمپو کی خوشبو بسے بالوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر اجلی اجلی روشن پیشانی کو کئی کئی بار چوم چوم کر، کمر کو گدگدا کر۔ وہ اٹھلاتی، بل کھاتی، مسکراتی بڑے ناز سے آنکھیں کھول دیتی۔

اس کی آنکھیں کھُلی دیکھتے ہی بالی صدقے قربان ہونے لگتی... اور پھر چڑھتے دن کا پروگرام شروع ہو جاتا۔

اچھے سے اچھا ناشتہ، کھانا۔ ایسی ایسی نعمتیں جو اس نے تصوّر آباد میں کبھی تصوّر میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ کام و دہن کی لذت بنتیں۔

پھر ہر تین چار گھنٹے بعد ایک نیا اور انوکھی قسم کا لباس زیب تن ہوتا۔ کئی قسم کے میک اَپ اور پرفیومز اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر تھے۔ بے حد قیمتی، ہر رنگ کے نگینوں والے اور ہر قسم کے زیورات میز کی دراز میں پڑے ہوئے تھے۔ جب بھی جو پہننے کو جی چاہے آزادانہ پہن لے۔ ملکاؤں اور شہزادیوں کو بھلا کسی کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تو نہ صرف اپنی آپ مالک ہوتی ہیں بلکہ... بلکہ...

خالہ بالی کی حیثیت بھی اس سے کہیں کم تر تھی۔ وہ تو اس پر بھی حکم چلانے کا حق رکھتی تھی۔ یہ تو صرف اس کا اپنا ظرف تھا کہ ہر تک عاجزی ہی پسند تھی۔ بالی کو ماں جیسا مقام ہی دیتی تھی۔

کچھ اس لیے بھی کہ بالی کی وہ محتاج تھی ابھی۔ وہ اسے ہر اس چیز کے متعلق بتاتی تھی جو صاحباں پہلی بار دیکھتی تھی۔ ان کے نام سکھاتی تھی۔ ان کے استعمال کے طریقے بتاتی تھی۔ شہری لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب سمجھاتی تھی۔

صاحباں جلد از جلد سیکھنے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ کوشش کامیاب بھی ہو رہی تھی ایک تو وہ ذہین بہت تھی۔ دوسرا اسے اس وجیہہ و شکیل اور بانکے سجیلے شہزادے کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا جس کی دُلہن شہر شہر، گاؤں گاؤں پھر کر بڑی مشکل سے ڈھونڈی گئی تھی۔

اور اب... اس دُلہن کی اپنے دُولہا سے اسی وقت ملاقات ہونا تھی جب وہ یہ سب کچھ سیکھ کر بالکل اس کے قابل ہو جائے۔ شوق کا ایک ایک لمحہ بڑا صبر آزما تھا اور یہی شوق اور لگن اسے جلد از جلد سب کچھ سکھائے جا رہا تھا۔

ہر دن کی جب رات ہوتی۔ اسے شب خوابی کا نرم، ملائم اور مہین سا لباس پہنا کر اس کے نرم نرم بستر پر لٹا کر بالی اس کے کمرے سے رُخصت ہوتی تو وہ چپکے سے اُٹھ کر کئی کئی گھنٹے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھتی رہتی۔

پہلے دن سے اب تک اس میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ گو لباس اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ شکل و صورت بدل ہی جاتی ہے مگر وہ تو ساتھ خوراک بھی بہت اچھی کھا رہی تھی۔ جس نے اس کے رنگ رُوپ کو اور بھی عجیب سا نکھار بخش دیا تھا۔

گاؤں کی کھلی دُھوپ اور کھلی آب و ہوا سے اس کا کملایا ہوا حسن اب اپنی قدرتی چمک دَمک کی طرف لوٹ آیا تھا۔ خود اس سے اپنے آپ پر نگاہ ٹکائی نہ جاتی تھی۔ تب وہ اپنے مقدر پہ آپ ہی رشک کرنے لگتی۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے ہی سراپا کو دیکھ رہی تھی کہ عقبی دروازے سے بالی داخل ہوئی۔

"لو بھئی صاحباں...!"

اس کے چہرے پہ مسرّت کی لہریں تھیں اور آنکھوں میں ایک خاص چمک۔

"کل تمہاری اپنے شہزادے سے ملاقات ہو گی تیار رہنا!"

"کیا...؟" وہ سٹپٹا کر، گھبرا کر پلٹی۔

ماں باپ کو چھوڑ کر یہاں شہر میں آنے کا اس کا مقصد یہی تھا۔ مگر پھر بھی بالی کی زبان سے اس وقت یہ سنسنی خیز خبر سُن کر وہ سُن سی ہو گئی۔

کتنا عجیب لگ رہا تھا یہ سب کچھ اور... اور... اس سے ملاقات کا تصوّر... جس سے وہ تصوّر ہی تصوّر میں ہر روز، بلکہ دن کے ہر گھنٹے میں ملتی تھی۔

یہ نوید اسے سٹپٹا ئے بھی دے رہی تھی مگر لذّت بھی بخش رہی تھی۔ عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ وہیں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"خالہ! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

بات وہ بالی سے کر رہی تھی مگر اس کی نگاہ آئینے میں اپنے کپکپاتے ہونٹوں اور زرد ہوتے چہرے پہ گڑی تھی۔

"ڈر... ڈر کس بات کا...؟"

"پتا نہیں میں کیسی ہوں...؟"

اس کے کپکپاتے ہونٹ بڑبڑائے۔

"اور ان کو کیسی لگوں...؟ شاید بہت بُری۔"

اس نے سہم کر چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

"پھر کیا ہو گا خالہ... پھر کیا ہو گا...؟"

"ارے واہ! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری خالہ کو خدا نے ایسی آنکھ عطا کی ہوئی ہے کہ اس کا انتخاب کوئی رد کر ہی نہیں سکتا۔"

وہ صاحباں کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پُورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ بولی۔

"پھر بھی خالہ...!"

"میں نے کہا نا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... اور تم سنبھالو خود کو۔"

بالی نے قریب آ کر اس کا وجود بازوؤں میں بھرتے ہوئے اسے کھڑا کر دیا۔ پھر اسے اُوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اس پھولوں کی ڈالی کی مہک تو دیکھے سُونگھے بغیر ہی دُور دُور تک پہنچ چکی ہے۔"

"کیا... یہ تم کیا کہہ رہی ہو...؟"

بالی کی بات پتا نہیں کیسی تھی۔ صاحباں کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

"چلو آؤ... سو جاؤ اب۔"

نجانے کیوں بالی نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے جلدی سے موضوعِ سخن ہی بدل دیا۔

"رات بہت ہو چکی ہے۔"

ساتھ ہی ایک نگاہ پھر اس حسن و رعنائی کے مجسمے پر ڈالی۔ خوبصورت اور قیمتی لباس نے تو اس کی پُوری ہستی کو بدل کر رکھ ہی دیا تھا لیکن اتنے دنوں میں اسے جو ناز اور جو ادائیں اس کے جوان ہونے والے تصوّرات نے سکھائی تھیں انھوں نے تو جیسے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

گو بالی کی زبان پر اس کی تعریف کا ایک لفظ بھی نہ تھا مگر اس کی آنکھیں جیسے بلند آواز میں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ صاحباں ایسا نایاب ہیرا دُنیا میں کوئی دوسرا ملنا مشکل تھا۔ یہ تو کوہِ نور اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

"خالہ! مجھے ذرا نیند نہیں آئی۔"

صاحباں کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

"تو کیا پیا ملن کی خوشی میں آج ساری رات جاگو گی...؟"

"ہائے خالہ! کیسی باتیں کرتی ہو...؟"

شرم سے وہ گلنار ہو اُٹھی۔ بے شک بالی اس کی سہیلی تھی مگر پھر بھی یوں کھُلم کھُلا گفتگو اس وقت اسے بُری طرح گھبراہٹ میں ڈالے دے رہی تھی۔

"خالہ! تم آج ابھی سونے کے لیے نہیں جاؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔"

"پگلی بیٹی!" بالی نے انتہائی پیار سے اسے چمکارا۔

"تمہیں اس وقت سو جانا چاہیے تاکہ صبح تازہ دم اُٹھو۔ شب بیداری تو رنگ رُوپ خراب کر دیتی ہے اور تمہیں کل... ہاں ضرور اپنے حضور کے رُوبرو حاضری...؟"

بالی نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ صاحباں سمجھ گئی۔ تھوڑا سا مسکرائی، بہت سارا شرمائی اور پھر گردن جھکائے چپکے سے جا کر بستر پر دراز ہو گئی۔

"اگر نیند نہیں آ رہی تو میں تمہیں سُلا دیتی ہوں۔"

بالی آ کر اُس کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"ہاں خالہ...؟"

وہ اس کا سر سہلانے لگی۔ ساتھ ساتھ مدھم سے لہجے میں اس اجنبی شہزادے کے متعلق جسے صاحباں اپنا دُولہا سمجھتی تھی، چھوٹی چھوٹی مزیدار اور پُرلطف سی باتیں سُنانے لگی۔

جیسے خواب آور دوا قطرہ قطرہ اس کے حلق میں ٹپکتی جائے۔ وہی اثر اس کی باتوں کا ہو رہا تھا۔

اس کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی باتیں۔ معصومیت کی باتیں۔ جوانمردی کی باتیں اور بہادری کے قصّے۔

صاحباں بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی اور خوش نما ہونٹوں کو نیم وا کیے، چہرہ اُٹھائے بالی کو تکے جا رہی تھی۔ پھُول جھڑ رہے تھے۔ خوشبو دار اور خوش رنگ کلیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

یونہی تکتے تکتے، سُنتے سُنتے جانے کب اسے نیند نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"میں دس ہزار سے ایک کوڑی کم نہیں لوں گی۔"

"دس ہزار بہت زیادہ ہیں۔"

مردانہ بھاری سی آواز اور مردانہ بھاری بُوٹوں کی چاپ نے اس کی نیند مکمل طور پر توڑ دی۔

وہ گھبرا کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور پھر متوحش نگاہوں سے اردگرد دیکھنے لگی۔

وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلی اپنے بستر میں تھی اور کمرے میں ہلکی نیلی روشنی والا بلب روشن تھا۔

شاید کوئی خواب دیکھا تھا اُس نے۔ صاحباں نے لیٹ کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

"اچھی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ تو چکے ہو۔"

"دیکھ چکا ہوں۔ میں نے کب انکار کیا ہے۔"

"پھر؟ پھر بھی دس ہزار زیادہ ہیں...!"

"کئی ہزار تو میں نے اس کی نوک پلک درُست کرنے پر لگا دیے ہیں۔"

"وہ مسئلہ علیحدہ ہے۔ ہزار کیا لاکھ لگاؤ۔ میں تو اتنا جانتی ہوں ایسی شکل و صورت والا مال پہلے کبھی میرے ہاتھ نہیں لگا۔ اب یہی تو میری تقدیر بنے گی۔"

"چلو۔ نہ تمہاری بات نہ میری۔ چھ ہزار...؟"

"توبہ توبہ.... اس ہیرے کو پانے کے لیے جو تکلیفیں میں نے سہی ہیں اور جو جو کچھ مجھے کرنا پڑا ہے، وہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ معصوم ہے، بھولی بھالی ہے لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ معصومیت اور سادگی کو شیشے میں اُتارنا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت چالاکی کے۔"

"پھر آخر تم چاہتی کیا ہو...؟"

"ایک کم نہیں۔ پُورے دس۔"

"نہیں، کچھ تو رعایت کرو۔"

"اس کے لیے کوئی رعایت نہیں۔"

"کیوں...؟"

"اس لیے کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کل ہی کوئٹہ سے اس کا جو گاہک آ رہا ہے تم اس سے پچاس ہزار روپے لینے والے ہو۔"

"نہیں نہیں... یہ غلط ہے۔"

"بالکل غلط نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بس آخری بات۔ کم کروں گی تو صرف ایک ہزار۔ میں نے بھی اس پر کچھ کم محنت نہیں کی بادشاہ اور شہزادے کے قصے گھڑ گھڑ کر میرا دماغ خالی ہو گیا ہے۔"

زنانہ آواز خالہ بالی کی لگتی تھی۔ صاحباں کی نیند چوپٹ ہو گئی۔

"یہی تو اصل کمائی والا مال میرے ہاتھ لگا ہے اور...!"

قدرے توقف کے بعد وہی آواز پھر اُبھری۔

"تمہاری آنکھوں میں جو پسندیدگی تھی وہ میں نے اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لی ہے۔ پُورے پندرہ منٹ تم کھڑے اس حُسنِ خوابیدہ کو دیکھتے رہے ہو۔"

"وہ تو میں نگاہوں ہی نگاہوں سے اُسے پرکھ رہا تھا کہ جتنا اس پر خرچ کیا ہے، وصول بھی ہو گا یا...؟"

"ہاں..." خالہ نے اس کی بات کاٹ دی...

"نگاہوں سے پرکھ رہے تھے۔ میں اتنی نادان نہیں ہُوں۔ خود میری نگاہیں ہر وقت اس حُسن کے پیکر کا طواف کرتی رہتی ہیں... تو پھر ایک مَرد ہو۔ ایک عیاش اور بیوپاری مَرد... سمجھتی ہُوں سب کچھ۔"

"بالی بیگم! تم بڑی خبیث عورت ہو۔"

مَرد کی اس بات کے ساتھ ہی زنانہ قہقہہ بلند ہُوا... اور صاحباں سوچوں میں کھو گئی۔

بالی بیگم... بالی بیگم... تو... باتیں کرنے والی عورت بلاشبہ خالہ بالی ہی تھی اور مَرد نجانے کون تھا؟

وہ جب سے یہاں آئی تھی سوائے ایک دو ملازموں، ملازماؤں اور خالہ بالی کے اس نے اور کسی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر نجانے وہ کون تھا جس کے ساتھ اس قدر بے تکلفی سے گفتگو ہو رہی تھی۔

اور... اور یکایک ان کی گفتگو کا ایک ایک فقرہ اس کے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح ضرب لگانے لگا۔

یہ کیسی گفتگو تھی...؟ کونسا مال تھا جس کے لیے دونوں سودے بازی کر رہے تھے۔

اوہ! وہ مال... وہ مال... کہیں وہ خود ہی تو نہ تھی۔ ایک بار پھر ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔

بادشاہ اور شہزادے کے قصے۔ یہ تو اسے سُنائے گئے تھے۔ ہاں... اُسے... تو یہ صرف قصے ہی تھے، حقیقت نہ تھی؟

ہتھوڑے کی ضربیں شدید ہونے لگیں۔ تکلیف کے مارے اس کے دانت ہونٹوں میں گڑ گئے۔

یہ کیا ہو گیا صاحباں...؟ یہ کیا ہو گیا...؟

شک یقین میں بدل گیا... اور جب شک یقین میں بدلا تو اُس کی حیات کا رُخ بھی بدل گیا۔ کیسی مکروہ صورت نکلی تھی۔

چند منٹ پہلے یہ سب کچھ کتنا اچھا، کتنا دلفریب اور کیسا سہانا تھا... اور اب...

یکایک ہی اس ماحول سے، یہاں کی چیزوں اور فضاؤں سے اور سب سے بڑھ کر خالہ بالی کے وجود سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔

بے شک شہر کی، دولت کی، ایک خوبصورت بانکے سجیلے شہزادے کی کشش نے اُسے، اس کی جوانی کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا مگر وہ ایک بے حد شریف اور نیک انسان، عادل بابا کی بیٹی۔

اس عادل بابا کی بیٹی، جس کی عزّت نصور آباد کا بچہ بچہ کرتا تھا۔ اس عادل بابا کی بیٹی، جس کی شرافت کے نقوش نصور آباد کی گلیوں کے چپّے چپّے پر منقش تھے۔ اس عادل بابا کی، جس کے انصاف کے چرچے ہر زبان پر ہوتے تھے۔

وہ اُٹھ بیٹھی۔۔۔۔ گاؤں کی سیدھی سادی اور معصوم صاحباں کی چھٹی حس نے اپنے اطراف منڈلاتے اپنی عزّت کے سوداگروں کے خطرے کی بُو سُونگھ لی۔

وہ سمجھ گئی کہ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا فراڈ کھیلا گیا تھا۔ ابھی ابھی بالی اور ایک مَرد کے درمیان جو سودے بازی ہو رہی تھی، وہ کسی اچھے مقصد کے لیے تو نہ تھی۔ یقیناً کوئی بُری بات تھی جو یوں چُپکے چُپکے سوتے ہُوئے میں اُس کی نمائش کی گئی اور پھر چوری چوری دونوں گفتگو کر رہے تھے۔

یہاں نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ کسی بادشاہ کی بہو کی تلاش کا کام بالی کے سُپرد ہُوا تھا۔۔۔ نہ ہی کوئی خوبصورت اور بانکا سجیلا شہزادہ تھا جس کے لیے شہر شہر، گاؤں گاؤں پھرنے کے بعد وہ دُلہن ڈھونڈی گئی تھی۔

یہ کہانی صرف اُسے ورغلانے کے لیے گھڑی گئی تھی۔ اُسے شیشے میں اُتارنے کے لیے بالی نے یہ جال پھیلایا تھا، جس کا کہ وہ اپنی زبان سے اعتراف بھی کر چکی تھی۔

اور اب... صاحباں کو بالی نے جوان کیا تھا... اور اس کی جوانی نے اسے سمجھدار بھی کر دیا تھا۔ شعور و آگہی کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ وہ ایسی بھی باتیں سمجھنے لگی تھی جو چند دن پہلے تک اس کی عُمر سے بڑی خواتین کا حق سمجھی جاتی تھیں۔

ابھی ابھی بالی اور ایک اجنبی مَرد کے درمیان جو گفتگو ہُوئی تھی، تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اُس کا متن صاحباں پر واضح ہو گیا تھا۔ اور اب اس کے سامنے اپنی عزّت و ناموس کی حفاظت کرنے کا مسئلہ آن کھڑا ہُوا تھا۔ کیسے ان سے خود کو بچائے۔ کس طرح اس سودے بازی سے اپنے وجود کو نکالے۔

بہت دیر سوچنے پر بھی جب کوئی راستہ سُجھائی نہ دیا تو وہ اماں، بابا کو یاد کر کے رونے لگی۔

اُن کی محبّتوں اور شفقتوں نے کب اُسے ایک آنسو بھی بہانے دیا تھا۔ کب اُسے کسی محرومی کا احساس ہونے دیا تھا... اور کب کوئی آنچ آنے دی تھی۔ سب کچھ اپنی ناتواں جانوں پر ہی سہا کرتے تھے۔

اور آج وہ مشکلات کے جلتے الاؤ میں پڑی تھی اور اسے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ تن تنہا جل رہی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر چپکے چپکے روتی رہی اور اماں، بابا کے پیار، توجہات اور خلوص کو یاد کرتی رہی۔

من میں پچھتاوے اُترے جا رہے تھے۔ کیوں اس نے خالہ بالی کی باتوں میں آ کر اپنا اتنا اچھا گاؤں چھوڑ دیا؟ اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اپنی ایسی پناہ گاہ چھوڑ دی جس میں اس کی عزت یوں محفوظ تھی کہ کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔

کیسی حماقت کر ڈالی تھی اُس نے گھر سے قدم اُٹھا کر نہ صرف یہ کہ اس نے اپنی ہی عزت کی خرابی کا سامان کیا تھا بلکہ وہ تو اپنے بابا کی عزت کو بھی پاؤں تلے روند آئی تھی۔

اُسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اُن پر اُس کے اِس اقدام کی وجہ سے کیا کچھ نہ بیت گیا ہوگا۔۔۔ اکلوتی اولاد کی جُدائی بڑی کربناک ہوتی ہے۔ ستم بالائے ستم اُن کی طرف سب کی اُنگلیاں بھی اُٹھی ہوں گی۔

صاحباں! یہ تُو نے کیا کر دیا۔ یہ تُو نے ان کی محبتوں اور چاہتوں کا کیا صِلہ دیا۔ اس سے اچھا تھا تُو مر جاتی۔ جان سے گزر جاتی ان کے لیے وہ صبر کر لینا آسان تھا۔

اور اب۔۔۔ اب شاید انہیں دُکھ دینے ہی کی سزا خدا نے تجھے دی ہے کہ جس چیز کی طلب، خواہش اور تمنا لے کر گھر سے نکلی وہی تجھے نہیں ملی اور اس کی بجائے۔۔۔

تُو بازار میں سجا دی گئی۔ ایک بکاؤ مال بن گئی اور ایک عورت جب بکاؤ مال بن جائے تو دراصل وہ نہیں بکتی بلکہ اس کی عزت بکتی ہے۔ اس کی ناموس کے دام لگتے ہیں۔

بہت دیر رونے اور خود کو ڈھیروں ڈھیر لعن طعن اور سرزنش کرنے کے بعد وہ ذرا سنبھلی۔

ابھی اس کی عزت محفوظ تھی۔ وہ اسے بکنے سے بچا سکتی تھی۔ اِسی رات کے اندھیارے اُس کے لیے اُجالا ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ چپکے سے رات کے ان اندھیروں سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے، دن ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل سکتی تھی۔

ہاں، وہ ایسا کر سکتی تھی۔ وہ ایسا کرے گی۔ اپنی ہر ممکن کوشش کرے گی۔۔۔ اور اگر۔۔ کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی تو عزت دار باپ کی بیٹی عزت کی بجائے جان دیدے گی۔

اپنی سوچوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ جلدی سے اُٹھی۔ صبح ہونے میں وقت کم تھا۔ اس کے جسم میں جیسے برقی رَو دوڑ گئی۔ جلدی جلدی زیب تن کیا ہُوا شب خوابی کا مہین سا لباس اتار کر اس نے بالی کے دیے ہُوئے ملبوسات میں سے ایک انتہائی سادہ سا جوڑا نکالا اور پہن لیا۔

شانوں پر بکھرے بالوں کو سُلجھانے، بنانے کا وقت نہ تھا۔ جلدی جلدی اوڑھنی سے بالوں کو چھپایا۔ پھر اُسی اوڑھنی کے ایک پلّو سے چہرے پر لگائی ہُوئی رات والی کریم کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

یُوں وہ تصور آباد والی صاحباں، دوبارہ تو نہ بن سکی مگر کسی اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی ایک سادہ سی لڑکی ضرور بن گئی۔

اتنے دن ہو گئے تھے اُسے اِس جگہ آئے ہُوئے۔ اس نے یہاں سے فرار ہونے کی ایک ذرا سی بھی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی گھر چھوڑنے کے متعلق کسی پچھتاوے کا اظہار کیا تھا۔ وہ بے حد خوش رہی تھی۔

لہٰذا اس پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کی بے اعتباری محسوس ہُوئی تھی۔ اس لیے وہ کمرے میں اکیلی ہی سوتی تھی اور دروازے بھی سب کھلے ہوتے تھے نہ کوئی اس کے لیے پہرہ دیتا تھا نہ کوئی چوکیداری کرتا تھا۔

وہ دبے پاؤں کمرے سے نکلی۔ اِرد گِرد دیکھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، شاید سبھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

موقع اچھا تھا۔ اِسی طرح دبے دبے پاؤں برآمدے میں نکل آئی۔ برآمدے کا زینہ اُتر کر آ ہی پھاٹک کی طرف جانے لگی جہاں اسے یہاں سے نکل جانے کی اُمید قوی ہو گئی وہیں ساتھ ہی من میں ڈھیر ساری پریشانیاں بھی اُتر گئیں۔

اس چھت کی پناہ سے نکل کر وہ جائے گی کہاں۔۔۔؟ کہاں۔۔۔؟ کہاں۔۔۔؟

ماں باپ کا گھر تو وہ خود ہی چھوڑ چکی تھی کچھ اس انداز میں کہ اب وہاں واپس جانا تقریباً ناممکن تھا۔

۔۔۔ کوئی اور ٹھکانہ بھی نہ تھا۔ آنکھوں میں بہت سارے آنسو دُھند سی بن کر پھیل گئے۔

پلکیں جھپک جھپک کر ان آنسوؤں کو اندر ہی اندر پینے کی کوشش کرتے ہُوئے، وہ پھاٹک کھولنے لگی تو۔۔۔ سامنے ہی سا من دو من کا تالا اس کا مُنہ چڑا رہا تھا۔

بچپن میں درختوں پر چڑھنے کی اسے بڑی مہارت تھی اور یہ ہنر اس وقت کام آ سکتا تھا۔ وہ آہنی پھاٹک یا سیمنٹ کی دیوار پر اسی مہارت اور ہنر سے کام لیتے ہُوئے چڑھ کر دوسری طرف اُتر سکتی تھی۔

اس اِرادے اور پُختہ عزم کے ساتھ اس نے پھاٹک اور دیوار کی بلندی کو دیکھا۔

اوہ خدایا۔۔۔! دونوں ہی بالکل عمودی اور بہت اُونچے تھے۔ صاف شفاف اور پھسلن دار۔ نہ دیوار میں کوئی ہاتھ ڈالنے کو اُبھری ہُوئی اینٹ یا شگاف اور نہ ہی پھاٹک کی بناوٹ میں کوئی ایسا ڈیزائن کہ کہیں پاؤں رکھ سکے، کہیں ہاتھ ڈالنے کا سہارا مل جائے۔

اس کے علاوہ دیوار کے اُوپر جا کر کانچ کے ٹکڑے لگے تھے اور پھاٹک پر لمبی نوک دار میخیں۔

جُوں تُوں کر کے وہ اس بلندی پر چڑھ بھی جاتی تو پرلی طرف ثابت و سالم نہیں اُتر سکتی تھی۔ پھاٹک کے اُوپر سے جاتی تو نوکدار میخیں اُس کے نازک جسم کے آر پار ہو جاتیں اور دیوار پر چڑھتی تو کانچ کے ٹکڑوں سے بدن چھلنی ہو سکتا تھا۔

جان ہر ایک کو بہت پیاری ہوتی ہے۔ وہ کمزور سی لڑکی نہ اپنی عزت بکتی دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی جان جاتی۔ صرف رو سکتی تھی اور وہ پُوری لگن اور خلوص سے رونے لگی۔

جانے کتنی دیر وہیں پھاٹک کے قریب کھڑی روتی رہی اور خود کو کوستی رہی۔

تصور آباد میں کیسی آزاد و بے پروا زندگی گزارا کرتی تھی بلا سے غریبی تھی۔ پہننے کو جھوٹا موٹا اور کھانے کو رُوکھا سُوکھا مگر دل کو سکون تو تھا۔ ایسی پریشانی تو کبھی جان کو لاحق نہ ہُوئی تھی۔

ہائے! اس معصوم اور آزاد پنچھی کو یہ کیسا قفس اُس کے اندھے لالچ نے دے دیا کہ جس میں سے رہائی کی کوئی صورت اب دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

آنسوؤں نے سسکیوں کا رُوپ دھار لیا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اتنی زور زور سے روئے کہ اس کی فریاد و نالے اور آہ و فغاں اس پھاٹک کے لوہے کو پگھلا دیں اور اسے اس قید و بند سے رہائی مل جائے۔

جانے وہ کتنی دیر کسی ایسے ہی معجزے کی سوچوں میں غرق کھڑی روتی رہی۔ نہ وقت کا احساس تھا اور نہ موقعے کی نزاکت کا خیال کہ۔۔ پھاٹک کے عین باہر کسی کار کے ہارن کی آواز سُنائی دی۔ وہ چونکی۔ بہتے آنسو یک لخت رُک گئے۔ سسکیاں ایک دم تھم گئیں۔

ہارن کے تھوڑی دیر بعد جیسے کار کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ بھاری بُوٹوں والے قدموں کی چاپ ہُوئی اور گیٹ پر آ کر ختم ہو گئی۔

پھر۔۔۔ اسی عمارت کے اندر، جہاں سے صاحباں نکلی تھی، دُور کہیں گھنٹی کی آواز گونج اُٹھی۔۔۔ تو۔۔۔ یہیں۔۔۔ ادھر ہی کوئی آنا چاہتا تھا۔

چند لمحے گزرے۔ دوبارہ گھنٹی کی آواز گونجی۔۔۔ اور اب صاحباں کے سارے حواس بیدار ہو اُٹھے۔ مع عقل و ہوش کے۔

ابھی، ایک دو منٹ کے اندر اندر کسی نے یہاں آ کر اس آہنی دیوزاد پھاٹک کا قفل کھولنا تھا۔ یہیں کھڑے ہو کر، جہاں وہ کھڑی اپنے انجام پر آنسو بہا رہی تھی۔

تو۔۔۔ ہوش و خرد نے ذہن کو جھنجھوڑا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس مقصد کے لیے آئے، اسے یہاں سے ہٹ جانا چاہیے تھا۔ کہیں وہ فرار ہونے والے ارادے کے ساتھ پکڑی نہ لی جائے۔

کہاں جائے۔۔۔؟ دوبارہ عمارت کے اندر۔۔۔؟ نہیں۔ کبھی نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔

وہ اپنے اتنے اچھے اور اعلا اصُولوں کے مالک، عادل بابا کی بیٹی تھی۔ اپنی عزت و ناموس کو اسے اپنی جان پر بھی کھیل کر بچانا تھا۔

کار کا ہارن پھر ہُوا۔ دُور کہیں فضا میں پھر گھنٹی کی گونج سُنائی دی۔ آج پتا نہیں کیوں، سب بڑی گہری نیند سوئے ہُوئے تھے۔ کوئی بھی گھنٹی کی آواز پر اُٹھا نہیں تھا یا پھر شاید اس کی تقدیر نے اُسے جگانے کے لیے ابھی تک دوسروں کو سُلائے رکھا تھا۔

اُسے سوچنے کا موقع مل گیا تھا۔ چھپنے کے لیے اِرد گرد نگاہیں دوڑائیں۔ عمارت کے اندر جانا تو بے حد خطرناک تھا۔ یہیں کہیں کسی جھاڑی یا باڑھ میں گھُس جاتی تو اس وقت چھُپ سکتی تھی۔ رات کی تاریکی اس کی مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔

تیسری گھنٹی کی گونج سے چند لمحوں بعد ہی ملازموں کے برلے کوارٹروں میں ایک کی بتی جل اُٹھی۔

بتی کی یہ روشنی جیسے اس کے لیے آخری اشارہ تھا۔ صاحباں سٹپٹا کر، گھبرا کر بھاگی اور وہیں لان میں، سنگترے کی باڑھ کے اندر گھُس کر بیٹھ گئی۔

شکر، صد شکر، ہزار شکر۔ اُسے وہاں چھُپے ابھی پُورا ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ بُوڑھا چوکیدار کھانستا اور لاٹھی ٹیکتا ہُوا آ کر قفل کھولنے لگا۔

صاحباں باڑھ کی جھاڑیوں میں تھوڑا سا اور پرے کھسک گئی۔ رونا دھونا تو اُسی وقت بند کر دیا تھا۔ اب دماغ میں صرف یہ سوال تھا کہ آخر کون اور کیسا مہمان تھا جو یُوں آدھی رات کو آیا تھا۔ اسے دن کے وقت، وقت نہیں ملا تھا۔۔۔؟

چوکیدار نے قفل کھول کر پھاٹک ذرا سا دھکیلا، صرف اتنا کہ سر نکال کر آنے والے کے متعلق جان سکے۔ شاید اس کی جان پہچان والا

تھا۔ سلام دُعا کے بعد وہیں، اسی طرح کھڑے کھڑے اس سے گفتگو کرنے لگا۔

ان دونوں میں کیا گفتگو ہوئی صاحباں سُن تو نہ سکی البتہ اس گفتگو کا نتیجہ جو نکلا وہ چُپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی۔

چوکیدار نے پُورا پھاٹک کھول دیا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک بڑی سی سیاہ رنگ کی، بے حد چمکیلی اور خوبصورت سی گاڑی پختہ فرش پر پھسلتی اندر آگئی ـــــ اور گیٹ سے چند ہی گز آگے جا کر رُک گئی۔

"مجھے ابھی واپس جانا ہے۔ صابر میاں کو جلد بُلا دو"

گاڑی کے اندر موجود آدمی نے بڑی عجلت سے چوکیدار پر حکم چلایا۔

"بہت اچھا حضور"

وہ بڑھ کر گیٹ بند کر کے پھر قفل چڑھانے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو ـــ؟"

نووارد گاڑی سے باہر آگیا۔

"صاحب کا حکم ...؟ چوکیدار نے قفل میں کُنجی گھُماتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

"لیکن میں نے کہا نا کہ مجھے ابھی واپس جانا ہے"

"قفل پھر کھُل جائے گا حضرت! مگر اپنے صاحب کے حکم کی تعمیل بہت ضروری ہے۔ نوکری تو نہیں گنوانی"

چوکیدار کھانستے اور بڑبڑاتے ہوئے مُڑا۔

"چلو اچھا۔ جلدی آؤ ...؟"

وہ چوکیدار کے ساتھ ساتھ عمارت کی طرف چلا گیا۔

اس شخص کی آمد نے صاحباں کے مَن میں آس کی ایک کرن روشن کر دی تھی ... مگر ... اُسے پھر رونا سا آگیا۔ پھاٹک کھُلا بھی، دوبارہ مقفّل بھی ہو گیا اور وہ قسمت کی ماری وہیں باڑھ میں بیٹھی تاریکیوں میں چھُپی رہ گئی۔

ورنہ ... ورنہ اگر وہ دوبارہ پھاٹک مقفّل نہ کرتا تو وہ ان کے اندر چلے جانے کے بعد چُپکے سے، انتہائی آسانی سے اس قید سے رہائی حاصل کر سکتی تھی۔ وہ کرن بھی تاریکی میں ڈُوب گئی۔

مقدر کی تاریکی مَن میں اُتر آئی۔ مایُوسی کے مارے وہ دوبارہ اپنا رونے والا شغل جاری کرنے ہی والی تھی کہ اس کی نگاہ گاڑی کے اگلے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والے دروازے پر پڑ گئی۔

جلدی میں وہ گاڑی کا دروازہ کھُلا ہی چھوڑ گیا تھا۔ جانے کس بات کی اُسے جلدی تھی؟ صاحباں سوچنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنا خیال آگیا، خود کس مشکل میں گرفتار تھی اور سوچ دوسروں کے مسائل رہی تھی۔

"پاگل کہیں کی"

بڑے غصّے سے اس نے خود کو کوسا ... اور پھر ... یہی کوسنا اس کے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔ یکلخت صاحباں کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

وہ تو پتا نہیں کیوں کھُلا چھوڑ گیا۔ مگر صاحباں تیرے لیے یہ کھُلا دروازہ، درِ زنداں بن سکتا ہے۔ اُٹھ اور آزما اپنی قسمت کو ... قفس کا دَر کھُلا ہے ... شاید تیری آزادی کے لیے۔ خدا کو تجھ پہ رحم آگیا ہو۔ تیری عزّت اور تیری جان بچانے کے لیے یہ ایک معجزہ ثابت ہو۔

وہ باڑھ میں سے بڑی تیزی سے باہر آئی اور گاڑی کے کھُلے دروازے سے اندر گھُس گئی۔ پلک جھپکتے ہی یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ ڈر اور پریشانی سے اس کی حالت غیر تھی۔

اسی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اپنے غیر ہموار سانس درُست کرنے لگی۔ یوں لمبے لمبے سانس لے رہی تھی جیسے میلوں کی مسافت بھاگ کر طے کی تھی اور اب سانس سے سانس نہیں مل رہا تھا۔

ایک دم ہی ایک مدھم سا شور اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ چونکی۔ سامنے عمارت کی طرف دیکھا۔ برآمدے میں دو تین عورتیں اور مَرد نکل آئے۔

ایک تیزی سے دائیں سمت گھُوم گیا۔ ایک ملازمین کے کوارٹروں کی طرف بھاگا۔ دو عورتوں میں سے ایک برآمدے کے سامنے والے لان میں چل گئی۔ دوسری خالہ بالی تھی۔ وہ ابھی زینہ اُتر رہی تھی۔ اس کا رُخ اسی طرف تھا۔ اسی گاڑی کی طرف جہاں صاحباں چھُپی بیٹھی تھی اور سامنے والے شیشے میں سے صرف دو آنکھیں نکال کر سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

اس وقت تک ـــــ کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑی تھی۔ نہ لان میں نکل جانے والی کی اور نہ خالہ بالی کی۔ اگر کوئی اِدھر آ کر گاڑی کے کھُلے دروازے سے اندر جھانک لیتا یا پھر آنے والا ہی واپس جانے کے لیے آجاتا تو ...؟

تب تو وہ چھُپی نہ رہ سکتی تھی۔ کیا کرے ...؟ پہلے اگلی دونوں سیٹوں کے درمیان گھُسنے کی کوشش کی۔ اس صورت میں بھی خطرہ ٹل نہیں سکتا تھا۔

گھبرا کر اس نے گاڑی کے اندر اِردگرد نگاہ دَوڑائی۔ اگلی کی بہ نسبت پچھلی سیٹوں پر روشنی کم تھی اور ان کے اِردگرد کے دونوں دروازے بند تھے۔ کچھ اور سوچے بِنا وہ پچھلی سیٹ پر لڑھک گئی۔

پھر اِردگرد دیکھا۔ اپنی طرف دیکھا۔ سامنے والے شیشے میں سے آنے والی ہلکی روشنی اب بھی اس پر پڑ رہی تھی، وہاں سے بھی دکھائی دے جانے والا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ اب ... اب کیا کرے ...؟

کوئی غیبی قوّت ہی اُسے راستہ دکھا رہی تھی۔ جانے اس کے نیک ماں باپ کی نیکیاں تھیں یا دُعائیں۔ بچاؤ کا ایک اور طریقہ سُوجھ گیا ـــــ

وہ سیٹ پر سے اُتر کر، نیچے پاؤں والی جگہ میں سمٹ کر، دُبک کر بیٹھ گئی۔ اب وہ بالکل تاریکی میں تھی۔ نہ اُسے باہر کا کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ وہ کسی کو نظر آ سکتی تھی۔ جب تک کوئی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتا نہیں یا پھر روشنی کر کے ڈھونڈنے کی نیت سے اندر دیکھتا نہیں۔ اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

اور ... باہر سے آنے والی آوازوں سے یہ اندازہ تو اب اُسے بخوبی ہو گیا تھا کہ ساری بھاگ دوڑ اسی کی تلاش اور جستجو کے سلسلے میں تھی۔

پر جو ابھی کوئی لان میں گھُسا تھا تو کوئی ملازمین کے کوارٹروں کی طرف اور کوئی عمارت کی پچھلی جانب۔

"جانے کہاں چلی گئی ...؟ کوٹھی کا ایک ایک کونہ، ایک ایک چپّہ چھان مارا ہے"

"میں اِدھر سارے کوارٹروں میں بھی دیکھ آیا ہُوں۔ کوئی باہر جانے کا بھی راستہ نہیں ہے"

"دیوار کے اُوپر سے پھلانگ گئی ہو گی" یہ خالہ بالی کی آواز تھی۔

"درختوں پر بڑی پھُرتی سے چڑھا کرتی تھی اور پھر جب گھر سے فرار ہُوئی ہے تو دیوار کے راستے ہی"

"بالی بیگم! یہ دیوار نہیں پھلانگی جا سکتی"

یہ اسی مَرد کی آواز تھی ... بالکل وہی۔ جو رات کو بالی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اب اس کے لہجے میں طنز کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہُوا تھا۔

"تمہیں ـــــ ابھی تک اس کا علم ہی نہیں کہ اس دیوار میں برقی رَو والی تاریں لگی ہُوئی ہیں اور شام ہوتے ہی ان میں کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے"

"تو اس سے مطلب کیا ہے تمہارا ...؟"

بالی کا لہجہ تیز ہو گیا تو وہ شخص یکلخت دھیما پڑ گیا۔

"تو وہ آخر گئی کہاں۔ نہ زمین کھا سکتی ہے اُسے اور نہ آسمان نگل سکتا ہے"

"مجھے کیا معلوم ...؟ اسے لانا، اس کی دیکھ بھال کرنا، اُسے انسان بنانا میرا کام تھا اور اس کی حفاظت کرنا تمہاری ذمّے داری تھی ـــــ"

"صاحب! شکل سے ہی معصوم تھی، اندر سے کتنی چالاک نکلی۔ اُڑ گئی چڑیا" ایک اور آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"اتنے سخت انتظامات تھے۔ کیسے جا سکتی ہے"

وہی مَردانہ بھاری آواز فکر و تشویش سے بھَری اُبھری۔

"چلو جمالے! تم ایک بار پھر ملازموں کا ایک ایک کوارٹر اچھی طرح دیکھ کر آؤ ... اور تم نسیمہ، اُوپر والی منزل دیکھی ہے؟"

"ہاں صاحب، اچھی طرح"

"ایک بار پھر دیکھ کر آؤ"

وہ سارے جاری ہونے والے احکامات سُن رہی تھی۔ ایک ایک بات اس کے کان میں اُتر رہی تھی۔ ہر بات۔ ہر حکم کے بعد وہ کچھ اور سمٹ جاتی اور دُبک جاتی۔ یہاں تک کہ سانس بھی کتنی کتنی دیر روک کے رکھتی۔

دوبارہ دوبارہ، سہ بارہ سہ بارہ ہر جگہ اسے ڈھونڈا گیا مگر ... وہ جہاں تھی وہاں اُسے ڈھونڈنے کوئی نہ آیا۔ کسی نے نہ سوچا کہ اس گاڑی کے اندر بھی وہ چھُپ سکتی ہے۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا۔

یوں بہت دیر بھاگم دوڑ رہی تو آخر وہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی جو ابھی باڑھ میں چھپنے کے بعد اُس نے سُنی تھی۔
"صابر میاں! مجھے تو اس وقت اجازت دیجیئے - کل کا دن چھوڑ کر پرسوں آؤں گا۔"

یہ اس گاڑی کے مالک کی آواز تھی۔ بڑی سنجیدہ اور بارُعب سی۔ اسی لہجے میں اب بھی بات کر رہا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے کچھ دیر سے کی تھی۔

"لیکن... لیکن... معاملہ تو ہمارا پکّا ہے نا؟"

جتنی وہ آواز بارُعب اور پُرجلال تھی، اتنی ہی خوشامدانہ آواز سُنائی دی۔

"بالکل پکّا...؟"

مختصر اور مکمّل جواب تھا۔

جانے کونسا معاملہ تھا۔ نہ کوئی واضح بات ہوئی نہ وضاحت بھرا جواب ملا۔ دوسرے سب لوگ سمجھ گئے ہوں تو سمجھ گئے ہوں مگر صاحباں کو سوچنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

تب... ایک جھٹکے کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اسٹارٹ ہونے کی آواز سے زیادہ پھاٹک کھلنے کی آواز تھی۔

گاڑی پھاٹک سے نکلی۔ صاحباں نے ایک طویل سا اطمینان بھرا سانس لیا۔ مکمل خاموشی کے ساتھ۔ کہ وہ اس قید خانے سے آزاد ہو گئی تھی۔ پھر خدا کا ہزاروں شکر ادا کیا کہ اس نے کم از کم ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے اسکی عزّت اور جان تو بچالی تھی جو اس طرح اُسے ورغلا کر لائے تھے اور یوں سودے بازی کر رہے تھے۔

رہی بات اس قید سے رہائی کی جہاں وہ اس وقت تھی تو اس کی اُسے پُوری توقع تھی کہ جس طرح خدا نے ان خطرناک ہاتھوں سے اسے بچالیا تھا اسی طرح یہاں سے بھی یقیناً وہ اسے بچائے گا۔ پروردگار خود۔

یہ مشکل اس سے کہیں آسان تھی... کہیں آسان... کسی وقت بھی، کسی کام کے لیے بھی گاڑی والا منٹ دو منٹ کو بھی گاڑی کہیں کھڑی کرتا تو وہ چپکے سے نکل کر بھاگ سکتی تھی۔ کھُلی سڑک تھی۔ کھُلی جگہ تھی۔ اس عمارت کی طرح اِردگِرد کوئی اونچا آہنی میخوں والا گیٹ نہ تھا اور کانچ کے ٹکڑوں اور برقی تاروں والی چار دیواری نہ تھی۔

یہ قفس تو قفس نہ تھا بلکہ اس وقت اس کی پناہ گاہ تھی۔ وہ چُپ چاپ کسی آنے والے سنہری موقعے کے انتظار میں اسی طرح بیٹھی رہی۔

گاڑی کی رفتار بڑی تیز تھی۔ وہ کسی نامعلوم منزل کی طرف چلی جارہی تھی اور... صاحباں کا آزاد ذہن سوچ رہا تھا۔

اس کی منزل تو کھوچکی تھی۔

تصوّر آباد واپس جانے کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُسے اپنے بابا سے ڈر لگ رہا تھا۔

اس کا بابا وہ انسان تھا جو ہر مجرم اور ہر گناہ گار کے لیے عین قرآن و سنّت کے احکامات کے مطابق سزائیں تجویز کیا کرتا تھا اور پھر اتنی سختی سے ان پہ عمل بھی کرواتا کہ کوئی بے شک کتنا اس کا عزیز یا پیارا ہو، وہ کبھی کوئی رعایت نہیں برتا کرتا تھا۔ کوئی سفارش اس کے کیے گئے فیصلے کو بدل سکتی تھی اور نہ بڑی سے بڑی رشوت...

اس کی نگاہ میں امیر غریب، اپنا پرایا سب ایک جیسے انسان تھے۔ امیر کی زندگی انمول نہیں تھی اور غریب بے قیمت اور بے وقعت نہیں تھا۔

انصاف کے معاملے میں اپنے اور غیر کو وہ ایک درجہ دیتا تھا۔ اس نے کبھی کسی اپنے کی سزا میں ترمیم و تخفیف نہ کی تھی نہ مقابلے میں غیر کے ساتھ زیادتی۔

یہاں تک کہ... صاحباں کا ایک جوان بھائی تھا۔ جو اس کا اپنا بیٹا تھا۔ چار بیٹوں کو جنم دینے کے بعد ان میں سے صرف ایک اس عُمر کو پہنچا تھا۔ ماں باپ کے بڑھاپے کا اکلوتا سہارا۔ بہن کی عزّت کا اکیلا رکھوالا۔ جتنا جوان تھا، اتنا ہی سب کا لاڈلا۔

اس نے چوری کی تھی۔ ثبوت مل گیا۔ بابا نے ہاتھ کاٹ ڈالنے کی سزا سُنائی۔ امّاں نے کیسے کیسے واسطے بابا کو نہیں دیئے۔ کس کس طرح منتّیں نہیں کیں، ہاتھ نہیں جوڑے۔ کہ کسی طرح اس کی سزا معاف کردی جائے۔

مگر... بابا نے ایک نہ سُنی۔ آنکھوں میں آئے آنسو پیتا رہا اور انصاف کا ترازو تھامے کھڑا رہا۔

وہ اگر بستی کے منصف کا بیٹا تھا تو کیا ہُوا، دوسرے انسانوں جیسا ہی وہ بھی ایک انسان تھا اور جرم بھی اس نے کیا تھا۔ اور جرم کو سزائیں ملتی تھیں اور پُوری ہوتی تھیں۔ اسے ملی تھی۔ اس کی پُوری کیوں نہ کی جاتی۔ وہ بھی دوسرے ہی مجرموں جیسا ایک مجرم تھا۔ تب فیصلے کے مطابق انصاف کی رُو سے اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالا گیا۔

وہ بابا کا بیٹا تھا۔ ایک بے حد نیک انسان کا۔ جس کی عزّت تصوّر آباد کا بچّہ بچّہ کرتا تھا۔ یہ کیسا بیٹا تھا جس نے باپ کی ایک اتنے نیک نام کی عزّت کو بٹہ لگا ڈالا تھا۔

ہاتھ کٹنے کے بعد پچھتاوؤں اور شرمندگی نے اسے کوئی ایسا اندر کا روگ لگا دیا کہ چھ مہینے کے بعد وہ پُورے کا پُورا اس دُنیا سے اپنا ناتا ہی سب سے توڑ بیٹھا۔

صاحباں صرف چھ سال کی تھی اس وقت... اور یہ واقعہ ایسا اثر انگیز تھا کہ دس سال بعد بھی یہاں، گاڑی کی پچھلی سیٹ میں دُبکی صاحباں کو اس کے خیال سے اس وقت بھی جھُرجھُری سی آگئی۔

اور... صاحباں نے بھی تو رات کی تاریکی میں چوری چوری، چُپکے چُپکے گھر سے نکل بھاگنے کا جُرم کیا تھا۔ جانے اس جُرم کی اسلامی سزا تھی۔ قرآن و سنّت کیا کہتے تھے۔ اس پر کونسی حد لگتی تھی۔

وہ جانتی نہیں تھی۔ مگر خوف سے اس پر کپکپی سی طاری تھی۔

اس نے ارادہ کر لیا کہ گاڑی میں سے نکلنے کا جب بھی موقع مل گیا وہ اُسے جانے نہیں دے گی۔ موقع سے فائدہ ضرور اُٹھائے گی تصوّر آباد جانے کے لیے نہیں۔

وہ اب تصوّر آباد نہیں جائے گی۔ وہ کہیں اور چلی جائے گی۔ اسے کوئی عزّت دار ٹھکانہ نہ ملا تو زندگی ہی ختم کردے گی۔ مگر بھائی کی طرح —— سزاوار بن کر، شرمندگیوں کو گلے لگا کر، گھر کی ایک کوٹھری میں پڑی نہیں رہے گی۔ سسک سسک کر دم نہیں توڑے گی۔

وہ انہی سوچوں میں گُم تھی کہ گاڑی کو یکایک بریک لگنے سے پہیّوں کی تیز آواز کے ساتھ بڑے زور کا ایک جھٹکا لگا۔ اس کا سر سیٹ کے ساتھ ٹکرا گیا۔ چوٹ اتنی شدید آئی تھی کہ اسے خود پر اختیار رہا نہ قابو۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

"کون...؟" گاڑی کو روکنے کے لیے ہی بریک لگائے گئے تھے۔ رُک تو وہ پہلے ہی گئی تھی۔

"کون ہے یہاں...؟"

گاڑی کے اندر لگی بتّی کو روشن کر کے گاڑی چلانے والا گردن پھیر کر پیچھے دیکھنے لگا۔

صاحباں کو اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ وہ اور بھی دُبکنے کی کوشش کرنے لگی... مگر... کار چلانے والا اسے دیکھ چُکا تھا۔ اب کوئی کوشش بے کار تھی۔

وہ اپنے چوٹ لگے سر کو ہولے ہولے سہلانے لگی۔

"میں پُوچھ رہا ہوں کون ہو تم اور یہاں کب سے چھپی بیٹھی ہو...؟"

صاحباں پھر بھی چُپ بیٹھی رہی۔ کوئی جواب نہیں سُوجھ رہا تھا۔

اپنی بات کا کوئی جواب نہ پایا تو گاڑی والے کو غصّہ آگیا۔ ایکدم کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ نجانے وہ صاحباں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔

اس کی آواز کی تُندی اور جھلاہٹ سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اسے کچّا کھا جائے گا۔

صاحباں رونے لگی۔ بے بس لڑکی اور کر بھی کیا سکتی تھی...؟

"نہیں بتاؤ گی کہ تم کون ہو اور یہاں کیسے آئیں...؟"

وہ پچھلا دروازہ کھول کر اس کے اوپر جھکا ہُوا پُوچھ رہا تھا۔

صاحباں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ البتّہ اس کی سسکیاں کچھ اور تیز ہوگئیں۔

کار کے اندر جلتی روشنی شاید اسے ناکافی محسوس ہُوئی تھی اور وہ صاحباں کو اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ اب اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال کر تیز روشنی کا ایک ہالہ سا اس کے سارے وجود پر پھینکنا شروع کردیا۔

صاحباں نے گھبرا کر چہرہ اُٹھایا۔ بھیگی پلکیں۔ بھیگے رخسار۔ کپکپاتے ہونٹ۔ پھیلی آنکھیں اور... معصومیت بھری سہمی نگاہوں سے کار والے کو دیکھنے لگی۔

"میں... میں صاحباں ہوں..."

اس کے پتلے پتلے گُلابی گُلابی ہونٹ لرزے۔

"تصوّر آباد والی صاحباں"

ساتھ ہی اس کی سسکیاں اور تیز ہوگئیں اور سسکیوں کے درمیان پھنسا ہُوا اُس کا وجود ہلنے لگا۔ ہر ہچکی کے ساتھ اسے ایک جھٹکا سا لگتا۔

کار والا روشنی کا دائرہ اس کے اُوپر ڈالے جُھکا کھڑا تھا اور مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"وہ لوگ مجھے بیچنے لگے تھے۔ مگر... مگر..."

صاحباں جیسے فریاد ــــ کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی ہچکی نے اسے ایسا جھٹکا دیا کہ وہ فقرہ بھی مکمل نہ کر سکی۔

"مگر کیا...؟"

گاڑی والے کے لہجے میں اب قدرے نرمی تھی۔

"میں ایک بے حد شریف باپ کی بیٹی ہُوں"

ــــ دہشت اور خوف سے لرزتے ہُوئے صاحباں مرتعش سے لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے لگی۔

"خالہ بالی مجھے دھوکے سے شہر لے آئی تھی۔ میں کبھی نہ آتی مگر میری شادی ایک معمولی سے دُکاندار کے ساتھ ہونے لگی تھی۔ بالی نے کہا کہ وہ ایک امیر کبیر شہزادے کے ساتھ میری شادی کر دے گی۔ خدا کی قسم میں بُری لڑکی نہیں ہوں۔ بس پتا نہیں کیوں بالی کی باتوں میں آگئی"

"اوہ..."

"وہ خالہ بالی اسی گھر میں رہتی ہے جہاں ابھی آپ گئے تھے"

وہ چُپ چاپ اس کی سُنے جا رہا تھا۔ صاحباں کو کچھ تقویت ملی جو اطمینان اور سکون سے اس کی بات سُن رہا تھا سے اسے کچھ ہمدردی کی اُمّید ہو چلی تھی۔

"قصوّر آباد سے وہ یہیں مجھے لے کر آئی تھی اور اتنے دِن میں اسی گھر میں رہی ہُوں"

"جس لڑکی کو وہاں کے لوگ ڈھونڈ رہے تھے کیا وہی ہو تم...؟"

"ہاں... وہ میں ہی ہوں۔ باہر آنے کا راستہ کوئی نہیں تھا اس لیے میں آپ کی گاڑی میں چھُپ گئی۔ مجھے ڈر تھا وہ لوگ کہیں مجھے پکڑ نہ لیں"

صاحباں ہنوز سیٹ سے نیچے بیٹھی تھی، چہرے پر ہاتھ رکھ کر پھر رونے لگی۔

"عزّت دار لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، وہ روپوں سے بکتی تو نہیں اور خالہ بالی میرا مول تول کر رہی تھی۔ میں عزّت دار باپ کی بیٹی ہُوں۔ مرجانا قبول کر لوں گی مگر... اپنی عزّت کو بکنے نہیں دُوں گی"

صاحباں روئے جا رہی تھی۔

"سنو...!"

یکایک اس گاڑی والے کی آواز میں شہد کی سی مٹھاس گھُل گئی۔

"سیٹ پر ٹھیک طرح بیٹھو!"

صاحباں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اپنے چہرے پر روشنی پڑ رہی تھی اس لیے اس کی شکل دکھائی نہیں دی۔ شکل دکھائی نہیں دی تو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ دل میں کس قسم کا ارادہ لے کر یوں شیریں کلامی سے پیش آیا تھا۔

"آپ... آپ مجھے پھر ان کے حوالے تو نہیں کر دیں گے؟"

صاحباں نے بڑی سادگی سے مَن میں پیدا ہونے والے خدشے کا اظہار کر دیا۔

"نہیں۔ تم اطمینان رکھو"

وہ اسی نرمی اور مٹھاس سے بولا۔

"اور اپنے آنسو پُونچھ لو"

صاحباں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ آخر وہ اس آدھی رات میں وہاں گیا تھا۔ ان لوگوں سے کوئی واسطہ، میل ملاپ یا شاید رشتے داری ہو۔

ایسا کوئی نہ کوئی تعلق تو اس کا ان کے ساتھ ضرور ہو گا ہی۔ پھر وہ ان کے مقابلے میں صاحباں کی حمایت کس طرح کر سکتا ہے۔ کبھی نہیں...

صاحباں کی آنکھوں سے بے اعتباری عیاں تھی۔ وہ اسے شک کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک دھوکا اُسے ا...

"اُٹھو نا۔ سیٹ پر بیٹھو"

"نہیں...!"

صاحباں کی آنکھوں میں جو بے یقینی لہریں لے رہی تھی، وہ اس نے دیکھ لی۔ یکایک ٹارچ کا رُخ اپنے چہرے کی ...

...ڑے نرم و ملائم لہجے میں بولا۔

"دیکھو۔ میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ تمہارے باپ جیسا... اور تم میری بیٹی کی طرح ہو"

صاحباں نے روشنی میں نہائے اُس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا۔

"مجھ پر اعتبار کرو اور روؤ نہیں۔ تم جہاں کہو گی میں تمہیں وہیں پہنچا دُوں گا"

...ں کے الفاظ میں، اس کے لہجے میں صداقت تھی۔ صاحباں کے دل نے اس کی گواہی دی۔ اس نے پھر بڑے غور سے اُسے ...

...لے گندمی رنگ کے اس کے چہرے کو چھوٹی چھوٹی سیاہ اور سفید بالوں والی داڑھی نے ــــ خاصا باوقار بنا دیا تھا۔

"اُٹھو..."

اس نے صاحباں کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا اور سیٹ پر بٹھا دیا۔

یُوں تو اس کا یہ عمل بڑا معمولی سا تھا مگر جس انداز میں اس نے صاحباں کا ہاتھ پکڑا تھا، جس طرح اسے بٹھایا تھا، جانے اس کی کونسی بات تھی کہ یکایک ہی صاحباں کا دل اس پر اعتبار کرنے کو چاہنے لگا۔

"اب بتاؤ۔ کہاں جانا چاہتی ہو؟"

ٹارچ بجھ چکی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات جاننے کے لیے روشنی ناکافی تھی لیکن اس کے لہجے کا خلوص بتا رہا تھا کہ وہ ...ھا آدمی ہے۔

"تم جہاں کہو گی میں تمہیں ابھی، اسی وقت وہاں پہنچا دُوں گا"

"میں نے بتایا نا۔ میں قصوّر آباد کی رہنے والی ہُوں لیکن اب میں وہاں جانا نہیں چاہتی"

"کیوں...؟"

"میرے بابا بڑے سخت ہیں۔ وہ یقیناً مجھے مار ڈالیں گے یا پھر کوئی اور کڑی سے کڑی سزا دیں گے"

"اپنی اولاد کو کوئی نہیں مار سکتا اور پھر تم ایسی اولاد... معصوم اور سادہ... وہ تمہیں کوئی سزا بھی نہیں دیں گے"

"میں سچ کہہ رہی ہُوں۔ میرے بابا اصول اور قانون کے معاملے میں بڑے سخت ہیں"

"سخت سے سخت انسان بھی اولاد کا معاملہ سامنے آجائے تو نرم ہو جاتا ہے"

"نہیں وہ نہیں ہو سکتے کبھی بھی نہیں... چوری کے جرم میں میرے بھائی کا ہاتھ کاٹ ڈالا تھا"

"کس نے...؟"

"بابا نے خود"

"خود...؟"

"ہاں۔ بابا کا بیٹا ہونے کی وجہ سے کوئی بھی اُسے سزا دینے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ تب بابا نے خود سزا دی"

پھر اس نے بڑی معصومیت سے اپنے بابا کا مقام اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرے بابا قصوّر آباد کے قاضی ہیں۔ سب اُن کی بڑی عزّت کرتے ہیں۔ بستی کے مالک، ملک جی بھی"

اس نے پھر چہرے پر ہاتھ رکھ کر رونا شروع کر دیا۔

"ایک میں نے ہی اُن کی بے عزّتی کر ڈالی۔ خود میں نے... بابا کی اپنی اولاد نے... بہت بُری ہوں میں... مجھے مرجانا چاہیے"

"نہیں نہیں..." وہ یکدم تڑپ کر بولا۔

صاحباں نے حیرت سے اُس کی اس تڑپ کو محسوس کیا۔

"ایسے مت کہو۔ میں تمہیں مرنے نہیں دُوں گا"

اس نے صاحباں کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"تمہارے ساتھ دھوکا ہُوا ہے۔ تم بُری نہیں ہو"

وہ اُسے دلاسہ دیتے ہُوئے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

"میں نہیں جانتا قصوّر آباد کہاں ہے۔ کچھ اس کا اَتا پَتا بتاؤ"

"نہیں... میں شاید اب زندگی میں کبھی بھی گاؤں والوں کو اپنا مُنہ نہ دکھا سکوں۔ وہاں کے قانون بڑے سخت ہیں"

"اور تم نے ابھی کہا تھا کہ تمہارے بابا وہاں قاضی ہیں۔ پھر قانون سخت ہُوا کرے"

"میں نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ بابا قانون سے زیادہ سخت ہیں۔ وہ کوئی رعایت نہیں برتتے بلکہ رعایت ملے بھی تو نہیں کرتے۔ اولاد کے لیے بھی نہیں ... اب تو مجھے اس جرم کے لیے اپنی زندگی ہی بطور کفارہ دینا پڑے گی۔ آپ مجھے یہ اُتار دیں۔"

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ گردن موڑ کر صاحباں کو دیکھا۔

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے...؟"

"ہاں... میں گاؤں نہیں جاؤں گی اور بے عزتی کی زندگی بھی نہیں گزاروں گی۔"

"پھر...؟"

"اپنی جان دے دوں گی، دریا میں کود کر۔ کسی کار یا گاڑی کے نیچے سر دے کر۔ کسی اونچی جگہ سے چھلانگ لگا کر۔"

"بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو...؟"

"ہاں..." صاحباں کے چہرے پر اس وقت معصومیت کے بجائے عزم کی پختگی تھی۔

"تو پھر ایک سودا کرو۔"

"آپ...؟"

صاحباں نے سہم کر اُسے دیکھا۔

"آپ بھی... آپ بھی..."

اور وہ پریشانی کے مارے اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ جو بات وہ مکمل نہ کر سکی وہ شاید اس نے پوری کی پوری مکمل طور پر سمجھ لی تھی۔

ایک محبت بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"میں اور طرح کا سودا کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری زندگی کا سودا۔"

"کیا مطلب...؟"

"میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ جو زندگی تم ضائع کر دینا چاہتی ہو وہ مجھے دے دو۔ تمہیں ماں باپ مل جائیں گے اور ہمیں زندگی کی خوشیاں۔"

"یہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم میرے گھر چلو۔ وہاں تمہیں اپنی حقیقی ماں جیسی ایک ماں بھی ملے گی۔"

"نہیں نہیں..."

صاحباں یکدم چلا پڑی۔ پھر چہرے پر ہاتھ رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں آپ کے گھر نہیں جاؤں گی۔ میں بہت بری بیٹی ہوں۔ میں اب کسی بھی ماں باپ کے قابل نہیں۔ میں عزت کی بجائے ذلت دیتی ہوں۔"

"نہیں، تم ایسی نہیں ہو۔"

اس نے بے حد پیار سے صاحباں کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک ہاتھوں میں چہرہ دیے رو رہی تھی۔ اس نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بڑی شفقت سے اُسے تھپتھپایا۔

"تم بہت معصوم ہو۔ تم بہت اچھی ہو۔ بہت نیک ہو۔"

"میں...؟ جو گھر سے بھاگی ہوئی ہوں؟"

صاحباں نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اپنے آپ پر طنز کیا۔

"ہاں تم... صرف تم۔"

اس نے اُسی پیار اور اُلفت کی نگاہ سے اُسے دیکھا۔ ایک بار پھر اس کا سر تھپتھپایا۔

"اور مجھے یقین ہے تم اس نئے گھر میں خود بھی خوش رہو گی اور ہمیں بھی خوشیاں دو گی... تمہاری نئی زندگی تمہیں بھی سکون اطمینان دے گی اور ہمارے لیے بھی بابرکت اور سکون بخش ثابت ہو گی۔"

اس کا یہ فقرہ جیسے گفتگو کا خاتمہ تھا۔ سامنے کی طرف رُخ پھیر کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اور یہ صاحباں کی زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز تھا۔

"تو وہ شخص—"

حارث نے ہاتھوں میں سے سر نکال کر گردن اونچی کی چہرے پر پریشانیوں کے سائے اتنے گہرے تھے کہ اُس کا اصلی روپ کہیں دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

لہجے میں ارتعاش کے ساتھ دُکھ، درد اور عجیب سے کرب کی آمیزش تھی — اور — ہمیشہ چمکتی رہنے والی ذہین آنکھوں میں دُھند چھائی ہوئی تھی۔

"میاں جی تھے—؟"

صاحباں نے بھیگی بھیگی پلکیں اُٹھائیں۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کپکپائے مگر جیسے زبان میں قوتِ گویائی نہ تھی۔ اُسے ہی رہ گئی "یہ حلیہ تو تم نے اُنہیں کا بتایا ہے—"

صاحباں کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور حارث کا لہجہ بھیگا بھیگا، ٹوٹا ٹوٹا اور بکھرا بکھرا سا تھا۔

"تھے تو وہی لیکن میرا ابھی تک یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

صاحباں نے تھکا تھکا سا سانس لے کر سر صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک دیا اور پلو سے آنکھوں کو خشک کرنے کی ہی کوشش کرنے لگی جو پھر بھیگی جا رہی تھیں۔

"وہ شخص، جسے آپ ایک بردہ فروش کہتے ہیں۔ ہاں وہی۔ پھر مجھے، اپنے مال کو، اپنے کاروبار کو، اپنے گھر لے بگر — وہ، وہ نہیں تھا—"

"ابھی ابھی تم نے خود ہی کہا ہے کہ وہ میاں جی ہی تھے اور اب کہتی ہو وہ نہیں تھے—"

حارث نے یوں چونک کر اور قدرے سٹپٹا کر اُس کی طرف دیکھا جیسے اس کی دماغی صحت پر اُسے شک ہونے لگا ہو۔

بات تو صدمے ہی کی تھی کہ جسے آج تک وہ ایک باپ کا درجہ دیتی رہی وہ دوسرا انسان نکلا۔ جسے اُس نے اپنی عزت و دین کا محافظ سمجھا تھا وہ ڈاکو لٹیرا نکلا۔ ذہن پر، دماغ پر اثر کیسے نہ ہوتا۔

"وہ بھی کہتی ہوں۔ وہ میاں جی ہی تھے۔ آپ کے میاں جی۔ مگر میرے لیے اُس وقت وہ فرشتۂ رحمت کا رُوپ لیے ہوئے تھے۔"

صاحباں ایک طویل سا سانس لیتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر پلو آنکھوں پر جا پہنچا۔ دل میں جب لاوا ہے... آتش فشاں پھٹتے ہیں تو کبھی زبان کے راستے اور کبھی آنکھوں کے راستے اُنہیں بہنا ہی ہوتا ہے۔ ورنہ سب کچھ اندر رہ جائے تو انسان کی حیات اُس میں ڈوب ڈوب جاتی ہے۔ پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ نہ روح اور نہ جسم و جاں۔

حارث نے اس کے آنسو دیکھے — خاموش ہو رہا — صاحباں جس مقام پر پہلے کھڑی تھی، وہ مقام اُس کے پاؤں سے کھسک گیا تھا۔ اب وہ کسی امیر اور باعزت خاندان کی لڑکی نہ تھی۔

لیکن — حارث کی نگاہوں میں اب بھی اس کا وُہی مقام تھا۔ یا شاید پہلے سے بھی کچھ اُونچا ہو گیا تھا — کہ کیسے حالات سے گزری مگر اس نے اپنی آبرو محفوظ رکھی — گاؤں کی ایک جاہل اور گنوار اور ناسمجھ لڑکی ہو کر بھی۔

اسی لیے — اسی لیے — وہ اسے پہلے سے بھی کہیں زیادہ، کہیں زیادہ عزیز ہو گئی تھی — وہ اُسے زندہ سلامت دیکھنا چاہتا تھا۔ آنکھوں کے راستے لاوا بہہ جانا بہتر تھا۔ اسی میں اُس کی بقا تھی۔

"میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا کہ مجھے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی کوئی شک نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ مجھے نیکی کا مجسمہ دکھائی دیے۔ انہوں نے مجھے بیٹی کی طرح اپنے پاس رکھا۔ بالکل ایک حقیقی بیٹی کی طرح—" وہ ساتھ ہی بار بار بھیگ جانے والی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ ساتھ ہی بولے جا رہی تھی۔

"انہوں نے مجھے اچھے سے اچھا کھلایا۔ اچھے سے اچھا پہنایا۔ بہترین استاد میری تعلیم کے لیے مقرر کیے۔ میرے ذہن کو دینی تعلیم سے مرصع کیا۔ میری تربیت کی—"

... وہ ایک دم ہی جذباتی ہو گئی۔

"پھر میں کیسے یقین کروں۔ کیسے یقین کر لوں کہ میاں جی — ہائے کاش! یہ سب کچھ جاننے سے پہلے میں مر گئی ہوتی۔"

"سنو صاحباں! جو کچھ ہو چکا — اب آیندہ کے متعلق سوچو۔"

"آیندہ کے متعلق —؟ آیندہ کے متعلق —؟ نہیں — میں کچھ نہیں سوچ سکتی۔"

"کیوں نہیں سوچ سکتیں — تمہیں سوچنا چاہیے —"

"میں میاں جی اور بی بی سے علیحدہ ہو کر کچھ بھی نہیں ہوں — کچھ بھی نہیں۔"

"اور میاں جی جس طرح چاہیں تمہارا سودا کر ڈالیں۔"

"نہیں نہیں — میاں جی کسی اور کے ساتھ بے شک کیسا ہی سلوک کرتے پھریں۔ لیکن میرے ساتھ — ہاں میرے ساتھ ایسا نہیں کریں گے — میں تین سال سے ان کے پاس ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تمہارے والا سودا اسی نوعیت کا ہو گاؤں کی ایک سادہ سی لڑکی کو نئے زمانے کے مطابق ڈھال کر ماڈرن بنانے سے انہیں بہت زیادہ، بہت زیادہ منافع کی توقع ہو — تبھی —"

حارث نے بڑے دُکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں یہ سب کچھ نہ سوچتا اور نہ کہنا چاہتے ہُوئے بھی اس لیے سوچ رہا ہُوں اور تمہیں کہہ رہا ہُوں کہ پہلے، میں بھی یقین نہیں کرتا تھا پھر میں نے سارے ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے۔"

حارث نے مزید رنجیدہ اور دُکھی ہوتے ہُوئے پھر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"وہ جگہ جہاں مختلف مقامات سے جوان اور خوب صورت لڑکیاں لا لا کر ٹھہرائی جاتی تھیں۔ وہ عمارت جہاں کچھ دن بالے ساتھ تم رہی تھیں۔ پھر جس جس طرح اُن کی سودے بازی ہوتی تھی اور پھر...!"

حارث لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ بوجھل آواز کو غم نے مزید بوجھل کر دیا۔ حلق میں جیسے کچھ پھنسا جا رہا تھا۔ "لیکن میرا سودا نہیں ہُوا تھا۔ میں تو خود ان کی گاڑی میں چھپی تھی۔ ہو سکتا ہے۔ میاں جی کی نیت اور ارادہ میرے لیے وہ نہ ہو، جو دوسروں کے لیے ہو سکتا تھا۔"

"کاش! ایسا ہوتا۔ لیکن میرے سامنے وہ اپنی زبان سے یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ ایسا کاروبار کرتے ہیں۔ جب اُنہوں نے بھولی بھالی لڑکیوں کو ورغلانے پھسلانے کے لیے بالی جیسی گھاگ عورتیں رکھی ہُوئی تھیں۔ جنہیں وہ بڑی سے بڑی رقومات دے کر مال حاصل کرتے تھے تو اگر ان کی گاڑی میں تم خود بخود ہی ...!"

"بس — بس — خُدا کے لیے بس کیجیے۔"

صاحباں پھُوٹ پھُوٹ کر رو دی۔ اس نے اپنے حساب سے پُوری دیانت داری کے ساتھ میاں جی کی وکالت کر ڈالی تھی۔ مگر اس کی ہر دلیل، ہر توجیہہ کا معقول ترین جواب حارث کے پاس تھا۔

حارث جو اُن کا خون تھا۔ اُن کا حقیقی بیٹا تھا۔ جو چھ سال سے بَن باس کی سزا کاٹ رہا تھا۔ جو اپنی پیاری ماں سے بچھڑ کر بیمار پڑ گیا تھا۔ وہ جھُوٹ تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اُن پر الزام تراشی تو نہیں کر سکتا تھا۔

صاحباں کو سب کچھ ماننا پڑا — میاں جی کی اصلیت تسلیم کرنا پڑی۔ دُکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں دِل ڈُوب ڈُوب گیا۔ وہ اُبھری — بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

صاحباں! اب تجھے سنجیدگی سے اپنے متعلق سوچنا چاہیے۔ اُس نے بہت ہولے سے خود کو سمجھایا۔ پھر جھُکا ہُوا سر اُٹھا کر حارث کی طرف دیکھتے ہُوئے دھیمی آواز میں بولی۔

"تو پھر — اب میں کیا کروں —؟ مجھے کیا کرنا چاہیے —؟"

حارث فرشتہ نہ تھا جو اُن کہی بات سُن کر جواب دے دیتا۔ صاحباں کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں ڈوبا ہُوا سوچ بھرے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بڑبڑایا۔

"مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ میری بی بی بھی میاں جی کی شریکِ کار بن گئیں۔"

"کیا مطلب —؟"

صاحباں کے آنسو یکایک تھم گئے۔ سٹپٹا کر، چونک کر حارث کو گھُورتے ہُوئے چلاّ سی پڑی۔

"نہیں نہیں — ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری بی بی کم از کم ایسی نہیں ہو سکتیں۔ وہ بے حد معصوم ہیں۔"

"اور ابھی میاں جی کے متعلق بھی تم اسی طرح جذباتی ہو رہی تھیں۔"

حارث کے لبوں پر زہریلی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"کبھی میں بھی اپنے باپ کے متعلق اسی طرح سوچا کرتا تھا اور اب — وہ امیج ایسا ٹوٹا کہ میں خود ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ٹوٹا بکھرا انسان کسی پر بھی اعتبار و یقین نہیں کر سکتا۔"

"کچھ بھی ہو میں بی بی کے لیے ایسی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ شک بھی نہیں —"

"میاں جی کا کہا ہے نا —؟"

"مجھے آپ پر بھی اعتبار ہے اور میاں جی کے متعلق آپ کے پاس ثبوت وغیرہ ہیں۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہُوں کہ بی بی نے کس انداز میں تمہیں اپنایا ہُوا ہے۔ سدا کے لیے یا وقتی طور پر۔"

"میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ لیکن بی بی کے لیے یہ پُورے وثوق سے کہہ سکتی ہُوں کہ اگر میاں جی کا کاروبار ہے تو بی بی اس سے بالکل لاعلم ہُوں گی وہ تو میری عزت و عصمت کی حفاظت کرتی پھرتی ہیں۔ وہ تو میری عفت و ناموس کی خاطر اپنی جُدائی بھی سدا کے لیے گلے سے لگا لینے کو تیار ہیں۔ آپ کی، جن کی خاطر دن رات آنسو بہا بہا کر انہوں نے اپنی بینائی کھو دی ہے۔"

"اوہ — تو یہ سب کچھ کیا ہے —؟ میں کیا سمجھوں —؟ میں کیا کروں —؟"

"اور حارث! یہی میں آپ سے پُوچھ رہی تھی۔ بتائیے میں کیا کروں —؟ آپ مرد تھے، آپ تو گھر سے نکل گئے۔ اور میں —"

اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھُپا لیا۔

"میں جو ایک بار پہلے بھی گھر سے نکل چکی ہُوں۔ مجھے کوئی راستہ سُجھائی نہیں دے رہا۔ پہلے والا تجربہ اتنا تلخ ہے کہ کیا وہی حماقت پھر — پھر —"

وہ یکایک خاموش ہو گئی۔ چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بھرّائی، بکھری ہُوئی آواز میں بڑبڑائی۔

مگر صاحباں! یہ تو کس گھر سے نکلنے کی بات کر رہی ہے۔ جو لڑکی ایک بار گھر سے قدم نکال لے پھر اُس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔

یہ کیا ہو گیا تیرے ساتھ —؟ یہ تُو نے اپنے آپ سے ہی کس جنم کا بدلہ لے ڈالا۔ یہ تو نے کیا کیا —؟ صاحباں! یہ تُو نے کیا کیا —؟

"صاحباں —!" حارث نے اسے پُکارا۔

"اماں! بابا! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں دُکھ دیا ہے — نا اِسی لیے اب خود دُکھ کے ایک ایک سانس کو ترس رہی ہُوں۔"

"صاحباں —! صاحباں —!"

"شاید تم دونوں ہی کی بددُعائیں میرے ساتھ ہیں۔ میں اُس گھر سے نکل کر ایسی بے گھر ہُوئی کہ پھر کوئی عزت و آبرو کا گھر تو کیا، میرے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں کہ میں خود کو وہاں محفوظ کر سکوں۔"

وہ روئے جا رہی تھی۔ بلند آواز میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔ حارث نے کتنی ہی بار اُسے پُکارا مگر وہ مجذوبوں کی طرح بولے جا رہی تھی۔

تب، پریشان ہوتے ہُوئے حارث نے اُس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ کھینچ کر چہرے سے علیحدہ کیے اور اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر انہیں بڑے زور سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"میری بات تو سُنو۔"

"کیا سُنوں —؟"

"تمہیں ایک گھر چاہیے نا۔ تمہیں ایک پناہ گاہ چاہیے نا —؟"

"ہاں — مگر —"

ایک تلخی بھرا تبسم اُس کے لبوں پر پھیل گیا۔

"یہ آپ کے بھی بس میں نہیں ہے۔ یہاں سے میاں جی آکر مجھے لے جائیں گے۔"
"کس حق سے۔؟"
"فی الحال اُسی حق سے جس حق سے اُنہوں نے مجھے اپنے گھر میں رکھا ہُوا ہے۔"
"بیٹی کے حق سے ہی نا۔؟"
"ہاں۔"
"اور اگر میں اُن کا یہ حق رہنے ہی نہ دُوں۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"
"میں تم سے شادی کر لُوں گا۔ تم بالغ ہو۔ اس طرح میاں جی کا تم پر کوئی حق نہیں رہ جائے گا۔ وہ تمہیں یہاں سے زبردستی نہیں لے جا سکیں گے۔"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟"
صاحباں نے چونک کر گھبراتے ہُوئے اُس کے ہاتھوں میں سے اپنے ہاتھ نکال لیے۔
"میں جو کچھ کہہ رہا ہُوں پُورے ہوش و حواس سے کہہ رہا ہُوں۔ میں کل ہی تم سے شادی کر لُوں گا۔"
"کل ہی۔؟ شادی۔؟"
جیسے کہ صاحباں کی سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی۔
"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔؟"
"آج ہی شادی کر لیتا۔ ابھی۔ لیکن کوئی انتظام نہیں ہے۔ اور میں پُوری عزّت کے ساتھ تمہیں ایک گھر دینا چاہتا ہُوں اس لیے۔"
حارث اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے مُتبسم ہونٹوں سے بولا۔
"اپنے دفتر کے اور محلے کے چند لوگوں کو مدعو کر دُوں گا۔ پھر سب کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہو گا۔ چار گواہ ہُوں گے تو نہ کوئی بات بنے گی اور نہ کوئی جھگڑا اُٹھتا۔"
"یہ آپ کیا کہے جا رہے ہیں۔؟ آپ نے سب کچھ سوچ سمجھ لیا ہے۔؟"
"اس میں سوچنے سمجھنے کی کیا بات ہے۔؟"
"ہے۔ ضرور ہے۔"
"لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہُوں یہی اب مُناسب ہے۔ گھر کے علاوہ اِس وقت تمہیں ایک پناہ گاہ کی بھی ضرورت ہے۔ میں مرد ہُوں۔ میں تمہیں پناہ بھی دُوں گا اور گھر بھی۔ بالکل جائز طور پر۔"
"لیکن۔ لیکن۔"
وہ سٹپٹائی۔ گھبراہٹ میں ہکلائی۔
یہ کیسی بات حارث نے کہہ دی تھی۔؟
بلاشک و شُبہ اُسے حارث سے محبت تھی۔ بے پناہ محبت۔!!
اور۔ آج کے دن سے پہلے بے شک یہ اُس کی سب سے بڑی تمنّا اور خواہش تھی۔ سب سے بڑی
مگر اب۔ جب کہ دونوں کے ماضی ایک دوسرے پر کھُلے۔ تو۔
اُس نے جانا کہ وہ اب اُس کے قابل نہیں رہی۔
آج حارث اس کی نگاہ میں پہلے سے بھی زیادہ عظیم ہو گیا تھا اور وہ خود۔
دولت کے لالچ میں آکر گھر سے بھاگ جانے والی ایک بے گھر، بے بس لڑکی۔ جو کئی ہاتھوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی۔
وہ تو حارث کی عظمت تھی، اُس کا وسیع دل تھا اور اعلاظرفی تھی کہ اُس جیسی لڑکی کو بیوی بنا رہا تھا۔
وہ انسان، جو اتنا نیک تھا۔ اتنا عظیم تھا کہ زندگی کی آسائشوں کو چھوڑ دیا مگر اُس کے غلط رُخ کو نہیں اپنایا۔

والد کے سائے سے محروم ہُوا۔ ماں کی ممتا جیسی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کو چھوڑ کر حالات کی کڑی دھوپ اور چلچلاتی دھوپ
میں جلا۔ سینے میں روگ پالا۔ دربدر کی ٹھوکریں کھائیں مگر بدی کے راستوں پر نہیں چلا۔ نیک اصولوں سے مُنہ نہیں موڑا۔
اور آج وہ اُسے اُس کی بلندیوں سے گرا کر اپنی سطح پر، اپنی پستیوں میں لے آئے۔ وہ جس نے دولت، مرتبے اور آسائشوں کے لالچ میں آکر گھر سے قدم نکال دیا تھا۔ ماں باپ کی عزّت پاؤں تلے روند ڈالی تھی۔
اُس نے گناہوں سے کنارا کرنے کی خاطر گھر سے علیحدگی اختیار کی تھی اور میں نے گناہوں میں خود کو جھونک ڈالا تھا۔ لالچ کی خاطر
وہ تو اُس کے قابل نہ تھی۔ کسی بھی طور پر نہیں۔ کسی بھی صورت نہیں۔ اِس کا اور اُس کا کوئی جوڑ، کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔
"میں اب آپ سے شادی نہیں کروں گی حارث۔!"
صاحباں کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ آواز گمبھیر تھی اور آنکھوں میں سچائی کی ایک تڑپ، ایک چمک۔
"کیوں۔؟ اب کیا ہو گیا۔؟"
حارث نے اُسے تعجب سے دیکھا۔ اب اِسے اُس کی ضرورت تھی اور اب وہ انکار کر رہی تھی۔ کیسی تھی۔
"اب حارث! آپ میں اور مجھ میں زمین اور آسمان کا سا فرق پڑ گیا ہے اور زمین آسمان کبھی نہیں ملے۔"
"یہ یکایک دو انسان، ٹھیک ٹھاک اچھے بھلے انسان، زمین اور آسمان کیسے بن گئے۔؟"
تمام تر فکروں اور پریشانیوں کے باوجود حارث کو ہنسی آگئی۔
"آپ بہت بلند ہیں حارث! اور میں۔ میں۔"
اُس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔
"میں بہت بُری ہوں۔ بے حد خراب۔ آپ جیسے نیک انسان کے قابل نہیں۔ کن کن ہاتھوں اور کن کن جگہوں سے میں یہاں تک پہنچی ہُوں۔ میں آپ کو اپنی ساری کہانی سُناتی ہوں۔۔!"
اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی حارث نے اُس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر اُسے خاموش کرا دیا۔
"بس۔ میں مزید ایک بات بھی نہیں سُننا چاہتا۔ تم اب یہیں رہو گی۔ میری پناہ میں۔ میری جائز بیوی اور اِس گھر کی مالکن بن کر۔ میں میاں جی کو اُن کے گناہ کے ارادے پورے کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔ کبھی نہیں۔"
"اور حارث! آپ نے یقین کر لیا کہ۔ کہ۔"
کچھ کہتے کہتے وہ جھجک سی گئی۔
"ہاں ہاں کہو۔ بھئی میں تمہارا دوست ہُوں۔ جو دل میں آیا ہے۔ بے تکلف کہہ ڈالو۔"
"کہ۔ میرا مطلب ہے۔ ہو سکتا ہے میں نے آپ سے جھُوٹ بولا ہو۔"
"جھُوٹ۔؟ کیسا جھُوٹ۔؟"
"یہی کہ اتنے ہاتھوں سے گزر کر بھی میں پاک دامن ہُوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں آپ سے کچھ چھُپا گئی ہُوں۔"
"جانے بھی دو!"
حارث نے انتہائی بے تکلّفی سے اسے گھسیٹ کر اپنے قریب کر لیا۔
"اب تم جیسی بھی ہو جو کچھ بھی۔ بس میری ہو۔ میں نے خُدا کو گواہ بنا کر کہہ دیا ہے۔ انشاءاللہ کل ہی ہم اس نیک بندھن میں بندھ جائیں گے کہ پھر ہمیں صرف موت ہی جُدا کر سکے گی۔"
اور۔ صاحباں اُس کے سینے میں چہرہ چھُپا کر بے تحاشا رو دی۔
وہ اس قابل نہ تھی جو کچھ پروردگار نے اُسے دے دیا تھا۔ شُکرانے کے آنسو وہ خدا کے حضور پیش کرنے لگی۔
اُس کے آنسوؤں سے حارث کی چھاتی بھیگی جا رہی تھی۔ وہ اُس کا سر سہلانے لگا اور ساتھ ہی ہولے ہولے مدھم مدھم پیار سے بڑبڑانے لگا۔

"آج سارا دن ہم آنے والے کل کی باتیں کریں گے اور تیاری کریں گے۔ اس گھر کو سنواریں گے۔ خوابگاہ میں پھولوں کی سیج سجائیں گے۔ تم میری مدد کرنا۔"

"میں تمہارے ارمان پورے کروں گا۔"

"میں تمہیں، اپنی خوب صورت دُلہن کو، پورے احترام اور وقار کے ساتھ اپنے گھر میں اپنی خوابگاہ میں اور اپنے دل میں اتاروں گا۔"

حارث کی آواز میں مستی بھی، خمار تھا، محبت بھی، سچائی اور خلوص تھا۔

صاجباں جان و دل اور تن من سے اُس میں ڈوب گئی۔

❀

"بیگم صاحبہ۔! بیگم صاحبہ۔!"

شرجانہ چیختی چلاتی، بھاگی بھاگی بی بی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

وہ کھڑکی میں کھڑی جانے باہر کیا دیکھ رہی تھیں۔

"میاں جی آگئے ہیں۔"

وہ اتنی تیزی میں تھی، اتنی عجلت میں تھی کہ بی بی کے قریب آکر رُکتے رُکتے بھی اُن سے ٹکرا گئی۔

"آگئے۔"

بی بی بوکھلا کر پلٹیں اور شرجانہ کو کندھوں سے تھام کر جلدی سے سرگوشی کے لہجے میں پوچھنے لگیں۔

"صاجباں ابھی تک نہیں آئی نا۔؟"

"نہیں۔"

ساتھ ساتھ شرجانہ نے بڑے زور سے نفی میں سر بھی ہلا دیا۔

"نہیں آئیں۔"

"مجھ سے وعدہ کرکے گئی تھی کہ ایک گھنٹے میں واپس آجائے گی۔"

بی بی متفکر نگاہوں سے شرجانہ کو دیکھنے لگیں۔ جیسے اُس سے پوچھ رہی ہوں کہ اب کیا کریں۔؟

اُن کی نگاہوں کے اِس سوال کا جواب شرجانہ کے پاس بھی نہ تھا۔ خالی خالی نظروں سے معصوم سی صورت بنائے بس اُنھیں دیکھتی ہی رہ گئی۔

"دیکھو تو اِس لڑکی نے کیا کیا۔ اُس کے میاں جی تو سب سے پہلے اُسی کا پوچھیں گے۔"

پریشانی سے اُن کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور آواز کپکپا رہی تھی۔ شرجانہ کو اَب احساس ہوا۔

"میں اُنہیں بلانے جاؤں۔؟"

"تم۔۔ تم۔۔"

بی بی نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا۔ میاں جی کے کچھ پوچھنے سے پہلے اُسے وہاں سے بُلانا بھی چاہ رہی تھیں مگر۔

ساتھ ہی اُن کے دل میں پھر ایک ہلکی سی اُمید کی کرن جگمگائی۔

صاجباں کو حارث کے پاس گئے اتنی دیر ہوگئی تھی۔ آج شاید کوئی بات بن جائے۔ پھر اِس کے بعد اُسے جانے کا موقع کب مل سکے گا۔؟

اِس سوچ کے ساتھ ہی بی بی نے اپنی بات بدل ڈالی۔ "نہیں۔ تم جاکر چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔ وہ

خود ہی آجائے گی۔"

"لیکن اگر میاں جی نے مجھ سے چھوٹی بی بی کا پوچھا تو۔؟"

جاتے جاتے شرجانہ پھر پلٹ آئی۔

"تو کہہ دینا کسی سہیلی کے گھر گئی ہے۔ میں بھی یہی کہوں گی۔"

"صاجباں! بیٹی کہاں ہو۔؟"

میاں جی کی آواز پر دونوں دروازے کی طرف لپکیں۔

"بیگم! ارے بھئی بیگم! یہ گھر کے سب لوگ کہاں چھُپ گئے۔؟"

وہ خوشگوار لہجے میں بولتے ہوئے اور ہنستے ہوئے ایک ایک کمرے میں جھانک کر اُدھر ہی چلے آرہے تھے۔

"میری بیٹی تو یقیناً مجھے ہاؤ کرکے ڈرانے کے لیے کسی دروازے کے پیچھے یا الماری کے اندر گھُسی ہوگی"

"السلام علیکم میاں جی۔"

شرجانہ جلدی سے آگے بڑھی اور اُن کے سامنے گردن جُھکا کر کھڑی ہوگئی۔

"وعلیکم السلام۔ ٹھیک تو ہونا شرجانہ۔؟"

اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ چند قدم پرے کھڑی بی بی کی طرف دیکھنے لگے۔

"میری بیٹی ابھی تک دِکھائی نہیں دی۔"

"وہ۔۔ وہ۔۔" جھوٹ بولتے ہوئے بی بی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔؟"

میاں جی نے گھبرا کر بیوی کی گھبراہٹ اور ہکلاہٹ کو دیکھا۔

"وہ میاں جی! چھوٹی بی بی اپنی سہیلی کے ہاں گئی ہیں۔ زرقا بی بی کے گھر۔"

شرجانہ جلدی سے بی بی کے بجائے جواب دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تاکہ ان کے لیے چائے کا بندوبست کرے۔ اُس کا انداز بالکل نارمل تھا۔ وہ مطمئن سے ہوکر مُسکرا پڑے۔

"یہی بات بتانے سے تم اتنا کیوں سٹپٹائی جا رہی تھیں۔ سہیلیوں کے ہاں آنے جانے پر میں نے کوئی پابندی کبھی لگائی ہے اُس پر۔؟"

"اوہ نہیں۔ دراَصل اُس کی سہیلی کا نام نہیں یاد آرہا تھا وہ سوچ رہی تھی۔"

"ہماری بیگم کی آدھی زندگی گزر گئی مگر یہ نام بھولنے والی عادت نہ گئی۔"

اُنھوں نے بڑے پیار سے بڑے لاڈ سے اپنی گھبرائی گھبرائی حسین بیوی کی طرف دیکھا۔ بی بی خود پر پڑنے والی اُن کی نگاہوں کی گرمی سے سُرخ ہوگئیں۔

"ارے بھئی اتنا لمبا سفر طے کرکے آئے ہیں۔ ہمیں بیٹھنے کے لیے کوئی نہیں کہے گا۔"

میاں جی بڑھ کر خود ہی بی بی کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "ہماری بیٹی گھر میں ہوتی تو ہمارا استقبال یقیناً اِس سے بہت بہتر ہوتا۔"

اُنھوں نے پھر مُسکرا کر بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکی تھیں شاید۔ گردن جُھکائے کھوئی کھوئی سی کھڑی سوچ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بیگم۔! تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو۔؟"

"نہیں نہیں۔"

بی بی نے چونک کر سر اُٹھایا۔

"پچھتا رہی ہوں کہ صاجباں کو جانے کی اجازت کیوں دی؟"

وہ پھر اسی طرح گھبرائی گھبرائی سی بولیں۔

"ذہن میں رہا ہی نہیں تھا کہ آپ آج آرہے ہیں۔"

بی بی اُس کے جانے کا کوئی مضبوط و مستحکم جواز پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر یہ احساس مزید کچھ کہنے پر مجبور کر رہا تھا کہ شاید اُن سے کوئی پائدار بات نہیں بن رہی تھی۔ "ویسے ذہن میں رہتا بھی تو میں اُسے روک نہیں سکتی تھی۔ اس کا جانا ضروری تھا۔ آپ کو تو یہیں رہنا تھا۔ اور اُس کی سہیلی۔ وہ شاید اُسے پھر نہ مل سکتی۔"

ایک لمحہ کے توقف کے بعد پھر عجلت سے بولیں

"یوں بھی آپ نے خود ہی تو کہا ہُوا ہے کہ اُس کی کوئی خواہش رَد نہ کی جائے۔"

"تو میں کب تمھیں کچھ کہہ رہا ہُوں بیگم ــــ! اچھا کیا بلکہ بہت اچھا کیا اُسے بھیج دیا۔ پہلے پہلے سب سہیلیاں دَہیلیوں سے مِل مِلا کر پھر میری بیٹی میرے لیے فارغ تو ہُو جائے گی نا۔"

"ہاں ہاں ــــ بس اسی لیے میں نے اُسے اجازت دے دی تھی۔"

میاں جی کی بات پر اطمینان کا سانس لیتے ہُوئے بی بی اُن کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"تم دونوں ٹھیک ٹھاک تو رہیں۔؟"

میاں جی نے تکیے سے سر لگا کر نیم دراز ہُوتے ہُوئے آنکھیں مُوند لیں۔

"بالکل ــــ ہم دونوں تو بالکل ٹھیک رہیں ــــ وہ ــــ!"

اور اپنی بات نامکمل چھوڑتے ہُوئے بے حد گھبرا کر وہ میاں جی کی بند آنکھوں کی طرف دیکھنے لگیں۔

یہ ابھی وہ کیا کہنے جا رہی تھیں۔ میاں جی نے اُن دونوں کا حال پوچھا تھا اور اُن کے دماغ پر صبح سے حارث کی بیماری سوار تھی۔ جس کے متعلق صاجباں نے اُنھیں بتایا تھا اور جو اب ٹھیک بھی ہُو چکی تھی۔

مگر ــــ وہ ماں تھیں نا ــــ ایک لمحے کے لیے اُس کا خیال ذہن سے ہٹ نہیں رہا تھا۔

"بس وہ کیا ــــ؟"

آنکھیں بند تھیں اس لیے میاں جی بی بی کی گھبراہٹ اور سٹپٹاہٹ تو نہ دیکھ سکے لیکن کان کُھلے تھے اور جُملہ اَدھورا اُترا تھا اُن میں ــــ انتظار کر کے آخر پُوچھ ہی بیٹھے۔ "وہ ــــ وہ ــــ بس ایک دن ذرا صاجباں کی طبیعت خراب ہُوئی تھی ــــ"

اُنہیں صاجباں کا پیٹ کا دَرد یاد آگیا۔ جلدی سے اُسی کا سہارا لیا۔

"کیوں ــــ؟"

میاں جی آنکھیں کھولتے ہُوئے جلدی سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"کیا ہُوا تھا میری بیٹی کو ــــ؟"

"پیٹ میں دَرد تھا ــــ"

"پیٹ میں دَرد ــــ؟ کِس قِسم کا ــــ؟ اُس نے تو کھانے میں کبھی کوئی بدپرہیزی نہیں کی کہیں کوئی خطرناک معاملہ . . ."

"اُو ہو نہیں۔" بی بی نے جلدی سے اُن کی بات پُوری ہونے سے پہلے ہی اُن کی پریشانی رَفع کر دی۔

"اُس نے بدپرہیزی نہیں کی تھی میں نے اپنی محبّت سے مجبور ہو کر اُسے کرا دی تھی۔"

"بس ــــ وہاں مجھے یہی ڈر رہتا تھا۔"

میاں جی نے پھر اُسی طرح نیم دراز ہو کر آنکھیں میچ لیں۔

"تمھاری محبّت کہیں اُس کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنے۔"

"اور آپ کو تو جیسے اُس سے پیار ہی نہیں ہے۔"

بات بن گئی تھی بی بی کے چہرے پر اطمینان بھری مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے ہے ــــ تم سے زیادہ ہی ہو گا لیکن تمھارے جیسا بیوقوف نہیں ہُوں کہ بس سارا کھلانے پلانے میں نکال دُوں۔"

"بیگم۔! میری بیٹی میرے جیسی کم خوراک ہے۔ تم اُس سے پیار محبّت ضرور کرو مگر مجبور کر کے کِھلانے پلانے

الے پیار سے ذرا پرہیز ہی کر لیا کرو تو بہتر ہے۔"

جواب میں بی بی بھی کوئی اِسی انداز کی شوخی بھری، تیکھی سی بات کہنے ہی لگی تھیں کہ شرجانہ چائے کی ٹرالی لیے اندر آگئی۔

"آپ کے لیے خاص چائے بنائی ہے میاں جی۔"

وہ عادت کے مطابق کِھی کِھی ہنستے ہوئے بولی۔

"تمہاری خاص چائے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے پھر بھی میری بیٹی کی عام چائے جیسی بھی نہیں بنی۔"

میاں جی ہنستے ہُوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور شرارت سے شرجانہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ نے تو میاں جی پینے سے پہلے ہی فیصلہ سُنا دیا۔ اب اچھی بھی ہُوئی تو آپ کو کہاں اچھی لگے گی۔"

"میرے لیے اور تو... ! اچھی بنائے گی ــــ ؟ تو تو صرف اپنے کبیر خاں کے لیے اچھی چائے بنایا بنا ہے۔"

"نہیں نہیں میاں جی ! ایمان سے نہیں۔ اُس کو تو میں پُوچھتی بھی نہیں ــــ"

شرجانہ شرماتے لجاتے اور سر جُھکاتے ہُوئے بولی۔

"ارے ! کیا کہا ــــ؟ کبیر خاں کو پُوچھتی بھی نہیں ــــ کیا اِتنی جلدی تمھارا پیار ختم ہو گیا۔؟"

"وہ ــــ وہ میاں جی ــــ یہ بات نہیں ــــ"

"ہائے ہائے بے چاری کو کیوں پریشان کیے دے رہے ہیں۔"

بی بی کو اُس کی حالت پر ترس آگیا۔

"جاؤ شرجانہ ! تم کھانے کا بندوبست کرو۔ کبیر خاں بازار سے ہو آیا۔؟"

"جی ہاں ــــ جی ہاں بیگم صاحبہ ــــ سب کچھ لے آیا ہے۔"

"تو جاؤ پھر ــــ میں ابھی آتی ہوں ــــ"

بی بی کی اجازت پاتے ہی شرجانہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہُوئی۔

"ایک تو آتے ہی بیٹی نے گھر سے غائب ہو کر ہمارے لیے بے رونقی کر دی ہے اور سِتم بالائے سِتم اب بیگم ل باورچی خانے میں جا گھسیں گی۔ میرا خیال ہے چائے کی یہ ایک پیالی ختم کریں اور واپسی کا راستہ لیا ــــ"

میاں جی کی بڑبڑاہٹ پر بی بی ہنس پڑیں۔

"چائے تو پیجیے بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔"

"تمہیں کیا پتا یہ دِن میں نے کیسے گزارے ہیں۔ سارا دن تو خیر کاروبار کی مصروفیت ہوتی تھی۔ البتّہ رات کو جب گھر آتا تھا تو پھر کچھ پُوچھو نہیں۔"

چائے کی پیالی ختم کر کے میاں جی نے بی بی کے ہاتھ میں تھما دی

شادی کے بعد تم ہمیشہ پاس رہیں اور اب پچھلے دو تین سال سے صاجباں کی رونق تھی۔ تم دونوں کے بغیر رات کھانے کو دوڑتا رہا۔ بڑی مشکل سے وقت گزُرا ہے۔"

"پھر اولاد کی خوشیاں تو اسی طرح چھوٹی چھوٹی قربانیاں دے کر مَن کو مار کر ہی پُوری کی جاتی ہیں۔"

"ہاں یہ تو دُرست ہے۔ ایک اُسی کی خوشی کی خاطر تو میں نے بھی اجازت دے دی تھی ورنہ میرا دل کب بنتا تھا۔ ؟ وہ ایک منٹ کے لیے بھی نگاہوں سے اُوجھل ہو"

"بیٹی پرایا دَھن ہوتا ہے۔ جوان ہے۔ شادی کی عمر ہے۔"

"ہاں ــــ وہ تو میں جانتا ہوں ــــ"

"اور جب شادی ہو جائے گی۔ اپنے گھر چلی جائے گی پھر۔ پھر کیا کریں گے ــــ؟"

"پھر ــــ؟ ہاں سوچنے والی بات ہے"

میاں جی مغموم سے ہو گئے۔

"پتا نہیں اس لڑکی کے وجود میں کیا ہے۔ ایسا کوئی خیال بھی دل میں آئے تو برداشت نہیں ہو پاتا۔ واقعی بیگم! صاحباں اپنے گھر چلی گئی تو پھر ہم کیا کریں گے۔ بیٹی تو کبھی بادشاہ کی بھی گھر میں نہیں رہی۔"

"چلیں اس وقت یہ ذکر چھوڑیں۔ خود میرا دل ہَول کھانے لگتا ہے۔"

بی بی نے اُٹھ کر برتن سمیٹتے ہوئے ٹرالی میں رکھنا شروع کر دیے۔ میاں جی چُپ سے ہو گئے تھے۔ بی بی نے بھی انہیں مخاطب نہیں کیا۔

صاحباں کے معاملے میں ہمیشہ وہ ایسے ہی جذباتی ہو جایا کرتے تھے۔ ایسا پیار آج تک بی بی نے کسی باپ بیٹی میں نہیں دیکھا تھا جیسا میاں جی صاحباں سے کرتے تھے۔

صاحباں۔ جو اُن کی مُنہ بولی بیٹی تھی۔ اگر اپنی ہوتی تو پھر نجانے کیا کرتے۔ بی بی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

خدا نے دی تو تھی مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ نصیب میں نہ تھی۔ نہ وہ اور اُس کا پیار اور نہ ایسی خوشیاں۔

کیسا عجیب مقدر لے کر وہ اس دنیا میں آئی تھی۔ اپنی کوکھ کا پیار نصیب میں ہی نہ ہُوا۔ خدا نے دونوں چیزیں دیں لیکن ۔۔۔ دونوں ہی چھین لیں۔

"اچھا صاحباں! خُدا تجھے خوش ہی رکھے اگر پرائی آگ تاپنا ہی اپنی تقدیر میں لکھا گیا ہے تو یہی سہی ۔۔۔ پروردگار! اس حال میں بھی خوش ہیں اور تیرے شکر گزار ہیں۔"

بی بی کی سوچوں نے ایک لمحے کی فرصت دی تو نگاہ اُٹھا کر میاں جی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید سو گئے تھے۔ بہت آہستہ سے ٹرالی کھینچتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ گو گھر میں ملازموں کی کبھی کمی نہ رہی تھی مگر باپ اور بیٹی کو بی بی نے کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھ سے بنا کر کھلایا۔

دو تین مہینوں بعد شوہر نے ان کے ہاتھ کا کھانا کھایا تھا۔ آپ ہی آپ بڑے اہتمام اور توجہ سے مصروف ہو گئیں۔ کسی فرض سے غافل ہونا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میاں جی نے غسل وغیرہ کیا۔ کھانا کھایا۔ اِدھر اُدھر گھومے۔ گھر اچھی طرح دیکھا۔ کتنی دیر بیٹی کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھے۔ پھر کھڑکیوں میں سے باہر کا نظارہ کرنے لگے۔ گھر کا محل وقوع کیسا تھا۔ کچھ اس پر غور کیا۔

مگر۔ صاحباں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ انہیں آئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ اُلجھن سی ہونے لگی۔ بیگم سے بات کرنا چاہی۔ وہ غائب تھیں۔ شاید رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی تھیں۔ گھر میں بھی ان کا یہی طریقہ تھا۔ زیادہ وقت باورچی خانے میں ہی کاٹتی تھیں ۔۔۔ مگر ۔۔۔

وہاں تو وہ سارا دن یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے کے لیے گھر میں نہیں ہوتے تھے۔ شام کو جب کاروباری مصروفیات سے ہو کر آتے تھے تو صاحباں موجود ہوتی تھی۔ اپنی باغ و بہار شخصیت اور شگفتہ شگفتہ مُسکراہٹوں اور چمکتی چمکتی خُوب صورت آنکھوں سمیت سامنے آ جاتی، سارے دن کی اپنی مصروفیات بتاتی، اُن کی پُوچھتی تو کوئی دُوسرا احساس باقی ہی نہ رہتا۔

کب بیگم باورچی خانے سے نکلیں اور کب پھر جا گھسیں۔ سوچنے کا موقع ہی نہ ملتا۔

اور آج کا سارا دن ۔۔۔ کیسی بے سروسامانی میں گزرا تھا۔ کیسا بے کار اور فضول گزرا تھا ۔۔۔ ایسا دن تو زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔

اُلجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ قدموں کی چاپ پر صاحباں کو دیکھنے کی توقع میں نگاہیں اُٹھائیں ۔۔۔ بی بی اپنے دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے چلی آ رہی تھیں۔

"صاحباں کو میری آمد کا علم نہیں تھا ۔۔۔؟"

قدرے تلخ ہو کر پوچھنے لگے "علم کیوں نہیں تھا؟"

بے خیالی میں اتنا ہی کہنے کے بعد بی بی یکایک گڑبڑاتے ہوئے خود ہی اپنے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی تردید کرنے لگیں۔

"نہیں ۔۔۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ مجھے بتانا یاد ہی نہیں رہا تھا۔"

بی بی نے ساری بات اپنے سر لینے کی کوشش کی اندر ہی اندر پریشان خود بھی بہت تھیں۔ صبح سے شام ہونے کو تھی اور صاحباں ابھی تک نہیں آئی تھی۔

سب کچھ میاں جی سے چوری چھپے ہوا تھا انہیں کچھ بتا بھی نہ سکتی تھیں اور اپنی پریشانی چھُپانا بھی مُشکل ہو رہا تھا کیسی مشکل میں ہوئی تھیں۔

اولاد کی ممتا بھی عجیب جذبہ ہے۔ وہ بی بی جنہوں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ کبھی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اب سب کچھ کر رہی تھیں "بھلا یہ بھی کوئی بھولنے والی بات تھی بیگم! کمال ہے۔"

میاں جی اُلجھے اُلجھے سے کھوئے کھوئے سے پھر بولے۔

"کیا ان دو تین مہینوں میں میری حیثیت بدل گئی ہے ۔۔۔؟"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ۔۔۔؟"

"تو اور کیسی کروں۔ تم جانتی ہو مجھے اس سے کتنا پیار ہے۔ میں جو صبح سے شام تک اس کے بغیر اداس ہو جاتا ہُوں اور آج دو تین مہینے ہو گئے اس کی شکل دیکھے ہوئے۔"

وہ اُٹھ کر بڑی تیز رفتاری سے کمرے میں ٹہلنے لگے "کیا کیا سوچ کر آیا تھا۔ یوں ماں بیٹی میرا استقبال کریں گی۔ صاحباں مجھ سے لپٹ جائے گی۔ میں شرارت سے پیچھے دھکیلوں گا وہ جھپٹی چلی جائے گی۔ میں جھوٹ موٹ روٹھوں گا کہ اتنے دن خط بھی نہیں لکھا۔ فون بھی نہیں کیا اور وہ ۔۔۔"

میاں جی ٹہلتے جا رہے تھے اور بڑبڑاتے جا رہے تھے۔ جانے کیا کیا ۔۔۔ آخر میں ان کی بڑبڑاہٹ صرف ہونٹوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ اب بی بی کو کچھ سُنائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن نظارہ وہی سامنے تھا۔

اسی لمحے شرجانہ کچھ پُوچھنے کے لیے اندر آئی تو بی بی نے اشارے سے اسے پاس بُلایا۔ میاں جی ٹہلتے ٹہلتے کھڑکی میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی پشت اِدھر تھی اور رُخ پرلی طرف۔

"سُنو"

موقع غنیمت جانتے ہوئے بی بی شرجانہ کے کان میں عجلت سے کہنے لگیں۔

"تم جا کر صاحباں کو بلا لاؤ۔ اس کے میاں جی کا پارہ چڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو پیمانہ لبریز ہو جائے تو ہم پر ہی چھلک پڑے۔"

"میں خود جاؤں ۔۔۔؟"

شرجانہ نے اسی طرح سرگوشی کے سے انداز میں پُوچھا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے کبیرے کو بھیج دو۔ غصّے میں ہیں جانے کب تمہیں آواز دے ڈالیں۔"

"جی بہت اچھا۔"

شرجانہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

"بیگم! وہ سامنے نیچے کون رہتے ہیں ۔۔۔؟"

میاں جی اب شاید پُرسکون ہو چکے تھے۔ بالکل نارمل آواز میں پوچھ رہے تھے۔

"کہاں ۔۔۔؟"

بی بی اُٹھ کر ان کے پاس کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔

"وہ سرمئی پتھروں والی چھوٹی سی کاٹیج۔"

ان کا اشارہ حارث کے گھر کی سمت تھا۔

"وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔؟"

بی بی پیلی پڑ گئیں۔ پھر بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ بڑی احتیاط سے اور بہت سوچ سمجھ کر جھوٹ بولا "معلوم نہیں۔ میں تو جب سے آئی ہُوں گھر سے نکلی ہی نہیں۔"

"کہیں بھی نہیں گئیں ۔۔۔؟"

میاں جی نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"نہیں۔"

پھر یکایک بی بی نے ان کا بازو تھام لیا۔

"کھڑکی میں کھڑے دوسرے لوگوں کے گھروں کو کیوں دیکھ رہے ہیں۔"

بڑی خوب صورتی سے بی بی گفتگو کا موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

"آیئے اِدھر بیٹھیے اور مجھے میرے گھر کے متعلق بتائیے۔"

بی بی انہیں کھڑکی سے پرے ہٹا لے گئیں۔

کبیرے نے صاحباں کو بُلانے جانا تھا تو اِدھر سے ہی گزرنا تھا اور اسی گھر میں جانا تھا۔

وہاں سے میاں جی کو ہٹا کر بی بی ان کے ساتھ اپنے گھر، گھر کی چیزوں، ملازمین، ہمسایوں اور ملنے ملانے والوں کے متعلق گفتگو کرنے لگیں۔

اسی موضوع پر بی بی نے میاں جی سے ڈھیر ساری باتیں کر ڈالیں۔ اتنے سوالات کیے کہ ان کے جوابات میں میاں جی اس قدر منہمک ہو گئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔

"بیگم! صاحباں ابھی تک نہیں آئی۔"

باتیں کرتے کرتے اچانک ہی ان کا ذہن پھر اُدھر گھوم گیا۔ اندر ہی اندر پریشانی بی بی کو بھی لگی ہوئی تھی لیکن ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔

"آجائے گی۔ اسے رات کا کھانا کھا کر آنا تھا۔"

بی بی نے کلاک پر رات کے آٹھ بجتے دیکھے تو جلدی سے بولیں۔ لیکن۔ کلاک نے تو صرف آٹھ بار ٹن ٹن کیا تھا مگر ان کے دل پر جیسے کوئی ہتھوڑوں سے مسلسل ابھی ضربیں لگائے جا رہا تھا۔ لگائے جا رہا تھا۔

آخر ہوا کیا تھا۔ صاحباں کو حارث کے گھر گئے بارہ چودہ گھنٹے بیت چکے تھے۔ اسے پتا بھی تھا کہ میاں جی آنے والے ہیں پھر بھی وہ ابھی تک کیوں واپس نہیں آئی تھی۔ کیوں واپس نہیں آئی تھی۔؟؟

کیا ہو گیا تھا اسے۔؟ کیسا واقعہ پیش آگیا تھا۔؟ جوان بیٹی تھی۔ خوب صورت بھی بہت تھی۔ مگر۔ ادھر اپنی کوکھ سے پیدا ہوئے بیٹے پر بھی اتنا اعتماد ضرور تھا، اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔

پھر۔؟ پھر یہ سب کچھ کیوں ہو گیا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دماغ ماؤف سا ہوا جا رہا تھا۔ سوچیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ لیکن۔

اتنا ہوش ابھی تھا کہ میاں جی کو کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر ٹالے جا رہی تھیں اور وقت تھا کہ گزرا جا رہا تھا۔ کچھ اور گزر گیا تو پھر بات بنائے بھی نہ بنے گی اور ٹالے بھی نہ ٹلے گی۔

"وہ بھی رات کا کھانا کھا کر آئے گی ہم بھی اتنی دیر کھانے سے فارغ ہو جائیں۔"

بی بی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ کھانے میں ہی مصروف ہو کر کچھ اور وقت گزر سکتا تھا۔ شاید اتنی دیر میں صاحباں آجائے۔

"صبح جب میں آیا تھا اس وقت تو تم نے یہی کہا تھا کہ ابھی آجائے گی اور اب کہہ رہی ہو رات کا کھانا کھا کر آئے گی!"

میاں جی قدرے جھنجھلا کر بولے۔

"ارے! صبح میں نے یہ کہا تھا۔؟ مجھے تو یاد نہیں رہا۔"

"بیگم! یہاں آکر تمہارا حافظہ کچھ خراب ہو گیا ہے۔"

"یہاں آکر۔؟"

بی بی ہنس پڑیں۔

یہاں آکر تو ان کی سارے حواس بیدار ہوئے تھے۔ میاں جی کیا جانیں مامتا کِسے کہتے ہیں۔ باپ کا دل تو اتنا ہی ہوتا ہے کسی بات پر جھگڑا کیا اور بیٹے کو گھر سے نکل جانے دیا اور اب چھ سال سے جُدا ہیں اور خوش ہیں۔

آپ کی جگہ میں ہوتی میاں جی! ایک ماں۔ ایک چھوڑ لاکھ جھگڑے ہو جاتے۔ یوں بیٹے کو گھر سے کبھی نہ نکلنے دیتی۔ . . اس کے قدموں سے لپٹ کر اپنی مامتا کو اس کے پاؤں کی بیڑیاں بنا دیتی۔ مگر اکلوتی اولاد کو اپنے سے جُدا کبھی نہ ہونے دیتی کبھی نہ ہونے دیتی۔ مر جاتی۔ میری لاش پر سے گزر کر چلا جاتا مگر جیتے جی کبھی نہ جانے دیتی۔ کبھی نہیں۔

اور جُدائی کا وہی زہر جو چھ سال سے قطرہ قطرہ میرے اندر ٹپک رہا ہے۔ اسی نے مجھے آج اس حالت کو پہنچایا ہے۔ حافظہ آپ کو خراب لگ رہا ہے اور میں ایک جھوٹ اور دھوکے کا کھیل بقائم ہوش و حواس آپ کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔

بی بی ــــ سوچتے سوچتے اچانک زور سے ہنس کر بولیں۔

"یہاں آکر حافظہ کیا خراب ہونا تھا۔ سیدھی سی بات ہے عمر کا تقاضا ہے۔"

اندر کی ساری باتیں اندر دبا کر بی بی نے میاں جی کی بات کا جواب دیتے ہوئے انہیں کھانے کے کمرے میں چلے آنے کا کہا اور باورچی خانے میں جا گھسیں۔

"شرجانہ!"

تیز تیز آئی تھیں پھولے ہوئے سانس سے بولیں۔

"اتنی دیر ہو گئی صاحباں نہیں آئی۔ میں نے تمہیں کہا تھا۔ کبیر خان کو بھیج کر پتا کرو۔"

"کبیر خان کو تو اسی وقت بھیج دیا تھا بیگم صاحبہ۔!"

"پھر۔؟" بی بی تشویش سے بولیں۔

"وہ پھر بھی نہیں آئی۔ کیا ہو گیا اسے۔؟ اسے میاں جی کا بتایا تھا اس نے کہ وہ اس سے ملنے کو کتنے بے چین ہیں۔"

"جی وہ تو کبیر خاں کو ملی ہی نہیں۔"

"کیا مطلب۔؟"

"دروازہ بند تھا۔ کبیر خان نے جا کر کھٹکھٹایا تو حارث میاں باہر نکلے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا چھوٹی بی بی وہاں ہیں ہی نہیں۔"

"نہیں ہے۔؟ یہ کیا کہہ رہی ہو شرجانہ۔؟"

بی بی کا پورا وجود لرز اُٹھا۔ دل تھام کر وہیں چولھے کے سامنے والے اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ ٹانگوں میں جیسے اتنی طاقت ہی نہ تھی کہ پورے جسم کا بوجھ اُٹھا سکتیں۔

"تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا۔؟"

بی بی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شرجانہ کو دیکھا۔ آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی بے بسی تھی ان میں۔ شرجانہ ان کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ نظریں جھکاتے ہوئے ہولے سے بولی۔

"آپ اس وقت میاں جی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے کیسے بتاتی۔؟"

"میرا خیال ہے شرجانہ! کبیرے نے ٹھیک طرح پوچھا نہیں ہوگا۔ صاحباں ادھر ہی گئی تھی اور مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔"

بی بی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوا جا رہا تھا۔ آنکھیں چھلک پڑنے کو تیار تھیں مگر میاں جی کے خوف سے اندر ہی اندر ان آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ہائے ہائے اب میں اس کے میاں جی کو کیا جواب دوں گی۔ صبح سے شام ہو گئی۔"

"بیگم صاحبہ! میں خود جا کر پتا کروں۔؟"

"جب کبیر خاں کہتا ہے حارث نے بتایا ہے وہ وہاں نہیں ہے تو پھر۔ پھر تم وہاں جا کر کیا کرو گی۔"

"میرا خیال ہے وہ وہیں ہیں۔"

"کیا مطلب۔؟ حارث نے جھوٹ بولا ہے۔"

بی بی تو ایک دم ہی بھڑک اُٹھیں۔

"نہیں نہیں۔ میرے بیٹے نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ جھوٹ بولا ہے۔"

شرجانہ، بی بی کی اُلجھی بکھری حالت کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے انتہائی نرمی سے کہنے لگی۔

"شاید کوئی معاملہ ہو۔ کوئی بات ایسی ہو گئی ہو۔"

"کیسا معاملہ۔؟ کیسی بات۔؟"

"بیگم صاحبہ! مجھے ہر بات کا علم ہے۔ چھوٹی بی بی کے آپ کے سارے رازوں سے واقف ہوں۔ آپ بھروسہ رکھیں میں سارے معاملات کو سمجھتی ہوں۔ پوری رازداری سے جاؤں گی اور معلوم کر کے آتی ہوں کہ . . ."

"ہاں ہاں۔" ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انہوں نے اس کی پوری بات بھی نہیں سنی۔ یکدم ہی جیسے مرتے مرتے جی اُٹھیں

"جاؤ۔ تم خود جا کر اس کا پتا کرو۔ اور اگر وہ وہیں ہے تو معلوم کرو کہ ابھی تک آئی کیوں نہیں۔"

بی بی خود کو سنبھالتے ہوئے اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"تمہارے میاں جی تو کھانے والے کمرے میں بیٹھے کھانے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اتنی دیر کھانا نکال کر کر سے میز لگواتی ہُوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔۔ اور میں بس دو منٹ میں آئی۔"

شرجانہ چٹکی بجاتے ہُوئے بھاگی۔

بی بی کھانا لگوا کر فارغ ہوئی ہی تھیں کہ شرجانہ واپس بھی آگئی۔

"بیگم صاحبہ۔۔!"

شرجانہ کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

"حارث صاحب وہ، میرا مطلب ہے چھوٹے صاحب، وہ کہتے ہیں چھوٹی بی بی ان کے گھر نہیں ہیں، لیکن۔"

پھر وہ بی بی کے بالکل قریب ہو کر بہت رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"دوسرے کمرے سے مجھے چوڑیوں کی کھنک سُنائی دی تھی اور میں یہ بھی جانتی ہُوں کہ وہاں وہ اکیلے رہتے ہیں۔ کوئی عورت ان کے گھر نہیں۔"

"تم اندر چلی جاتیں۔"

بی بی کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی مگر وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا مگر۔۔"

"مگر کیا۔۔۔؟"

اس کے ادھورے جملے نے بی بی کو بے چین کر دیا۔

"مگر بیگم صاحبہ! وہ دروازے میں ہی بازو پھیلائے، دونوں کواڑوں کو پکڑے کھڑے مجھے یُوں جواب دیتے رہے جیسے وہ جانتے تھے کہ میں اندر جانے کی کوشش کروں گی۔"

"پھر بھی تم نے کوشش نہیں کی۔؟"

"جی ہاں۔ ساتھ ہی ان کا انداز یہ بتا رہا تھا کہ وہ میری اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ پھر میں زبردستی اندر کیسے گھس سکتی تھی۔"

"زبردستی کی بات ہے۔ ہماری لڑکی کا، ہماری عزت کا معاملہ ہے۔"

بی بی کو اب جوش آگیا۔

"تمہیں اسے دھکا دے کر بھی اندر چلے جانا چاہیے تھا۔"

"بیگم صاحبہ! میں ٹھہری عورت ذات۔ ایک مرد کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتی تھی نا۔ اور پھر یہ معاملہ تو خاموشی سے عقلمندی سے سُلجھانے والا ہے۔ شور شرابہ کرنے سے عزت جانے کا ڈر ہے۔"

"ہائے! یہ کیا ہو گیا شرجانہ۔۔؟ کیوں ہو گیا۔۔؟ اب کیا ہو گا۔۔؟"

بی بی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"یا میرے مولا تو ہی میری عزت کا رکھوالا ہے۔"

بیگم۔۔!" میاں جی نے کھانے والے کمرے سے آواز دی۔

"بیٹی اور بیوی کے پاس آ کر بھی میں اکیلا ہی کھانے کی میز پر بیٹھا ہُوا ہُوں۔"

"آئی۔۔ بس میں ہاتھ دھو لوں۔"

بی بی نے اپنی آواز کی تھرتھراہٹ کو بڑی مشکل سے چھپایا مگر اوسان کسی طرح بھی بحال نہیں ہو رہے تھے۔

"لیجیے۔ آ گئی۔"

فق چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے اور لرزتے کپکپاتے وجود کو سنبھالتے ہُوئے، گھسٹتے ہُوئے جا کر ان کے سامنے والی کُرسی پر بیٹھ گئیں۔ حالت لمحہ بہ لمحہ غیر ہُوئی جا رہی تھی۔

"یہ لو۔"

میاں جی نے سالن والی ڈش ان کی طرف بڑھائی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

بی بی نے نگاہیں جُھکا کر اپنی حالت ان سے چھُپاتے ہُوئے جواب دیا۔

"ہُوں۔۔؟" میاں جی مُسکرا دیے۔ بڑی بے جان سی مسکراہٹ تھی ان کی۔ یا شاید بی بی کو ہی محسوس ہُوئی تھی۔

"میری بھوک تو صاحباں نے اُڑا دی بیگم! تمہیں بھلا کیوں نہیں۔؟"

"کیا۔؟ صاحباں نے اُڑا دی۔؟"

بی بی ایک دم گھبرا اُٹھیں۔ کیا انہیں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔؟

"آپ کو کس نے بتایا۔؟"

گھبراہٹ میں ان کی آواز لرزی اور ہونٹ کپکپا سے گئے۔

"مجھے کس نے بتایا۔؟ کیا۔؟"

میاں جی نے حیرت سے بی بی کی طرف دیکھا۔

"صاحباں کے متعلق۔"

"صاحباں کے متعلق۔؟"

میاں جی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا صاحباں کے متعلق۔؟"

"آپ کہہ رہے تھے نا۔ اس نے بھوک اُڑا دی۔"

"دو تین مہینے کی جُدائی کے بعد سب سے زیادہ ارمان اسے ہی ملنے کا تھا۔ مگر وہ نہیں دکھائی دی۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا۔ اور تم۔ تم، بیگم۔۔ تم کس معاملے کے متعلق کہہ رہی تھیں۔؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

اب بی بی کو کچھ ہوش آیا۔

"میں بھی یہی کہہ رہی تھی۔ بالکل یہی۔"

"کوئی بات ہے بیگم! جو تم مجھ سے چھُپانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

میاں جی نے غور سے بی بی کے یکایک زرد پڑ جانے والے چہرے اور میز پر دھرے ان کے لرزتے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

"نہیں نہیں۔"

چہرہ تو فق تھا ہی ہونٹوں پر پھیلی زردی اور کپکپاہٹ بھی بڑی واضح تھی۔

"آپ سے کیا چھُپاؤں گی۔"

آواز کا ارتعاش بھی کئی راز عیاں کر رہا تھا۔

"واقعی نہیں چھُپ سکتیں۔ تمہارا فق چہرہ، ہونٹوں پر پھیلی زردی، یہ تمہارا لرزتا کپکپاتا وجود اور مرتعش لہجہ مجھے کوئی اشارہ دے رہا ہے۔"

میاں جی کا لہجہ یکایک سنگین ہو گیا۔

"مجھ سے مت کچھ چھُپاؤ اور نہ ہی مزید میرے صبر کا امتحان لو۔ صاحباں کو میں نے اولاد سے بڑھ کر چاہا ہے اور اس معاملے میں میں بہت کمزور ہُوں۔"

"وہ۔۔ وہ۔"

بی بی ہکلائیں۔ میاں جی کی غصّہ اور پریشانی سے بھری نگاہیں بی بی کے لرزیدہ وجود پر جمی تھیں۔

"وہ۔۔ وہ۔۔ وہ حارث۔۔ وہ صاحباں۔"

خوف کے مارے وہ ہکلا ہکلا کر رہ گئیں۔ مزید کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔ وہیں میز پر پیشانی ٹکائی اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ اور پھر اسی عالم میں روتے ہُوئے انہوں نے سب کچھ انہیں بتا دیا۔

کہ۔ ان کا ایبٹ آباد آنے کا مقصد سیر و تفریح نہ تھا وہ صرف حارث کی خاطر آئی تھی۔ وہ میاں جی کی اجازت کے بغیر ایسی حرکت کبھی نہ کرتی اگر صاحباں اپنی ہمتیں اور کوششیں انہیں پیش نہ کرتی۔

پھر — یہاں پہنچ کر کس کس طرح صاجیاں نے حارث سے تعارف حاصل کیا۔ ملاقات کی۔ میل جول بڑھایا… جھگڑے کی وجہ جان سکے جو باپ بیٹے کے درمیان ہُوا تھا اور پھر ایک ماںتا کی ماری ماں کے نصیب میں ایک اکلوتی اولاد کی… لکھی گئی تھی۔

بی بی بڑے ہی جذباتی انداز میں روتی رہیں اور سُناتی رہیں۔ میاں جی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت تو کر ہی لی تھی۔… واقعات کے علاوہ چھ سال کی جُدائی کے اپنے زخم بھی ان کے سامنے کھول ڈالے۔

کہ — حارث کی جُدائی میں خود انہوں نے یہ وقت کیسے گزارا تھا۔ ان کے سامنے وہ ہمیشہ خاموش رہیں لیکن گیلی لکڑی… طرح اندر ہی اندر ایسا سلگی ہیں کہ رُوح تو راکھ بن گئی جسم میں بھی اس دکھ نے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔

میاں جی ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے اور چُپ چاپ سب کچھ سُن رہے تھے۔ بی بی کی باتوں نے ان کی آنکھ… کو بھی بھگو دیا تھا — اور — ایک مضبوط دل کے مرد ہو کر بھی وہ رو رہے تھے۔

بی بی کی سسکیاں، ہچکیاں اور باتیں ختم ہُوئیں۔ انہیں ذرا سکون آیا۔ تو میاں جی نے بھی سر اُٹھایا۔

"اور اب وہ —"

ان کی بات بھی پُوری نہیں ہونے دی قطع کرتے ہُوئے بی بی عجلت سے بولیں۔

"ہاں — اب وہ اسی کے پاس گئی ہے۔ آج اس نے اس سے آپ دونوں باپ بیٹے کے جھگڑے کی وجہ معلوم کر لی تھی… مگر —"

وہ میاں جی کو سب کچھ بتا کر قدرے مطمئن تو ہو گئی تھیں لیکن کچھ پریشانی ابھی تھی۔

"نجانے کیا ہو گیا ہے۔ کبیر خاں گیا تھا بُلانے، پھر شہزادہ بھی معلوم ہُوا ہے وہ وہاں نہیں ہے۔ مجھ سے پُوچھے بغیر تو کبھی کہیں نہیں جایا کرتی تھی۔ آج حارث کے گھر سے اور نجانے کہاں چلی گئی۔"

بی بی پھر رونے لگیں۔

"تم روؤ نہیں۔ حوصلہ رکھو۔ آجائے گی۔ میں خود اسے لینے جاتا ہُوں۔"

"آپ — آپ اس وقت کہاں جائیں گے —؟"

"وہ حارث کے گھر میں ہی ہو گی۔ میں وہیں جاؤں گا۔"

میاں جی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"لیکن — لیکن حارث کے ساتھ تو آپ کا جھگڑا ہے۔ آپ اس کے گھر…"

"ہاں — میں خود اس کے گھر جاؤں گا۔ اب یہ معاملہ میں ہی نمٹاؤں گا۔ میں خود — صاجیاں وہیں ہے۔ اس کے گھ… میں اور میں ہی اسے لے کر آؤں گا۔"

میاں جی نے ایک عزم کے ساتھ قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔ بی بی اُٹھ کر عین ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

"کیا بات ہے —؟"

میاں جی وہیں تھم گئے۔

"چھ سال کی مُدت گزر گئی۔ اب مجھ میں مزید بیٹے کی جُدائی سہنے کی ہمت نہیں ہے۔"

بی بی نے روتے ہوئے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"خدا کے لیے میری خاطر اب اُسے بھی معاف کر دیجیے — میری خاطر — اس کی کوتاہیوں اور گستاخیوں کی… آپ سے معافی مانگتی ہُوں —"

میاں جی نے گھبرا کر بی بی کے دونوں ہاتھ تھام لیے انہیں تھپتھپایا اور تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

"اسے بھی ساتھ لے کر آؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

اور بی بی کی حالت دیکھتے ہُوئے چہرے پر عجیب سے تاثرات لیے کمرے سے نکل گئے۔

بی بی انہیں جاتے ہُوئے دیکھتی رہیں۔ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو خیال آیا —

انہیں حارث کے گھر کا تو پتا ہی نہیں تھا — پھر وہ کہاں گئے تھے —؟ عجلت سے ان کے پیچھے لپکیں۔

"آپ جا کہاں رہے ہیں —؟ آپ کو حارث کے گھر کا علم ہے —؟"

"ہاں —"

"کیا —؟" بی بی نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"یقیناً وہی ہو گا جو تمہارے کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دیتا ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا —؟" حیرت سے بی بی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"پُوری زندگی تمہارے ساتھ گزاری ہے۔ کیا اب بھی تمہیں نہیں جانوں گا۔"

"لیکن — لیکن —"

"تم نے جب خاص طور پر اس گھر کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتے ہُوئے مجھے ایک دم وہاں سے ہٹا دیا تھا تو اسی وقت… تھا ٹھنکا تھا کہ اس گھر کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق یا واسطہ ضرور ہے اور ایسا کہ تم مجھ سے چھُپانا چاہتی ہو۔ اور باقی کہانی تم نے… اپنی زبان سے سُنا دی ہے۔"

میاں جی واقعی بڑے عقلمند تھے۔ بی بی نے تعریفی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"اچھا اب جائیے۔"

میاں جی نے قدم بڑھائے تو بی بی دامن پھیلا کر یُوں دُعائیں مانگنے لگیں جیسے وہ کسی محاذِ جنگ پر جا رہے تھے اور… ان کی اس فتح میں ہی بی بی کی بقا بھی تھی۔

❀

میاں جی جس تیز رفتاری سے اس گھر تک آئے تھے ان کا سانس پھُولنا اچنبھے کی بات نہ تھی۔ دروازے سے باہر کھڑے… ہو کر سانسوں کو ہموار کرنے لگے۔

لیکن — کئی لمحے گزارنے کے بعد بھی وہ نارمل نہ ہو پائے۔ تب انہیں اندازہ ہوا کہ رفتار کی تیزی نے نہیں بلکہ اس… وقت نے انہیں قدرے مضطرب کر دیا تھا جو اَب ان پر گزرنے والا تھا۔

کئی منٹ وہ ساکت کھڑے کچھ سوچتے رہے۔

وارث میاں! یہ وقت تو آنا ہی تھا اور اب، بہت بہادری اور مردانگی کے ساتھ تمہیں اس وقت کا سامنا کرنا ہے اور بہت… عقلمندی اور ہمت کے ساتھ اس کو نبھانا ہے۔

آج تمہارا امتحان ہے وارث میاں۔ شاید ایسا ہی جیسا روزِ حشر ہو گا۔ خدا کے سامنے بھی تو انسان اپنے گناہوں کا… اعتراف کرتا ہے۔ اپنی نیکیوں پر بھروسہ کر کے اس کی رحمت اور بخشش کا طلب گار ہوتا ہے اور جزا و سزا پاتا ہے۔

اسی طرح آج میں اولاد کے سامنے پیش ہو رہا ہُوں۔ اپنے گناہوں اور نیکیوں کو لے کر۔ پروردگار! تو اپنی رحمت… ان کے سینوں میں ڈال دے۔ آج میرا یومِ حساب ہے۔ مجھے اولاد کے سامنے اتنا شرمسار نہ کرنا کہ سر جھُکے تو جھُکا ہی رہے… وہ مجھے معاف کریں ہی نہیں۔

مولا! جیسا ایمان تُو نے مجھے بخشا، جیسی ہدایت تُو نے مجھے دی۔ اسی انداز میں معاف کر دینے والے حوصلے انہیں… عطا کر دے۔ ایسے ہی نرم دل انہیں دے دے۔"

کتنی ہی دیر وہ کھڑے رہے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے اور — پھر نجانے کون سی آہٹ تھی۔ وہ چونک… پڑے۔ اب ان کی سانس نارمل تھی اور وجود میں بھی کپکپاہٹ کے بجائے ایک مضبوطی تھی۔

عزم و ارادے سے بھرپُور قدم اُٹھا کر وہ آگے بڑھے اور بند دروازے پر دستک دے ڈالی۔

"کون ــــ؟"

حارث کی آواز تھی۔ شاید دروازہ کھولے بنا ہی آنے والے کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ کیوں کہ دروازہ نہیں کھلا۔ اتنے عرصے بعد بیٹے کی آواز سنی تھی۔ میاں جی کا دل دھڑک کر جیسے حلق میں آگیا۔

"کون ہے ــــ؟"

دروازہ بند ہی رہا اور دوبارہ اندر سے پوچھا گیا۔ آواز اب بھی حارث ہی کی تھی اور اب جو آواز میاں جی کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے ان کا دل دھڑکانے کے بجائے ہمت اور حوصلہ دیا۔

یہ تمہارا اپنا خون ہے وارث میاں ۔ اپنی اولاد ــــ والدین اور اولاد دونوں ایک دوسرے کی پناہ ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا کھلم کھلا معافی نامہ ہوتے ہیں۔ بس ۔ دلوں میں خدا کا خوف اور ایمان کی روشنی موجود ہو۔

اور ــــ حارث کے سینے میں تو ایمان ہی ایمان ہے۔ اس کا دل تو ان روشنیوں سے پوری طرح منور ہے۔

میاں جی نے کون کا جواب دیئے بغیر ہی بڑھ کر ایک بار پھر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

اس دستک میں ان کا عزم اور نیک ارادہ شامل تھا۔ اب بلا جھجک وہ سر بلند کیے کھڑے دستک کے جواب کے منتظر تھے۔

بہت انتظار نہیں کرنا پڑا اور نہ ہی اب کسی نے اندر ہی سے کون والا اجنبی سا سوال کیا۔ بس خاموشی سے ایک ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

میاں جی نے دروازہ کھولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ حارث ہی تھا۔ چھ سال بعد اسے دیکھ رہے تھے۔ سارے بدن میں ایک عجیب سنسنی خیز لہر دوڑ اٹھی۔ اس مدت میں وہ کچھ اور بھی باوقار ہو گیا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی کمرے میں جلتی بتی کی روشنی میاں جی کے چہرے پر پڑی۔

"اوہ ــــ!" چند لمحات انہیں ایک ٹک دیکھتے رہنے کے بعد حارث کے چہرے پر پہچان کی لہر کے ساتھ ہونٹوں سے کلمۂ حیرت بھی نکلا۔

پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے دونوں لمبے لمبے بازو پھیلے۔ میاں جی نے سمجھا وہ ان سے بغلگیر ہونے کے لیے بازو پھیلا کر آگے بڑھ رہا ہے۔

میاں جی نے بھی مسکراتے ہوئے قدم بڑھائے مگر ــــ وہ دوسرے قدم پر ہی ٹھٹھک گئے۔

حارث کے پھیلنے والے بازو ان سے بغلگیر ہونے کے لیے نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے تو ان کا اندر جانے والا راستہ بند کیا تھا دروازے کی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے حارث دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔

"وہ میری پناہ میں ہے۔ اسے یہاں سے لے جانے کی کوشش بے کار ہوگی۔"

اجنبی سا لہجہ اور ایک دشمن کا سا انداز ــ لگتا تھا میاں جی کے خون کی ایک بوند بھی ان کے پورے جسم میں نہ تھی۔ اس لہجے اور اس انداز نے ان کے جسم کا پورا خون جیسے نچوڑ لیا تھا۔ وہ واپس مڑنے ہی لگے تھے کہ یکایک انہیں خیال آگیا۔

جن حالات میں وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے اس کا تقاضا یہی تھا۔ بلکہ جتنی مخالفت ان دونوں کے درمیان تھی اس لحاظ سے تو حارث کا لہجہ بہت نرم اور بالکل دوستانہ تھا۔

آخر خون تو انہی کا تھا، نا۔ باپ کے ناتے ان کا ادب، احترام ملحوظ تھا۔

میاں جی کے چہرے پر شفقت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"چھ سال بعد باپ سے مل رہے ہو ملنے کا یہ انداز کیسا ہے، بیٹے! نہ سلام نہ آداب۔"

"باپ؟ بیٹا...؟"

حارث کے سنجیدہ چہرے پر زہر بھرا تبسم مچلا۔ ایک طنزیہ نگاہ سے میاں جی کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کون باپ... کس کا بیٹا...؟ یہ رشتہ تو آپ بہت عرصہ ہوا توڑ چکے ہیں۔"

"خون کے رشتے توڑنے پر بھی ٹوٹا نہیں کرتے۔"

میاں جی کا انداز بڑا شگفتہ اور محبت بھرا تھا۔

حارث نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"ٹوٹ جایا کرتے ہیں میاں جی۔ جب باپ بیٹے میں اتنے زبردست اختلافات ہوں!"

"سب اختلافات مٹ چکے ہیں بیٹے۔ اب میں ایک نیا انسان ہوں۔ اس انسان سے بہت مختلف جسے چھ سال پہلے تم جانتے ..."

"صاحباں کو ساتھ لے جانے کے لیے چال چل رہے ہیں۔"

حارث ابھی تک اسی طرح سنجیدہ تھا اور اسی انداز میں بازو پھیلائے، چوکھٹ تھامے، اُن کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

"لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ آپ اِس مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ کبھی نہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ... میں کامیاب ہوں۔"

میاں جی مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ ہلکا سا جھٹکا دے کر حارث کا ایک بازو پرے ہٹایا اور کمرے کے اندر داخل ہو ...

"دوسرے کے گھر میں زبردستی داخل ہونے کا انجام آپ جانتے ہیں...؟"

"میں اپنے بیٹے کے گھر میں آیا ہوں۔"

میاں جی بڑھ کر انتہائی بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"مجھ پر دُنیا کی کوئی عدالت اس قسم کا کوئی فردِ جرم عائد نہیں کر سکتی۔ میں اپنے پورے حق سے یہاں آیا ہوں... اور ...ں۔"

حارث حیرت اور تعجب سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ کھڑا میاں جی کو دیکھے جا رہا تھا۔

ان کے چہرے پر جلال تھا، غصہ اور سختی، جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ عام نارمل حالات میں بھی۔

اور یہ آج... آج تو اس کا خیال تھا کہ دو دشمنوں کا ٹکراؤ ہوگا۔ ایسا، کہ دُنیا دیکھے گی۔ وہ میاں جی کو اُن کے آئینہ دکھائے گا۔ نہ صرف اُن کو بلکہ سب کو تاکہ بدی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

اب اِس کا خاتمہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ صاحباں جیسی نجانے کتنی لڑکیاں کیسے کیسے حالات سے گزر رہی ہوں گی۔ آیندہ ...کی صاحباں نہیں بنے گی اور میاں جی کو اپنے کیے کی سزا بھگتنا ہوگی۔

مگر... مگر... یہ سب کیا تھا؟ میاں جی کو کیا ہو گیا تھا؟ اتنے حلیم، اتنے نرم و ملائم تو وہ کبھی بھی نہ تھے۔ کیا یہ بھی ایک ...ی...؟

وہ حیرت میں ڈوبا ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میاں جی پھر بولے۔ اُسی شفقت بھری آواز اور لہجے میں۔

"یہاں آؤ، میرے پاس بیٹھو۔ اطمینان سے گفتگو کرتے ہیں۔"

اُن کی آنکھوں میں خلوص اور محبت کی چمک ضرور تھی مگر ریا کاری کا عکس نہ تھا۔ حارث انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔

شاید یہ حقیقت تھی یا پھر، باپ ہونے کے ناتے اُس کا اپنا خون جوش مارنے لگا تھا۔

...شک و شبہے کے عالم میں ڈوبا کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"صاحباں کہاں ہے؟"

میاں جی کے پوچھنے پر حارث چونکا۔ تو اُسی سونے کی چڑیا کے لیے میاں جی نے یہ مہر و محبت والا چولا بدلا ہے۔ چہرے پر ...بھری مسکراہٹ کا خول چڑھایا ہے اور انداز میں اپنائیت و خلوص کا رنگ بھرا ہے۔

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا... اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میاں جی کو کس نگاہ سے دیکھے۔ کس خانے میں فِٹ کرے میاں جی کی سنجیدہ..... آواز سماعت سے ٹکرائی "صاحباں! صاحباں بیٹی... ! میرا ماضی تمہاری نگاہوں میں ...ہو چکا ہے۔"

وہ دوسرے کمرے کی طرف جانے والے دروازے کی سمت رُخ کیے بلند آواز میں صاحباں سے مخاطب تھے۔

"...ایک مجرم کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں۔ لیکن دُنیا کی کسی بھی عدالت میں یہ قانون نہیں کہ مجرم کو اپنی صفائی میں کچھ بھی ...موقع دیے بغیر فیصلہ سُنا دیا جائے۔ کیا تم دونوں یہ حق مجھے نہیں دو گے؟"

آخری الفاظ کہتے کہتے اِن کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔

یہ جو کچھ ہو رہا تھا، حارث کی عقل و فہم سے بالاتر تھا۔ وہ گم سم کھڑا تھا۔ کیا کہے ؟ کیا نہ کہے ؟ عجیب سی کیفیت تھی۔ کمرے سے باہر کاریڈور میں قدموں کی چاپ ہوئی تو وہ چونکا۔ دروازے تک آ کر وہ آہٹ تھم گئی۔

"کہیے ..." صاحباں نے میاں جی کی بات شاید سُن لی تھی۔ اُس کی لرزتی کانپتی آواز فضا میں لہرائی۔

"لیکن مَیں آپ کے سامنے، آپ کے پاس نہیں آؤں گی۔"

"تمہاری خوشی بیٹے۔"

میاں جی کا سَر جُھک گیا۔ آواز میں رنج کی آمیزش تھی۔ "مَیں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن یہ یقین رکھوں نا کہ تم میری بات سُن رہی ہو۔"

"جی ہاں۔"

پھر میاں جی نے حارث کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ "بیٹے ! سُنو گے تم بھی ؟"

آپ ہی آپ کسی آٹو میٹک مشین کی طرح حارث کا سَر اثبات میں ہِل گیا۔

"تو بیٹھ جاؤ یہاں، میرے سامنے۔"

میاں جی نے حارث کو بیٹھنے کے لیے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی کیفیت، اسی عالم میں خاموشی سے .... وہ بیٹھ گیا۔ ابھی تک اُس کے ہوش حواس جیسے بجا نہ ہوئے تھے اور وہ صرف ایک معمول کی طرح عامل کا حکم مان رہا تھا۔

"صاحباں کو تم نے میرے ماضی کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ مَیں جانتا ہوں۔ اسی لیے وہ اب اپنے گھر نہیں جا رہی۔"

"گھر... ؟ آپ اُس کو اُس کا گھر کہتے ہیں۔ ؟"

"ہاں ! وہی اُس کا گھر ہے۔"

"اپنے پاس آنے والی ہر لڑکی اور عورت کو کیا آپ ایسا ہی گھر دیتے رہے ہیں ؟"

میاں جی نے بات شروع کی تو حارث کے سارے اوسان، سارے حواس کام کرنے لگے۔ آج تو یہ آپریشن ہو ہی جانا چاہیے۔ حارث نے سوچا۔ اَب تک وہ میاں جی کا لحاظ کرتا آیا تھا۔ مگر آج... اس نے باپ والا ناتا بھی توڑنا تھا۔ میاں جی، ملک و معاشرے کے لیے ایک ناسُور تھے۔ آج اُسے اس ناسُور کو نشتر لگا ہی دینا چاہیے تھا۔ انسانیت، ملک، قوم اور معاشرے کے بھی کچھ حقوق اور فرائض اس پہ عاید ہوتے تھے۔ وہ بھی تو اُسے پُورا کرنا تھے۔

یہ کیا۔ ایک باپ کا ناتا اس نے نبھایا اور دوسرے سارے فرائض کی طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ یہ اس نے غلط کیا تھا۔ یہ اس نے غلط سوچا تھا اور آج جب کہ میاں جی اس سے ٹکرانے کے لیے سامنے آ ہی گئے تھے تو اسے نہ صرف ... صاحباں کی خاطر بلکہ اپنے وطن کی دوسری ہزاروں بہنوں بیٹیوں کی خاطر ہی میاں جی کو ان کے کارناموں کا احساس دلا کر قانون کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

میاں جی خاموش تھے۔ حارث نے دوبارہ سختی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ ہر عورت، ہر لڑکی کو ایسا ہی گھر دیتے رہے ہیں ؟"

یہ لگ بھی نہیں رہا تھا کہ بیٹا باپ سے مخاطب تھا۔ اس کے تیور ہی اور تھے اور میاں جی ..... چند لمحے خاموش رہے پھر سَر اٹھا کر ایک تبسم کے ساتھ بولے۔

"یہ انداز تمہیں چھ سال پہلے اختیار کرنا چاہیے تھا۔ مَیں جو کچھ کر رہا تھا تمہیں وہ سب روکنے کے لیے اس وقت مجھے پابند کر دینا چاہیے تھا۔ پولیس کو بُلاتے ... مجھے اس کے حوالے کر دیتے۔ ہر ثبوت تمہارے پاس تھا تاکہ مَیں مزید گناہوں سے بچ جاتا۔"

"مَیں اس وقت بی بی کی خاطر خاموشی سے وہاں سے نکل آیا تھا اگر آپ یقین کریں گے۔ اس کے بعد ایک پل مجھے چین نہیں ملا۔ آپ کے گناہوں کی خاطر میں سنگسار ہُوا ہوں۔ ذہنی طور پر، جسمانی طور پر اور مالی طور پر کس کس طرح مَیں نے اپنے اوپر سنگباری نہیں سہی۔"

"وہ سب میں جان چکا ہُوں۔ صاحباں نے اپنی بی بی کو سب کچھ بتا دیا ہے اور انہوں نے مجھ کو کہ کیسے کیسے تم نے ... اور کس طرح تم نے کمایا ہے مگر خود پہ خرچ نہیں کیا۔ تم نے بیواؤں اور یتیموں کی سر پرستی کی۔ تم نے طالب علموں کو وظیفے ...

میاں جی کے چہرے پر بڑی معصوم سی مسکراہٹ تھی۔

"تمہارا طریقِ کار بالکل غلط تھا۔ تمہیں اُسی وقت بُرائی کو جڑ سے اُکھیڑ دینا چاہیے تھا۔ اُسی وقت تم نے تو مزید گناہوں کا بوجھ مجھ پر لادنے کے لیے مجھے آزاد اور کھلا چھوڑ دیا۔ اور خود...."

"یہ آپ کہہ رہے ہیں ؟"

کیسے خوب صُورت تبسم اور دیدہ دلیری کے ساتھ، میاں جی اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے۔ حارث حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

کیا وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے ؟

"برخوردار ! انسان غلطی کا پُتلا ہے۔ کوئی چھوٹی غلطی کرتا ہے۔ کوئی بڑی اور کوئی بہت بڑی۔ آج میں تم دونوں یعنی اپنی اولاد کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ مَیں بُرائی کے راستے پر تھا۔" تھا پر غور کرنا میرے بیٹے۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ تم نے مجھے جن راستوں پر چلتے دیکھا تھا مَیں اب وہ راستے چھوڑ چکا ہُوں۔ بس افسوس اس بات کا ہے کہ تم نے جب مجھے غلط راستے پر چلتے دیکھا تو بجائے اس کے کہ وہ راستہ ہی بند کر دیتے، تم نے مجھے اس پر چلتا رہنے دیا اور خود وہاں سے مُنہ پھیر کر دوسری سمت چل دیے۔ تب میں اُسی راستے پر چلتا گیا مگر پھر اُس راستے پر مجھے ایک اور انسان ملا۔ خدا کی مہربانی شامل حال تھی۔ وہ میرے لیے روشنی کا مینار بن گیا۔ میرے لیے راہِ ہدایت بن گیا۔"

"وہ... وہ کون... ؟"

"صاحباں۔"

"کیا مطلب... ؟"

"کیا میری داستان تم دونوں صبر و تحمل کے ساتھ سُنو گے ؟"

"جی"

"جی میاں جی۔" اُدھر سے صاحباں کی گُھٹی گُھٹی، پھنسی پھنسی بھرائی ہُوئی آواز نکلی۔

اسے میاں جی سے بہت پیار تھا۔ یہ سارے واقعات نہ ہو گئے ہوتے تو وہ اِس وقت اُن کے گلے میں بانہیں ڈالے اُن کے پاس بیٹھی ہوتی۔

پچھلے تین سال کے عرصے میں وہ ان سے اتنی مدت کے لیے کبھی جُدا نہ ہوئی تھی ... اور اَب صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا حالات نے اسے کِس دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھا۔

ایک دل سے وہ ان کے پاس جانا چاہتی بھی تھی مگر اسے اپنی عزت کا بھی خیال تھا۔ میاں جی نے اتنا بڑا دھوکا اُسے کیوں دیا۔ اُسے اُن سے یہ توقع نہیں تھی۔

محبت اور نفرت کے درمیان عجیب سی کشمکش جاری تھی کبھی وہ پلڑا بھاری ہو جاتا اور کبھی وہ ... اپنے آپ ہی کو دلائل سے کبھی اُن سے پَرے رہنے کی تلقین کر لیتی اور کبھی ان کی محبت ان کے ہر جُرم کے لیے بے شمار صفائیاں پیش کرتی تو وہ ڈول جاتی۔

... اور یُوں، بڑی جذباتی ہو رہی تھی اس وقت۔ میاں جی نے کچھ کہنے کے لیے پُکارا تو اُن کی محبتیں اور پیار ایک منٹ میں اُسے کھینچ کر وہاں تک لے آیا اور لگے، وہ حد تھی جہاں اُسے ان سے نفرت کرنا تھی جو کہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔

میاں جی نے اپنے متعلق کچھ کہنا چاہا تو وہ پُورے ہوش و حواس سے اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"یا اللہ ! میرے میاں جی وہ شخص نہ ہوں جو حارث کہتا تھا۔"

اس کی سب سے پہلی دُعا قبول نہ ہوئی۔ میاں جی نے اپنی زبان سے اعتراف کر لیا۔

صاحباں کا دل ڈوب ڈوب گیا لیکن دوسرے ہی لمحے جب انہوں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو وہ پھر ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اُس کے جسم کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔

"میرے مولا ! میاں جی کی پیش کی ہوئی ہر صفائی ایسی ہو کہ حارث کا مَن بھی صاف ہو جائے۔ اگر کبھی وہ ایسے تھے تو اب

وہ وُہی ہوں، جنہیں میں میاں جی کہتی ہوں۔ نیک اور اچھے اوصاف سے مزّین۔ یا پروردگار! میری یہ خواہش پُوری کر دے،" بے شمار دُعاؤں کے ساتھ وہ میاں جی کی بات سُننے لگی۔

جہاں سے صاحباں کی داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ وہی باب میری اس جُرم و گناہ کی کہانی کا اختتام ہے،" میاں جی نے انتہائی سنجیدگی سے اپنا بیان شروع کر دیا۔

"اُس رات مَیں تصور آباد کی صاحباں ہی کا سودا کرنے وہاں گیا تھا۔ ایسا انمول ہیرا آج تک ہاتھ نہیں لگا تھا۔ جیسے اُس کے چرچے تھے۔ میرے علاوہ اور بھی اُس کے بہت سے گاہک تھے۔"

میاں جی لمحہ بھر کے لیے خاموش ہُوئے۔ حلق میں جیسے کچھ اٹک گیا تھا اُسے نگلا۔

"چونکہ مَیں ہر حال، ہر صورت میں یہ مال خریدنا چاہتا تھا۔ بیرونِ ملک سے ایک گاہک کے ساتھ سودا پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا۔ اس لیے ایک کثیر رقم اس وقت میری جیب میں تھی۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہُوا کہ صاحباں کسی نہ کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔"

حارث باپ کے چہرے پر نظریں گاڑے ساکت بیٹھا تھا۔ ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے جیسے سچ اور جھُوٹ میں امتیاز کرنا چاہتا تھا۔

"صاحباں کے وہاں سے فرار ہو جانے کا افسوس اور پریشانی لیے مَیں ناکام و نامُراد لوٹ رہا تھا کہ... خُدا نے بے دام ہی مجھے وہ انمول ہیرا بخش دیا۔ میری ہی گاڑی میں چھُپ کر صاحباں اُس شکارگاہ کی حدود سے نکلی تھی... لیکن...."

میاں جی نے جھُکا ہُوا سر اونچا کیا۔ حارث کی نظریں جیسے اُن کے دل و جگر کو چھید رہی تھیں۔ اُنہوں نے جلدی سے پھر سر جھُکا لیا۔

"میرے بچّو! یقین کرو گے؟ اپنے خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں۔ اُس لمحے میں جانے کیا ہُوا تھا۔ صاحباں کی معصوم صُورت اُس کی آنکھوں میں ستاروں کی طرح چمکتے آنسو اور لرزتا کپکپاتا وجود، مجھے ایسے لگا جیسے میری خدیجہ مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہے۔"

"خدیجہ...؟ خدیجہ کون...؟"

حارث نے تعجب سے میاں جی کی طرف دیکھا۔

"تمہاری بہن۔ تم سے چار سال بڑی تھی۔"

"میری بہن... میری کوئی بہن بھی تھی؟ کہاں ہے وہ...؟"

حارث نے بے یقینی سے باپ کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ ایسا ویسا چکمہ دے کر، ایسی ویسی داستان سُنا کر اس کے دِل کو پگھلا کر صاحباں کو یہاں سے نکال لے جانے کا ارادہ تو نہیں کیے بیٹھے تھے۔

لیکن اُن کی آنکھوں کی نمی اور ہونٹوں کے پھڑپھڑاتے ہُوئے گوشوں نے حارث کو اُن کی بات کا یقین کرنے پر مجبور سا کر دیا۔

"ہاں... تم سے بڑی تھی وہ۔" سسکی کی طرح میاں جی کے مُنہ سے بات نکلی۔

"بہت خُوب صُورت تھی۔ گُم ہو گئی۔"

"خوب صورت تھی...؟ گُم ہو گئی...؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

حارث نے پھر شک کی نگاہ سے انہیں دیکھا۔

"بے شک اس وقت تم مجھ پر ہر قسم کا شک کرنے کا حق رکھتے ہو۔ تم صاحباں کو مجھ سے بچانا جو چاہتے ہو مگر بیٹے! مَیں نے خدا کو گواہ بنا کر بات شروع کی تھی۔"

"میں سُن رہی ہوں میاں جی۔"

صاحباں کی آواز بالکل دروازے کے قریب سے آئی۔ میاں جی نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ پردے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اُنہوں نے جی چاہنے کے باوجود اسے قریب آنے کو نہیں کہا۔ بس بات جاری رکھی۔

"تمہیں اس داستان سے آج تک اس لیے لاعلم رکھا گیا کہ جو دُکھ ہم پر گُزرا ہے تم اُس سے بچے رہو... خدیجہ گُم نہیں

ہوئی تھی اغوا کر لی گئی تھی۔ بے حد پیاری بچّی تھی اور اسے اُٹھا لے جانے والوں نے پچاس ہزار کا مطالبہ کیا تھا مجھ سے۔ میں جو اس وقت یوں تو ایک بڑے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ رئیس ابنِ رئیس سر غیاث کا بیٹا تھا مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سر غیاث نام ہی کی جائداد چھوڑ کر مرے تھے۔ اصل میں وہ اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے اور باپ کا قرضہ ہی قرضہ میری جائداد تھا۔"

میاں جی خاموش ہو کر اپنی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو صاف کرنے لگے۔

حارث صوفے سے اتر کر ان کے قریب نیچے فرش پر جا بیٹھا۔ اسے اس وقت کوئی ہوش نہ تھا۔

"پھر کیا ہُوا میاں جی؟"

خود اُس کی اپنی آواز بھرّائی ہُوئی تھی۔

"ہونا کیا تھا مَیں وہ رقم ادا نہ کر سکا۔ اور میری خدیجہ مجھ سے جُدا ہو گئی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

"پولیس میں رپورٹ نہیں کی؟"

"کیا... سب کچھ کیا۔ مگر یہی تو غلطی تھی۔ کسی نہ کسی طرح مانگ تانگ کر کھپ کر رقم کا بندوبست کر کے اغوا کنندگان کو دے دیتا تو شاید وہ مجھے واپس مل جاتی۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی تو اُس کی لاش مل گئی۔"

اب کمرے میں صرف میاں جی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

"اوہ۔ یہ کیسی کہانی ہے؟"

حارث نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کے آنسو بھی رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"کاش! آپ نے اب بھی مجھے کچھ نہ بتایا ہوتا۔"

"کبھی نہ بتاتا۔ صرف صاحباں کی خاطر سب کچھ بتا رہا ہوں۔ تم اب تک مجھے اُس کا باپ نہیں سوداگر سمجھ رہے تھے۔"

"میاں جی وہ بھی تو حقیقت تھی۔ آپ نے خود بھی اعتراف کیا تھا۔"

"ہاں! اسی دُکھ نے، خدیجہ کے واقعہ نے مجھے بھی مُجرم بنا ڈالا۔ میری اتنی خوبصورت، اتنی پیاری بیٹی میرے پاس نہیں رہی تو کسی کی بھی کیوں پاس رہتی! اپنے دُکھ کا انتقام میں بے قصور اور بے گناہ لوگوں سے لینے لگا۔ مَیں نے بھی اُسی طرح لوگوں کی چھوٹی بڑی بچیاں اغوا کرنا شروع کر دیں۔"

"اوہ۔ انتقام کا یہ تو کوئی طریقہ نہ تھا۔"

"بے شک نہ تھا۔ مگر مجھے بڑی تسکین ملتی تھی۔ ساتھ دولت کی بھی فراوانی ہو گئی۔ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھ سے میری خدیجہ بچھڑی تھی۔ سب کچھ میرے پاس تھا۔ مَیں مطمئن تھا خوش تھا۔"

"مطمئن تھے... خوش تھے۔"

"ہاں۔ یہ احساس کی بات ہوتی ہے۔ مَیں جو کچھ کر رہا تھا۔ یہ مجھے احساس ہی نہ تھا کہ یہ ظلم و زیادتی ہے۔ اس لیے مَیں مطمئن اور خوش تھا یہاں تک کہ...."

میاں جی قدرے توقف کے بعد پھر بولے۔

"تم نے احساس دلانے کی کوشش کی نہیں...! میری آنکھوں پر پردے پڑے رہے۔ میرے دِل پر مُہریں لگی رہیں.... تمہارے یوں سمجھانے سے بات کیا بننا تھی۔ کوئی حادثہ ہوتا، کوئی سانحہ گزرتا تب مَیں اُن راہوں سے پلٹ سکتا تھا۔"

"میں جو آپ سے رُوٹھ کر، جھگڑ کر گھر سے نکل آیا تھا۔ کیا میری جُدائی نے بھی آپ کے دِل کو موم نہیں کیا؟"

"میرا دل جل رہا تھا بیٹی کے غم کے شعلوں سے یہ آگ جو اتنی زیادہ تھی، اتنے سالوں سے نہیں بُجھی تھی۔ اس کے آگے تمہارا یہ سمجھانا، اُلجھنا، جھگڑنا اور پھر گھر سے چل دینا، کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ خدیجہ کے غم نے مجھے تم سے بھی اولاد کی محبت نہ کرنے دی۔ اسی لیے تمہیں باہر بھی بھیج دیا۔ میرے اندر تو بس خدیجہ ہی تھی۔ اُس کا غم تھا اور انتقام کی آگ۔"

"پھر...؟ پھر آپ اب کون سی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں؟"

ابھی ابھی حارث کا دِل باپ کے دُکھ کے لیے تڑپ رہا تھا، دھڑک رہا تھا۔ میاں جی کی سچی سچی باتیں سُنیں تو اُسے پھر غصہ آ گیا۔

"صفائی کوئی نہیں بیٹے! وہ تو مَیں، صرف اپنے گزرے اوقات کو دُہرا رہا ہوں۔ زندگی میں بعض موڑ بالا سوچے سمجھے چپکے سے کیسے آتے ہیں وہ بتا رہا تھا۔"

پھر اُنہوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"صاحباں بیٹی میری باتیں سن رہی ہو؟"

"جی میاں جی، بہت غور سے۔" کھڑی کھڑی شاید تھک گئی تھی۔ پردے کے اُس پار وہ دہلیز میں بیٹھی تھی۔ بازوؤں میں گھٹنے لیے تھے اور گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے بیٹھی بس روئے ہی جا رہی تھی۔

میاں جی کی کہانی کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اُسے حدیث کی طرح سچا اور کھرا لگ رہا تھا۔

"میری زندگی کا موڑ تم ہو بیٹی۔ تمہیں دیکھا تو مجھے محسوس ہُوا کہ میری بچھڑی بیٹی مل گئی ہے۔ مجھے کبھی کسی کے آنسوؤں نے متاثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ مَیں آنسو دیکھ کر ہنسا کرتا تھا، قہقہے لگایا کرتا تھا۔"

"اُف میرے خدا!"

"مَیں خود اعتراف کر رہا ہوں۔ تم دونوں کے سامنے، اپنے ہی جرم کا، اپنے ہر گناہ کا۔ پوری سچائی اور ایمان داری سے اور اب... وہ سب کچھ سُنانے کے بعد یہ بتانے میں مجھے فخر اور خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ پھر میری زندگی کی راہیں بدل گئیں۔"

ان کے چہرے پر ایک تبسّم نمودار ہُوا۔ اِک پاکیزہ اور صداقت بھرا تبسّم۔

"صاحباں کے آنسوؤں نے مجھے تڑپا تڑپا دیا۔ اس کی معصوم صُورت نے مجھ سے وہ کچھ کہہ دیا جو اُس دن تم بھی نہ کہہ پائے تھے، نہ سمجھا پائے تھے۔ پھر مَیں اسے اپنے گھر لے آیا۔ اپنی خدیجہ کو... اپنی معصوم بیٹی کو۔ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کی صُورت میں مجھے وہ ہزاروں لڑکیاں یاد آ گئیں جن سے مَیں نے خدیجہ کا انتقام لینے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ آگ نہیں بجھ سکی تھی۔ نہ ان کے آنسوؤں سے اور نہ اُن کی چیخوں سے یہ پتھر دل موم ہُوا تھا۔"

میاں جی کی آواز بھاری سی ہو رہی تھی۔ حارث اُٹھ کر گیا اور پانی کا گلاس بھر لایا۔

"عقل مند ہو کافی۔ مجھے اِس وقت چند قطرے پانی کی بہت ضرورت تھی۔"

میاں جی نے گلاس تھاما۔ چند گھونٹ پانی کے پیئے اور واپس میز پر رکھ دیا۔

"صاحباں میرے گھر میں بہار بن کر آئی، نہ صرف بہار بلکہ ایک روشنی کا مینار۔ اُس کی صُورت دیکھتا تھا تو مجھے سب روتی چیختی لڑکیاں اور ان کے غمزدہ باپ یاد آ جاتے تھے۔ تب مَیں نے یہ دھندا چھوڑ دیا۔ صاحباں کی خاطر میں نے دوسرے جائز ذرائع سے کمانا شروع کر دیا۔ اُس کے نصیب کا خدا نے مجھے بہت کچھ دیا ہے حق حلال کا۔ اور نہ صرف دھن دولت بلکہ راہِ ہدایت بھی اور سکون واطمینان بھی۔"

"واقعی آپ نے... ؟"

"ارے بیٹے،" میاں جی... حارث کی بات سُنے بنا سمجھ گئے۔ "اب یقین کر لو۔ کیوں کہ انسان دوسرے ہر انسان کو دھوکا دے سکتا ہے مگر اپنے خدا کو نہیں۔ اور مَیں نے... اُس کی قسم کھا کر تمہیں ساری بات بتانا شروع کی تھی۔"

"پھر آپ نے مجھے کیوں بُھلائے رکھا۔ مَیں نے کیسے کیسے وقت گزارے آپ کو کیا بتاؤں۔"

"سب پتا چل چکا ہے۔ گناہ گار ہوں تمہارا۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ راہِ ہدایت پانے کے بعد، جب سینے پر لگی مُہریں ٹوٹ گئیں۔ میرا دِل پشیمان ہُوا۔ اپنے ہر گناہ کا اعتراف کیا تو تب مَیں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ تمہاری بی بی کو تو کچھ بھی معلوم نہیں صاحباں کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ بیٹی بنایا تھا۔ وہی عزت اور احترام اُس کی نگاہوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ صرف ایک تم تھے۔ جسے سب کچھ معلوم تھا اور تمہارے سامنے اعتراف کر کے، پشیمانی کا اظہار کر کے سکون پانا چاہتا تھا... تم سے معافی مانگ کر۔"

"نہیں نہیں میاں جی! مجھ سے معافی کیسی۔ خدا سے مانگ لی، وہ معاف کرے۔"

"مَیں تمہارا بھی گنہگار ہوں بیٹے: اچھی تعلیم دلا کر، باشعور کر کے تمہیں کیسی رُسوائی دی۔ میرا ضمیر مجھے ہر وقت لعن طعن کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ تمہاری ماں کا بھی گناہگار تھا۔ اُس سے اُس کی بیٹی خدا نے چھین لی اور بیٹا مَیں نے خود اُس سے جُدا کر دیا۔"

"میری بی بی۔ میری اپنی بی بی۔"

حارث دبا دبا سا بڑبڑایا۔

"جانتا ہوں تم دونوں ہی کو ایک دوسرے سے بہت پیار تھا۔ ایک عام ماں اور اولاد کی نسبت کہیں زیادہ۔ وہ شاید خدیجہ کے وجود کو بھی تم میں پاتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بھی سُرخرو ہونے کے لیے مَیں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ کتنی خوش ہو گی جب چپکے سے تمہیں ڈھونڈ کر اور لے جا کر اس کے سامنے کھڑا کر دوں گا۔ مگر..."

پھر میاں جی بہت زور سے ہنس پڑے

"یہ تو اپنا اپنا مقدر ہے۔ مَیں سوچتا ہوں اور یہ بازی بھی صاحباں ہی لے گئی۔ اسی نے تمہیں تلاش کیا اور آج مجھے اور ...ہیں ملایا۔ اس کا وجود بڑا بابرکت ہے۔ یہ میرے لیے روشنی کا مینار ہے۔"

پھر یکایک وہ بلند آواز میں پکار اُٹھے۔

"کیوں میرے بچو! اب بھی مجھے گناہگار ہی سمجھو گے یا... یا صبح کا بُھولا شام کو گھر آیا سمجھ کر معاف کر دو گے۔ لیکن نہیں میں تم ...دل پر کوئی زبردستی نہیں کروں گا۔ تمہاری عقل اور فہم پر یہ معاملہ چھوڑ دوں گا۔ تم دونوں اب سمجھ دار ہو سوچو۔ مَیں تمہیں وقت ...تا ہوں۔"

میاں جی اُٹھ کر کھڑے ہوئے۔

"جو کچھ تم میرے متعلق فیصلہ کرو گے وہ مجھے منظور ہو گا۔ مَیں اب کل آؤں گا۔"

"نہیں نہیں..." صاحباں بلند آواز میں چلّاتے ہوئے لپک کر اندر آ گُھسی۔

"میرے میاں جی سچ کہتے ہیں۔ میرے میاں جی نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔"

وہ میاں جی کے گلے میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔

"میرے میاں جی جیسا نیک شخص اور کوئی بھی اس دنیا میں نہیں ہو گا۔ میاں جی میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ آپ کے پاس ...بی بی کے پاس۔"

پھر یکایک اُسے نجانے کیا ہُوا۔ اُن کے قدموں میں بیٹھ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"آپ خود کو گناہگار کہہ رہے ہیں۔ لیکن اصل مَیں بُری میں ہُوں میاں جی... مَیں جس کی آپ نے عزت بچائی۔ جسے آپ ...نے اتنی زیادہ محبت دی۔ اتنا خوب صُورت گھر دیا۔ علم سکھایا، اچھی تربیت کی۔ میرے ساتھ آپ نے کیا نہیں کیا اور مَیں... ...میں نے آپ کو بلا سوچے سمجھے گناہ گار تصوّر کر لیا۔ اپنی عزت کے محافظ کو سوداگر سمجھنے لگی۔ مَیں نمک حرام اور احسان فراموش ہوں میاں ...جی... مجھے معاف کر دیں... مجھے تو ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا خیال دل میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ گناہ گار مَیں ہُوں۔ ...مجرم میں ہوں پہلے ایک باپ کے گھر سے نکلی اور اب... دوسرے باپ کی عزت بھی مٹّی میں ملانے چلی تھی میں اس قابل نہیں کہ..."

"بس بیٹے بس! تم جس قابل ہو وہ میں جانتا ہوں۔"

میاں جی نے ہمیشہ کی طرح اُسے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ ایک ننّھے سے بچّے کی مانند اُسے چمکارا۔ اُس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

"تم اور کچھ نہیں ہو۔ بس صرف میری بیٹی ہو... چلو... تمہیں تمہاری بی بی کے پاس لے چلوں۔ وہ تمہارے لیے بہت پریشان ...ہیں۔" اسے بازو میں بھرے وہ دروازے کی سمت چلے تو حارث جھکی جھکی گردن سے اُن کے درمیان آن کھڑا ہُوا۔

"اور میاں جی! میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تمہارے لیے۔"

میاں جی یوں چونکے جیسے اُس کی موجودگی کا احساس اُنہیں اب ہُوا تھا۔

"تمہارے لیے! میرا کیا حکم ہے؟"

میاں جی نے مجرموں کی طرح گردن جُھکائے کھڑے حارث کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر جیسے اُنہیں خود ...اختیار ہی نہ رہا ہو۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

"میرا حکم تمہارے لیے کیا ہو گا۔ حکم تو مجھے دو کہ میں تمہاری عظمت کے سامنے خود بہت چھوٹا ہو گیا ہوں۔ جہاں ...تمہارے جیسے عظیم بیٹے کا باپ ہونے پر آج مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے وہیں شرم سے ڈوبا بھی جا رہا ہوں۔ تم سے نگاہیں چار نہیں ...کر پا رہا۔"

حارث اُن کے سینے سے لگا کھڑا تھا اور میاں جی روتے رہے، بے تحاشا روتے رہے۔

صاحباں میاں جی کی پُشت پر کھڑی تھی۔ یوں حارث کا رُخ اُس کے سامنے تھا۔ میاں جی جس طرح رو رہے تھے، صاحباں ...سے اُن کے یہ پشیمانی بھرے آنسو اور اُن کی شرمساری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

خود بھی رو رہی تھی اور حارث کو اشارے کیے جا رہی تھی کہ کسی طرح میاں جی کو چُپ کرائے لیکن حارث نے نفی میں سر ...ہلا دیا۔

اُن کے یہ آنسو جیسے اُن کے گناہوں کو دھو رہے تھے، اُن کے ضمیر کی کسک اور چُبھن کو دُور کر رہے تھے۔ اُن کے

پچھتاووں کو ختم کر رہے تھے۔

"مجھ جیسے شخص کا بیٹا ہونے کے ناتے تمہارا ایک ایک لمحہ کس اذیت اور تکلیف میں گزرا ہوگا۔ یقیناً تم نے سب سے منہ چھپا کر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ تم کسی کو بھی اپنی ولدیت بتانے سے گریز کرتے ہوگے۔"

آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ میاں جی بڑبڑاتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ اس طرح کہ جیسے انہیں اپنا کوئی ہوش ہی نہ ہو۔

"تمہیں اتنی تعلیم دلا کر، اتنا باشعور کر کے، پھر میں نے تمہارے سامنے ایک گنہگار، اک مجرم، ایک بدترین باپ کھڑا کر کے کتنا بڑا ظلم تم پر توڑا ..... آج ہر بات کا احساس مجھے پوری شدت سے ہو رہا ہے ... اور ... اور ...."

وہ یک دم خود ہی حارث سے علیحدہ ہو کر اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر بولے۔

"ان سب کا کفارہ میں ادا کروں گا بیٹے، انشاءاللہ۔ پروردگار! تُو گواہ رہنا اور مجھے ہمت دینا۔"

"میاں جی۔"

اَب بہت کافی ہوگیا تھا۔ بہت پشیمان ہوئے تھے۔ بہت شرمندگی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک بوڑھا انسان۔ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ کہیں غم و پشیمانی کی زیادتی اُن کی صحت کو برباد نہ کر دے۔

ایک حقیقی بیٹی جیسی سوچ ذہن میں لے کر صاجیاں آگے بڑھی۔ حارث کا بازو پکڑ کر اسے پرے دھکیلا اور خود ان کے سامنے آ گئی۔ آنسوؤں سے دُھلے روشن روشن چہرے پر بھیگی بھیگی پلکیں، جگمگاتی آنکھیں اور مسکراہٹوں سے لبریز ہونٹ بڑا خوبصورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔

"حارث کو اپنا گھر سنبھالنے دیں اور آیئے ہم باپ بیٹی اپنی بی بی کے پاس چلیں۔"

صاجیاں نے موضوع کو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں، باپ بیٹی چلیں۔"

حارث نے اسی کے سے انداز میں اُسے پرے ہٹا دیا اور خود میاں جی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"تقریباً تین مہینے سے میاں جی اِس لڑکی نے اس گھر پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ اسے بھی یہیں چھوڑیں اور میں آپ کے ساتھ اپنی بی بی کے پاس چلوں گا۔ میری بی بی۔"

اس نے آنکھیں میچ لیں اور ایک ٹھنڈی سی آہ بھری۔

"چھ سال ہوگئے انہیں دیکھے ہوئے۔"

پھر آنکھیں کھول کر بالکل بچوں کے سے انداز میں شوخی سے مسکرایا۔

"آپ سے تو میاں جی میرا جھگڑا تھا لیکن میں نے بی بی کو اتنا یاد کیا ہے، اتنا یاد کیا ہے کہ بس کچھ پوچھیں نہیں۔ اور یہ صاجیاں۔"

صاجیاں کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اتنے عرصے سے ہر وقت اُن کے پاس رہی ہے۔ میرا حق زیادہ ہے۔"

"خواہ مخواہ۔"

صاجیاں نے بڑھ کر جلدی سے میاں جی کے پہلو میں گھستے ہوئے اُن کا بازو تھام لیا۔

"حق اُس کا جو حق بنائے۔ آپ کیوں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں نے تو کبھی ایسی بات نہیں سوچی۔ اس لیے میاں جی اور بی بی پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔"

میاں جی کے چہرے پر بڑا خوب صورت تبسم تھا۔ دونوں ..... معصوم بچوں کی طرح جھگڑ رہے تھے۔ وہ بے حد محظوظ ہو رہے تھے۔

"پھر ...؟ یہاں کون رہے گا؟ اُدھر کون جائے گا؟"

میاں جی کے شگفتہ چہرے پر شوخی بکھری۔

"جلدی فیصلہ کرو کس کا حق زیادہ ہے؟"

"میاں جی میرا۔"

صاجیاں ان کے بازو سے ..... جھول سی گئی۔

"میاں جی میرا زیادہ ہے۔ میں تو بی بی کے بغیر بیمار بھی ہوگیا تھا۔"

اُن کی دوسری سمت حارث جا کھڑا ہوا۔

میاں جی ایک زوردار قہقہہ لگا اُٹھے۔

"چلو دونوں ہی ... اور حق کا فیصلہ تمہاری ماں کی عدالت میں ہوگا۔ کہ کس کا زیادہ ہے۔"

میاں جی نے دوسرا بازو حارث کی کمر میں لپٹایا۔ آخر وہ اُن کا خون تھا۔ اتنا عرصہ جُدا رہا تھا۔ اُس پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ اس وقت تو انہیں اس کی جھگڑا کر کے گھر سے نکل جانے والی ادا بھی اچھی لگ رہی تھی۔ کم از کم بااصول تو تھا۔ صاحبِ ... تو تھا۔ نیکی بدی میں امتیاز کرنے کا شعور تو تھا۔ بدی سے دامن بچانا اور نیکی کے راستوں پر چلنے کی آگہی تو تھی۔ جس وقت اُس نے جنم لیا تھا۔ اُس وقت انہوں نے ایسے ہی بیٹے کی دُعا کی تھی اور بعد میں... بعد میں ... اس کا جھگڑا وغیرہ ... ی اپنی غلطی تھی، اپنا گناہ تھا۔ اس سوچ کے ساتھ شرمندگی بھرا ایک سایہ سا چہرے پر دوڑ گیا۔

"ہم تینوں ہی چلے گئے تو پھر یہ گھر۔ یہ کھلا ہی رہے گا کیا!"

صاجیاں سچ مچ گھر کی مالکن کے سے انداز میں تشویش بھرے لہجے کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

میاں جی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شکر ہے اندر کی سوچ اندر ہی رہتی ہے۔ چہرے پر نہیں لکھی جاتی۔

"تو رہنے دو کھلا ہی۔"

حارث نے بھی بے پروائی اور بے نیازی سے جواب دیا۔

"لیکن۔" صاجیاں بجانے کیا کہنا چاہتی تھی۔

میاں جی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں بھئی وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ قیمتی چیزیں تو میں سمیٹے لیے جا رہا ہوں پھر باقی یہاں کیا رہ گیا ہے جس کے لیے پریشان جائے۔"

"ایک تو بے شک قیمتی ہے میاں جی، مگر دوسری ... ؟"

حارث نے شوخی سے صاجیاں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

صاجیاں اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اتنے دنوں کی اُلجھن، پریشانی اور تناؤ کے بعد آج سارا معاملہ کھل گیا تھا۔ تینوں ہی بڑے ے موڈ میں تھے۔ بے حد خوش تھے۔

"ہاں میاں جی، دوسری بداخلاق، بدزبان اور جانور قسم کی ....."

"ارے ارے۔" میاں جی چونکے۔ مسکرائے اور پھر سب کچھ سمجھ کر چہکے۔

"یہ کس کی صفات بیان کی جا رہی ہیں۔ کیا کوئی تیسرا فرد بھی یہاں رہتا ہے؟"

صاجیاں کے جواب دینے سے پہلے ہی حارث مُسکراتے ہوئے جلدی سے متبسم لہجے میں بول اُٹھا۔

"رہتا تھا میاں جی، مگر یہ جو آپ کی بے حد پیاری ..... جان سے عزیز بیٹی ہے نا۔ اس نے اس بے چارے کو گھر سے ل دیا۔ اب پتا نہیں وہ کوئی دوسرا گھر تلاش کر پایا یا نہیں۔"

"کیوں بیٹی! حارث درست کہہ رہا ہے؟"

"میاں جی! کیا اب اس کی گواہی سے آپ میری بات کا یقین کیا کریں گے؟" حارث شاکی انداز میں بولا۔

صاجیاں زور سے قہقہہ لگا اٹھی۔

"بنا کر رکھی ہوئی ہے۔ اخلاق والی ہوں۔ تمیز والی ہوں۔ جھگڑالو نہیں ہوں اور سب سے بڑی بات۔ اپنے میاں جی کی بیٹی ہوں۔"

پھر وہ اُسی معصوم سے انداز میں ہنستے ہوئے میاں جی سے مخاطب ہوئی۔

"اور میاں جی ایک باپ کو بیٹی، بیٹے کی نسبت زیادہ پیاری ہوتی ہے نا!"

میاں جی ہنستے جا رہے تھے۔ اتنی مدت کا بچھڑا بیٹا آج ملا تھا۔ اس کے خلاف بھی کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے اور صاجیاں پورے ما اور اعتماد کے ساتھ ان سے پوچھ رہی تھی۔ اُس کی مخالفت کیسے کرتے؟

"بتایئے نا میاں جی۔"

حارث میاں جی کی پوزیشن کو سمجھ گیا تھا۔ صاجیاں کا دل یا مان ٹوٹنا اُسے گوارا نہ تھا۔ اِس سے پہلے کہ میاں جی کسی جھوٹ ....

کا سہارا لیتے یا پھر اسے مایوس کرتے حارث پہلے ہی بول پڑا۔

"ٹھیک ہے۔ باپ کو بیٹی اگر عزیز ہوتی ہے تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ ماں کو بیٹے سے زیادہ پیار ہوتا ہے۔ اب پوری بات سامنے ہی جا کر ہوگی۔ چلیں میاں جی۔"

سب سے پہلے حارث نے قدم اُٹھائے۔

"صاجیاں، حارث۔"

دروازے تک جا کر میاں جی یک دم تھم گئے۔ لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا پھر انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

"تمہاری ماں کے سامنے میرے شرمناک ماضی کا ذکر نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔"

وہ کچھ پریشان سے، کچھ بوکھلائے ہوئے سے جھجک کر کہہ رہے تھے۔

"دیکھو نا اولاد کی بات اور ہوتی ہے۔ خون کے ناتے بڑی جلدی ایک دوسرے کی بڑی سے بڑی غلطی یا گناہ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اور معاف کر دیتے ہیں لیکن... لیکن...!"

لمحہ بھر کے لیے اُنہوں نے توقف کیا۔ جیسے جو کچھ سمجھانا چاہ رہے تھے وہ بہتر طریقے سے نہیں کہہ پا رہے تھے۔

"میاں بیوی، زندگی بھر کے لیے ساتھی ہوتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ ناتا ہی بھرم کا ہوتا ہے۔ مان ہوتا ہے۔ شوہر کی طرف سے اگر بیوی کا دل ٹوٹ جائے تو....... بال آجاتا ہے جو کبھی نہیں جاتا۔ اس آخری عمر میں، میں نہیں چاہتا کہ تمہاری ماں کے دل میں میری طرف سے... میری طرف سے"

وہ خاموش ہو گئے۔ چہرے پہ عجیب سی پژمردگی چھا گئی۔ ساری پشیمانیاں جیسے اب ان پر اُتر ی تھیں۔ ساری ندامتوں نے جیسے اب اُن پر یلغار کی تھی۔

"ہاں میاں جی، آپ درست کہہ رہے ہیں۔"

حارث نے اُن کے چہرے کے رَدّ و بدل کو دیکھا۔ اُن کی مشکل جیسے اُن کے بتانے سے بھی زیادہ سمجھ گیا تھا۔ ہمیشہ سے ہی وہ اتنا سمجھدار تھا۔

"میں تو میاں جی! آپ کے کہنے سے پہلے ہی بی بی کو کچھ بھی بتانے کا ارادہ نہیں تھا۔"

"مجھے اپنی بیٹی کی عقل پر ناز ہے۔"

میاں جی نے مشکور نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پیار سے اپنے پہلو کے ساتھ لگا لیا۔

"فٹافٹ یہ اپنے نمبر بنا لیتی ہے۔"

حارث تیکھی نگاہ سے صاجیاں کو تکتے ہوئے بڑبڑایا۔ تو میاں جی اور صاجیاں دونوں ہی ہنسنے لگے۔

ایسی خوشی اور طمانیت سب کے چہروں پر تھی۔ کہ پہلے شاید کبھی بھی کسی کے نصیب میں نہ آئی ہوگی۔

میاں جی کے ایک پہلو سے صاجیاں لگی ہوئی تھی اور دوسرے سے حارث۔ اسی حالت میں چھوٹی چھوٹی معصوم معصوم باتیں اور نوک جھونک کرتے ہوئے تینوں جب گھر پہنچے... بی بی کے گھر، میاں جی کے گھر... اپنے گھر... تو....

کھانے کے کمرے میں اُسی طرح میز پہ کھانا لگا تھا۔ اُسی طرح کرسی پر بی بی بیٹھی تھیں اور میز کے ایک کنارے پر کہنی میں چہرہ دیے رو رہی تھیں۔

ان دونوں کو ذرا پیچھے چھوڑ کر میاں جی جلدی سے آگے بڑھے۔

"بیگم جب خدا خوشی دے تو آنسو نہیں بہایا کرتے۔"

میاں جی نے بی بی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر ہولے سے سہلایا۔

"صاجیاں آگئی؟" بی بی نے چونک کر سر اُٹھایا۔

"ہاں صاجیاں بھی آگئی اور یہ دیکھو اور کون آیا ہے؟"

"کون...؟"

بی بی نے آنکھیں جھپکتے ہوئے مرتعش لہجے میں پوچھا۔ جیسے خود اُنہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہو۔

"کون آیا ہے؟"

"تمہارا بیٹا۔"

"حارث...؟ میرا حارث...؟"

بی بی جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ سارا وجود کپکپا رہا تھا۔ مڑ کر میاں جی کی طرف دیکھا وہ اُن کے قریب ہی... کھڑا تھا۔

"ہاں ہاں وُہی ہے۔ وُہی ہے وُہی ہے۔"

بی بی دیوانوں کی طرح بڑبڑاتے اور اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے اُس کی طرف بڑھیں۔ ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ پورے کا پورا وجود لہرا گیا۔

"بی بی... میری اپنی بی بی۔"

حارث نے بڑھ کر جلدی سے ماں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھال کر گلے کے ساتھ لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دیجیے بی بی، میں نے آپ کو بہت دُکھ دیے ہیں۔ مگر اب انشاءاللہ سب کا ازالہ کر دوں گا۔"

بی بی نے سر اٹھا کر چمچماتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

"تم... تم... سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ ہاں بی بی! اب میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گا۔ آپ کے قدموں میں..."

حارث کے آنسو ماں کے چہرے پر ٹپکنے لگے۔ وہ کتنی نحیف و نزار ہو چکی تھیں۔ صرف ان چھ سالوں میں ورنہ پہلے تو عمر سے بھی زیادہ جوان لگا کرتی تھیں۔ جدائی کا اتنا غم انہوں نے سہا تھا۔

حارث کو بے حد دُکھ ہوا۔ آنسو بہتے ہی چلے گئے۔

"نہ میرا بچہ... نہ..."

بی بی بے اختیار ہو کر اُس کی پیشانی، اُس کی آنکھیں چومنے لگیں۔

عجیب نظارہ تھا۔ ایسا کہ وہاں...... موجود ہر ایک کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"چھ سال تو مجھ سے جدا رہا۔ تو نے اپنی شکل مجھے کیوں نہیں دکھائی؟ کیوں؟ آخر ایسی کون سی اتنی بڑی بات ہو گئی تھی؟"

"وہ بی بی... وہ... بس ایک غلطی ہو گئی تھی۔ معاف کر دیجیے۔"

بی بی بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ کہیں دل پر نہ اثر ہو جائے۔

"بیگم... بیگم..." میاں جی نے انہیں پکارا۔

"باپ کے ساتھ جھگڑ کر تو نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اپنے فرشتہ سیرت باپ کے ساتھ۔ آخر ایسی کیا بات تھی؟"

بی بی نے اسی انداز میں حارث کا گریبان تھام لیا تھا۔ جیسے باپ کی شان میں گستاخی کرنے کی اُسے سزا دینے والی تھیں۔ بس بات یہیں تک پہنچی تھی کہ پھر...

اور... میاں جی حارث کی پوزیشن سمجھ رہے تھے۔ آگے بڑھ کر بی بی کو کندھوں سے تھام لیا اور ان کا رُخ صاجیاں کی طرف...

"دیکھ لو کیسے دونوں مجرموں کو گرفتار کر لایا ہوں۔"

ماحول کو خوش گوار کرنے کی خاطر میاں جی ہنسے۔

"صاجیاں آگئی ہے؟ میری صاجیاں آگئی ہے۔ مگر..."

بی بی نے یکایک غصیلی نگاہوں سے اُسے گھورنا شروع کر دیا۔

"یہ وہاں سے گھر کیوں نہیں آ رہی تھی۔ کتنا ستایا ہے آج اس نے مجھے۔"

گو بی بی کی نگاہوں سے اس وقت غصہ عیاں تھا مگر پھیلے بازو اُن کی محبت کا کھلم کھلا اعلان کر رہے تھے۔

صاجیاں جھکے سر اور جھکی نظروں کے ساتھ اُن کے گلے سے لگ گئی۔

"بتاؤ نا ذرا تم، کیوں نہیں آ رہی تھیں؟"

بی بی نے اپنے سینے سے اُسے بھینچتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"وہ... وہ..." صاجیاں ہکلائی۔ بات کیا بنائے؟ فوری طور پر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"یہ بھی میں بتاؤں؟"

شہر جانے کب سے ان کے پاس کھڑی تھی اور سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ عادت کے مطابق بلا وجہ ہی کھی کھی کر کے

ہنسنے لگی۔

"تجھے کیا معلوم ہے ری ؟"

صاجباں نے سب کی نظریں بچا کر اُسے......... گھورا اور بی بی سے ذرا علیحدہ ہو کر کھانے کے لیے جا بیٹھی۔

"بہت کچھ معلوم ہے چھوٹی بی بی۔"

شرجانہ اُس کی نگاہوں کی فہمائش کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی دلیری اور ڈھٹائی سے بولی۔ پھر عجیب سے انداز میں دیدے بچا کر حارث کی طرف دیکھا۔

ایک منٹ پہلے آہستہ آہستہ چل کر صاجباں کے پیچھے بالکل قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ عین اس کے کان کے پاس مُنہ جا کر ہولے سے بڑبڑائی۔

"مجھے تو چھوٹے صاحب بہت پسند آئے ہیں۔ ٹھیک ہی آپ .... گھر واپس نہیں آ رہی تھیں۔"

"بدتمیز۔ بے حیا، بے شرم۔" صاجباں نے ہولے سے اسے جھڑکا۔

"چل بھاگ یہاں سے۔"

"کیا ہُوا بیٹی ؟"

"جی... جی... کچھ نہیں میاں جی۔"

"کوئی بات تو ہے بیٹی۔ کھانا کھانے کے لیے آگے بڑھ کر وہ بھی ایک کُرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"یہ شرجانہ کیا کہہ رہی تھی ؟"

"جی کچھ نہیں میاں جی یہ ہر وقت ایسے ہی اول فول بکتی رہتی ہے۔"

"کچھ کچھ سمجھ تو مجھے آگئی ہے۔" میاں جی بڑی دُور رس نگاہ رکھتے تھے۔

"جی... ؟ وہ کیا جی ؟ وہ کیا میاں جی ؟"

گھبراہٹ میں صاجباں کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ گیا۔

میاں جی نے اُس کی گھبراہٹ کی پروا کی اور نہ چمچ چھُوٹ جانے کی۔ بڑے شگفتہ انداز میں مُسکراتے ہوئے بولے۔

"لگتا ہے میری بیٹی اِس گھر سے کہیں اور نہیں جانا چاہتی.... بلکہ ہمیشہ میری ہی بیٹی بنی رہنا چاہتی ہے۔"

میاں جی سب میں بیٹھ کر اور خصوصاً حارث کے سامنے ہی ایسی بات کہہ دیں گے۔ اُسے توقع نہ تھی۔ پہلے چمچ چھوٹا تھا اور اب پلیٹ بھی ہاتھ سے گر گئی۔

"اِس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے !"

وفورِ مسرت سے ہانپتا کانپتا بی بی کا فقرہ اب صاجباں کی سماعت سے ٹکرایا تو...

وہ مزید وہاں نہ ٹھہر سکی۔ چند لمحے گھبرا گھبرا کر ایک ایک کو دیکھنے کے بعد شرم و حیا میں ڈوبا سُرخ چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

ملک جی کے بیٹے کو کار کا حادثہ پیش آگیا۔ بڑا خوب رُو اور کڑیل جوان بیٹا تھا۔ حادثے میں جان تو بچ گئی لیکن آنکھیں نہ بچ سکیں۔ بیٹے کو اِس حال میں دیکھ کر ملک جی کے دُکھ کی انتہا نہ رہی۔ ایک ہی تو بیٹا تھا۔ کیا کچھ نہ سوچ رکھا تھا، اُس کے لیے... اور سوچتے ہے نہیں۔

خُدا نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ ہزاروں ایکڑ زمین تھی، نہایت زرخیز۔ ہر سال لاکھوں من اناج دیتی تھی۔ وہ اناج منڈیوں میں بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں۔ جن سے نہ صرف شہر کے خوبصورت ترین علاقے میں موجود وسیع کوٹھی کے بلکہ بیسیوں مُلازموں کے بھی پُورے ہوتے تھے۔

ہر قسم کی آسائشیں میسّر آنے کے بعد، بینک بیلنس بھی روز بروز بڑھتا جا رہا تھا... اور اِن سب سے زندگی کی خوشیاں پانے اور لذّت ہونے کے لیے اُن کا بیٹا تھا ملک سہیل...

مگر آنکھیں کھونے کے بعد، ساری خوشیاں، ساری لذّتیں اُس کے لیے ختم ہو گئی تھیں۔ یہ رنگ برنگی دُنیا، تاریکی میں ڈوب گئی اور جب اُس کے مقدّر میں تاریکی ہی رہ گئی تھی تو کہیں کی بھی تاریکی ہو... شہر کی یا گاؤں کی، بات ایک ہی تھی۔

اِس خواب کے بعد ملک جی کا شہر میں قیام مناسب نہیں تھا۔ خواب کیا تھا، ایک اِشارہ تھا، خُدا کی طرف سے۔

صبح بیدار ہوئے تو اُنھوں نے خواب کسی کو نہیں بتایا البتہ شہر سے اپنے گاؤں زمینوں پر واپس جانے کا اعلان کر دیا۔ بیٹے کے اس کے بعد ملکانی خود اپنے ہوش و حواس میں نہ تھیں۔ ملک جی سے واپس جانے کے متعلق کیا پُوچھتیں کہ اُنھوں نے اچانک یہ ارادہ کیا ؟

اُن کے لیے بھی اب یہ ساری آسائشیں بیکار ہو گئی تھیں۔ اُن کی آنکھوں کے نُور کی دُنیا ہی تاریک ہو گئی تھی تو اُنھوں نے شہر کی اِن کو کیا کرنا تھا۔ اسی لیے جب ملک جی نے شہر چھوڑنے کو کہا تو اُنھوں نے خاموشی سے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

چُپ چاپ ساتھ ہو لیں۔ چند روز پہلے والے حالات ہوتے تو شاید وہ ملک جی کو ہرگز ایسا نہ کرنے دیتیں۔ کرنے بھی کیوں دیتیں ؟ جب کہ شہر میں آرام سے میٹھے بیٹھے، ہاتھ ہلائے بغیر، اُنہیں سب کچھ مل رہا تھا۔

باپ دادا نے جو اتنی زمین ورثے میں چھوڑی تھی، مزارعین اُس پر ہل چلایا کرتے تھے اور لاکھوں من اناج پیدا کرتے تھے... پھر اُن کے کارندے سارا غلّہ، بیل گاڑیوں پر لاد کر منڈی پہنچا دیتے اور جو آمدنی ہوتی وہ لا کر ملک جی کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے۔

زمین اتنی تھی کہ اُس کی آمدنی، دیانتدار اور بددیانت ہاتھوں سے گزرنے کے بعد بھی لاکھوں میں ہوتی تھی... اور یُوں بغیر ہاتھ، ... وہ سب خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔

رات کو خواب دیکھا، صبح اُٹھ کر بیوی اور اندھے بیٹے سمیت، شہر کی رونقیں، آسائشیں اور گہما گہمی چھوڑ، پہاڑوں میں گھری، اُس بستی میں جا کر ڈیرا جما لیا، جہاں اُن کے باپ دادا کی زمینیں اور حویلی تھی۔

وہاں رہ کر ہی وہ، وہاں کے لوگوں کے لیے کچھ کر سکتے تھے، جنھیں اب تک بھُولے ہُوئے تھے اور جن کے بارے میں اُنہیں خواب ... اب یہ خواب وہیں جا کر پُورا ہو سکتا تھا۔

اُجڑی حویلی جب آباد ہُوئی تو وہاں کے باسیوں کے دِل خوشی سے جھُوم اُٹھے۔ مالک کے بیٹے کی آنکھیں بے نُور ہونے کا غم بھی ... مالک کو اپنے درمیان پا کر مسرّت اور راحت بھی مِلی۔

پاس ہوں گے۔ دُکھ، سُکھ سنیں گے، مشکل کے وقت سہارا تو بنیں گے ورنہ اُن کے مقدّر میں تو صرف محنت کرنا اور پسینہ بہانا لکھا ... بے وقت کام آنے والا کوئی نہ تھا۔ دُکھ سہنے والا کوئی نہ تھا۔

سبھی تو ایک جیسے نصیب والے، غریب و مفلس ہی وہاں رہتے تھے جو محنت کر کے کما کر اُن کی جھولی میں ڈال دیتے تھے اور خود

تہی دامن بھرا کرتے تھے۔

ملک جی حویلی میں آگئے... اور یہ دیکھ کر سب کی خوشی دوچند ہوگئی کہ ملک جی اب پہلے والے ملک جی نہ تھے۔ رنگ وروپ د...
تھا، شکل وصورت اور قد وقامت وہی تھا۔ لیکن انداز بالکل بدلے ہوئے تھے۔

اُن کے مزاج میں انکساری آگئی تھی۔ بہت نرم گفتار ہوگئے تھے۔ غرض کہ اُن کی زندگی کا ہر طور بدل گیا تھا۔

...اب وہ، انہیں ایسے لگتے تھے جیسے وہ، انہی میں سے ایک ہیں... ان کے اپنے ہیں۔

ملک جی کو زندگی کی اصل حقیقت کا احساس اب ہوا تھا۔ وہ خواب' شاید انہیں راہِ ہدایت دکھانے ہی کے لیے نظر آیا تھا... ا...
کے بیٹے کی آنکھوں کا نور شاید اسی لیے پروردگار نے چھین لیا تھا کہ جن حقائق سے انہوں نے مُنہ موڑا تھا، انہیں محسوس کریں۔

ظاہر کے اندھیرے، باطن کی روشنیوں کو جنم دیتے ہیں... اور جب اُن کا باطن روشن ہوا تو انہیں حق اور ناحق میں تمیز کرنا آگئی۔ انہیں
معلوم ہوگیا کہ اب تک جو کچھ ہو رہا تھا، وہ غلط تھا۔ بے شمار انسانوں کی حق تلفی تھی۔

وہ آج تک دوسروں کی محنت پر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے رہے تھے جو سراسر ناجائز تھی۔

انہوں نے دل ہی دل میں اپنا محاسبہ کیا۔ اس نظام کا محاسبہ کیا جو گاؤں میں رائج تھا۔ بالکل فرسودہ اور ناانصافی پر مبنی۔

جو لوگ محنت کرتے تھے، خُون پسینہ بہاتے تھے اور فصل اُگاتے تھے... کیا زیادہ حق، اُن لوگوں کا نہیں تھا؟... یقیناً زمینوں
کی آمدنی پر زیادہ حق، انہی لوگوں کا تھا۔

تب شاید، اُن کی سوچ میں انقلاب آیا اور انہوں نے سوچا کہ اُن سے حق تلفی ہوئی ہے، ناانصافی ہوئی ہے، جو نہ ہونا چاہیے تھی۔

... اور جب محاسبہ مکمل ہوا...

من کی روشنیوں نے انہیں راستہ دکھایا۔

حق وانصاف کا راستہ۔

... تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب جو فصل آئے گی تو اس کی تمام آمدنی وہ، انہی حقدار لوگوں میں تقسیم کردیں گے جنہوں نے
محنت کی تھی، خُون پسینہ بہایا تھا۔ اب وہ، حق، حقدار کو پہنچانے ہی گاؤں آئے تھے۔

رہا، اُن کا اپنا معاملہ... تو اُن کے پاس اتنا تھا کہ انہیں مزید ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے سادگی کو اپنا لیا تھا۔ اس لیے اب اخراجات
میں خاصی کمی آگئی تھی... پھر اب لالچ کس لیے اور کس کے لیے کرتے؟ جس کے لیے اب تک سب کچھ کیا تھا وہی معذور ہوگیا تھا... جو
مہینے بھر میں ہزاروں روپے خرچ کر ڈالتا تھا، اب تو اس کا خرچہ سینکڑوں سے بھی کم ہوکر بیسیوں پر آگیا تھا۔

... پھر حقداروں ہی کو حق کیوں نہ دیا جائے۔ تجوریاں بھرنے اور بینک بیلنس بڑھانے سے کیا فائدہ؟

اور پھر باطن کی روشنیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ تمام ظاہر بھی منوّر ہوگیا۔

"اس فصل پر ساری آمدنی' پورے انصاف کے ساتھ... ان زمینوں پر محنت کرنے والے سب لوگوں میں یکساں تقسیم ہوگی"
ملک جی کی طرف سے اعلان کیا گیا۔

فصل کی کٹائی ہوئی۔ غلہ منڈی میں پہنچ گیا۔ دام وصول ہوئے... تو ملک جی کے حکم کے مطابق تمام مزارعے جمع ہونے لگے۔
حویلی کے باہر ایک میدان میں، لکڑی کے اُونچے سے تخت پر ملک جی نوٹوں سے بھری سینیاں لیے بیٹھے ہوئے تھے اور بستی کے
تمام لوگوں کے جمع ہو جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

اُن کے خاص خدمتگار نے جب سب کے پہنچ جانے کی اطلاع دی تو انہوں نے سب کو ایک قطار میں کھڑے ہو جانے
کا حکم دیا... پھر ایک ایک کرکے سب کو اپنے پاس بلانے لگے۔

"اللہ رکھا ولد خدا بخش...!"

ملک جی نے نوٹوں کی ایک گڈی اُٹھا کر قطار میں سب سے آگے کھڑے ہوئے مزارعے کا نام لے کر بلایا۔

وہ، ہونٹوں پر پُرمسرت مسکراہٹ سجائے، آگے بڑھا۔ ملک جی نے نوٹوں کی گڈی والا ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ کسی تیسرے ہا...
نے پہلو سے نکل کر اُن کا ہاتھ تھام لیا۔

ملک جی نے متحیرانہ انداز میں سر گھما کر، ہاتھ تھامنے والے کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

ان کا ہاتھ تھامنے والے کی آنکھوں میں ذہانت کی ایسی چمک تھی کہ ملک جی نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"انصاف...!"

"کیسا انصاف؟"

"آج تک اس زمین کی کمائی' میرے باپ دادا اور میں کھاتے رہے ہیں۔ یہ انصاف نہ تھا۔"

"انصاف کیا ہے؟"

"حق دار کو حق ملے۔ جنہوں نے محنت کی ہے، اب وہی اس کا پھل بھی کھائیں گے۔"

ملک جی کے چہرے پر قناعت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم کیوں فکرمند ہوتے ہو؟ اپنا اللہ مالک ہے۔ بس، وہ پچھلی کوتاہیوں کی معافی دے دے۔"

اُس نے اُن کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ دینے والا ہاتھ... اور سامنے لینے والا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔

"چھوڑ دو، میرا ہاتھ۔" انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "قرآن مجید میں ہے کہ نیکی کا کام جتنی جلدی ہو سکے، کر گزرو۔ اس
میں دیر نہیں لگانی چاہیے۔"

"لیکن نیکی کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے' ملک جی!"

"یہ غلط ہے، کیا؟" انہوں نے قدرے اُلجھ کر پُوچھا۔ "حقدار کو اس کا حق دینا غلط ہے کیا؟"

"نہیں' ملک جی! حقدار کو اس کا حق دینا عین ثواب کا کام ہے۔"

"پھر تم نے میرا ہاتھ کیوں تھام رکھا ہے؟"

انہوں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور بڑی نرمی سے بولے۔ "حق اور انصاف کے ساتھ ساتھ میں اپنے اجداد کی اس
زمین پر خوشحال لوگوں کی ایک بستی بسانا چاہتا ہوں جو آج تک میری غفلت کی وجہ سے نہیں بس سکی۔"

"مگر، ملک جی! لوگوں کو خوشحال بنانے کا یہ طریقہ تو نہیں۔ اس طرح تو آپ، ہمیں پہلے سے زیادہ بدحال کردیں گے۔"

"تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، ملک جی! آپ تو حق کی ادائیگی کرکے سرخرو ہو جائیں گے... مگر ہمیں رُوسیاہ کر دینے کا بھی آپ کو
حق نہیں۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" ملک جی نے ناگواری سے کہا۔ "جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔"

"تو سنیے، ملک جی! یہ ظلم ہم پر نہ کریں۔"

اُس نے ملک جی کا بازو چھوڑ دیا۔

"ظلم...؟" ملک جی کا نوٹوں کی گڈی والا ہاتھ آزاد ہوکر بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ طلبگار ہاتھ ابھی تک پھیلا ہوا تھا... لیکن اُن کا ہاتھ
اُن کے سینے میں جا پڑا۔

"ہاں، یہ ظلم ہے، ملک جی... ہم غریبوں نے اتنی بڑی رقم' یکمشت کبھی نہیں دیکھی۔ ہم' اسے خرچ کرنے کا طریقہ نہیں جانتے۔ ہم تو
بھی سادے بیوقوف سے دیہاتی ہیں۔"

وہ بڑے عجیب سے طنزیہ انداز میں ہنسا اور میدان میں جمع لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا! "ہم تو یہ رقم لے کر شہر جائیں گے۔ کوئی وہاں جوا
کھیلے گا، کوئی چرس پیئے گا، کوئی شراب... کوئی فلم دیکھے گا، کوئی رنڈی کے کوٹھے پر چلا جائے گا۔ ہمارے پاس رقم نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ
کرنے کی دلوں میں حسرت ضرور موجود ہے۔"

ملک جی بڑی حیرت سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"... اور یوں، آپ یہ رقم' ہمارے ہاتھوں میں دے کر ہمیں کیوں خراب کر رہے ہیں؟"

"عجیب انسان ہو، تم بھی۔" ملک جی قدرے جھنجھلا گئے۔

اُس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یُوں تو ہر وقت تم لوگ، زمیندار کے مظالم اور ناانصافیوں کا رونا روتے رہتے ہو... اور آج میں جب انصاف کرنے اور تم لوگوں
کو حق دینے بیٹھا ہوں تو تم ایسے کہہ رہے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

یہ رقم جب تک ایک ہے' بہت کام کی ہے، ملک جی! اگر ہر گڈی علیحدہ علیحدہ جیبوں میں چلی گئی تو بے کار ہو جائے گی...
بھلائی، بُرائی بن جائے گی۔"

"یہ مولاداد ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے' ملک جی! اس کے دماغ میں کوئی خرابی ہے۔" قطار میں سے ایک شخص نے غصیلی آواز میں کہا۔
... لیکن نہ ملک جی نے اس طرف توجہ دی اور نہ مولاداد نے اُس کی بات سُنی۔ وہ اپنی ہی کہے گیا۔ مبادا ملک جی دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔

"حق و انصاف کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں، خوشحال لوگوں کی بستی آباد کرنا چاہتے ہیں' ملک جی... تو یُوں یہ رقم، ہم لوگوں کے ہاتھوں میں دینے کے بجائے' اس بستی میں بچّوں کے لیے ایک اسکول کھولیے..."

"اس کے دماغ کے پُرزے بچپن ہی سے ڈھیلے ہیں' ملک جی! آپ اپنا کام کریں۔" قطار میں کھڑے ہُوئے لوگوں میں سے ایک اور شخص بھنّا کر بولا۔

پھر کئی آوازیں اس شخص کی تائید میں اُبھریں۔

مولاداد خاموش ہوگیا... لیکن ملک جی اپنی پُوری توجہ اُسی کی جانب مرکوز کیے ہُوئے تھے۔

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کہو... میں سُن رہا ہُوں۔"

مولاداد کے چہرے پر خوشی کا نُور سا پھیل گیا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ بچّوں کا اسکول کھولیے تاکہ ہمارے بچّے پڑھ لکھ کر خود کو پہچان سکیں... اور جب اپنی پہچان ہوگی تو خُدا اور رسُول کو بھی پہچاننے لگیں گے..."

"ہمارے بچّے بے پڑھے ہی سب کچھ پہچانتے ہیں، تم اپنی بات کرو۔" قطار بکھر کر ملک جی کے گرد جمع ہوگئی تھی۔ سب کے چہروں پر غصّے اور برہمی کے آثار تھے۔

ایک اَدھیڑ عُمر کا شخص تو آپے سے باہر ہی ہوگیا۔ اُس نے جب سے یہ سُنا تھا کہ ایک بڑی رقم ہاتھ آنے والی ہے تو اُسے اپنی دوسری شادی کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے نظر آنے لگے۔ جس عورت سے وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا وہ جوان تھی اور اُس سے عُمر میں کافی چھوٹی تھی لیکن اُن کے ہاں پیسے لینے کا رواج تھا... اور اس کے پاس صرف غربت تھی کبھی اتنی رقم دیکھی ہی نہ تھی کہ دوسری بیوی والی حسرت پوری کر سکتا... آج وہی ارمان پُورا ہونے جا رہا تھا کہ یہ مولاداد...

وہ کھَول رہا تھا، تلملا رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ "ملک جی... اِس کی باتوں میں نہ آجایئے گا۔"

"ہُوں..." ملک جی نے اس کی طرف دیکھا مگر سُنی اَن سُنی کر کے دوبارہ مولاداد کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کوئی ڈسپنسری بنایئے اس رقم سے۔" مولاداد پھر پُورے جوش و خروش سے بولنے لگا۔ "جہاں وقت پر ہمیں علاج کی سہولت ملے، اور ہم غریب بغیر دوا کے بے موت نہ مریں۔"

وہ سانس لینے کو لمحہ بھر کے لیے رُکا تو ملک جی ایک دَم بول پڑے۔ "اور...؟"

"ہمیں ایسے گھر بنوا دیجیے جن کی چھتیں' ایک آدھ بارش سے گھُل کر ہمارے سروں پر نہ آن گریں۔"

پچھلے ہی سال، بستی میں ایسے دو، تین حادثے ہو گئے تھے، جن کی طرف مولاداد کا اشارہ تھا۔

"اس کے علاوہ بستی میں روزمرّہ کی ضروریات کی دو، چار دُکانیں کھُلوا دیں۔ ایسی جہاں ہماری کھالیں نہ اُتاری جائیں۔ ہم اپنی بساط اور مرضی کے مطابق، مناسب داموں پر چیزیں خرید سکیں۔"

ملک جی، نوٹوں سے بھَری سینی کی طرف دیکھ رہے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔

"خوشحال بستی بنانا چاہتے ہیں تو ہمارے دِلوں میں مذہب کی روشنی پیدا کرنے کے لیے ایک مسجد تعمیر کرایے اور پھر اس میں کسی سمجھدار اور باعلم امام صاحب کا انتظام کیجیے... لوگوں میں نوٹ تقسیم کر دینے سے بستیاں خوشحال نہیں ہُوا کرتیں۔"

"اوہ..." ملک جی نے نوٹوں والی سینی پر دونوں ہاتھ پھیلا کر رکھ دیے جیسے اُسے ڈھانپ لینا چاہتے ہوں۔

"مگر تم... تم کون ہو؟"

وہ اُسے نہیں جانتے تھے لیکن آنکھیں جھپک جھپک کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"آپ مجھے نہیں جانتے، ملک جی! میں، آپ کی زمینوں پر کام کرنے والا ایک معمولی کسان ہُوں، مولاداد۔"

"مولاداد..." اُنہوں نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "یہی نام بتایا ہے نا؟"

"جی ہاں..."

"یہ سب باتیں تم نے کہاں سے سیکھیں؟"

"کہیں سے بھی نہیں۔ بس' دِل کی طلب ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "بہت عرصے سے دل میں یہ خواہش تھی کہ اللہ کی زمین پر کوئی بستی بھی ہو، جو گناہوں سے پاک ہو۔"

"آؤ، میرے ساتھ۔" ملک جی مولاداد کا ہاتھ تھام کر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ "چلو، حویلی میں۔"

پھر اُنہوں نے اپنے ملازمِ خاص کو نوٹوں کی سینی' اندر لے جانے کا حُکم دیا... اور اپنے گرد ہجُوم کو دیکھتے ہُوئے بولے۔ "یہ کام پھر کسی وقت کیا جائے گا۔ اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

طبیعت کی خرابی کا تو اُنہوں نے بہانہ ہی بنایا تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ مولاداد کی باتیں' اُن کے جی کو لگ گئی تھیں اور وہ اُن کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے... لیکن مصلحتاً صاف گوئی بھی اختیار کرنا نہیں چاہتے تھے کہیں بستی والے' مولاداد کی جان کے دُشمن نہ ہو جائیں۔

لوگ، مایوسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہُوئے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تو ملک جی، مولاداد کا ہاتھ تھامے حویلی کی بیٹھک میں آگئے۔

دو گھنٹے تک تنہائی میں وہ، مولاداد سے گفتگو کرتے رہے۔

اگلے روز پھر اُنہوں نے مولاداد کو بُلا لیا... پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ وہ کئی کئی گھنٹوں تک بیٹھے، اس سے صلاح و مشورے کرتے رہتے۔ بات چھوٹی نہ تھی، اس کے لیے وقت بھی اتنا ہی درکار تھا۔

اِدھر بستی کے لوگ اس انتظار میں تھے کہ ملک جی کب اپنا وعدہ پُورا کرتے ہیں... ویسے مولاداد نے ہر ایک کے دِل کی عکاسی خوب کی تھی لیکن...

آخر اُسے کیا حق پہنچتا تھا کہ یُوں اُن کی تمنّاؤں اور ارمانوں کا گلا گھونٹے۔ سب دل ہی دل میں اُسے کوس رہے تھے... لیکن ملک جی پر بھی اُنہیں پُورا بھروسہ تھا کہ وعدہ ضرور نبھائیں گے۔

ایک ہفتہ بیت گیا لیکن ملک جی کا وعدہ پُورا نہیں ہُوا... پھر لوگوں نے دیکھا کہ کھیتی باڑی والی زمین چھوڑ کر باقی جگہ کی پیمائش ہو رہی ہے۔

چند روز بعد' ملک جی اور مولاداد' شہر چلے گئے۔ جانے دونوں کیا کرتے پھر رہے تھے۔ لوگوں کے دِلوں میں مولاداد کی باتوں کا خیال تو آیا مگر اُنہوں نے سر جھٹک دیے۔ اُن کے ذہن ملنے والی متوقع رقم سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھے۔

... لیکن یہ اُن کی خام خیالی تھی۔ جب ملک جی اور مولاداد، شہر سے واپس آئے تو ان کے ساتھ سیمنٹ، ریت اور اینٹوں کے ٹرک آئے... گویا ملک جی اپنے وعدے سے پھر گئے تھے... اور اس کا باعث صرف مولاداد تھا۔

سب کے دلوں میں مولاداد کے خلاف زہر بھَر گیا جس نے عین وقت پر آکر ملک جی کا سخاوت والا ہاتھ تھام لیا تھا۔

مولاداد کیا تھا؛ بستی کا سب سے معمولی انسان... وہ دو سال کی عُمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ غربت و افلاس اور بچّے کی یتیمی کے غم نے اُس کی ماں کو بیمار ڈال دیا۔ پیٹ کا تنُور ہی نہیں بھَرتا تھا تو دوا کہاں سے آتی؟ چند مہینوں تک ایڑیاں رگڑتی رہی پھر چھ سال کے مولاداد کو بھَری دُنیا میں تنہا چھوڑ گئی۔

اُس کے ماں' باپ نہ جانے کہاں سے آکر اس چھوٹی سی بستی میں آباد ہو گئے تھے۔ کوئی رشتے دار یا عزیز نہیں تھا... پتا ہی نہیں تھا کہ ان کا... نہ کبھی کسی کا نام سُنا تھا۔

بس ہمسائے تھے جو روٹی ٹکڑا اور کبھی کبھار پھٹا پرانا، وہ بھی اپنے کسی بچّے کا پیٹ کاٹ کر دے دیتے تو اس کے پیٹ کی آگ بُجھ جاتی اور تن ڈھک جاتا۔

بستی میں بسنے والے سب ہی تو مفلس و غریب تھے۔ ایک ملک جی تھے جو ایسے وقتوں میں ان کے کام آ سکتے تھے، جن کے بزرگ وہ خون پسینے کی طرح بہایا کرتے تھے مگر وہ بھی جا شہر میں رہائش پذیر ہُوئے تھے۔

یوں اس بے سہارے پن میں مولاداد پلنے لگا۔ جانے اس کا ذہن کیسا تھا؛ سوچ کیا تھی؛ بچپن سے ہی وہ ایسی ایسی باتیں کیا کرتا تھا جو دوسروں کی سمجھ میں نہیں آیا کرتی تھیں۔

ایسے ایسے خواب دیکھا کرتا تھا جن کی تعبیر اس دنیا میں نہیں مل سکتی تھی مگر وہ پھر بھی دیکھا کرتا تھا۔ تبھی اسے کوئی صحیح الدماغ نہ سمجھتا تھا۔

... اور اب ملک جی بھی عجیب تھے۔ اس مجذوب کی باتوں میں آگئے تھے۔ وہی کچھ کر رہے تھے جو دیوانہ مولاداد کہہ دیتا۔ بستی میں ایک سے ایک بڑھ کر عقل مند موجود تھا اور سب سے بڑے تو ملک جی خود تھے۔

اتنا اچھا فیصلہ کیا تھا انہوں نے۔ اتنی انصاف والی بات کی تھی مگر یہ مولاداد۔ بھلا اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی جہنم واصل کیوں نہیں ہو گیا تھا۔ یہ گھڑی تو نہ آتی۔ آج سبھوں کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتیں جو ملک جی کے کان مولاداد کی باتوں سے نہ بھرے ہوتے۔ ملک جی کے خلاف تو کوئی کچھ نہ کہہ سکا مگر مولاداد کوئی بڑی ہستی تو تھی نہیں ملک جی کی طرح ان داتا بھی نہیں تھا۔ بستی کے ہر شخص کی زبان اس کے خلاف زہر اُگلنے لگی۔

سب نے اُس کا بائیکاٹ کر دیا۔ حقّہ پانی بند کر دیا۔ بول چال بند کر دی مگر یتیمی میں پلنے والا تنہائی کے زہر سے مرا نہیں۔ وہ تو اس کا عادی تھا۔

اس نے کسی سے معافی مانگی نہ اپنی ہٹ سے پیچھے ہٹا۔ اسی طرح ملک جی کا صلاح کار، مشورہ دہندہ بنا رہا اور ملک جی بھی اس کے سے خواب دیکھنے لگے۔ ایک تصوّراتی بستی کے کیوں کہ انہوں نے شہر سے گاؤں کی طرف جو ہجرت کی تھی وہ ایک خواب کا نتیجہ تھی اور مولاداد جو کچھ کہہ رہا تھا وہ انہیں اپنے اس خواب کی تعبیر ہی محسوس ہو رہی تھی۔

مولاداد بچپن سے ہی محنت کرنے کا عادی تھا اور اس کی جن باتوں کو لوگ دیوانگی اور مجذوب کی بڑ کہتے تھے۔ وہ اس کی سمجھ بُوجھ تھی، وہ اس کی عقل و دانش تھی۔

موقع ملا تو ملک جی کی زمینوں کی آمدنی اور اس کا دماغ مل کر کام کرنے لگے۔ لاکھ مخالفوں اور دشمنوں نے راہوں میں روڑے اٹکائے، کانٹے بکھیرے مگر...

... پانچ سال گزرنے کے بعد وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ پرائمری تک ایک اسکول تھا وہاں اب ایک ڈسپنسری تھی، ایک بڑی خوبصورت مسجد تھی۔ چند دکانیں تھیں جہاں ضروریاتِ زندگی معقول داموں مل جاتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات کے لیے شہر کا رُخ نہیں کرنا پڑتا تھا۔

... اور اب بستی کا ایک نام بھی تھا، تصوّر آباد۔ یہ نام ملک جی کے اندھے بیٹے نے رکھا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کے تصوّر کی آنکھیں جو نقشہ دکھا رہی تھیں وہ اسی قسم کا ہو سکتا تھا۔

وہ بھی اپنی محرومی کو بھُول کر تصوّر آباد کی تعمیر میں لگا ہُوا تھا۔ بہت خوش تھا اور اسے خوش دیکھ کر ملک جی جیسے پھر سے جی اُٹھے تھے اور اس میں سب سے بڑا ہاتھ مولاداد کا سمجھتے تھے۔ وہ احسان مند تھے اس کے۔ جس نے انہیں پھر سے خوشیوں کا اور نیکی کا راستہ دکھایا تھا۔

... اور خود مولاداد، اسے تو جیسے کوئی جنون سا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی پرواز کو اور بلند کرنا چاہتا تھا۔ معمولی چھوٹی سی ڈسپنسری کی جگہ ایک بڑا دواخانہ بنا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہشات بہت بلند تھیں۔

مولاداد جس کو اس کے اندر کی خواہشات نے بے چین و بے کل کر رکھا تھا۔ کتنے ظلم کی بات تھی وہ خود بالکل اَن پڑھ تھا۔ صبح کے وقت جو ماسٹر جی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ شام کو اپنے کام دھندے سے فارغ ہو کر وہ خود بھی ان سے پڑھنے لگا۔ مسجد کے امام صاحب سے قرآن پاک کا سبق پڑھ لیا بلکہ اس کے معنی بھی اچھی طرح سمجھ لیے اور انہیں کی روشنی میں اپنی زندگی کے شب و روز گزارنے لگا۔

اب مولاداد ایک فرد نہیں تھا پورا تصوّر آباد تھا۔ ملک جی اُس کا لحاظ کرتے تھے تو آہستہ آہستہ دوسرے لوگ بھی دلوں سے اس کی کدورت نکال کر اس کا احترام کرنے لگے تھے۔

بستی میں جو انقلاب آیا تھا وہ انہیں پسند آگیا تھا اور اس انقلاب کا بانی مولاداد تھا۔ وہ اس سے محبت بھی کرنے لگے۔ ہر بات ہر کام میں اس کی تقلید کرنے لگے تھے۔

مولاداد کے دیکھا دیکھی اور بھی کئی افراد سکول کے ماسٹر جی سے پڑھنے لگے تھے۔ امام صاحب مسجد سے قرآن پاک کا درس لینے لگے۔ مولاداد کی ہدایت کے مطابق مسجد کے امام صاحب جنہیں خصوصی مراعات دے کر ملک جی نے شہر سے بلایا تھا، لوگوں کو آہستہ آہستہ مذہب کی طرف لا رہے تھے۔

اکثریت لوگوں کی مسلمان ہو کر بھی مسلمان نہ تھی۔ اپنے مذہب ہی کی کسی بات کا علم نہ تھا اور جب تک مذہب نہ مکمل ہو.... انسانیت بھی مکمل نہیں ہوتی۔

وقت گزر رہا تھا۔ لوگوں کے دلوں کی تاریکیوں میں مذہب کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ اجالے بکھر رہے تھے۔ بصارت حاصل ہی تھی۔ عقل و شعور کے در کھل رہے تھے۔

لوگ خوش تھے، بہت خوش۔ غربت بے شک بالکل ختم نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے مصائب اور مسائل ختم ہو گئے تھے۔ وہ ن تھے۔

یک دن وہاں کے ایک دکان دار کی چوری ہو گئی۔ کوئی تھانہ یا پولیس تو وہاں تھی نہیں۔ پنچایت کا فیصلہ آخری ہوتا تھا۔ وہیں ری تھی، وہیں کا چور۔ اگلے دن ہی پکڑا گیا۔

وہ پنچایت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس دن مولاداد بھی وہاں موجود تھا اور بھی بہت لوگ آئے ہوئے تھے۔ چور کو کیا سزا دالی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے۔ چور نے اقرارِ جرم کر لیا تھا اور اب وہ سر جھکائے فیصلہ سننے کا منتظر کھڑا تھا۔

پنچایت میں تین پنچ تھے۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہے تھے۔ بڑی دیر سزا پر بحث کرتے رہے کہ کیا دینی چاہیے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کافی دیر کی بحث سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو تینوں آپس میں اُلجھنے لگے اور پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی بتائی ہوئی سزا کو مناسب کر اس پر لاگو کرنا چاہ رہا تھا۔

پھر جب بحث اور جھگڑا طول پکڑ گیا تو مولاداد اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"ہمارے پاس ایک ہدایت نامہ ہے تو پھر بحث و تکرار سے فائدہ؟"

مولاداد مسجد میں سے ایک قرآن پاک اُٹھا لایا۔

"اس میں پروردگار نے ہمیں زندگی کا ہر راستہ، ہر اُلجھن کا حل اور نقطۂ نظر سمجھایا ہُوا ہے۔ سارے قوانین اس میں موجود ہیں۔ ہم اس سے استفادہ کیوں نہ کریں۔"

مولاداد نے بات تو درست کی تھی۔ ہر ایک کے دل کو لگی۔

اسی وقت مسجد میں سے امام صاحب کو بُلوایا گیا اور سب کے سامنے ایک چور کی سزا کے متعلق تفصیل سے قرآن پاک اور... احادیث میں سے پڑھنے کو کہا گیا۔

یوں اس دن سے مولاداد پنچایت کا ایک اہم رکن بن گیا۔ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا مگر ملک جی اور چند دیگر بڑے بوڑھوں نے اسے بنا دیا۔

اب اس پر ایک بہت بڑی ذمے داری آن پڑی تھی۔ وہ اسے پورے انصاف سے نبھانا چاہتا تھا اور اسے نبھانے کے لیے اس کے پاس علم پُورا نہ تھا۔ اس کا اسے خود بھی احساس تھا۔

... اور اس کا یہ احساس اسے شہر لے گیا۔ وہ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھے۔ قرآن و سنّت کے خلاف۔ اسے پورا علم ہونا چاہیے تھا۔

شہر کی بڑی مسجد کے امام صاحب بہت پڑھے لکھے اور باعلم تھے۔ قرآن و سنّت کو اچھی طرح جاننے سمجھنے کے لیے مولاداد دو مہینے تک ان کے پاس ٹھہرا رہا۔

جب وہ شہر سے واپس آیا تو تصوّر آباد میں قرآن و سنّت کے مطابق قوانین نافذ کر دیے گئے۔ اسلامی نظام رائج کر دیا گیا۔

اسی طرح پندرہ سال گزر گئے۔ ان پندرہ سالوں نے کچھ ہاتھ پاؤں لیے۔ بے شمار کو کوڑے لگوائے۔ ایک یا دو کو سنگسار بھی کرایا مگر ساتھ ہی تصوّر آباد کو واقعی ایک تصوّراتی بستی بھی بنا دیا۔

مولاداد کے انصاف بھرے فیصلوں کی وجہ سے اسے مولے کے بجائے عادل اور بڑھتی عمر کے تقاضے کے ساتھ ساتھ عادل بابا کہا جانے لگا۔

عادل بابا بننے میں جہاں اسے نام اور شہرت ملی۔ وہیں اس سے اس کے دو بیٹے چھن بھی گئے۔ مگر اس نے انصاف کے نام کو بٹہ نہیں لگنے دیا۔

خود اپنی زبان سے انہیں سزا سُنائی۔ ایک کو دھوکا دہی کے جرم میں کوڑوں کی اور دوسرے کو چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹ ڈالنے کی۔

وہ عادل بابا کے بیٹے تھے۔ دوسرے ان کی رعایت کرنا چاہتے تھے مگر اس نے صاف کہہ دیا۔

"انسان سب برابر ہوتے ہیں خواہ بادشاہ کا بیٹا ہو یا کسی مزدور کا۔ قانون سب کے لیے ایک جیسا ہوتا ہے۔ قانون میں کوئی رعایت نہیں اور میں قانون کا محافظ ہوں۔"

تب اس محافظ نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں سزائیں دی تھیں کوئی اور دینے کو تیار نہ تھا۔

...اور کوئی تو بے انصاف بھی ہو سکتا تھا مگر تصور آباد کا منصف پنچایت کا سرپنچ۔ وہ بے انصافی یا رو رعایت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سب کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا تھا اور آج تک رعایت کسی کو نہیں دی تھی۔ انصاف کا تقاضا پورا کیا تھا۔

اس کے جس بیٹے کو کوڑوں کی سزا ملی تھی۔ وہ تو وہیں کوڑے کھاتے کھاتے ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔

دوسرا، جسے چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹ ڈالنے کی سزا ملی تھی۔ ہاتھ کٹنے کا اسے کچھ ایسا صدمہ ہوا۔ ایسی شرمندگی ہوئی، سزا کے بعد ایسے پچھتاوے لگے کہ کم از کم اسے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو عادل بابا کا بیٹا تھا۔ اس بستی کے منصف اور قاضی کا بیٹا... وہ کوئی اچھا کام کر کے اگر باپ کا نام روشن نہیں کر سکا تھا تو اسے بدنام بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ اس سے کیا ہو گا؟

انہیں شرمندگیوں اور پچھتاووں میں اُلجھ کر بیمار پڑ گیا اور پھر ایسا بیمار پڑا کہ پھر اُٹھ نہ سکا۔ گاؤں والوں کو اپنا مُنہ ہی اس وقت دکھایا کہ جب ان کے دیکھنے سے اسے کسی شرمندگی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ سب احساس لیے وہ اپنے رب کے پاس چلا گیا۔

بیٹوں کے معاملے میں عادل بابا کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ تو کسی اور کی سفارش یا رعایت کون کر سکتا تھا۔ کوئی نہیں۔ کوئی ایک شخص بھی نہیں۔ ملک جی بھی نہیں۔

اس لیے سب عادل بابا کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کے ساتھ سب کو ایک خاص عقیدت سی تھی۔

ان دو بیٹوں کے علاوہ دو لڑکے اور دو لڑکیاں قضائے الٰہی سے رخصت ہو گئے تھے۔

... اور اب صرف صاجیاں تھی اس کے پاس۔

اس کی زندگی کی واحد خوشی۔

اس کی حیات کا واحد سہارا۔

اس کے بڑھاپے کی لاٹھی۔

اس کے دُکھوں کا مداوا۔

بھولی بھالی اور معصوم سی لڑکی۔

صاجیاں۔

... اور اب وہ کہاں تھی وہ؟

عادل بابا غم کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ اس کی زندگی کی واحد خوشی گم ہو گئی تھی۔ اس کی حیات کا سہارا کھو گیا تھا۔ اس کی لاٹھی اس سے چھین گئی تھی۔ جانے کیسے یہ ہو گیا تھا اور کیونکر ہو گیا تھا۔

صبح زندگی کے لیے نیا پیغام لے کر آتی ہے۔ نور لے کر آتی ہے۔ روشنی لے کر آتی ہے۔

مگر تصور آباد میں وہ صبح بڑے بھیانک سناٹے لے کر آئی تھی۔ بارہ چودہ سو نفوس پر مشتمل آبادی والی اس بستی میں آج کسی گھر میں چولھا نہیں جلا تھا۔

آج کسی ماں نے اپنے بچے کے لیے چوری نہیں بنائی تھی۔ کسی بیوی نے اپنے شوہر کے لیے روٹی نہیں پکائی تھی۔

یہاں تک کہ دودھ پینے والے بچے اپنی ماؤں کی گودیوں میں پڑے ماں کی چھاتیوں کو ہاتھ مار مار کر واویلا کر رہے تھے، بلبلا رہے تھے مگر ماؤں کو ان کی بھوک کی فکر کر کے اسے مٹانے کا کوئی ہوش نہ تھا۔

دانتوں میں اُنگلیاں دابے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسری کو دیکھتے ہوئے اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کھُسر پھُسر کرتی ہوئی عورتیں عادل بابا کے صحن میں جمع تھیں۔

درمیان میں عادل کی بیوی سکینہ بیٹھی بلند آواز میں رو رہی تھی۔ بین کر رہی تھی۔ کبھی کبھی دُکھ انتہا کو پہنچ جاتا تو وہ جوش میں آ کر زور زور سے سینہ کوبی کرنے لگتی۔ سر کے بال نوچنے لگتی اور گال پیٹنے لگتی۔

عورتیں بڑی ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھیں اور باری باری بڑھ کر اسے تسلیاں دلاسے دے رہی تھیں مگر ہر ایک کی تسلی میں کھوکھلا پن اس قدر نمایاں تھا کہ تسلی بے تسلی ہوئی جا رہی تھی۔

سکینہ کو صبر نہیں آ رہا تھا۔ مسلسل تین گھنٹے سے وہ اسی طرح اپنا آپ گُم رہی تھی۔ اس پر حادثہ بھی تو ایسا گزر گیا تھا کہ جو کچھ نہ کر

زرتی تھوڑا تھا۔

اس کے صحن میں جمع شدہ عورتوں سے اس کی نہ رشتہ داری تھی نہ کوئی عزیز داری۔ صرف ہمسائیگی یا ایک ہی بستی میں رہنے کا تعلق تھا مگر ان سب کے دل... اس کے دکھ میں جل رہے تھے۔

ان سب کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والے آنسو تھے۔ ان کے ہونٹوں پر بھی بین تھے مگر بے آواز۔

اس لیے کہ وہ عادل اور سکینہ کا دُکھ بڑھانے نہیں انہیں صبر حوصلے کی تلقین کرنے آئی تھیں۔ ان کے غم میں شریک ہونے آئی تھیں۔ سکینہ تو خیر صاجیاں کی ماں تھی... لیکن ان سب کو صاجیاں کچھ کم عزیز نہ تھی۔ سکینہ کی کوکھ سے جنم لینے والی صاجیاں کے لیے بستی کی ہر عورت کی آغوش آغوشِ مادر تھی۔

اس کی وجہ عادل کی منصف مزاجی، سکینہ کی خوش اخلاقی اور صاجیاں کی معصومیت تھی۔

وہ اسی طرح پھول پھول اُڑنے والی تتلی کی طرح ہر گود سے پیار لیے بڑھی تھی۔ ایسی خوب صورت جوانی تصور آباد کی کسی بھی جوان ہونے والی لڑکی پر نہیں آئی تھی جیسی صاجیاں پر۔

ساری بستی میں اس کے چرچے تھے۔ مگر خود اسے اس انداز سے — اندازہ نہ تھا۔ خود وہ بچوں ہی کی طرح معصوم تھی۔

ہر گھر میں اس بے تکلفی سے چلی جایا کرتی۔ اسی معصومیت سے باتیں اور شرارتیں کرتی رہتی۔ اسی الھڑپن سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ آموں کے باغ میں آنکھ مچولی کھیلا کرتی۔

اس کے جسم پر جوانی بے شک چڑھتی ندی کی طرح بپھر کر آئی تھی۔ لیکن اس کا ذہن شباب کے اس سیلاب سے ابھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

مگر... مگر... مگر... ہر ذہن یہی سوچ رہا تھا کہ آج کا واقعہ کیونکر رُونما ہو گیا۔

کسی آنکھ نے اسے کبھی آوارگی کرتے نہ دیکھا تھا۔ کسی لڑکے سے اس کی دوستی نہ تھی۔ اشارے کنائے نہ تھے۔ چور نگاہوں یا مسکراہٹوں کے تبادلے نہ تھے۔ کچھ بھی تو نہ تھا۔

تصور آباد کا ہر فرد اس کا گواہ تھا کہ وہ مُجرم نہ تھی۔ نہ اس نے کسی سے یارانہ گانٹھا تھا نہ گھر سے فرار ہوئی تھی۔ اس جیسی معصوم لڑکی ایسی کوئی حرکت کر ہی نہ سکتی تھی۔

یہ یقیناً یا تو کسی کی دشمنی تھی یا پھر آسیب وغیرہ۔ اس کے علاوہ تیسری کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔

ملک جی کو علم ہوا تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اور اپنے اندھے بیٹے سہیل کا ہاتھ تھامے ہوئے فوراً چلے آئے۔

ان کے حکم سے بستی کے ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ کھیتوں اور ویرانوں کی طرف انہوں نے اپنے آدمی دوڑا دیے۔ یہاں تک کہ صاجیاں کا سُراغ لگانے کی خاطر کنوؤں تک میں بانس ڈلوا دیے۔

مگر اس کا سراغ نہ لگا۔

ملک جی اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے لیکن ذہن اس طرح کام کرتا تھا۔ کچھ نابینا ملک سہیل کے مشورے ایسے بصیرت افروز ہوتے تھے کہ خود انہیں اپنے بوڑھے ہونے کا ذرا سا بھی احساس دلائے بغیر سب کچھ سُجھا دیتے تھے۔

عورتوں کے شک نے یقین کی صورت اختیار کر لینا تھی اگر ملک جی سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے ہٹا نہ دیتے۔ بڑھتی ہوئی یہ کھسر پھسر یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ دو تین عورتیں رات کسی ضرورت سے بیدار ہوئیں تو انہوں نے ہوا میں سیٹیوں کی آوازیں سُنیں۔ کچھ عجیب قسم کی سرسراہٹیں اور سرگوشیاں بھی سُنیں۔

جس کا مطلب تھا کہ ایسی آوازیں ہوائی مخلوق کی ہوتی ہیں۔ رات ان کا ادھر سے گزر ہوا۔ صاجیاں اس گاؤں کی سب سے زیادہ خوب صورت لڑکی تھی انہیں پسند آ گئی اور بس۔

ہوائی مخلوق اُسے لے اُڑی۔

"یہ کیا بکواس ہے۔"

ملک جی کی ڈانٹ سُنتے ہی آناً فاناً عادل کا صحن خالی ہو گیا۔

اب وہاں صرف عادل اور سکینہ رہ گئے تھے اور ملک جی اور ملک سہیل تھے۔

"تمہارا بھی ایسا ہی خیال ہے عادل میاں۔"

"نہیں نہیں۔ توبہ جی توبہ۔"

بھرائی ہوئی آواز میں عادل کے لب کپکپائے۔

"اباجی۔ آپ اس بے چارے مصیبت کے مارے سے کیا پوچھتے ہیں۔ اپنے کھوجیوں کو بلوایئے۔"

"کھوجیوں کو؟"

ملک جی سوچ میں ڈوبے ڈوبے سے اُبھر کر بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہاں کے کھوجی تو کسی کی گائے گم ہوجائے یا بھینس وغیرہ کا کھوج بھی نہیں لگا پاتے۔"

"آپ بلوایئے تو سہی پورا گاؤں بچی کی تلاش میں لگ رہا ہے مگر کامیابی نہیں ہوئی کھوجی ہر قسم کا کھوج لگا لیا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے صاجاں کا بھی وہ پتا چلا لیں گے۔"

"تم کہتے ہو تو بلوا لیتا ہوں لیکن اُمید ذرا۔۔۔"

اپنی بات نامکمل چھوڑتے ہوئے انہوں نے یکایک عادل کی طرف دیکھا۔

"کیوں عادل میاں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ سہیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بلوائے جائیں کھوجی؟"

عادل بابا سوچوں میں ڈوبا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔

"تم نے کچھ نہیں کہا؟" ملک جی نے پوچھا۔

اب بھی عادل زبان سے کچھ نہیں بولا صرف نظر اٹھا کر ملک جی کو دیکھا۔ اور پھر گردن جھکا لی۔

کیا کچھ نہ تھا اس ایک نگاہ میں۔ ملک جی نے سب پڑھ لیا۔

اس کی ویرانی کہہ رہی تھی۔ اگر اس کی صاجاں نہ ملی تو ایسے ہی وہ خود کو بھی گم کرلے گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

۔۔۔ اور عادل گم ہو گیا تو۔۔۔

تصور آباد تو نہ صرف ان کا بلکہ اب ملک سہیل کی زندگی کا بھی سکون و قرار تھا۔

اس کے علاوہ جتنی عادل نے اس بستی کی اور بستی والوں کی خدمت کی تھی۔ اس کا حق بنتا تھا کہ وہ سب جس طرح بھی۔۔۔ ہو سکے اس کی صاجاں کو تلاش کر کے اس کے سامنے لا کھڑا کریں۔

آج تک عادل نے کسی سے کچھ نہ لیا تھا۔ ملک جی سے بھی نہیں۔ سب کچھ بے لوث کیا اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ عادل کے پچھلے سارے قرض چکا دیتے۔ اس کی صاجاں کو ڈھونڈ کر لا دیتے جس طرح بھی ممکن ہو سکتا۔ ان کے وسائل تو بہت تھے۔ بے بس اور بے پر تو صرف عادل تھا۔

عادل بے بس و مجبور ضرور تھا لیکن ملک جی اور ملک سہیل تو نہ تھے۔ پڑھے لکھے اور تجربہ کار تھے۔ زندگی کا ایک خاص حصہ شہر میں بھی گزار چکے تھے۔

اور شہر میں جیسی زندگی گزاری تھی وہ تجربات سے پُر تھی۔ خصوصاً ملک سہیل کی۔ ہر قسم کی سوسائٹی میں گھوما پھرا تھا۔ دولت پاس تھی۔ اچھا بُرا سب کچھ کیا تھا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ نہ کوئی پابندی۔ بہت کچھ کھویا۔ بہت کچھ پایا۔ بہت کچھ سیکھا۔

اور۔ سب سے زیادہ تو اب سیکھا یا شاید سیکھا نہیں۔ خدا نے ودیعت کیا۔ بینائی چھین کر من کی روشنی دے دی تھی۔ اب ملک سہیل بڑی سمجھداری کی باتیں کرتا تھا۔ ایک ایک لفظ اس کا موتیوں میں تولنے والا ہوتا تھا۔ ایک ایک مشورہ انمول ہوتا تھا۔ بے مثال ہوتا تھا۔

کئی دن، کئی ہفتے، کئی مہینے بیت گئے تھے۔ صاجاں کا کوئی سراغ نہیں لگا تھا اور یہ صرف عادل ہی کی نہیں خود ان کی بدنامی تھی۔ ان کے گاؤں سے یوں چپ چپاتے اور اس انداز میں ایک جوان لڑکی گم ہوجائے اور پھر تلاش نہ کی جا سکے۔

دونوں باپ بیٹا عادل سے زیادہ پریشان تھے۔ عادل کی بجائے اسے اپنا مسئلہ، اپنی عزت، اپنی غیرت سمجھتے تھے لیکن کچھ زیادہ اس لیے بھی۔ کہ۔

عادل نے ان کی اور ان کے تصور آباد کی بڑی خدمت کی تھی۔ اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ اس گاؤں کو اچھے انداز سے آباد کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں اس نے اسے ایک مثالی بستی بنانے میں اپنی اولاد قربان کی تھی۔ اپنا تن من لٹایا تھا۔

اور اب۔ صاجاں کے اس واقعہ پر وہ بظاہر خاموش تھا لیکن ملک جی اور ملک سہیل اس کے اندر کے دُکھ کو جانتے تھے انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کس کرب و اذیت سے گزر رہا تھا۔ سدا مسکراتے رہنے والے عادل کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

تھی۔

صاجاں کے گم ہو جانے کے بعد پورے تصور آباد میں کچھ ایسا سناٹا سا چھایا تھا کہ لوگ۔۔۔ کچھ کرنا ہی بھول گئے تھے صرف بنیادی ضروریات تھیں جنہیں جیسے مجبوری سے سب پوری کیے جا رہے تھے۔

کھانا پینا، پہننا اوڑھنا اور سونا۔ اور۔ باقی وقت جہاں کہیں دو چار اکٹھے ہو جاتے، صاجاں کا ذکر چھڑ جاتا۔ کسی نے مرحلے میں اپنی کسی اولاد کا کچھ نہیں کیا تھا۔ نہ رشتہ ناتا نہ شادی بیاہ۔ نہ کوئی اور تقریب تہوار۔ پورے کا پورا تصور آباد سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

عادل بابا نے بڑے صبر و حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا مگر سکینہ بیٹی کی جدائی میں ایسی بیمار پڑی کہ بستر کی ہو کر رہ گئی۔

اور ملک جی اور ملک سہیل یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے اور یہ ان کا تصور آباد تھا۔ ان کے تصور آباد کو ضرورتوں اور خوشحالیوں سے دوچار کرنے والا عادل تھا۔ وہ اپنی اس بستی اور اس کے لوگوں کے لیے اور عادل کے خاندان کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ بس ایک بار پھر ان کی بستی کی خوشیاں لوٹ آئیں۔ عادل کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھر اُٹھیں صاجاں مل جائے۔ اسے تلاش کیا جائے۔

اپنے گاؤں کے اور ارد گرد کی بستیوں کے کھوج لگانے والوں اور سیانوں کو آزما ڈالا۔ بہت پیسہ خرچ کیا۔ جہاں ہوتے وہاں بیس خرچ کیے۔ فالیں نکلوائیں۔ پیروں فقیروں کے پاس گئے۔ تعویذ گنڈے کو نہیں مانتے تھے مگر۔ وہ بھی دیکھا۔ کچھ حاصل وصول نہ ہوا۔

آخر میں تھک ہار کر پولیس میں بھی رپورٹ درج کرائی۔ عادل کے نہ چاہنے کے باوجود ملک جی خود تھانے گئے۔ تھانیدار حویلی میں آیا۔ اس کی خاطر مدارات کی۔ تفتیش ہوتی رہی لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی ناکام ہو کر بیٹھ گئے یا پھر ویسی توجہ نہیں دی جیسی دینا چاہیے تھی۔

یا۔ نجانے کیا ہوا۔ بہرحال نتیجہ صفر رہا۔ صاجاں کا کوئی سراغ کوئی کھوج نہیں لگا۔

اور۔ اب تو تصور آباد کے زیادہ تر لوگ واقعی یہی سمجھنے لگے تھے کہ صاجاں کی گمشدگی میں کسی انسان کا ہاتھ نہیں تھا۔

وہ غائب بھی تو بڑے انوکھے انداز میں ہوئی تھی۔ اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں اپنی ماں کے ساتھ ملی ہوئی چارپائی پر سوئی تھی۔ کوئی کھٹکا نہیں ہوا۔ کوئی آہٹ نہیں۔ باہر کھلنے والا صحن کا دروازہ بھی اسی طرح بند تھا۔ اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔

چارپائی کے پاس اسی طرح اس کی جوتی پڑی ہوئی تھی۔ سرہانے دوپٹہ۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ لگتا تھا جیسے اُوپر سے کسی نے اُسے اُوپر کھینچ لیا تھا۔

پھر۔ کیسے نہیں لوگ ایسے ایسے وہموں کا شکار ہوتے لیکن۔ ملک سہیل کسی صورت یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

"اباجی۔! ایک دن گھنٹوں سے سوچوں میں کھوئے بیٹھے ملک سہیل نے باپ کو پکارا۔" میرا خیال ہے شہر سے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کو بلایا جائے۔"

"کچھ نہیں بنے گا بیٹے! مجھے لگتا ہے وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہے۔"

"لیکن اباجی! یہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔ زندہ کا سراغ نہیں ملا تھا تو یہی پتا چل جاتا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ ہو گیا۔"

"پریشانی سی پریشانی ہے۔ کیسے غم کے بادلوں نے ہماری بستی کو گھیر لیا ہے۔ لگتا ہے جیسے اب یہ کبھی بھی نہیں چھٹیں گے خوشی کا سورج کبھی نہیں نکلے گا۔"

ملک جی نے ایک طویل سی ٹھنڈی آہ بھری۔

"عادل اور سکینہ کے لیے میرا دل روتا ہے۔"

"اسی لیے کہتا ہوں ایک کوشش اور کر دیکھیں۔ بہت دنوں سے یہ سوچ میرے ذہن میں آرہی ہے۔"

"تمہاری سوچ اور مشورہ ہوتا تو ہمیشہ درست ہے۔"

"تو پھر مان لیجیے۔"

"کسی سراغ رساں کو تم جانتے ہو۔ مجھے تو اب جیسے تصور آباد کے علاوہ نہ کسی اور علاقے کا پتا ہے اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کے علاوہ کسی جگہ کے لوگوں کو جانتا ہوں۔ سب کچھ جیسے بھول بھال گیا ہوں۔"

"میرا ایک دوست نہیں تھا اباجی! جو اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ شاکر۔"

"شاکر۔۔؟" ملک جی کچھ سوچنے لگے۔

"وہی نا جس کا باپ ایک جاگیردار تھا اور اسی واسطے تمہاری اور اس کی دوستی دوسروں کی نسبت زیادہ گہری تھی۔"

"ہاں ہاں وہی۔ اسے بچپن سے ہی جاسوسی کرنے اور جاسوسی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ ایم۔اے کرنے کے بعد بھی تو اس نے یہی پیشہ اختیار کر لیا حالانکہ اس کا باپ اس کی مخالفت کرتا تھا۔"

"کیوں؟"

"زمینیں جائداد بہت تھی اور اس کا خیال تھا اسے کچھ... کرنے کی ضرورت نہ تھی۔"

"یہی میں نے تمہارے متعلق سوچا تھا۔" ملک جی دلگیر سے ہو کر بولے۔

"اور وہی بات ہو بھی گئی۔" ملک سہیل کے لبوں پر ایک تلخ سا تبسم پھیل گیا۔ "میں سدا کے لیے بے کار ہو گیا۔"

"ہاں تو تم شاکر کی بات کر رہے تھے۔" ملک جی نے جلدی سے موضوع کو پھر اِدھر ہی موڑ دیا۔ بیٹے کی محرومی کا احساس انہیں بھی تو ہر لمحہ ڈستا رہتا تھا۔ بہت دل دُکھتا تھا اس ذکر سے۔

"ہاں۔ وہ شاکر۔ وہ بڑا کامیاب سراغ رساں بن گیا تھا آبا جی۔! دو تین کیس میرے سامنے اس نے کیے تھے۔ بڑے مشکل تھے لیکن اسے خدا کی طرف سے کچھ ایسی ذہانت عطا ہوئی ہے کہ بڑی کامیابی سے حل کر لیے۔"

"تم اس کا پتا جانتے ہو؟"

"ہاں۔ ابھی تک یاد ہے۔"

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ باپ کی خواہش کے مطابق اپنی جاگیر پر چلا گیا ہو اور اب وہ یہ کام نہ کرتا ہو۔"

"امید تو نہیں۔ وہ دوسرے ہی خیالات کا مالک تھا۔ خود کمانا اور کھانا۔ جب تک خود کسی قابل نہ ہوا بس اس وقت تک باپ سے خرچ لیتا رہا پھر جب کمانے لگا تو پھر باپ سے کچھ نہیں لیتا تھا۔"

"بڑے اچھے اصول رکھتا تھا۔"

"ہاں۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ وہ اب تک وہیں ہو گا اور یہی کام کر رہا ہو گا۔ اس میں اسے آمدن بھی بہت تھی اور دلچسپی بھی۔"

"پھر۔۔؟"

"کل ہی طفیل کو شہر بھیج دیں۔ میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ اب تو اس سے ملے پندرہ سولہ سال کے قریب ہو گئے۔ پھر بھی مجھے یقین ہے وہ میرے بھیجے ہوئے کسی آدمی کی بھی اسی طرح عزت کرے گا۔ اب بھی آبا جی۔ اس کا اور میرا اتنا دوستانہ تھا۔"

پھر ملک سہیل نے آہ بھرتے ہوئے ہولے سے کہا۔ "میں نے اچھا نہیں کیا۔ بینائی گئی تھی تو قدرت کی طرف سے میرے ملنے والوں کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ مگر میں نے سب سے رُخ پھیر لیا۔"

بیٹے کے انداز اور لب و لہجے نے اب باپ کو بھی دل گرفتہ کر دیا۔ تسلی آمیز لہجے میں جلدی سے بولے۔

"تم نے تو نہیں رُخ پھیرا تھا۔ میں ہی تمہیں یہاں اُٹھا لایا تھا۔ شہر میں رہتے تو شاید تمہاری آنکھوں کا بھی کوئی نہ کوئی ہو ہی جاتا۔"

"ایسے نہ کہیں۔ آنکھوں کا اب مجھے کوئی غم نہیں۔ میں نے ان کے بدلے میں تصور آباد جو پا لیا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی مجبوریاں ختم ہو گئیں۔ بدحالی دُور ہو گئی۔ کتنی دُعائیں دیتے ہیں سب۔ وہاں رہتا تو یہ سب کچھ کہاں ملتا؟"

"خالی خولی دعائیں ہی ملی نا۔ آنکھیں تو نہیں مل سکیں۔"

ان کے الفاظ میں ان کے انداز میں حسرت ہی حسرت تھی۔ "میں نے کہا تھا نا آبا جی! مجھے اس کا دکھ نہیں۔ میں بہت خوش ہوں اور آپ کو بھی خوش ہونا چاہیے۔ ایک آنکھیں دے کر اور ہم نے کتنا کچھ پا یا ہے۔ دوستوں کی بات تو میں نے ویسے ہی وقت کر دی تھی یاد جو آ گئے تھے۔"

"تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں سہیل! مگر یہ جو عادل کی بیٹی والا معاملہ ہو گیا ہے نا۔ اس نے تو میرے ماضی کے دُکھ بھی دبے ہیں۔"

"شاکر آ جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی سُراغ لگا لے گا۔ ہماری یہ پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔"

"اللہ تمہاری زبان مُبارک کرے۔"

ملک جی نے خلوصِ دل سے دُعا دی اور۔۔۔

اگلے ہی روز ملک سہیل کا بتایا ہُوا پتا دے کر طفیل کو اسے بُلانے کے لیے بھیج دیا۔ ملک سہیل کی عین توقع کے مطابق ہوتے ہوتے شاکر، طفیل کے ساتھ تصور آباد پہنچ گیا۔

اتنے عرصے بعد دونوں دوست ملے تھے۔ جوانی سے ادھیڑ عمری تک کی منزلیں طے کر چکے تھے۔ کافی طویل مسافت جذبوں کی گرم جوشی وہی تھی۔ وہی خلوص تھا۔ وہی محبت تھی۔ تب ہی تو پیغام ملتے ہی شاکر چلا آیا تھا۔ اپنے کئی کام چھوڑ کر بھی۔

"ارے۔! کھانا کھانے بیٹھا تو شاکر ایسا پُر تکلف سجا دسترخوان دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔

"یہ سارا اہتمام میرے لیے کیا گیا ہے یا روز ایسا ہی کھانا کھاتے ہو۔؟"

ملک سہیل نے لمبے لمبے سانس لیتے ہُوئے کھانوں کی خوشبو سونگھی اور پھر ایک قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"یار! پندرہ سولہ سال بعد ملے ہو۔ اپنے خلوص کا اظہار اور کیسے کرتا۔؟"

"مگر میں تو پہنچا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہُوں۔ اتنے وقت میں یہ سارے انتظامات۔ الٰہ دین کا چراغ تو نہیں ہے تمہارے پاس"

"محبت جو جذبہ ہے نا۔ اسے الٰہ دین کا چراغ ہی سمجھو۔ مجھے پورا اعتماد اور یقین تھا کہ اگر تم طفیل کو مل گئے، میرا پیغام تم تک پہنچ گیا تو میرے پاس فوراً چلے آؤ گے۔ تب میں نے طفیل کو تمہاری طرف بھیجتے ہی یہ سارے انتظامات کرا لیے تھے۔"

"ٹھیک اعتماد کیا تھا۔ اگر نہ کرتے تو؟"

"تو کیا؟ خاموش کیوں ہو گئے؟"

"پھر اپنے خلوص اور محبت پر افسوس ہوتا جو اتنے سالوں کے بعد بھی دل میں تمہارے لیے رکھے ہُوئے تھا۔"

"شکر ہے۔" ملک سہیل ہنس پڑا۔ "تمہیں افسوس اور پشیمانی سے دوچار نہیں ہونا پڑا اور اب ٹھیک طرح سے کھانا کھاؤ۔ تکلف نہیں کرنا۔"

"نہیں۔ یاروں کے ساتھ تکلف کرنا اپنے مذہب میں حرام ہے۔"

شاکر واقعی بے تکلفی سے کھانا کھانے لگا۔

"وہ۔ یاد ہے اپنا شعیب۔ وہ احمد نگر میں کمشنر لگا ہُوا ہے اور غیاث۔ وہ آئی جی پولیس ہو گیا ہے۔"

دونوں کھانا کھاتے رہے اور ساتھ ساتھ شاکر اسے باقی دوستوں کے متعلق معلومات فراہم کرتا رہا۔ دوستوں ملنے والوں کے سیاست کی، مذہب کی، حالاتِ حاضرہ کی بھی دونوں نے بے شمار باتیں کر ڈالیں۔

ساری رات جاگتے رہے۔ ایک پل کو نہیں سوئے۔ بہت سارا وقت تو ماضی کی یادوں نے لے لیا اور پھر جب کچھ ہوش آیا۔ ڈوبے اُبھرے تو۔

"ویسے یار! مجھے تو تمہارا پتا معلوم نہیں تھا ورنہ میں ضرور تمہارے پاس بہت پہلے پہنچ جاتا۔ تم سُناؤ تم نے مجھے اس طویل عرصے کے بعد آج کیسے یاد کیا۔ کوئی وجہ ہو گی۔" شاکر تجسس سے بولا۔

"سچی بات یہ ہے یاد تو تم اکثر آتے ہی رہتے تھے آج ایک کام پڑ گیا۔"

ملک سہیل نے صاف گوئی سے کام لیتے ہُوئے صاحباں کی گمشدگی کا واقعہ پُوری تفصیل سے اسے سُنا دیا۔

"بڑا دلچسپ معاملہ ہے... اور انتہائی حیرت انگیز بھی۔"

"تو بس اسی لیے تمہیں بُلایا ہے۔ اس معاملے کی پڑتال کے لیے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ تمہاری جو فیس ہو گی وہ..."

"آگے کچھ نہیں بولنا ورنہ جھگڑا ہو جائے گا۔"

"اتنے عرصے بعد ملے ہو۔ جھگڑا کر سکو گے؟"

"کرنا پڑے گا۔ نہ کیا تو دوستی جائے گی۔"

"اچھا بابا! کچھ نہیں کہتا۔ اب بتاؤ کچھ مدد کر سکو گے؟"

"کیوں نہیں۔ اپنا پیشہ بھی ہے اور ہابی بھی ہے اور خدا نے اتنا دیا ہُوا ہے کہ اب پیشے کی پروا رہی نہیں البتہ بطور مشغلے اور ہی کے کوئی نہ کوئی کیس لیے ہی رکھتا ہُوں۔ اکثر رفاہِ عامہ کے بھی کام کرتا رہتا ہُوں اور یہ کام۔"

وہ انتہائی خلوص واپنایت سے بولا۔

"یہ تو تمہارا ہے۔ دل وجان سے کروں گا۔ مشغلے سے بھی زیادہ خوشی اور شوق اور لگن کے ساتھ۔"

"بہت بہت شکریہ! تم نے میرے خلوص اور اعتماد کا مان رکھا۔"

"ملک سہیل دوستی تو ہر کوئی کر لیتا ہے لیکن نبا ہنا کوئی کوئی جانتا ہے اور اپنے شاکر کو تم اس معاملے میں گھٹیا نہیں پاؤ گے"

"میرا شاکر کسی بھی معاملے میں گھٹیا نہیں ہے۔ اسی لیے تو پندرہ سال تک دل میں بسائے رکھا۔"

"اچھا بھئی سہیل! اب مجھے اجازت دو۔"

علی الصباح چائے کی صرف ایک پیالی پینے کے بعد ہی شاکر نے اپنی واپسی کا اعلان کر دیا۔

"کیوں...؟ اتنی جلد۔ ایک آدھ دن تو اور رہو۔"

"کچھ ضروری کام ہیں۔ وہ نمٹانا ہیں اور پھر یہ والا۔ سب سے ضروری۔ اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔"

ملک سہیل کے اصرار کے باوجود شاکر ناشتے کے لیے بھی نہیں رُکا۔ سب ہی حیران تھے۔ اتنا خلوص لے کر آیا۔ اتنی محبت اور پیار سے ملا اور پھر یوں ایک دم ہی اُٹھ کر چل بھی دیا۔

شاید کسی کی کوئی بات بُری لگ گئی تھی۔ ملک جی اور ملک سہیل آپس میں بیٹھے بڑی دیر شاکر کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔

"نہیں ابا جی! کوئی بات بُری نہیں لگی ہوگی۔ یقیناً کوئی ضروری کام ہوگا۔ عجیب قسم کا انسان ہے۔ انتھک کام کرنے والا۔ ہمت والا جرأت والا۔ دل والا۔ خلوص والا۔ محبت والا۔"

"ہمارا کام کرے گا نا۔؟"

"کیوں نہیں۔؟ ضرور کرے گا۔"

"مگر اس وقت تو یکدم ہی اُٹھ کر چلا گیا۔ نہ کوئی پلان بنایا۔ نہ کوئی اور پُوچھ گُچھ کی نہ کوئی امید دلائی نہ پکا وعدہ کیا۔"

"میں نے کہا نا ابا جی! وہ عجیب قسم کا انسان ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہے گا لیکن عمل دیکھیے گا۔"

ملک سہیل اپنی نابینا نگاہوں سے دُور کہیں خلا میں دیکھتے ہُوئے مسکرایا۔

"اس نے امید کوئی نہیں دلائی لیکن اس سے بات کر کے امید ہی نہیں مجھے تو پکا یقین ہو گیا ہے کہ اب صاحباں مل جائے گی زندہ ہُوئی، دُنیا کے کسی کونے میں بھی ہُوئی تو مل جائے گی۔ ضرور دیکھ لیجیے گا۔"

"اچھا۔ اللہ بہتری کرے۔ بیٹے! یہ معاملہ عادل سے زیادہ ہماری عزت غیرت کا ہے۔ ہمارے تصور آباد میں یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ اس بستی کی ساری بہو بیٹیاں ہماری ہیں۔ ہم ان کے رکھوالے ہیں۔"

"بس ابا جی! دُعا کیجیے۔ آپ بھی اور میں بھی کروں گا۔"

"ضرور ضرور۔ پروردگار ہماری عزت رکھنا۔"

ملک جی مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتے ہُوئے کھانستے ہُوئے اور ضعیفی کے مارے جھکی کمر کو سہلاتے ہُوئے اُٹھ کر نجانے کہاں چل دیے۔

اور۔ تیسرے دن ملک سہیل حویلی کی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ کھویا کھویا سا۔ گُم سُم سا۔ کہ باہر سے کسی کی زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔

"چھوٹے ملک صاحب کہاں گھُسے بیٹھے ہو۔ ارے ناشتہ تو کراؤ بڑی بھوک لگی ہے۔"

"کون؟ شاکر...؟ یہ آواز تو شاکر کی ہے۔"

ملک سہیل جلدی سے اُٹھا۔ ایک ٹھوکر کھائی مگر سنبھل کر تیز تیز قدم اُٹھاتا دروازے کی طرف بڑھا۔

"اور میں یہ اپنا سامان کدھر رکھوں۔ حویلی میں کون سا کمرہ میرا ہوگا۔ میں چند دن تمہارے تصور آباد میں رہوں گا ملک سہیل۔"

"آؤ بھئی آؤ۔ ایک کمرے کی کیا بات کرتے ہو ساری حویلی تمہاری ہے۔ طفیل۔! ابا جی۔! او فضلو۔ کہاں ہیں سب!"

"شاکر کے ناشتے کا بندوبست کریں۔"

"وہ اترسوں والا میرے حصے کا پڑا ہوگا وہی دے دو۔"

"اتنے بے صبرے بنو کہ چار دن کے باسی پر ٹوٹ پڑو۔ ابھی دو منٹ میں سارا انتظام ہوا جاتا ہے۔"

ملک سہیل شاکر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھک ہی میں پلٹ آیا۔

"او فضلو! میرے ساتھ والے کمرے میں ان کا سامان رکھوا دے۔"

"جو حکم چھوٹے ملک جی... وہیں رکھوائے دیتا ہوں۔"

"اور اندر ناشتے کے لیے کہہ دے۔"

"وہ تو کہہ بھی آیا۔"

"ابا جی کہاں ہیں...؟"

"آ رہے ہیں وہ بھی..."

"تم سناؤ شاکر..." پھر ملک سہیل شاکر سے مخاطب ہو گیا۔

"تم تو ابھی دو دن پہلے گئے تھے۔ اب کیسے آنا ہوا۔ خیریت تو ہے نا۔؟"

ملک سہیل نے شاکر کی اچانک آمد پر حیرت کا اظہار کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"خیریت ہے بالکل۔ لیکن اب میں تمہارا دوست بن کر نہیں آیا۔"

"کیا مطلب۔؟"

"آج شاکر نہیں ایک سُراغ رساں تصور آباد میں آیا ہے۔"

"لیجیے چھوٹے ملک جی! ناشتہ آ گیا۔"

"سناؤ شاکر میاں کیسے ہو۔؟"

فضلو کے پیچھے پیچھے ملک جی بھی کھانستے ہُوئے اندر آ گئے۔

"دعا ہے آپ کی ملک جی۔"

شاکر نے بے تکلفی سے ناشتے کی سینی اپنے آگے کھینچ لی۔

"آدھی رات کا گھر سے چلا ہوا ہوں۔" بڑی معصومیت سے اُس نے اپنی بھوک کا جواز پیش کیا۔

"خیریت تو تھی نا۔؟"

"وہ... کیا نام تھا گُم ہونے والی لڑکی کا۔؟"

"صاحباں۔" ملک جی اُس کے قریب بیٹھتے ہُوئے جلدی سے بولے۔

"ہاں ہاں صاحباں۔ بس اسی کی خاطر آیا ہوں... وعدہ کیا تھا نا۔"

"بہت اچھا کیا شاکر بیٹے... بہت اچھا کیا... میں تو سمجھا تھا۔"

مزید کچھ کہے بغیر ملک جی خاموش ہو گئے۔

"کیا سمجھے تھے۔؟"

"ابا جی سمجھے تھے تم ٹرخا گئے ہو۔"

"واہ ملک جی! ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر سہیل کے لیے... اپنے آپ کو ٹرخا سکتا ہوں۔ اس کو نہیں ملک جی۔"

"خدا کرے تم کامیاب ہو جاؤ۔" انھوں نے دعا دی۔

"بس آپ کی دعا شاملِ حال رہی تو انشاءاللہ یہ کام ہو جائے گا۔"

پھر ناشتے کے دوران ہی شاکر نے ملک جی اور سہیل کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اُنھیں کیا کرنا ہے۔

"اور ہاں دیکھیے۔ گاؤں کے سارے لوگوں سے کہہ دیں کہ میرے کسی کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ میں جو کروں مجھے کوئی روکے ٹوکے نہیں کے علاوہ گاؤں کے جس آدمی، عورت یا بچے سے جو کچھ پوچھوں مجھ سے کوئی کچھ چھپائے نہیں۔ سچ سچ بتا دے۔"

"اور کوئی ہدایت۔؟" ملک جی بے حد سنجیدہ تھے۔

"تم جو سہولت چاہو گے ہم تمہیں مہیا کریں گے بیٹے! بس ایک بار تم اس بچی کا پتا لگا دو۔ وہ گھر آ جائے تو ہمارے پورے گاؤں کے لیے یہ خوشی کا باعث ہوگا۔ ہمارا عادل جی اُٹھے گا تو ہم سب جی اُٹھیں گے۔"

"بس ملک جی! اور سہولتوں کے علاوہ آپ اللہ سے دعا کریں وہ مجھے اس کام کو سرانجام دینے کی ہمت و طاقت دے۔ سہیل نے پہلی بار کوئی کام کہا ہے۔ میں اپنی دوستی سے سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔"

"میں ہی نہیں صرف بلکہ پورا تصور آباد تمہارے ساتھ تعاون کرے گا اور سب تمہارے لیے دعائیں مانگیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" شاکر ناشتہ ختم کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلے؟" ملک سہیل نے اس کی آہٹ سن کر بیتابی سے پوچھا۔

"اپنے کام پر۔"

"مگر ایک آدھ دن آرام تو کر لو۔"

"پہلے کام پھر آرام۔"

شاکر مسکراتا ہوا بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

"تصور آباد کے راستوں سے واقف نہیں ہو پھر کہاں جا رہے ہو۔؟"

سہیل نے پیچھے سے بلند آواز میں پوچھا۔ وہ وہیں رُک گیا۔

"واقف نہیں ہوں تو کیا ہوا۔ میں چند لمحوں میں واقفیت کر لیا کرتا ہوں۔" شاکر گردن موڑ کر مسکراتا ہوا بولا۔ "دو چار گھنٹوں کے بعد جب واپس تمہارے پاس آؤں گا تو مجھ سے گاؤں کے سب گھروں کے حالات پوچھ لینا۔"

"بہت خوب۔" ملک سہیل ہنس دیا اور شاکر بھی ہنستا ہوا نکل گیا۔

"مجھے لگتا ہے شاکر صاحباں کو ڈھونڈ نکالے گا۔" اس کے جانے کے بعد ملک جی نے پُر اُمید لہجے میں ملک سہیل سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اسی یقین اور توقع کے سہارے تو میں نے بھی اُسے بلا بھیجا تھا۔ بہت ذہین ہے اور بے حد پُر خلوص بھی۔"

پھر یکایک ملک سہیل کچھ پژمردہ سی آواز میں بڑبڑایا۔

"بس ہمیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ لڑکی زندہ سلامت ہو۔ زمانہ بڑا خراب ہے اور وہ بڑی معصوم اور خوب صورت بچی تھی"

"سہیل تم نے تو نہیں دیکھی تھی وہ ...؟"

"نہیں، سُنی سنائی کے مطابق کہہ رہا ہوں۔"

"وہ بچی دیکھنے والی تھی۔"

"کاش! میری ...ائی ... اُوہ! لیکن ... نہیں ... کچھ نہیں ... شکر ہے پروردگار کا ... بہت کچھ دیا ہے اُس نے سب کچھ دیا ہے۔"

ملک سہیل اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آبا جی شاکر کا خیال رکھیے گا اور سب کو ابھی ابھی بتا دیجیے گا کہ کس مقصد کے لیے وہ یہاں آیا ہے اور کوئی اُس کے کام میں روڑے نہ اٹکائے بلکہ سبھی اس کی مدد کریں۔"

"ابھی کہے دیتا ہوں۔"

ملک جی بھی اُٹھ کر ملک سہیل کے پیچھے پیچھے بیٹھک سے نکل گئے ... ساتھ ساتھ عادت کے مطابق بولتے جا رہے تھے۔

"اب تو یہ ہماری عزت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اسے ضرور حل ہونا چاہیے ... ضرور ... ہر قیمت پر۔"

❋

شاکر کا قیام حویلی میں تھا۔ کھانے پینے کا بھی وہیں انتظام تھا لیکن وہ سارا سارا دن غائب رہتا۔ نہ اُسے کھانے پینے کا ہوش تھا اور نہ کپڑے لتے کا۔ کھانے پینے کا نجانے کیا کرتا تھا۔ شاید بھوکا پیاسا ہی اپنے مشن کی تکمیل میں مگن رہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ خود ملک سہیل کو بھی نہیں جو اس کا گہرا دوست تھا۔

اور اب تو اُس سے شاکر کی ملاقات بھی کم ہی ہوتی تھی۔ کئی کئی دن گزر جاتے، اُس کی آہٹ، اُس کی آواز سُنے۔ دیکھ تو سکتا نہیں تھا۔ کب آتا تھا کب چلا جاتا تھا یہ اُسے پتا ہی نہ چلتا تھا۔ ملک جی ہی سے اس کی شب و روز کی مصروفیات کا علم ہوتا تھا۔

یہ بات بڑی اطمینان بخش تھی کہ یہ ساری مصروفیات، رات رات بھر جاگنا، غائب رہنا، کھانے پینے کی طرف سے غفلت، یہ

...اسی کام کے باعث تھی۔ وہ انتہائی خلوص سے دوستی نبھا رہا تھا۔

دس دِن، پندرہ دِن ... اور پھر پورا ایک مہینہ بیت گیا۔ شاکر اسی طرح مصروف رہا ... ملک سہیل اور ملک جی منتظر رہے کہ صاحباں ...ج آج ملے ... کل ملے۔ اُن کا ایک ایک لمحہ انتظار کی ایسی بے کلی میں گزر رہا تھا جو اُن کے چہروں سے عیاں ہو رہی تھی ...

مگر اتنے دِن گزر جانے کے باوجود، وہ ہنوز وہیں تھا جہاں پہلے دن تھا۔ کہیں سے بھی ذرا سا بھی سُراغ نہیں ملتا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ اس جیسا ذہین سُراغ رساں، سارا مُلک جس کی صلاحیتوں کا معترف تھا، یہاں پر بے بس نظر آ رہا تھا۔

کیا واقعی گاؤں والے درست کہتے تھے کہ کوئی ہوائی مخلوق، اُسے لے اُڑی تھی ... لیکن تعلیم یافتہ اور روشن خیال شاکر جھنجلا ...بھر کے لیے ایسا سوچ سکتا تھا لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں ... کیا وہ ملک سہیل کو بتا دے کہ اس کا سراغ رساں دوست اپنے مشن ...ناکام ہو گیا ہے۔

اس رات، وہ یہی کچھ سوچتا ہوا حویلی میں آیا تھا۔ وہ بے حد فکر مند اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اسے کبھی ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کیسا ...لہ تھا جس نے پہلی بار، اُسے اس تلخ حقیقت سے رُوشناس کرایا تھا کہ وہ شکست بھی کھا سکتا ہے۔

وہ سوچتا رہا اور تمام رات کروٹیں بدلتا رہا ... کیا اس کی تفتیش میں کہیں خامی رہ گئی تھی ... ہر کروٹ سے ایک نئی سوچ اُبھرتی ... کون سی غلطی ہو گئی تھی، اس سے ... وہ سوچنے لگا۔

اس نے تصور آباد کے ایک ایک فرد سے صاحباں کے متعلق گفتگو کی تھی۔ خصوصاً اُس کی ہم عُمر لڑکیوں کے ساتھ، جن میں سے دو، تین ...ڑ کو اُس کی سہیلیاں ظاہر کیا تھا۔ مگر اُن کی گفتگو سے بھی کوئی ایسا نکتہ ہاتھ نہیں آیا تھا جو اس کی تفتیش کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ...سکتا۔

اس کے علاوہ، تصور آباد کے اِرد گرد کئی کئی میل کا علاقہ اس نے چھان مارا تھا۔ عدسی شیشے اور دوسرے آلاتِ سراغرسی کی مدد سے ایک ایک گز زمین کو کُرید ڈالا تھا ... کسی قتل کا نشان ملا نہ کوئی خُون کا دھبّہ۔ کہیں کوئی لاش دفن نہیں کی گئی تھی۔

غرض اپنی سی ہر ممکن کوشش، اُس نے کر ڈالی تھی۔ اپنے دورانِ تفتیش کے ایک ایک لمحے کا محاسبہ کیا کہیں کوئی جھول یا خامی ...یں آئی ... پھر بھی ... پھر بھی وہ ناکام ہو گیا تھا ... تب اس نے فیصلہ کر لیا کہ کل وہ یہاں سے چلا جائے گا۔

رات کا ایک پہر ابھی باقی تھا۔ وہ اُٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا حویلی سے نکل آیا۔ یُوں تو وہ اکثر راتوں کو اُٹھ کر نکل جاتا تھا لیکن ...ہ بلا مقصد ہی آوارہ گردی کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کن الفاظ میں ملک سہیل کو بتائے گا کہ وہ اس کیس کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے اپنی ...ت کا اعتراف کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اُلجھا اُلجھا سا، سوچوں میں ڈوبا ہُوا، وہ آبادی سے بہت دُور نکل گیا۔ اس نے کبھی ناکامی کا مُنہ نہیں دیکھا تھا اس لیے اس ناکامی کو ...ا ذہن قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ اُسے اپنی ناکامی کا اتنا افسوس ہرگز نہ ہوتا اگر ملک سہیل اس کا دوست نہ ہوتا۔ ملک سہیل کے پاس اتنی ...محرومی تھی کہ وہ، اُسے مزید کوئی پریشانی نہیں دے سکتا تھا۔

صاحباں کی گُم شدگی کو ملک سہیل اور اُس کے باپ نے اپنی عزت و آبرو اور اَنا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور شاکر ہر صُورت میں اُن کے ...کو بحال رکھنا چاہتا تھا لیکن اپنی تمام تر سر توڑ کوششوں کے باوجود ناکام ہو گیا تھا۔

اس سے زیادہ اذیّت ناک بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ اُس کے دوست نے ایک خوشی مانگی تھی، وہ بھی اُسے نہ دے سکا۔

ان ہی سوچوں اور پریشانیوں میں گُم، وہ حویلی کی طرف واپس آ رہا تھا کہ چونک کر رُک گیا۔ وہ نہ جانے کون تھی؟ اس سے ذرا فاصلے ...ئے سے اسی کی مانند سوچوں میں غرق سر جھکائے چلی آ رہی تھی۔

قریب پہنچ کر وہ بھی ٹھٹھک گئی اس نے سر اُٹھا کر شاکر کی طرف دیکھا۔

وہ ایک نوجوان، دُبلی پتلی اور قبول صُورت لڑکی تھی۔ تحقیقات کے دوران میں وہ، گاؤں کے ایک ایک فرد کو دیکھ چکا تھا۔ یہ لڑکی اجنبی ...ہوتی تھی ... اس کا تجسّس جاگ اُٹھا۔ وہ کچھ افسردہ اور پژمردہ سی دکھائی دیتی تھی ... وہ اتنی اُداس کیوں تھی؟ رات کے اس پہر میں کہاں ...ی ہے اور کہاں جانا چاہتی ہے؟ کئی سوال اس کے ذہن میں کُلبلانے لگے۔

"تم ... تم کون ہو؟"

"میں کوئی بھی ہوں ..." وہ تلخی سے بولی۔ "تم کیوں پُوچھ رہے ہو؟"

"اس سے قبل، میں نے تمھیں بستی میں نہیں دیکھا۔"

"میں نے بھی تمہیں یہاں، پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں شاکر ہوں۔ ملک سہیل کا دوست۔"

"کہاں سے آئے ہو؟" لڑکی نے گہری نظروں سے اس کو دیکھا۔

"شہر سے آیا ہوں... یہاں کی ایک گُم شدہ لڑکی صاحباں کا کھوج لگانے..."

"صاحباں... صاحباں کا..." لڑکی نے جلدی سے اُس کی بات کاٹی اور ایک دَم پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ پھر روتے روتے وہ بیٹھ گئی...

"کیا بات ہے؟" شاکر نے ہمدردی سے پُوچھا۔ "صاحباں سے تمہاری کوئی رِشتے داری ہے؟"

"رِشتے داری تو بہت چھوٹا تعلق ہوتا ہے۔ ہم دونوں تو ایک دوسرے کی سب کچھ تھیں۔" وہ سسکی لے کر بولی۔

"پھر بھی کوئی ناتا؟"

"وہ میری سہیلی تھی... میری ایک ہی سہیلی... میرا نام زرینہ ہے۔"

"جب سے میں آیا ہوں، صاحباں کے رِشتے داروں، سہیلیوں اور تمام مِلنے جُلنے والوں سے مِل چُکا ہوں... مگر تم... تم تو کہیں دکھائی نہیں دیں۔" وہ، اُس کے قریب بیٹھ کر اُسے اُلجھی ہُوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"صاحباں کے گُم ہونے کے بعد، میں بیمار ہوگئی تھی۔ بہت علاج ہُوئے مگر آرام نہیں آیا... پھر میری ماں نے مجھے میرے ماموں کے پاس بھیج دیا تھا۔ کل رات ہی واپس آئی ہوں۔"

"اب ٹھیک ہو؟"

"دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں مگر صاحباں کا دُکھ، جس نے مجھے بیمار کر دیا تھا، کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میں آج تک، ایک پَل کے لیے بھی اُسے بھُول نہیں سکی ہُوں۔"

"اتنا پیار تھا، تم دونوں میں...؟"

"بہت... بہت..." اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔ "وہ، میری ہم عُمر تھی۔ ہم بچپن میں اکٹھی کھیلا کرتی تھیں۔ اکٹھی مسجد میں قرآن پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ اسکول میں بھی ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں... پھر پانچویں جماعت پاس کر کے ایک ہی دن، دونوں نے اسکول چھوڑا تھا..." اُس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے لیکن وہ بولے چلی جا رہی تھی۔ صاحباں کی باتیں کر رہی تھی۔ بے شمار باتیں... اس کی عادات کے متعلق... اُس کے اوصاف اور عیوب کے متعلق... اتنا کچھ تو صاحباں کے والدین بھی نہ بتا سکے تھے، جتنی معلومات زرینہ فراہم کر رہی تھی۔

زرینہ، صاحباں کی باتوں میں شاکر کی دلچسپی محسوس کر کے اور زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ وہ، صاحباں کے ساتھ گزارنے والے ہر لمحے کی باتیں کر رہی تھی۔ پیار کی باتیں... جھگڑے کی باتیں... صلح کی باتیں... کھیل کُود کی باتیں... سانس لیے بغیر، بے تکان بولے جا رہی تھی اور اُس کے تیزی سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

"میں اب یہاں نہیں رہُوں گی۔ میں، ماموں کے پاس واپس چلی جاؤں گی۔ یہاں کی ہر چیز مجھے صاحباں کی یاد دلاتی ہے۔" اُس نے گھٹنوں میں اپنا سر دے لیا۔ اُس کا پُورا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

شاکر دَم بخود بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ صاحباں کو اُس عورت کی نظر کھا گئی۔" زرینہ اچانک گھٹنوں میں سے سر نکال کر بولی۔ "صاحباں بہت خوبصورت تھی۔ وہ، اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھُورا کرتی تھی۔"

"کون سی عورت...؟" شاکر نے جلدی سے پُوچھا۔

"تھی ایک... چڑیل تھی یا ڈائن..." وہ غصّے میں بڑبڑائی۔ "اسی کے سبز قدم ہمارے گاؤں میں آئے تو... تو صاحباں..."

"یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو؟" شاکر نے اُسے ٹوکا۔ "مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ شاید اسی سے صاحباں کا کچھ سُراغ مل جائے۔"

"نہیں، صاحباں کا تعلق اس سے نہیں ہے۔ میں تو بس یُونہی غصّے میں کہہ رہی تھی۔ دراصل اُسی کے آنے کے بعد... میں پاگل ہو گئی ہوں... یُونہی کسی نہ کسی کو اِلزام دیتی رہتی ہوں۔" وہ آنسو پونچھتی ہُوئی اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ "میری ماں مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔"

شاکر بھی کھڑا ہو گیا اور اُسے جانے کے لیے راستہ دینے کی خاطر ایک طرف ہٹ گیا لیکن وہ آگے جانے کی بجائے واپس مُڑ گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"گھر جاؤں گی۔"

"پہلے کہاں جا رہی تھیں؟"

"ایسے ہی..."

"پھر بھی...؟"

"اُس اگلے کھیت میں۔ میرا بابا وہاں ہَل چلایا کرتا ہے۔ میں اُس کی روٹی... لایا کرتی تھی تو صاحباں بھی میرے ساتھ آ جایا کرتی تھی... پھر..." اُس نے اُنگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

"وہ ایک کھالہ بہہ رہا ہے نا... بس، اسی کے کنارے ہم دونوں بیٹھ جاتی تھیں۔ پاؤں کھالے میں ڈال کر ایک دوسرے پر چھینٹے اُڑایا کرتی تھیں... پھر جب ابا روٹی کھا لیتا تو خالی برتن لے کر ہم واپس چلی جاتی تھیں... میں وہ جگہ دیکھنے آئی تھی۔"

"تو چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہُوں۔" شاکر نے پیشکش کی۔ وہ ابھی اُس سے مزید باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"مگر اب کیا فائدہ...؟" وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔"

"پھر بھی... میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہُوں۔ صاحباں کی باتیں سُن کر مجھے بھی اُس کے ساتھ ایک لگاؤ سا ہو گیا ہے۔"

"ابھی تو باتیں ہی سُنی ہیں اگر دیکھ لیتے تو... تو..." وہ خاموش ہو گئی۔

"تو... کیا ہوتا؟"

"بستی کے سب لوگ اُسے کتنا یاد کرتے ہیں۔ دیکھا ہے نا؟"

"ہاں..."

"ایسے ہی تم بھی اُسے کبھی نہ بھُول پاتے۔ اس کا کھوج ضرور لگا لیتے۔"

"میں نے اپنی پُوری کوشش کی ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہُوئے اسی کھالے کی طرف جا رہے تھے۔

"تم نہیں جانتیں۔ ملک سہیل میرا کتنا عزیز دوست ہے۔ اس کی خاطر میں نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ یہ اُس کی عزّت اور آبرو کا مسئلہ ہے۔"

"ہاں، ہے تو... اُن کا گاؤں ہے۔ بڑی بدنامی کی بات ہے۔"

"میں مایوس ہو چُکا تھا اور آج واپس جانے والا تھا... مگر اب..."

"اب کیا...؟" زرینہ جلدی سے بولی۔ "کیا صاحباں مِل جائے گی؟"

"ہاں، اب اُمید ہو چلی ہے۔"

"پھر کب مِلے گی؟ جلدی بتاؤ، وہ کب مِلے گی؟"

"اگر تم میرا ساتھ دو تو شاید بہت جلد۔"

"میں، تمہارا ساتھ دُوں...؟" وہ چلتے چلتے رُک کر حیرت آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں..."

"مگر، وہ کیسے...؟"

"تم مجھ سے اُس کی باتیں کرو۔"

"اتنی تو کرتی رہی ہُوں..."

ایک تلخ سا تبسّم اُس کے لبوں پر پھیل گیا۔

"اگر میرے باتیں کرنے سے وہ مِل سکتی ہے تو میں ساری زندگی، اُس کی باتیں کرنے کو تیار ہُوں۔ کبھی نہ تھکُوں... کبھی نہ رُکوں۔" ایک بار پھر موٹے موٹے آنسو اُس کے رُخساروں پر بہہ نکلے۔

"تم تو صاحباں کے ہر راز سے واقف ہو گی؟"

"اُس کا کوئی راز ہی نہیں تھا۔ وہ بڑی معصوم تھی۔ بڑی بھولی تھی۔"

"پھر بھی... کچھ نہ کچھ؟"

"یقین کرو۔"

"آخری بار جب وہ تم سے ملی تھی تو اُس کی کسی بات یا انداز سے کوئی پریشانی یا...؟"

"آخری بار..." وہ، شاکر کی بات کاٹ کر بولی۔ "یہی تو دُکھ کی بات ہے کہ وہ جب غائب ہوئی ہے تو اس سے تین چار دِن پہلے میں، اس سے اچھی طرح مِل بھی نہیں سکی۔"

"کیوں ...؟"

"میری بہن کی شادی تھی اور میں بہت مصروف تھی ... ارے، ہاں..." وہ چونک پڑی۔ "وہ تو کہا کرتی تھی کہ میری آپا، اُس کی آپا ہے۔ وہ، اُس کی شادی میں مجھ سے زیادہ کام کرے گی بلکہ سارے کام وہی کرے گی... مگر... مگر..."

زرینہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ شاکر، اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"مگر کیا ہُوا؟"

"پتا نہیں کیا ہُوا...؟ بس مہندی کی رات، مجھے یاد ہے، وہ آئی ہُوئی تھی۔ لڑکیاں لُڈّی ناچ رہی تھیں۔ وہ بڑی شوقین تھی۔ ناچنے کی نہیں، ناچ دیکھنے کی... حالانکہ اُس دِن اُس کی طبیعت خراب تھی لیکن پھر بھی اُس نے میرے ساتھ بہت کام کیا تھا۔ پھر وہ ناچ دیکھنے لگی..."

زرینہ خاموش ہو گئی... جیسے ماضی کے واقعات کو یکجا کر رہی ہو۔

"پھر...؟" شاکر نے بے قراری سے پُوچھا۔ وہ بڑی توجہ سے اس کے ایک ایک لفظ کو ذہن نشین کر رہا تھا۔

"پھر... ہاں، پھر اسی وقت کی بات ہے۔ وہ عورت، جس کے بارے میں، مَیں تمھیں پہلے بھی بتا چُکی ہُوں کہ صاحباں کو اُس کی نظر کھا گئی ہو گی..."

"کیا، کیا تھا، اُس عورت نے؟"

"وہ بڑے غور سے صاحباں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں اس پر ہنسی بھی تھیں کہ وہ کیسے دِیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ اس وقت تو صاحباں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر..." وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"مگر کیا...؟" شاکر جھنجلا سا گیا۔ "تم بات کرتے کرتے چُپ کیوں ہو جاتی ہو؟"

"میں سوچ رہی ہُوں کہ اس عورت اور صاحباں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں تھا لیکن میں نے دوسرے دِن دونوں کو اکٹھا دیکھا تھا۔"

"کہاں...؟"

"ماسی چراغ بی بی کے گھر کے پچھواڑے والے کھیت میں۔ وہ گاؤں دیکھنا چاہتی ہو گی۔ صاحباں کو کسی نے اُس کے ساتھ بھیج دیا ہو گا"

"تم نے اُس سے پُوچھا نہیں؟ کوئی بات نہیں کی؟"

"میں جلدی میں تھی۔ دراصل ماں نے کسی ضروری کام سے ماسی کے گھر بھیجا تھا اس لیے میں جلد ہی واپس آ گئی۔ پھر دوسرے روز وہ مجھے دکھائی ہی نہیں دی۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ مجھے ملے گی تو شکایت کروں گی کہ شادی کے کام میں اُس نے میرا ہاتھ نہیں بٹایا۔"

"لیکن تم نے اس عورت کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟"

"اس عورت کے متعلق... اس کا ہم سے کیا تعلق؟"

"مگر وہ کون تھی؟"

"نجانے کون تھی... شہر سے آئی تھی۔"

"کس لیے آئی تھی؟"

"گاؤں کی شادی دیکھنے۔"

"کیا مطلب...؟"

"میرا بھائی دلاور ہے نا۔ وہ شہر میں مونگ پھلی کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کا ایک شراکت دار ہے۔ اُسی کی کوئی واقف کار تھی یا رشتے دار... اسی نے دلاور سے کہا تھا کہ اپنا گاؤں دِکھا دے۔"

"وہ کتنے دِن رہی تھی؟"

"یاد نہیں۔ شاید تین یا چار دِن۔"

"اور صاحباں کب غائب ہُوئی تھی؟"

"صاحباں کا اُس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔"

"پھر بھی... تم میری بات کا جواب تو دو۔"

"اُس کے جانے کے دوسرے یا تیسرے دِن۔ یہ بھی مجھے اچھی طرح یاد نہیں... ہاں، البتہ ایک بات یاد آئی ہے۔ وہ، شہر [illegible] عورت تھی۔ اس لیے بھائی کے کہنے پر اُس کے لیے علیحدہ کمرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ پلنگ پر نئی چادر بچھائی تھی۔ ملک جی کے گھر سے میز اور کُرسی بھی لا کر رکھی تھی۔ اس کمرے میں وہ اکیلی ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے صاحباں کو چُھپکے چُھپکے اس کے کمرے میں [illegible]ے ہُوئے بھی دیکھا تھا۔"

"تم نے مجھے یہ بتایا کیوں نہیں؟"

"میں نے اس بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ البتہ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ مجھے اس وقت بڑی جلن محسوس ہُوئی تھی... [illegible] صاحباں، سہیلی میری تھی... پھر وہ میرے پاس آنے کی بجائے یُوں چُھپکے چُھپکے اُس کے پاس کیوں گئی؟ میں نے سوچا کہ شادی سے [illegible] فارغ ہو کر اُس سے پُوچھوں گی مگر... مگر اس کا موقع ہی نہیں آیا۔" اُس کی آواز پھر رُندھ گئی۔

وہ بھرائے ہُوئے لہجے میں بولی۔ "جب تک شادی سے فارغ ہو کر ہم دونوں سہیلیاں بیٹھتیں۔ کچھ شادی کی باتیں کرتیں۔ کچھ گلے [illegible]ے کرتیں... وہ... وہ نجانے کہاں گُم ہو گئی۔ مجھے تو یقین ہے کہ کوئی جن بھُوت..."

"پھر وہی جہالت کی باتیں..." شاکر نے مُنہ بنایا۔

"سبھی یہی کہتے ہیں، سچ... وہ بڑی خوبصورت اور بڑی بھولی تھی۔ ایسی سہیلی، مجھے کوئی اور نہیں مِل سکتی۔ وہ بڑی اچھی تھی۔"

"اُس عورت کا حُلیہ کیا تھا؟"

"کیوں...؟ اُس کا اس معاملے سے کیا تعلق؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صاحباں کی گُمشدگی میں اُس کا بھی ہاتھ ہے۔"

زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھٹک کر خاموش ہو گئی جیسے وہ، شاکر کے خیال سے بالکل متفق نہ ہو۔

"تم نے بتایا نہیں کہ اُس کی شکل و صُورت کیسی تھی؟"

"بس، عام سی تھی۔ اب تو مجھے اچھی طرح یاد بھی نہیں رہی... گوری تھی نہ کالی... موٹی تھی نہ دُبلی۔ سانولی سی رنگت والی درمیانے [illegible]ل عام سی عورت تھی لیکن ایک بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کپڑے بہت اچھے پہنتی تھی۔"

"اچھے سے کیا مطلب ہے؟"

"قیمتی اور فیشن والے۔ گاؤں والی عورتوں کی طرح ڈھیلے ڈھالے نہیں۔ بڑے چُست اور شوخ شوخ رنگوں کے۔ جُوتیاں بھی [illegible]بورت پہنتی تھی، اُونچی ایڑی والی اور چمکدار۔ اسی لیے عام سی صُورت ہونے کے باوجود اچھی لگتی تھی اور گاؤں کی ساری عورتیں اُسے [illegible] عزت کی نِگاہ سے دیکھتی تھیں اور..."

ایک لمحہ توقف کے بعد زرینہ، شاکر کی طرف دیکھتی ہُوئی بولی۔ "تم کہتے ہو کہ صاحباں کے گُم ہونے میں اس کا ہاتھ ہے لیکن میرا [illegible]ال ہے کہ وہ عورت ایسی نہیں تھی۔ وہ تو بڑے شوق سے گاؤں کی شادی دیکھنے آئی تھی۔ اُسے کیا پتا تھا کہ یہاں صاحباں جیسی خوبصورت بھولی بھالی لڑکی ہو گی۔"

"دلیل تمھاری بھی درست ہے لیکن تم نہیں جانتیں، دُنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ تم، گاؤں کے سیدھے سادے لوگ، ان باتوں [illegible] واقف ہو۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں۔" وہ پہلی بار مُسکرائی۔ "ہمارے تصور آباد میں بہت چالاک لوگ بھی بستے ہیں۔" پھر وہ یکایک سنجیدہ [illegible]ئی۔ "ہاں، البتہ صاحباں کچھ زیادہ ہی معصوم تھی۔ پتا نہیں، اُس کے ساتھ کیا بیت گئی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ عورت، لڑکیوں کا کاروبار کرتی ہو۔"

"لڑکیوں کا کاروبار..." زرینہ حیرت سے بولی۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تم اس بات کو سمجھ نہیں سکو گی۔ اخباروں میں آج کل یہ خبریں عام آ رہی ہیں کہ صاحباں کی طرح دُوسرے کئی دیہاتوں سے [illegible]ولی بھالی اور خوبصورت لڑکیاں اسی طرح گُم ہو رہی ہیں۔ اُن کا بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں۔ اُنہیں بھی ایسی ہی کوئی عورت [illegible] ورغلا پھسلا کر..."

"نہیں... نہیں..." زرینہ جلدی سے بولی۔ "بھلا کسی غیر کے کہنے سے کوئی ماں باپ کو چھوڑ سکتا ہے۔ صاحباں کو اپنی اماں،

ابّا سے بہت پیار تھا اور مجھ سے بھی۔ کسی کے کہنے یا بہلانے پھسلانے سے وہ ہمیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتی... کبھی بھی نہیں۔"

"تم نہیں جانتیں۔ تم بھی بہت معصوم ہو۔ گاؤں کی سبھی لڑکیاں معصوم ہوتی ہیں، تبھی تو..." شاکر خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"میں اب جاؤں... میری ماں سمجھ رہی ہوگی کہ میں بھی کہیں گم ہو گئی۔ اُس میں تو صاحباں کی اماں اور ابّا جیسا صبر اور حوصلہ بھی نہیں۔ پل بھر میں سارے گاؤں کو اکٹھا کر لے گی۔"

"مجھے پھر کسی وقت ملو گی؟"

"کیوں...؟"

"صاحباں کی کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس لیے...؟" زرینہ نے تیکھی نگاہ سے اُسے دیکھا۔ "تمھارا، اُس سے کیا واسطہ؟"

"میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ ملک سہیل کا دوست ہوں اور اُس نے صاحباں کا سُراغ لگانے کے لیے مجھے شہر سے بلایا ہے اور تم سب گاؤں والوں کا فرض ہے کہ میرے ساتھ تعاون کرو۔"

"صاحباں کا معاملہ ہے تو ضرور ملوں گی لیکن ایک بات بتا دوں کہ اُس کا کھوج کوئی عام آدمی نہیں لگا سکتا۔ کوئی فال رمل والا ہو یا پیر فقیر ہی کچھ بتا سکتا ہے۔ یہ جنوں بھوتوں کا معاملہ ہے۔"

شاکر کو ہنسی آ گئی۔ گاؤں کے مرد تو نہیں البتہ عورتیں یہ بات دِل میں بٹھا چکی تھیں۔

اُس نے آج کے لیے اپنی واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ گاؤں میں زرینہ کی آمد نیک شگون تھا۔ اُسے اُس کی باتوں سے ایسے بہت سے نکتے ملے تھے جو صاحباں کی بازیابی میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔

وہ رات ہونے سے پہلے ہی حویلی میں لوٹ آیا۔

صبح کو وہ جہاں زرینہ سے ملا تھا، دوپہر کو بھی اچانک وہیں اُس سے ملاقات ہو گئی۔ باتوں باتوں میں اُس کے اور بھی کئی سوالوں کے جواب مل گئے جن سے اس نے اپنے ذہن میں ترتیب دیا ہوا خاکہ اور واضح کر لیا تھا۔

اب وہ اُس عورت تک پہنچنے کے لیے زرینہ کے بھائی دِلاور سے ملنا چاہتا تھا۔ زرینہ کے ذریعے اُس سے ملنا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ اس کام کے لیے ملک سہیل سب سے بہتر تھا۔

اس نے پُوری تفصیل سے ملک سہیل کو تمام حالات بتائے تو ملک سہیل نے اسی وقت دلاور کو بُلا بھیجا لیکن پتا چلا کہ وہ شہر گیا ہُوا ہے اور دو دن بعد اُس کی واپسی ہو گی۔

ملک سہیل کے لیے دو دن کاٹنے دُشوار ہو گئے تھے لیکن وہ خوش تھا کہ صاحباں کی بازیابی کی کوئی اُمید بندھ گئی ہے۔ وہ سارا سارا دن شاکر سے اسی مسئلے پر گفتگو کرتا رہتا اور شاکر نے بھی اُسے اطمینان دلا لیا تھا۔

"میں تمھاری یہ خوشی ضرور پُوری کروں گا، ملک سہیل... تمھارے پاس اور کون سی خوشیاں ہیں۔ تصوّر آباد کے لوگوں کے مسائل کا حل اور اُن کی خوشیاں ہی تمھاری خوشیاں ہیں۔ میں اپنی جان لڑا کر یہ خوشیاں تمھیں دوں گا۔"

شاکر، ملک سہیل کے مسکراتے چہرے کو دیکھتا رہا اور صاحباں کی تلاش کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرتا رہا۔

دوسرے روز، شام کو دلاور آ گیا... اپنے گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی اُسے ملک سہیل کا پیغام مِلا۔ وہ گھر بھی نہیں گیا۔ سیدھا [illegible] میں چلا آیا۔ ملک سہیل نے فوراً اُسے بُلوا لیا۔

"تمھیں یاد ہوگا، دلاور! کہ تمھاری بہن کی شادی میں شہر سے ایک عورت آئی تھی۔"

"ہاں جی... بڑی اچھی طرح یاد ہے۔ اُسے گاؤں میں ہونے والی کوئی شادی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔"

"کون تھی وہ؟ یہاں سے جانے کے بعد کبھی اُس کی تم سے ملاقات ہُوئی؟"

"جی نہیں۔ شادی کے بعد سے اب تک وہ مجھے نہیں ملی اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔"

"پھر وہ کس تعلق سے یہاں چلی آئی تھی؟"

"میرا کاروباری شریک ہے جی، کریم۔ وہ شہر ہی میں رہتا ہے۔ اس کی کوئی واقف تھی... اُسی سے اُس نے میری بہن کی شادی کے متعلق سُنا تھا اور آ گئی تھی۔"

اب تک ملک سہیل ہی اُس سے سوال کر رہا تھا۔ شاکر اس کے پاس بیٹھا، خاموشی اور توجہ سے سُن رہا تھا۔ اس کی نظریں دلاور کے چہرے پر تھیں اور وہ نہایت باریک بینی سے اُس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا... لیکن اس کے چہرے پر صرف سادگی اور غیر متوقع بات کی حیرت تھی۔

"کیا میں کریم سے مِل سکتا ہوں؟" شاکر نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

"کیوں نہیں جی... کریم کو یہیں بُلواؤں یا آپ شہر چلیں گے؟"

"میں خود شہر جاؤں گا اور آج ہی۔" شاکر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"آج ہی...!" دلاور نے قدرے تعجب سے شاکر کو دیکھا۔

"ہاں، کیوں...؟"

"اب شام تو ہو گئی ہے، جی... شہر جاتے جاتے رات ہو جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں آج کا کام کل پر نہیں ٹالا کرتا۔"

شاکر کی بات سُن کر ملک سہیل کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی... میں نے بالکل صحیح شخص کا انتخاب کیا ہے۔ اس نے سوچا۔ ملک جی بھی پاس ہی بیٹھے تھے۔ وہ بھی شاکر کی کارکردگی سے خوش تھے۔

"پھر جو حکم، چھوٹے ملک جی کریں؟"

"اس معاملے میں میرا نہیں، اِن کا حکم ماننا ہوگا۔" ملک سہیل نے شاکر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بلکہ میری جگہ انہیں ہی سمجھو... سمجھ گئے نا؟"

"جی سرکار..." دِلاور نے کہا اور پھر شاکر سے مخاطب ہُوا۔ "ابھی چلیں گے، صاحب جی؟"

"ہاں، جب تک میں اپنی تیاری کرتا ہوں، تم اپنے گھر والوں سے مِل آؤ۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ چھ سات دِنوں بعد آئے ہو۔ گھر والے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔" ملک صاحب بولے۔

"بس جی، پانچ منٹ میں آیا۔"

دلاور اپنے گھر چلا گیا اور شاکر شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے لمبی تیاری کر رہے ہو۔" ملک سہیل آہٹ سُن کر بڑبڑایا۔ "کیا واپس آنے کا ارادہ نہیں؟"

"یہ کیا بات ہوئی؟ اب تمھیں چھوڑوں گا نہیں۔ یہ کام نمٹ گیا تو پھر بھی ہفتے میں ایک آدھ چکر تو ضرور لگا ہی لیا کروں گا۔" شاکر ملک کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتا ہُوا بولا۔

"تم چکر نہیں لگاؤ گے تو میں خود لگوا لیا کروں گا۔ وہ تو بعد کی بات ہے۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے اس عورت کی تلاش میں کئی دن لگ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے، دو دِن ہی میں کام بن جائے۔"

"خُدا تمھیں کامیاب کرے، بیٹے!" ملک جی نے شاکر کو دُعا دی۔ "اور تمھاری محنت کا پھل مل جائے۔"

"ہاں، ملک جی... بس، دُعا کیجیے۔ میں اپنے دوست کے سامنے سُرخ رُو ہونا چاہتا ہوں۔ اس معاملے نے تو میری راتوں کی نیند اور دِن کا چین حرام کر دیا ہے۔"

"دیکھ رہا ہوں، سب کچھ۔ بہت دُعائیں نکلتی ہیں، دِل سے تمھارے لیے۔"

"جس طرح تم دوستی کا مان پال رہے ہو۔ اِس طرح کوئی کم ہی کرے گا۔ کئی روز سے بیوی بچّوں کو چھوڑ کر یہاں بھٹک رہے ہو۔" ملک سہیل کی کپکپاتی ہُوئی آواز میں ممنونیت تھی۔

"چھوڑو، یار... ابھی میں کیا کر سکا ہوں؟ دوست تو دوستوں کے لیے بہت کچھ کیا کرتے ہیں۔"

"خُدا تم دونوں کی دوستی سدا قائم رکھے۔" ملک جی دونوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ملازم نے دلاور کے آنے کی اطلاع دی۔

"اچھا جی، ہم تو چلے۔" شاکر ملک سہیل سے مصافحہ کرتا ہوا بولا۔ "اجازت ہے؟"

"کھانا تو کھا لیتے..."

"ملک جی! کام کے مقابلے میں، مَیں کھانے کو اہمیّت نہیں دیا کرتا۔ اب اس وقت آپ ہمیں جانے ہی دیں۔"
"اچھا تو جاؤ، خُدا تمھارا مددگار ہو اور تمھیں کامیابی عطا کرے... ہماری اور ہمارے تصوّر آباد کی عزّت بچ جائے۔"
"خُدا حافظ...!"
"اللہ کے سپُرد...!"

گاڑی لیٹ ہوجانے کی وجہ سے شاکر اور دلاور آدھی رات کے قریب شہر پہنچے۔ شاکر کے سر پر ایسی دُھن سوار تھی کہ وہ اُسی وقت دلاور کے پارٹنر کریم سے مِلنا چاہتا تھا۔ ملک سہیل نے دلاور کو ہدایت کردی تھی کہ شاکر کے ہر حکم کی ہر حال میں تعمیل کی جائے۔ اسی لیے وہ شاکر کی خواہش پر اسے سیدھا اپنے پارٹنر کے ہاں لے گیا۔

آدھی رات کو دلاور کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر کریم حیرت زدہ رہ گیا لیکن سمجھدار تھا اِس لیے معاملے کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا۔ شاکر کو احترام سے اندر لاکر بٹھایا۔ شاکر فوراً ہی مطلب کی بات زبان پر لے آیا۔

"وہ عورت... وہ عورت..." کریم یاد کرتا ہُوا بولا۔ "ہاں، مجھے یاد آگئی... مگر... مگر وہ ہماری رشتے دار تو نہیں تھی۔"
"پھر کون تھی وہ؟ تم نے اُسے تصوّر آباد بھجوایا تھا۔"
"وہ میری ماں کی کوئی ملنے والی تھی۔ میں نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جس وقت میں دلاور کی بہن کی شادی کی بات ماں سے کر رہا تھا تو وہ موجود تھی، وہاں۔"
"تمھارے گھر...؟"
"ہاں، ماں سے ملنے آئی تھی۔"
"تو تمھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ تمھاری ماں کو کس رِشتے یا تعلق سے ملنے آئی تھی؟"
"میں گھر کی باتوں میں بہت کم دخل دیتا ہُوں۔ دلاور سے پُوچھ لیں۔ زیادہ وقت تو اِس کے ساتھ ہی دُکان پر گزارتا ہُوں۔ رات گئے واپس آتا ہُوں تو اکثر گھر والے سوئے ہُوئے ملتے ہیں۔ اس دِن صرف اسی لیے جلدی آگیا تھا کہ دلاور نے اپنی بہن کی شادی پر آنے کی بہت تاکید کی تھی۔"
"پھر...؟ وہ چلی گئی اور تمھاری ماں نہیں گئی؟"
"میری ماں کو بُخار تھا... اور وہ خود بخود چلنے کو تیار ہوگئی۔"
"کیوں...؟"
"میں اکثر تصوّر آباد اور وہاں کے لوگوں کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ میری ماں کہتی تھی، کسی موقع یا تقریب پر چلیں گے۔ اُس نے بھی سُن لیا ہوگا۔ بس اسی شوق میں وہ بھی چلی گئی۔"
"مجھے اس سے ملوا سکتے ہو؟"
"اب...؟ اسی وقت...؟" کریم نے گھبرا کر پُوچھا۔
"ابھی نہیں..." شاکر اس کی گھبراہٹ پر مسکرانے لگا۔ "کل... البتہ پرسوں تک انتظار نہیں کرسکتا۔"
"کریم، یہ ذہن میں رکھنا کہ یہ ہمارے ملک سہیل کے جگری دوست ہیں۔" دلاور بولا۔
"میرے ذہن میں تو یہ ہے کہ تُو میرا جگری یار ہے اور ان صاحب کو تُو ساتھ لے کر آیا ہے۔" کریم کندھے اُچکا کر بے پروائی سے بولا... پھر وہ چونک پڑا اور جلدی سے بولا۔ "رات بھر سفر میں رہے ہو۔ بستر لگواتا ہُوں اور کھانا بھی شاید نہ کھایا ہو۔"
"مَیں تو اِس وقت چلتا ہُوں۔ البتہ دلاور کے لیے یہ سارے انتظامات ضرور کرادو۔"

"مگر آپ کہاں جائیں گے؟" دلاور نے جلدی سے پُوچھا۔
"اسی شہر میں میرا اپنا گھر ہے۔"
"اوہ...!" اُس نے حیرت سے شاکر کی طرف دیکھا۔
"بس، کام کی دُھن سوار ہوجائے تو میں ایسا ہی اُلٹ پُلٹ انسان بن جایا کرتا ہُوں۔"
شاکر ہنستا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔
"اُلٹ پُلٹ مَیں تو نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں آپ سے متاثر ہُوا ہُوں۔ ہر انسان کو ایسا ہی دُھن کا پکّا ہونا چاہیے۔" دلاور س کے ساتھ کھڑا ہوتا ہُوا بولا۔
"اچھا بھئی، صبح دس بجے آؤں گا... اور پُوری معلومات مجھے مِل جانا چاہئیں۔"
"معلومات یا وہ عورت؟"
"عورت بھی مِل جائے تو کیا ہی کہنے۔ ویسے مجھے یقین نہیں کہ وہ عورت آسانی سے مل جائے گی۔"
"کیوں...؟"
"اس کیوں کا جواب تمھیں خود ہی مل جائے گا۔"
شاکر، دونوں کو ہکّا بکّا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد، دلاور نے صاحباں کی گمشُدگی کا سارا واقعہ کریم کو بتایا۔
"تمھارے گاؤں کی عزّت کا معاملہ ہے تو جو کچھ بھی مجھ سے ہوسکا ضرور کروں گا۔"
شاکر وقت کا ایسا پابند نکلا کہ پُورے دس بجے آپہنچا۔
"ہم پہلے دوسرے محلّے میں رہتے تھے۔" کریم نے بتایا۔ "وہیں پر ہماری ایک پڑوسن کی وہ ملنے والی تھی۔ میری ماں نے ہے کہ وہ اتنی بااخلاق تھی کہ پورے محلّے سے اس کی میل ملاقات ہوگئی تھی۔ جب بھی ہماری پڑوسن سے ملنے آتی تو سارے ی عورتوں سے مِل کر جایا کرتی تھی۔"
"مجھے اس تفصیل کی ضرورت نہیں۔ میں تو اُس عورت سے ملنا چاہتا ہُوں۔" شاکر قدرے اُلجھ کر بولا۔
"وہی تو بتا رہا ہُوں۔ میری ماں نے صبح ہی میرے چھوٹے بھائی سلیم کو بھیجا تھا... لیکن وہ پڑوسن ہی نہیں ملی۔ اگر وہ جاتی تو آسانی سے اُس عورت کا پتا چل جاتا۔"
"اوہ..." شاکر نے ایک طویل سانس لی۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ آسانی سے نہیں ملے گی۔"
...پھر وہ یکایک مطمئن اور سنجیدہ سا ہوگیا اور انتہائی نرم لہجے میں بولا۔ "وہ پڑوسن کب ملے گی؟"
"وہ تو حج کرنے گئی ہوئی ہے۔ تین مہینے تک اُس کی واپسی ہوگی، تبھی کچھ معلوم ہوسکے گا۔"
"کوئی بات نہیں۔ شاکر پر اِس سے کٹھن مرحلے آئے ہیں۔ انتظار کرلوں گا۔"
"ملک سہیل پریشان ہوں گے۔" دلاور بولا۔
"آج ہی اُن سے مِل کر ساری بات سمجھا دوں گا۔ ایسے معاملات میں یہ سب کچھ تو ہُوا ہی کرتا ہے۔"
تین مہینوں کا انتظار خاصا صبر آزما تھا۔ ملک جی اور ملک سہیل پریشان ہوگئے۔ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ جانے صاحباں جب یہ دیر کر رہے تھے یا تصوّر آباد والوں کے مقدّر... پہلے ہی دو سال اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے گزر چکے تھے۔ خُدا کرکے اب ایک راہ ملی تھی تو اس میں بھی جگہ جگہ رُکاوٹیں پیش آرہی تھیں۔

بڑی مشکل سے انتظار کی یہ مدّت گزری جو تین مہینوں سے بڑھ کر پانچ، چھ مہینوں تک جا پہنچی تھی۔ حج کے بعد پڑوسن ہاں پر اپنے بیٹے کے پاس ٹھہر گئی تھی۔ اس کا بیٹا سعودی عرب میں مُلازمت کرتا تھا۔ اس مقدّس سرزمین پر رہنے کا موقع ملا تھا اُسے گنوانا نہیں چاہتی تھی... پھر شاید زندگی میں ایسا موقع نہ ملے۔

چھ ماہ بعد، اس کی واپسی ہوئی تو اسی وقت کریم نے شاکر کو اس کی اطلاع دے دی... اور شاکر ایک لمحہ بھی ضائع بغیر اس کے پاس جا پہنچا۔

گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا لیکن پھر بھی شاکر کے لیے اُس نے وقت نکال لیا۔
کوئی بھی عام سی بات بھُلانے کے لیے ڈھائی سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔ وہ اس واقعے اور عورت کو بھُول چُکی تھی۔

کریم، دلاور اور شاکر کے بار بار یاد دلانے پر اسے یاد آیا۔
"اچھا... اچھا... وہ سانولی سی رنگت اور درمیانے جسم والی فیشن ایبل اُدھیڑ عُمر سی عورت؟"
"ہاں... ہاں، وہی..." دلاور جلدی سے بولا۔
"کپڑے اور جوتیاں نئے نئے فیشن کی پہنتی تھی۔" شاکر نے بتایا۔
"ہاں، بڑے اخلاق والی تھی۔ کیا نام تھا، اس کا...؟... ثریّا... ہاں، ثریّا ہی تھا۔"
"نام وام تو ہم نہیں جانتے۔ حُلیہ البتّہ یہی تھا۔"
"وہ میری بہن کے ساتھ والے مکان میں رہتی تھی۔ میں جب بھی اپنی بہن سے مِلنے جاتی تھی اُس سے ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ پھر وہ ہمارے ہاں بھی آنے جانے لگی تھی۔ بڑی ملنسار تھی۔ سارے محلّے ہی سے اُس کی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ جب مجھ میرے پاس آتی تو سب سے مل جاتی تھی۔"
"وہ عورت جس کا نام آپ، ثریّا بتاتی ہیں، کریم کے پارٹنر دلاور کے گاؤں بھی گئی تھی؟" شاکر نے پُوچھا۔
"ہاں... اب سب کچھ یاد آرہا ہے۔ شادی وغیرہ کی تقریبات میں شریک ہونے کی بڑی شوقین تھی۔"
"بس، ہم اسی سے مِلنا چاہتے ہیں۔"
"کل میں، آپ کو اپنی بہن کے گھر لے چلوں گی۔ آج مہمانوں کی وجہ سے مصروفیت ہے۔"
"بہت مہربانی آپ کی جو اتنا بھی وقت دے دیا۔"
دوسرے دن کا وعدہ لے کر شاکر اُٹھ کھڑا ہُوا۔
اگلے روز، کریم کی سابقہ پڑوسن، حسبِ وعدہ شاکر کو اپنی بہن کے ہاں لے گئی۔
"ہاں، وہ میرے ساتھ والے مکان میں کئی مہینے رہی تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں اچانک ہی چلی گئی۔" اس کی بہن نے بتایا۔
"کب گئی؟" شاکر نے بے چینی سے پُوچھا۔
"دو، ڈھائی سال ہو گئے۔"
"وہ تصوّر آباد، کسی شادی میں شرکت کے لیے بھی گئی تھی؟"
"ہاں، وہاں سے واپس آتے ہی یہ گھر چھوڑ گئی تھی۔"
"جب وہ گاؤں سے واپس آئی تھی تو آپ اُس سے ملی تھیں؟... وہ اکیلی تھی یا ساتھ کوئی...؟"
"وہ رات میں واپس آئی تھی اور اسی رات اپنا سامان وغیرہ لے کر یہ مکان چھوڑ گئی تھی۔ ہمیں تو دوسرے دِن صبح کو پتا چلا تھا... سارے محلّے والے حیران تھے کہ ایسی با اخلاق اور ملنسار عورت بغیر کسی سے مِلے یا کچھ بتائے ہی چلی گئی۔ بہت دِنوں تک اس کے متعلق باتیں بھی ہوتی رہیں۔"
"پھر وہ کبھی مِلنے بھی نہیں آئی؟"
"نہیں..."
"اتنا دوستانہ تھا بلکہ بہنوں کی طرح تھی۔"
"ہاں۔ پھر بھی نہیں۔ یہی تو سب کو حیرت تھی کہ اُس نے ایسا کیوں کیا؟!"
"وہ اکیلی ہی تھی؟"
"ہاں... اکیلی ہی سمجھیں۔"
"کیا مطلب...؟"
"ایک بیٹی تھی مگر وہ بھی اُس کے پاس نہیں رہتی تھی۔"
"تو پھر کہاں رہتی تھی... ننھیال یا ددھیال میں؟"
"نہیں... نہ ننھیال میں نہ ددھیال میں... وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔"
"کیوں...؟"
"شوہر کے ساتھ بنتی نہ تھی۔ اس لیے گھریلو فضا بچّی کے لیے ناسازگار تھی۔ چنانچہ اُسے ہوسٹل میں ڈال دیا۔ کچھ عرصے بعد، میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی تو لڑکی کو ہوسٹل میں رہنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ بس یہی وجہ اُس نے بتائی تھی۔"

"اور ان کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟ میرا مطلب ہے شوہر سے علیحدگی کے بعد اخراجات کیسے پُورے ہوتے تھے؟"
"یہ میری عادت نہیں کہ کسی کے خالص گھریلو یا ذاتی معاملات کے بارے میں چھان بین کرتی پھروں اور نہ ہی اُس نے اِس بارے میں کچھ بتایا تھا۔"
"پھر اب...؟ آپ، ہماری کچھ مدد نہیں کر سکتیں؟"
"مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ..."
وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی پھر قدرے توقف سے بولی۔ "ہاں، یاد آیا۔ ایک دِن میرا لڑکا فیض بتا رہا تھا کہ اُسے راستے میں ملی تھی میرے کو بھی اُس سے کافی لگاؤ ہوگیا تھا... اُس نے ثریّا سے یُوں یکایک چلے جانے کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے بتایا تھا کہ اکیلے ہونے کی ے مکان چھوڑ کر وہ اپنے کسی رِشتے دار کے پاس چلی گئی ہے۔"
"کہاں...؟"
"گھر کا تو معلوم نہیں، گلبرگ میں کہیں بتایا تھا۔"
"آپ کے لڑکے کو یاد ہوگا؟"
"وہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ سوات کی سیر کو گیا ہُوا ہے۔"
کئی دِن فیض کو سوات سے آنے میں لگے۔ تب کہیں اُس سے ملاقات ہُوئی۔
"خالہ ثریّا کا گھر... مجھے یاد تو نہیں رہا لیکن اُس علاقے میں جاؤں تو شاید مِل جائے۔"
"ہائے، ہائے! تم اس کے گھر بھی گئے تھے؟ مجھے کیوں نہیں بتایا۔" ماں نے غصیلی نگاہ سے بیٹے کو دیکھا۔ "میرا اتنا جی چاہ رہا تھا اُس سے کو۔" پھر وہ، شاکر سے مخاطب ہُوئی۔ "کوئی زیادہ عرصہ بھی وہ اس مکان میں نہیں رہی مگر لگتا تھا جیسے ہماری برسوں سے ملاقات ہو۔ اتنی سار اور با اخلاق تھی وہ۔"
وہ پھر بیٹے سے اُلجھنے لگی۔ "جب تم نے اُس کا گھر دیکھا تھا تو مجھے کیوں نہیں بتایا!"
"امّاں یاد نہیں رہا ہوگا۔ راستے میں ملی تھیں۔ تیز تیز کہیں جا رہی تھیں۔ میں اسکوٹر پر تھا۔ انہیں جلدی میں دیکھ کر انہیں اُن کے گھر پا دینے کی پیشکش کی وہ فوراً راضی ہوگئیں۔ چانکہ میں بھی ذرا جلدی میں تھا۔ اس لیے جہاں اُنہوں نے کہا، اُتار کر آگے بڑھ گیا تھا۔"
"اگر اسکوٹر پر چلیں تو اب اُس کا گھر ڈھونڈ لوگے، برخوردار؟" شاکر نے بڑے پیار سے پُوچھا۔
"کیوں نہیں جی، ضرور... لیکن آپ کو کام کیا ہے؟"
"کوئی ہوگا... تم کیوں پُوچھتے ہو؟ مجھے یہ عادت پسند نہیں۔" ماں نے بیٹے کو ڈانٹا۔ ڈانٹ کھا کر وہ خاموش ہوگیا۔
"تو پھر چلوگے، میرے ساتھ؟"
"کیوں نہیں جائے گا... چلو، اُٹھو..." ماں تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "اگر گھر مِل گیا تو کل مجھے بھی لے کر چلنا۔"
"لے جاؤں گا... پہلے میں تو تلاش کروں۔ کیا پتا نہ ملے۔"
"گھر بھی مل جائے گا اور انشاءاللہ وہ خُود بھی مِل جائے گی۔ مجھے پُورا یقین ہے۔ اس لیے کہ میرا اس سے ملنے کو بہت دِل چاہتا ہے۔"
... اور... وہ گھر مِل گیا... مگر وہ عورت نہ مِلی۔
"حُلیہ یہی تھا مگر اُس کا نام تو رشیدہ تھا۔"
"نہیں جی... رشیدہ نہیں، ثریّا... ثریّا..." فیض اس شخص کے ساتھ بحث کرنے لگا، جو اس مکان سے نِکلا تھا۔
"اُوں ہُوں..." شاکر نے اُسے ٹوکا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ رشیدہ ہی نام ہوگا۔"
"نہیں جی، رشیدہ نہیں ثریّا تھا۔" فیض پھر بولا۔
"بیٹے، نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حُلیہ تو اُنہوں نے وہی بتایا ہے نا۔" شاکر اسے سمجھانے لگا۔ "نام بدلا جا سکتا ہے۔ شکل و صُورت نہیں۔"
"یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ قائل ہوگیا۔ "لیکن خالہ کو نام بدلنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟" فیض کچھ سوچنے لگا۔
شاکر، اُس شخص سے مخاطب ہُوا۔ "ہاں، تو جناب! بتائیے نا... وہ رشیدہ کہاں ہے؟"
"وہ چند دن یہاں رہی تھی۔ اس کے بعد پتا نہیں کہاں چلی گئی؟ آپ اُس کے رِشتے دار ہیں؟"
"نہیں۔ ہمارا اور اس کا بس اتنا تعلق تھا کہ جس مکان میں ہم رہتے ہیں وہ مکان ہم سے پہلے اُس کے پاس تھا۔"
"کیا بہت ہی ضروری کام ہے، آپ کو، اُس سے؟"

"ہاں، بے حد ضروری۔"
"شاید مالک مکان سے اس کا پتا چل جائے۔"
"تو اس مکان کا مالک کہاں رہتا ہے؟"
"شادماں میں..."
"پورا ایڈریس تو ہوگا، آپ کے پاس؟"
"کیوں نہیں... اکثر آنا جانا رہتا ہے۔"
فیض کو وہیں سے واپس بھیج کر شاکر شادماں کی طرف روانہ ہوگیا۔

جوں جوں اُس عورت کے ملنے کی آس بندھ بندھ کر ٹوٹ رہی تھی شاکر کا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ صاحباں کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ ہے۔ تبھی تو وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹکی تھی اور نام بھی بدلے جاتے رہے تھے۔ یقیناً وہ غلط قسم ہی کا دھندا کر رہی تھی۔
صاحباں کے ساتھ ساتھ اور نجانے کتنی معصوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کی ہوگی... اب تو اُسے ڈھونڈنا تم پر فرض ہوگیا ہے، شاکر میاں اپنے پیشے اور ملک سہیل کی دوستی کی خاطر نہیں بلکہ ایک محبِ وطن کی حیثیت سے، ملک و قوم کی سینکڑوں بیٹیوں کی خاطر تمہیں اب اُسے ہر حال میں تلاش کرنا ہوگا۔
حلیہ معلوم ہونے پر شادماں والے غفار نے شاکر کو بتایا۔
"جی ہاں، اس نے ہمارا مکان کرائے پر لیا تھا... لیکن پھر ڈیڑھ دو ماہ بعد چھوڑ دیا..."
"پھر وہ کہاں چلی گئی؟ آپ جانتے ہیں؟"
"یہ تو نہیں معلوم... لیکن کبھی کبھار ملنے آجایا کرتی ہے۔"
"ملنے آتی ہے...!" شاکر متحیر سا رہ گیا۔
"ہاں... لیکن آپ اس قدر حیران کیوں ہوئے؟"
"نہیں... نہیں..." شاکر نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "اس میں بھلا حیرت کی کیا بات ہے؟"
غفار کو تو اُس نے ٹال دیا تھا لیکن اُس کی حیرت بدستور قائم تھی۔ وہ عورت جہاں ایک بار رہی تھی۔ دوبارہ وہاں نہیں آئی تھی اور نہ ہی وہاں سے کسی قسم کا رابطہ رکھا تھا... پھر... غفار کے لیے یہ رعایت کیوں؟... ضرور اس میں بھی اس کا کوئی نہ کوئی مفاد ہوگا۔
"پیار محبت اور دوستی کے رشتے تو کہیں بھی استوار کیے جاسکتے ہیں۔ وہ بڑی ملنسار عورت ہے۔ آپ کی بیوی سے تو..."
"میری بیوی تو تین سال ہوئے انتقال کر چکی ہے۔" غفار اُس کی بات کاٹ کر بولا۔
بیوی کے ذکر سے اس کے چہرے پر آزردگی سی پھیل گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔ چند لمحے بعد اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر آئی اور آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔
"دراصل، میری ایک بیٹی ہے۔ وہ، اسی کی خاطر آتی ہے۔"
"بیٹی کی خاطر...!" شاکر چونکا لیکن اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔
"ہاں، میری بیٹی کو بہت چاہتی ہے۔ بڑی دوستی ہے، دونوں میں۔"
"کیا عمر ہے، آپ کی بیٹی کی؟"
"دو مہینے بعد اُس کی تیرھویں سالگرہ ہے۔"
ہوں... تو اس لیے یہ محبت لٹائی جا رہی ہے۔ یقیناً اُس کا اگلا شکار یہ لڑکی ہوگی ورنہ تیرہ سال کی بچی اور چالیس پینتالیس سال کی عورت میں دوستی کی کیا تُک۔ یقیناً وہ نہایت خوبصورت بچی ہوگی۔
"آپ کی بچی پڑھتی ہے؟"
"جی ہاں، بہت لائق ہے۔ ہمیشہ کلاس میں اوّل آتی ہے۔"
"بہت اچھی بات ہے یہ تو... مجھے ایسے ہونہار بچے بہت پیارے لگتے ہیں۔ کیا میں، آپ کی بچی سے مل سکتا ہوں؟"
"کیوں نہیں... کیوں نہیں۔" باپ فخر و مسرت سے بولا۔ "وہ ابھی دس پندرہ منٹ میں آجائے گی۔ آپ اندر تشریف رکھیں۔"
وہ جلدی سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر گیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ "آیئے۔ آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔"
شاکر اندر جا کر بیٹھ گیا۔

"چائے پئیں گے؟"
"جی...!" شاکر نے چونک کر پوچھا۔ وہ اپنی سوچوں میں مگن تھا۔
"میں کہہ رہا تھا، جب تک دُردانہ نہیں آتی، چائے کی ایک پیالی ہو جائے۔"
وہ، شاکر کا جواب سُنے بغیر کمرے سے نکل گیا۔
دس منٹ بعد، وہ خود ہی چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوا۔
"میرا اپنا دل، اس وقت چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ کا ساتھ ہوگیا۔"
شاکر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اولاد بھی عجیب چیز ہے۔ اُس کی تعریف کرنے والا بھی عزیز ہو جاتا ہے۔ اِس سے شاکر کو [...]ہ ہوگیا کہ اُسے اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہے۔
"یہ لیجیے، چائے..." اس نے چائے بنا کر شاکر کو پیش کی۔ "اور آپ..." وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز پر چونک [...]روازے کی جانب دیکھنے لگا۔
"السلام علیکم...!" ایک لڑکی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ کھٹ کھٹ کی آواز اُسی کے سینڈلوں کی تھی۔ شاکر کی نگاہ [...]ب سے پہلے اُس کے پیروں ہی پر پڑی تھی۔ سیاہ سینڈلوں میں نازک سے گورے گورے پاؤں بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ [...]اس کی نگاہیں اوپر اُٹھتی ہوئی، لڑکی کے چہرے پر آکر رُک گئیں۔
"بُوا نے بتایا ہے، مہمان آئے ہیں، مجھے ملنے؟" وہ آکر باپ کے پاس کھڑی ہوگئی۔
لڑکی ابھی تیرہ سال کی نہیں ہوئی تھی لیکن اُس کی اُٹھان قیامت خیز تھی۔ انار کی کلیوں جیسے سُرخ سُرخ گالوں والی وہ لڑکی بیحد [...]عوم اور حسین تھی۔ بارہ تیرہ سال کی اس معصوم سی بچی پر شباب اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ آنے والا تھا... اور شاکر دم بخود [...]ھا اُسے دیکھ رہا تھا۔
"یہ میری بیٹی دُردانہ ہے۔" غفار نے تفاخر سے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔
"ڈیڈی! میں نے ان انکل کو تو پہلے کبھی نہیں دیکھا... بُوا کہہ رہی تھیں کہ میرے مہمان ہیں۔" شاکر کی طرف دیکھ کر وہ بڑے [...]رے انداز میں مسکرائی۔
"ہاں، بیٹے... آپ نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں، آپ کی آنٹی رشیدہ..."
"اوہ، آنٹی رشیدہ..." وہ جلدی سے شاکر کے پاس آکھڑی ہوئی۔ "مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہت پیار کرتی ہیں... [...]ب وہ کب آئیں گی؟ میں روزانہ اُن کا انتظار کرتی ہوں۔"
"دو تین دن تک شاید آجائیں۔ میں خود اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں...؟ آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"
"میں، ان کا دُور کا رشتے دار ہوں۔ باہر سے آیا ہوں۔ جب گیا تھا تو وہ آپ کے مکان میں رہتی تھیں۔ اب ملنے آیا تو معلوم ہوا کہ [...]کان چھوڑ کر جا چکی ہیں۔"
"مجھے تو نہیں پتا کہ وہ اب کہاں رہتی ہیں... ڈیڈی کو بھی نہیں معلوم۔ ہیں نا، ڈیڈی؟"
"ہاں، کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ خود ہی آجایا کرتی ہیں۔" باپ نے بیٹی کی تائید کی۔
"تو بیٹے..." شاکر، دُردانہ سے مخاطب ہوا۔ "پھر یہ پیار کیسا ہوا کہ آپ کو اپنی اتنی پیاری آنٹی کے گھر ہی کا پتا نہیں؟"
"ہاں، ڈیڈی..." وہ باپ کی طرف مُڑی۔ "انکل ٹھیک کہتے ہیں... اب دیکھیں نا، جب آنٹی کا ملنے کو دل چاہتا ہے تو وہ آ جاتی ہیں۔ جب میرا جی چاہتا ہے تو میں نہیں جاسکتی۔"
"تو بیٹے، آنٹی سے اُن کا پتا معلوم کر لیا ہوتا، نا..."
"اس کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ اب آئیں گی تو ضرور پوچھ لوں گی۔" پھر وہ، شاکر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ "مجھ سے آپ نے بس آنٹی رشیدہ ہی کا پوچھنا تھا؟"
"جی ہاں..."
"تو پھر میں اب جاؤں۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ بُوا نے کھانا گرم کر دیا ہوگا۔"
"ہاں بیٹے... آپ کھانا کھائیں۔"

"السلام علیکم!" اجازت ملتے ہی وہ سلام کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"ماشاءاللہ...!" اس کے جانے کے بعد شاکر بولا۔ "آپ کی بیٹی بڑی پیاری اور ذہین ہے۔"

"بس جی... بیچاری کے نصیب کچھ اچھے نہ ثابت نہ ہوئے۔"

"کیا مطلب...؟"

"ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔"

"آپ جو ہیں۔ خدا آپ کو اس کے سر پر سلامت رکھے... اس کے کاموں کے سامنے انسان دم نہیں مار سکتا۔"

"جی ہاں..." اس نے ایک طویل سانس لی۔ "یہ تو ہے۔"

"رشیدہ کی کتنے عرصے سے آپ کے ہاں آمد و رفت ہے؟" شاکر پھر اپنے مطلب پر آ گیا۔

"یہی کوئی سال بھر سے۔ دُردانہ، ماں کی کمی، اُسی کے پیار میں پوری کرتی ہے۔ وہ بھی اسے بے انتہا چاہتی ہے۔ ہر وقت اُس کے ہونٹوں پر آنٹی رشیدہ کا نام ہوتا ہے۔"

غفار نے ان دونوں کی محبت کے کئی واقعات سنائے۔ شاکر توجہ سے سب کچھ سنتا رہا اور نتیجے اخذ کرتا رہا۔

اُس نے بہتر یہی سمجھا کہ اس شخص کی بیٹی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آنے سے پیشتر ہی اسے رشیدہ کی اصلیت بتا دینا چاہیے۔

تب اُس نے اپنی آمد کی اصل وجہ اور صاحباں کا پورا واقعہ اُسے بتا ڈالا۔

"میں تو اب کبھی اُسے اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دوں گا۔" بیٹی کا معاملہ تھا غفار ایک دم طیش میں آ گیا۔

"اب آپ کی بیٹی پر اُس کی نگاہ ہے۔ آپ اُسے اپنے گھر میں آنے نہیں دیں گے تو وہ کوئی اور حربہ استعمال کرے گی۔"

"حرامزادی..." وفورِ طیش سے اس کی آواز پھٹنے لگی۔ آنکھیں خون کبوتر کی مانند سرخ ہو گئیں۔

"دیکھیے، میں ایک بار پھر آپ سے یہی التجا کروں گا کہ آپے سے باہر نہ ہوں۔ آپ اگر باحوصلہ اور پُرسکون رہیں گے تو اور بیشمار لڑکیاں برباد ہونے سے بچ جائیں گی۔"

"اتنی بڑی بات یہ... اور میں باحوصلہ اور پُرسکون رہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے، جناب!"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اس کی بہتری کی خاطر ہی آپ ذرا خود کو سنبھالیے۔"

"کیا کروں؟" شاکر کے سمجھانے پر غفار قدرے دھیما پڑ گیا۔

"اب وہ جب آئے تو..."

"اب تو میں اُسے اپنے گھر کی طرف دیکھنے بھی نہ دوں۔" غفار، اس کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں بولا۔

"پھر وہی بچوں والی باتیں..." شاکر مسکرا دیا۔

"نہیں... نہیں۔" شاکر کی مسکراہٹ سے وہ کچھ خفیف سا ہو گیا۔ "آپ بتائیے۔ اب میں اپنے غصے کو قابو میں رکھوں گا۔"

"اگر آپ نے ذہانت سے کام نہ لیا اور اس عورت کے منہ ہی پر اس کی پول کھول دی تو بات اور بگڑ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسکول میں آپ کی بیٹی سے ملنا شروع کر دے۔"

"ارے ہاں، یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ وہ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ آپ درست کہتے ہیں۔ تو پھر بتائیے میں کیسا طرزِ عمل اختیار کروں۔ لے دے کے میری زندگی بھر کی پونجی بس یہی بیٹی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ جیسا میں کہوں ویسا ہی کریں۔"

"بتائیے، میں اپنی دُردانہ کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"آپ اپنے طرزِ عمل سے اس پر ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ آپ اُس کے سیاہ کرتوتوں سے واقف ہو چکے ہیں۔"

"پھر... اس کے بعد...؟"

"کسی نہ کسی طرح اُس کی قیام گاہ کا پتا معلوم کریں۔"

"دُردانہ سے کہوں گا۔ وہ لاڈ و پیار میں معلوم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر میں نے پوچھا تو شاید سمجھ جائے۔"

"آپ کا کہنا بھی درست ہے لیکن بچی یہ کام مناسب انداز میں کر سکے گی؟ اگر اُس نے میرے متعلق کچھ بتا دیا تو پھر وہ ہاتھ نہیں آ سکے گی۔"

"دُردانہ کو آپ نہیں جانتے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ ذہین اور سمجھدار ہے۔ ویسے میں اُسے سمجھا دوں گا۔"

شاکر اسے تاکید کرنے کے بعد اپنا پتا دے کر لوٹ آیا۔

پانچ، چھ روز ہی گزرے تھے کہ غفار، رشیدہ یا ثریا کا مکمل پتا لے کر آ گیا۔

"بہت خوب..." شاکر کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ "کیسے پتا حاصل کیا؟"

"آپ کے چلے آنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اگر وہ غلط قسم کی عورت ہے تو اپنا صحیح پتا بچی کو بھی نہیں بتائے گی۔ تب میں نے اپنے ... صورتحال بتا کر اس کام پر آمادہ کیا۔"

"اوہ، زیادہ کانوں تک یہ بات نہیں پہنچنا چاہیے تھی۔"

"وہ لڑکا قابلِ اعتماد ہے۔"

"پھر...؟"

"کل وہ آئی تھی اور میری توقع کے مطابق اُس نے دُردانہ کے کئی بار پوچھنے پر بھی اپنا پتا نہیں بتایا... پھر میں نے واپسی پر اپنے ... کو اس کے تعاقب میں لگا دیا۔"

"اُسے کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟"

"بالکل نہیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

شاکر اُسی دن، غفار کے دیے ہوئے پتے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس نام کی کوئی عورت وہاں نہیں رہتی۔ البتہ صغریٰ نام کی ایک ... ضرور وہاں ڈیڑھ دو مہینے رہی تھی لیکن ایک روز قبل وہ بھی یہ مکان چھوڑ گئی تھی۔ اس عورت کا بھی حلیہ وہی تھا جو رشیدہ ...یا کا تھا۔

شاکر اپنے چکراتے سر کو تھام کر رہ گیا۔ وہ عورت تھی یا چھلاوہ... اُس کا سراغ ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اگر کہیں ذرا سا لگتا بھی ... ہاتھ نہ لگتی۔ اتنی چالاک تھی کہ اپنا پتا کسی کو معلوم ہی نہ ہونے دیتی تھی... اور اب وہی پہلے دن والی تاریکی تھی۔

وہ انہی سوچوں میں غرق مایوس اور دل گرفتہ سا واپس آ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا... اُس کی ... ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اس کی وساطت سے اس عورت کو ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ وہ خود تو ہر گھر آسانی سے بدل لیتی تھی لیکن بیٹی کا اسکول ... بدلا جا سکتا تھا۔

شاکر سیدھا فیض کے گھر پہنچا۔ اب فیض کی ماں کو بھی اعتماد میں لینا ناگزیر ہو گیا تھا۔

"مجھے تو وہ پہلے دن ہی ایسی ویسی لگی تھی۔" فیض کی ماں نے رازدارانہ انداز میں انکشاف کیا۔

چند روز پہلے وہ، اس کی محبت میں بیٹے سے جھگڑ رہی تھی۔ اب اُسی میں سو سو عیب دکھائی دینے لگے۔ وہ منہ بھر بھر کر اُسے کوسنے ...

پھر شاکر کے سمجھانے پر بڑی مشکل سے اُس کا غصہ قدرے سرد ہوا۔

"اُس کی بیٹی کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ کیا نام تھا، اس کا... فاریہ... ہاں فاریہ ہی تھا۔"

"اب اگر آپ اُسے دیکھیں تو پہچان لیں گی؟"

"کیوں نہیں... میرا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے۔"

"کون سے ہوسٹل میں ہے؟"

"اسکول کے نام کا تو پتا نہیں لیکن ایک بار میں، ثریا کے ساتھ اُس کے ہوسٹل گئی تھی۔"

"چلیں پھر...؟"

"ابھی...؟"

"ہاں، ابھی... ہمیں جلد پہنچنا چاہیے۔"

فیض کی ماں، اُس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی۔ وہ فطرتاً نیک عورت تھی۔ دوسرے دل میں تجسس بھی تھا۔ وہ، ثریا جیسی ...لط عورت کا انجام دیکھنا چاہتی تھی۔

ہوسٹل کی وارڈن نے بتایا کہ فاریہ نام کی کوئی لڑکی اس وقت ہوسٹل میں نہیں ہے۔ البتہ پچھلے ہی سال اسی نام کی ایک لڑکی ...یٹرک کر کے گئی تھی۔ کہاں گئی؟ مزید تعلیم حاصل کر رہی ہے یا نہیں؟ یہ اُسے نہیں معلوم تھا۔

یہ سن کر شاکر بے حد پریشان ہو گیا۔ "ہمارا اُس سے ملنا بے حد ضروری تھا۔"

"اُس کی رُوم میٹ پچھلے سال بیماری کی وجہ سے امتحان نہیں دے سکی تھی وہ آج کل یہیں ہے۔ شاید اُس سے کچھ معلوم ہو سکے میں اُسے بلواتی ہُوں۔" وارڈن نے شاکر کی پریشانی دیکھتے ہُوئے کہا۔

"بڑی مہربانی ہوگی۔"

فاریہ کی رُوم میٹ آئی تو وارڈن کی طلبی پر خاصی بوکھلائی ہُوئی تھی۔ جب فاریہ کے متعلق اس سے پوچھا گیا تو تب اس کے اوسان بحال ہوئے۔

"تمھارا کیا نام ہے، بیٹی؟" فیض کی ماں نے پُوچھا۔

"صاعقہ..." وہ سانسوں کو اعتدال پر لاتی ہُوئی بولی۔

"فاریہ کو جانتی ہو؟"

"ہاں، وہ میری بڑی گہری سہیلی ہے۔"

"اُس کا کچھ اَتا پتا جانتی ہو؟" شاکر نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ ہم اکثر ملتی رہتی ہیں۔ اُس نے مزید تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔"

"اور رہتی ہوسٹل ہی میں ہے؟"

"ہاں، وہ ماں کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔"

"کیوں...؟"

"اس کی ماں کے میل ملاقات والے بہت ہیں اس لیے وہ اکثر گھر سے باہر ہی رہتی ہے اور فاریہ گھر میں اکیلی بور ہوتی رہتی ہے۔ ہوسٹل میں تو لڑکیاں ہوتی ہیں، دل لگا رہتا ہے۔" پھر وہ ایک دم چونک کر شاکر کی طرف دیکھتی ہُوئی بولی۔ "مگر آپ کیوں اُسے ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"میں اُس کا چچا ہُوں۔ کئی سالوں بعد باہر سے آیا ہُوں۔ بچپن میں اُسے گودیوں میں کھلایا تھا... بڑا پیار تھا، اُس سے۔ اب پاکستان آیا تو بے اختیار اُس سے ملنے کو جی چاہا۔"

شاکر کی گفتگو میں ایسی بے ساختگی اور والہانہ پن تھا کہ صاعقہ نے اسے سچ سمجھا اور اُسے، فاریہ کے ہوسٹل کا پُورا پتا بتا دیا۔

یہاں فاریہ مل گئی... دُبلی پتلی، نازک سی خاصی پُرکشش لڑکی تھی۔ اس ہوسٹل کی وارڈن کو بھی وہی کہانی سُنانا پڑی جو صاعقہ کو سُنائی تھی... فاریہ نے جھٹ یقین کر لیا... پھر شاکر کے محبت آمیز اصرار پر اگلے دن ہی ہونے والا ویک اینڈ، اس کے ہاں گزارنے پر تیار ہو گئی۔ فاریہ کی ماں ہر ہفتے اپنی بیٹی سے ملنے آیا کرتی تھی۔ چنانچہ شاکر کی ہدایت پر ماں کے نام ایک چھوٹا سا خط لکھ کر، وارڈن کے پاس چھوڑ وہ، شاکر کے ساتھ چلی آئی۔

"امی! میں اپنے چچا کے پاس ویک اینڈ گزارنے جا رہی ہُوں۔ آپ بھی یہیں آجائیے۔ میرے چچا بہت اچھے ہیں۔ آپ بھی اُن سے مل کر یقیناً خوش ہوں گی۔

آپ کی فاریہ"

فاریہ ہی کی ہم عمر، شاکر کی بھی ایک بیٹی تھی اور اُس سے چھوٹے دو بیٹے تھے۔ یُوں بھرے پُرے گھر میں فاریہ کا بے حد دِل لگا۔ شاکر نے اپنی بیوی اور بیٹی کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ اُنہوں نے بھی اُس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جیسے واقعی وہ، اُن کی رشتے دار ہو اور ایک طویل عرصے کے بعد ملی ہو۔

فاریہ نے ہوش سنبھالا تو بورڈنگ میں تھی۔ گھریلو ماحول پہلی بار دیکھا تھا۔ شاکر نے بھی اُسے اجنبیت محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ دوسرے روز... فاریہ نے بڑے پیار سے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "چچا جان! اب میں آپ کے پاس رہوں گی۔ ہوسٹل نہیں جاؤں گی۔ چچی اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہنا بڑا اچھا لگتا ہے۔"

شاکر نے اس سے وعدہ تو کر لیا مگر اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔ ماں کے جرائم کی سزا وہ معصوم بیٹی کو دے رہا تھا۔ اسے تو اُس نے چارہ بنایا تھا، اُس کی ماں کو پکڑنے کے لیے۔ اب صرف یہی آخری راستہ رہ گیا تھا... اور وہ بیچاری معصوم لڑکی کس اپنائیت سے سوچنے لگی تھی۔ ملک سہیل! کاش! تم میرے دوست نہ ہوتے... یا پھر فاریہ، کاش! تم اس عورت کی بیٹی نہ ہوتیں...

شاکر انہی سوچوں میں غلطاں بیٹھا ہُوا تھا کہ مُلازم نے ایک عورت کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ، فاریہ کی ماں ہی ہو سکتی ہے۔ وہ، جس عورت کے تعاقب میں سال بھر سے بھاگ رہا تھا۔ اب وہ خود اس کے دروازے پر آموجود ہُوئی تھی۔

اُس نے شکر کیا کہ اس وقت وہ تنہا ہی ہے ورنہ فاریہ زیادہ تر اُسی سے لپٹی رہتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کی بیٹی، فاریہ

لائبریری دکھانے دوسری منزل پر لے گئی تھی... شاکر نے ملازم سے اُسے دفتر میں بٹھانے کو کہا۔

یہ کمرہ جسے اُس نے دفتر بنا رکھا تھا، گھر کے دوسرے کمروں سے بالکل علیحدہ تھا۔ اِس طرح کہ اس کا باقی گھر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ی اس نے مُلازم کو یہ تاکید بھی کر دی کہ گھر کے کسی فرد کو اُس عورت کی آمد کے متعلق علم نہ ہو... پھر وہ اپنے دفتر میں پہنچ گیا۔ وہ بیٹھی نی۔ اس کا حُلیہ وہی تھا۔ واقعی بڑی بارُعب شخصیت تھی، اُس کی۔

"تو تم میری بیٹی کے چچا بنے ہو؟" اُس نے چبھتی ہُوئی نگاہوں سے شاکر کو دیکھا۔

"ہاں، تم بیسیوں لڑکیوں کی کچھ نہ کچھ بن چکی ہو تو کیا میں صرف ایک لڑکی کا چچا بھی نہیں بن سکتا؟"

شاکر کے جواب پر ایک لمحے کے لیے اس کا رنگ اُڑ گیا تھا لیکن فوراً ہی اُس نے خود کو سنبھال لیا۔ شاکر اس کے چہرے کی طرف ا تھا۔ اس کی یہ لمحاتی تبدیلی، اُس کی باریک بین نگاہوں سے چھُپی نہ رہ سکی۔

"تم اپنا مقصد بتاؤ۔ میری بیٹی کو اِغوا کر کے کیوں لائے ہو؟" وہ نہایت بارعب لہجے میں بولی۔ "تم شاید مجھے نہیں جانتے؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمھارے کئی نام ہیں اور ہر مہینے دو مہینے بعد، تم مکان تبدیل کر لیتی ہو۔ میں کئی مہینوں سے ں تلاش میں تھا۔"

"پھر معلوم ہوگیا کہ میں کیا ہُوں؟"

"ہاں..." شاکر مسکرایا۔

"فاریہ کو بلاؤ۔ میں، اُسے لینے آئی ہُوں۔"

"لے جانا... ضرور لے جانا... مگر ایسے نہیں۔"

"کیا مطلب...؟"

"ایک سودا کرنا ہوگا۔"

"سودا...؟" وہ نخوت سے بولی۔ "میں نے کبھی کوئی سودا نہیں کیا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، میں پولیس میں تمھاری اطلاع دے دیتا ہُوں۔"

"اس کی پروا نہیں۔ جاؤ دے دو۔" وہ ہنس پڑی۔

"اوہ...!" شاکر بڑبڑایا... تو یہ چکر ہے۔ صاحباں اور دوسری لڑکیوں کا اِغوا اس اکیلی کا کارنامہ نہیں۔ یقیناً اِس کی پُشت پر کوئی بڑا اور پولیس کے کچھ لوگ ہیں جبھی یہ بے دھڑک ہو کر یہاں چلی آئی ہے۔ اب محتاط ہو کر ہر قدم اُٹھانا پڑے گا۔

"مجھے جانتی ہو، میں کون ہوں؟"

"آتے ہُوئے تمھارے نام کی تختی پڑھی تھی۔" وہ بے پروائی سے کندھے اُچکا کر بولی۔ "تم سمجھتے ہو، میں تم سے ڈر جاؤں گی۔" اُس نے ایک لگایا۔ "میرے ہاتھ بھی بہت مضبوط ہیں۔"

"پھر کیسا جکڑا، تمھارے مضبوط ہاتھوں کو؟"

"کیا مطلب؟"

"فاریہ والا معاملہ کیسا رہا؟ تمھاری دُکھتی رگ پر ہاتھ دھرا ہے۔"

"میری بیٹی میرے حوالے کر دو۔" اس کا لہجہ یکایک نرم ہوگیا۔ شاید وہ معاملے کی نزاکت کو بھانپ گئی تھی۔

"سودا کر لو۔" شاکر نے پھر اپنا مطالبہ دُہرایا۔

"کونسا سودا...؟ میں نے تو تمھاری بیٹی پر کبھی ایسی نگاہ نہیں ڈالی۔"

"یُوں سمجھو، صاحباں میری بیٹی ہے۔"

"صاحباں...! کون سی صاحباں؟"

"بابا عادل کی بیٹی... تصور آباد والی صاحباں دے دو، فاریہ لے لو۔" شاکر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"لیکن میں کہاں سے دوں؟ میں تو کسی صاحباں کو نہیں جانتی۔"

"تقریباً تین سال قبل، تم کریم کے پارٹنر دلاور کے ساتھ تصور آباد گئی تھیں۔"

"کون کریم، کون دلاور اور کون سا تصور آباد؟ نجانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ یہ سب نام نے پہلی بار سُنے ہیں۔"

"اگر میری باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہیں تو تمھاری بھی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جانے فاریہ کون ہے؟"

"اُس کے ہاتھ کا لکھا ہُوا رُقعہ، میرے پاس موجود ہے اور اُس میں تمھارا پتا درج ہے۔ میں، پولیس میں رپورٹ کراؤں گی۔"

"شوق سے کراؤ... تم میرے خلاف ایک کیس کرو گی تو تمھارے خلاف درجنوں ہیں۔"

پھر شاکر نے میز کی دراز میں سے اخباروں کے چند تراشے نکال کر اُس کے سامنے پھیلا دیے۔

"یہ دیکھو، مختلف دیہاتوں سے کئی لڑکیاں غائب ہونے کی خبریں... اور ہر خبر میں ایک بات مشترکہ ہے، وہ یہ کہ ہر واردات کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہے... کیا وہ عورت تم نہیں ہو؟"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ عورت میں ہُوں؟ تمھارے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

"ثبوت ہوتے تو تم اب تک سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکی ہوتیں اور مجھے یہ طریقہ استعمال نہ کرنا پڑتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایک بہت بڑے گروہ کے ساتھ مل کر لڑکیاں اِغوا کرنے کا کام کر رہی ہو... اور اُن لوگوں کے ہاتھ بہت مضبوط ہیں۔"

"فاریہ کہاں ہے؟" وہ سُنی اَن سُنی کرتی ہُوئی بولی۔

"جب تک صاحباں کا پتا نہ بتاؤ گی، فاریہ کا پتا بھی نہیں ملے گا۔"

"فاریہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔" وہ اِلتجا آمیز لہجے میں بولی۔

"صاحباں بھی اپنے والدین کی ایک ہی بیٹی تھی۔"

"دیکھو، اس معاملے میں نہ پڑو۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔ "وہ لوگ بہت ظالم ہیں۔"

"میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ یہ دوستی کا معاملہ ہے۔"

"دوستی کا معاملہ!" وہ حیرت سے بولی۔

"تصوّر آباد کا مالک، ملک سہیل میرا بچپن کا دوست ہے... لہٰذا مَیں ہر حال میں صاحباں کی بازیابی چاہتا ہُوں۔"

"تین سال تک کہاں تھے؟"

"مجھے دیر سے اس معاملے کا علم ہُوا تھا۔"

"پھر بھی اب صاحباں کا مطالبہ کر رہے ہو؟"

"ہاں، چھ سال بھی گزر جاتے تو میرا مطالبہ برقرار رہتا۔ تصوّر آباد، میرے دوست کا ہے۔ وہاں کی لڑکی یُوں راتوں رات غائب ہو جائے اور وہ خاموش بیٹھا رہے۔ یہ اس کی عزت اور وقار کا مسئلہ ہے... خیر چھوڑو، ان باتوں سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے صاحباں چاہیے... فاریہ کے بدلے، سمجھیں...؟"

"وہ اب نہیں مِل سکتی۔"

"کیوں...؟"

"وہ تو نجانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہو گی۔"

"وہ پاتال میں بھی پہنچ جائے، اسے ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔"

"لیکن آخر اس میں فاریہ کا کیا قصُور ہے؟"

"تمھاری بیٹی ہے اور صاحباں کو تصوّر آباد سے غائب کرنے والی ہستی تمھارے سوا اور کوئی نہیں۔"

"دیکھو، میں تمھاری منت کرتی ہُوں۔ صاحباں کے معاملے کو دبا رہنے دو۔ تین سال گزر گئے ہیں۔ اب تو وہ پتے گھر والوں کے پاس جانے کے قابل بھی نہیں رہی ہو گی۔"

"تو چلو، فاریہ بھی اسی جیسی ایک لڑکی ہے۔"

"نہیں... نہیں..." وہ ایک دم چیخ پڑی۔ "تم مجھ سے جتنی چاہے رقم لے لو۔"

"تم سے کیوں...؟ جہاں صاحباں کا سودا ہُوا تھا۔ ویسی ہی کسی جگہ فاریہ بھی جائے گی۔ بہت خوبصورت ہے، اچھی رقم مِل جائے گی۔" شاکر اس کی طرف دیکھتا ہُوا بڑے بے رحمانہ انداز میں بولا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ میں مر جاؤں گی۔"

"جانے کتنی ماؤں اور باپوں کو تم نے مار ڈالا ہے؟"

"مگر میں کیا کرتی...؟ عورت تھی، ماں تھی۔" آخر وہ ماتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر بلک پڑی۔ "اپنی بچّی کو بچانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ ان کے لیے کام کروں ورنہ پھر میری فاریہ..." وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ "بِن باپ کی بچّی... یتیم بے چاری۔"

"اس کا باپ تو شاید زندہ ہے۔ تم نے اس سے طلاق لے لی تھی۔"

"نہیں، وہ سب گھڑی ہُوئی کہانیاں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی دو سال کی بچّی کو بڑی مشکلوں سے پالا ہے اور... اور بس، کچھ نہ پُوچھو۔ یہ لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ کہ اس کو بچانے کی خاطر مجھے جرائم کی دُنیا میں آنا پڑا۔"

"بغیر جُرم یا گناہ کیے بھی تم اپنی بیٹی کو بچا سکتی تھیں۔" شاکر نے اُسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ شاید اب وہ اس طرح ہمدردی حاصل کر کے اپنی بیٹی کو نکال لے جانا چاہتی تھی۔

"نہیں، خُدا گواہ ہے۔ میں اُس ذاتِ برتر کی قسم کھا کر کہہ رہی ہُوں کہ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور پھر جب کوئی راستہ نہ ملا تو مجبوراً اُن کے آگے جھکنا پڑا۔ صرف اس بچّی کی خاطر۔ یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مرتے وقت، اس کے باپ سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ..."

سسکیوں اور ہچکیوں میں اُس کی آواز ڈوب گئی۔ کئی منٹ تک کمرے میں خاموشی رہی۔ صرف اس کی سسکیوں کی آواز... ڈوب کر اُبھرتی رہی۔

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟" وہ ذرا سنبھلی تو شاکر نے پُوچھا۔

"خُدا کے لیے میری بیٹی مجھے دے دو۔"

"اس کی تو صرف ایک ہی صُورت ہے۔"

"صاحباں...؟"

"ہاں..."

"مگر وہ اب نہیں مِل سکتی؟"

"کیوں...؟" شاکر کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔ "اُسے فروخت ہی کیا گیا ہو گا نا؟... اور جس کے ہاتھ فروخت کیا گیا ہو گا اس کا نام، پتا بھی ضرور ہو گا... تم اب بھی چھپا رہی ہو۔"

"یقین کرو۔ مجھے نہیں معلوم۔ میرا کام صرف لڑکیوں کو ورغلا کر لانا اور اُن کی اُس وقت تک دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ جب تک کوئی گاہک دام چکا کر انہیں لے نہ جائے۔ کون آیا؟ کون لے گیا؟ کہاں لے گیا؟ مجھے کوئی علم نہیں ہوتا۔"

"حیرت ہے۔"

"فاریہ ہی کی قسم لے لو۔ مجھے اگر علم ہوتا تو اپنی بچّی کی خاطر ضرور بتا دیتی۔ ویسے صاحباں کے ساتھ بڑا عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہُوا۔"

"کیا ہُوا تھا؟" شاکر نے پھر اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

"ایسے نہیں دیکھو۔" وہ، اس کی نگاہوں کا انداز سمجھ کر التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "میری بات کا یقین کرو۔ اس وقت تمھارے سامنے بردہ فروش عورت نہیں، ایک ماں بیٹھی ہے اور کوئی بھی ماں اپنی اولاد کی جھُوٹی قسم نہیں کھا سکتی۔"

"واقعہ بتاؤ..."

"جس روز، اس کا سودا ہونا تھا، اُس سے ایک رات پہلے وہ غائب ہو گئی۔ شاید اُس نے کچھ سُن گُن پالی تھی۔"

"پھر اس کے بعد، اُس کا پتا ہی نہیں چلا؟... یہ ناممکن ہے کہ تم لوگوں نے اُسے تلاش نہ کیا ہو۔"

"یہ میں نے کب کہا کہ اُسے تلاش نہیں کیا گیا... بہت تلاش کیا مگر وہ نہ مِلی۔ حیرت ہی تھی۔ وہاں سے کبھی کوئی لڑکی بھاگ نہیں سکی تھی۔ وہ بھولی بھالی لڑکی کیسے نکل گئی۔"

"بات مختصر کرو۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔"

"ہمارا ایک مستقل گاہک تھا جو سندھ سے آیا کرتا تھا۔ وہی صاحباں کو خریدنا چاہتا تھا۔ پھر جب وہ سودا کرنے آیا تو اسی وقت صاحباں کے غائب ہونے کا علم ہوا تھا۔ بے چارا مایوس ہو کر واپس چلا گیا... لیکن آٹھ، دس روز بعد، وہ صاحباں کے دام چکانے آ گیا سب حیران رہ گئے کہ مال لیے بغیر وہ دام دے رہا ہے۔ تب اس نے بتایا کہ صاحباں، اسی کی گاڑی میں چھُپ کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہُوئی تھی۔ وہ ان لوگوں کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے ساری بات بتا دی اور دُگنی رقم دے کر چلا گیا۔"

"دُگنی کیوں...؟"

زیادہ پسند آگئی ہوگی۔"
"مستقل گاہک تھا۔ اس سے تو صاحباں کے متعلق معلوم کیا ہی جاسکتا ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟"
"اس کے بعد، وہ پھر کبھی آیا ہی نہیں۔"
"کیا مطلب...؟"
"میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید اس گروہ کے سربراہ کو علم ہو۔"
"تو پھر اس شخص کا پتا معلوم کرو۔"
"وہ کیسے...؟"
"یہ تمھارا کام ہے۔"
"اگر نہ پتا چل سکا...؟"
"تو فاریہ کو بھول جانا۔"
"نہیں... نہیں... ایسا ظُلم نہ کرو۔" وہ تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔
"تم شاید یہ بھول گئی تھیں کہ ظالم ایک نہ ایک دِن خود اپنے ہی ظُلم کا شکار ہوتا ہے۔"
وہ پھر رونے لگی۔ شاکر کو اس پر ترس بھی آرہا تھا۔ یہ عورت کچھ بھی سہی لیکن اس وقت صرف ایک ماں ہے... اس نے سر کو جھٹک کر سوچا۔ اس وقت سختی ناگزیر ہے۔ اگر فاریہ اس کو مِل گئی تو پھر وہ، صاحباں تک نہیں پہنچ سکے گا۔
قصُور اس کا بھی نہیں تھا۔ مامتا کی مجبوریوں نے اُسے غلط راہ پر لا کھڑا کیا تھا۔ شاکر نے سوچ لیا تھا کہ صاحباں کی بازیابی کے بعد، اس گروہ ہی کا قلع قمع کردے گا اور...
"اچھا ایک بار، اُس کی صُورت تو دِکھا دو۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"
"صُورت دیکھنے سے کیا ہوگا؟ کہہ تو رہا ہوں اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ بس، تم جتنی جلدی اس شخص کا پتا معلوم کرکے بتادو گی اتنی ہی جلدی اپنی بیٹی سے مِل سکوگی۔"
"کوشش کروں گی۔"
"کوشش نہیں۔ یہ کام تمھی کو کرنا ہے، ہر حالت میں... اپنی بیٹی کی خاطر۔"
تھوڑی دیر تک وہ سر جُھکائے بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر سر اُٹھا کر بولی۔ "پکّا وعدہ ہے نا... پتا لا دوں گی تو میری بیٹی مجھے مل جائے گی؟" پھر وہ اپنے آنسو پُونچھنے لگی۔
"ہاں، تمھاری بیٹی تمھیں مِل جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی تمھیں ایک وعدہ بھی کرنا ہوگا۔"
"وہ کیا...؟"
"تم یہ دھندہ چھوڑ دو گی۔"
"اور اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے کھو دوں۔ میرے پاس کسی مَرد کا مضبوط سہارا موجود نہیں ہے۔ میں تنہا عورت اس کی حفاظت نہیں کرسکتی... میں بہت کمزور ہوں۔"
"عورت بظاہر کمزور ہوتی ہے لیکن اس کا کردار مضبُوط ہو تو وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرسکتی ہے۔"
"صرف اپنی ذات کی حد تک، جب کوئی دوسرا ساتھ وابستہ ہوجائے اور وہ بھی جوان بیٹی... تو پھر جان بھی نہیں دی جاسکتی۔"
"اوہ...!"
"زمانہ بڑا بے درد ہے، شاکر سراغ رساں... تم نہ تو عورت ہو اور نہ ہی کبھی ایسی مجبوری سے تمھیں واسطہ پڑا ہوگا۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اکیلی عورت کا جوان اور خوبصورت بیٹی کے ساتھ زندگی گزارنا بے حد مشکل ہے بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تم یہ غلط کام چھوڑنے کو تیار نہیں ہو؟"
"میں تیار نہیں..." زہریلی سی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ "ارے، زمانہ مجھ سے چھُڑانے کو تیار نہیں۔"
اُس کے کاٹتے ہوئے لہجے نے اُس کی ہر مجبُوری اور بے بسی شاکر پر عیاں کردی۔ اب اس کے دل میں، اس عورت کے لیے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔

"تمھارا شوہر مرچکا ہے تو کوئی بھائی تو ہوگا، اُس کے پاس کیوں نہیں رہتیں؟"
"اُسی بے غیرت نے تو اپنی بیوی کے کہنے پر ہمیں دھکّے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اب نہ اُسے معلوم ہے کہ اس کی بیوہ بہن یتیم بھانجی کہاں دھکّے کھاتی پھر رہی ہیں... اور نہ ہی مجھے علم ہے کہ وہ کہاں ہے۔ میرے لیے وہ اُسی دِن مَر گیا تھا۔"
"میری بہن بنو گی...؟" اچانک شاکر نے پُوچھا۔
"کیا مطلب...؟" وہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔
"ایک بھائی نے ٹھکرا دیا تھا۔ میں دوسرا بھائی بن کر تمھیں سہارا دینا چاہتا ہوں۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ تمھارے اندر کی نیک رت ابھی زندہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھاری بیٹی تمھارا موجودہ رُوپ دیکھے... ورنہ وہ معصوم ساری زندگی اس اذیت میں گزار ے گی کہ وہ ایک مجرمہ کی بیٹی ہے۔"
"ئل... لیکن... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا ایسا مُمکن ہے؟" اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ میں سُکھ کا لس لے سکوں، عزت کی زندگی بسر کرسکوں، اپنی بیٹی کے ساتھ رہ سکوں؟" وہ بڑبڑانے لگی۔
"کیوں نہیں ہوسکتا؟ میں تمھیں اور تمھاری بیٹی کو مکمل تحفظ دوں گا۔"
"نہیں... نہیں..." وہ اچانک ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "میں، تمھارے ساتھ دُشمنی نہیں کرسکتی۔ تم نے مجھے بہن کہا ہے۔ میں تمھیں اندھیرے ں نہیں رکھ سکتی۔ وہ لوگ بہت ظالم اور بے رحم ہیں... وہ تمھاری جان کے درپے ہوجائیں گے۔"
"میں، اُنہیں چھوڑ دوں، تب نا؟" وہ ہنس کر بولا۔
"پھر... میں بھی تو اُن کی شریکِ کار ہوں۔ کیا قانون مجھے چھوڑ دے گا؟"
"تم فکر نہ کرو۔ صاحباں مِل جائے اور بحفاظت تصوّر آباد پہنچ جائے پھر یہ آپریشن ہوگا۔ تم سُلطانی گواہ بن جانا۔ بنو گی...؟"
"میں خود اس زندگی سے تنگ آچکی ہوں... لیکن میری بیٹی کو کسی بات کا پتا نہ چلے۔ تم وعدہ کرو کہ اُسے کچھ معلوم نہ ہوگا اور میں بچ جاؤں گی۔ میں اپنی بیٹی کی خاطر بچنا چاہتی ہوں۔ اپنی فاریہ کی خاطر۔"
"میں نے پُورے خلوص سے اور خُدا کو گواہ بنا کر تمھیں بہن کہا ہے۔ تم یقین رکھو۔"
"تو پھر ٹھیک ہے... میں تم پر اعتماد کروں گی۔"
"خُدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ بہتری کرے گا۔"
"میں پرسوں آؤں گی۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "صاحباں کا پتا اور اس گروہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ اطلاعات لے کر آؤں گی۔" پھر وہ جوڑتی ہوئی بولی۔ "ایک بار پھر میں، منت کرتی ہوں کہ فاریہ کو کسی بات کا علم نہ ہو۔" چلتے چلتے پھر اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ "اس کا خیال ا۔ وہ میری زندگی کا واحد سہارا ہے۔"
وہ آنسو پُونچھتی ہوئی چلی گئی... اور شاکر دم بخود بیٹھا اُس کُرسی کی طرف دیکھتا رہا جہاں ایک بے بس اور تنہا ماں، مجبُوریوں کی ستان بنی بیٹھی اپنے حالِ زار پر آنسو بہا رہی تھی۔

صاحباں کو گُم ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا تھا کہ اب کسی کو بھی اُس کے ملنے کی اُمید نہیں رہی تھی ملک سہیل اور ملک جی نے پُورے اور توقعات کے ساتھ، صاحباں کا کھوج لگانے کا کام شاکر کے سُپرد کیا تھا... مگر اب وہ اس سے بھی مایوس ہوچکے تھے۔ کئی ہفتے تو کیا، کئی ہ بیت گئے تھے۔ اُس نے کوئی خبر نہیں دی تھی... کچھ بھی نہیں بتایا تھا، صاحباں کے متعلق...

... اور اب تو ملک سہیل جیسا تعلیم یافتہ شخص بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ بقول گاؤں والوں کے، کیا واقعی یہ جنّات کا کام ہے؟

ملک سہیل تنہائی میں بیٹھا انہی سوچوں میں گم تھا کہ فضلو کی آواز نے چونکا دیا۔

"شاکر صاحب آئے ہیں، چھوٹے ملک جی!"

"شاکر...! وہ کیسے آگیا؟" ملک سہیل نے بے یقینی کی کیفیت میں پوچھا۔

"کیوں...! کیا شاکر کا اس گاؤں میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا ہے؟" شاکر، کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

ملک سہیل اضطراری انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ... آؤ... تمھارا یہاں آنا کیوں ممنوع قرار دیا جائے گا۔ اگر کام نہیں ہو سکا تو یہ تمھارا قصور نہیں۔ قسمتوں ہی کا کوئی چکر ہے۔ ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

"آئے گا... کیوں نہیں آئے گا..." شاکر، ملک سہیل کے پاس بیٹھ کر، اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے خوشگوار موڈ میں بولا۔ "تم نہ کچھ محسوس کرنا۔ خُدا نے تمھیں بہت بڑا ظرف دیا ہے لیکن میرے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ دوست نے ساری زندگی میں پہلا کام کہا اور میں وہ بھی نہ کر..."

"نہیں... نہیں۔ ایسا کبھی نہ سوچنا... اوئے، فضلو! چائے پانی کا انتظام کر۔"

"اسے کہو، چائے پانی کے ساتھ کوئی میٹھی چیز لانا نہ بھولے۔"

"بھوک لگ رہی ہے؟"

"بھوک لگتی تو کھانا مانگتا۔ تمھارے گھر میں کوئی تکلف نہیں ہے۔"

"پھر...؟ میں سمجھا نہیں۔"

"میٹھی چیز مانگی ہے۔ منہ میٹھا کروں گا اپنا اور تمھارا بھی کراؤں گا۔"

"کیوں...؟" ملک سہیل نے سنبھل کر شاکر کے کندھے تھام لیے۔ "کیا ہوا، شاکر؟ مجھے تمھاری آواز سے اندازہ ہو رہا ہے کہ کوئی خوشی کی خبر لائے ہو۔ بتاؤ، یار... جلدی سے بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟" شاکر ہنستے ہوئے بولا۔

"یہی کہ صاحباں کا پتا چل گیا ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں، نا؟"

"بالکل..."

"زندہ ہے...؟"

"بالکل زندہ سلامت۔ ٹھیک ٹھاک۔"

"پھر... کہاں ہے، وہ؟" ملک سہیل کی آواز وفورِ مسرت سے کپکپانے لگی۔ "ابا جی... اوئے، فضلو! ابا جی کو تو بلا... اور سن، گھر میں جو جو میٹھی چیزیں بنی ہوئی ہوں، چائے کے ساتھ سبھی لے آنا۔"

"اور اگر کوئی بنی ہوئی ہی نہ ہو تو؟"

"مجھے میٹھا بہت پسند ہے۔ دو، تین قسم کے میٹھے تو ہر وقت موجود رہتے ہیں... اوئے، فضلو! تو گیا نہیں، ابھی تک؟"

"بس، جی... جا رہا ہوں۔" فضلو کھڑا، بڑے اشتیاق سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ چھوٹے ملک جی کی پیار بھری ڈانٹ سن کر بھاگ کھڑا ہوا۔

"جلدی چائے لانا اور ابا جی کو بھی فوراً بھیجنا۔"

ملک سہیل کی بلند آواز نے اُس کا پیچھا کیا تو اس کے قدموں میں اور تیزی آگئی۔

"پھر...؟" ملک سہیل، شاکر سے مخاطب ہوا۔ "اُسے ساتھ لے آئے ہو، نا؟"

"نہیں..."

"نہیں...! کیوں؟"

"میں تو ابھی صرف اُس کا پتا لایا ہوں۔ اُسے لانا آسان کام نہیں ہے۔"

"پولیس کو خبر کی ہوتی۔"

"نہیں۔ پولیس کو خبر کرنے سے بات پھیل جانے کا اندیشہ ہے... اور اگر بات پھیل گئی تو وہاں سے لڑکی غائب کر دی جائے گی۔"

"پھر...؟"

"یہی معاملہ سوچنے کا ہے۔"

"کیا سوچنے کا؟... کچھ تفصیل بتاؤ نا، کہ لڑکی اس وقت کہاں ہے؟ وہ گئی کیوں اور کیسے تھی؟"

"سہیل بیٹے!" اچانک دروازے سے ملک جی کی آواز آئی۔ "سنا ہے، شاکر آیا ہے۔" پھر اُن کی نظر شاکر پر پڑی تو بولے۔

"اوہ! شاکر یہیں ہے۔ سناؤ، شاکر میاں! کہاں رہے، اتنے دن؟"

"السلام علیکم! ملک جی..." شاکر تعظیماً کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام! بیٹھو، بیٹھو... یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" وہ، ان دونوں کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ "کوئی افواہ وغیرہ تو نہیں۔"

"نہیں، ملک جی! آپ نے جو کچھ سنا، سچ ہے۔ صاحباں کا پتا چل گیا ہے۔"

"تمھارے منہ میں گھی، شکر..."

"گھی، شکر سے کچھ نہیں بنے گا، ملک جی! کوئی مزیدار سی میٹھی چیز کھلائیے۔"

"تمھارا منہ اعلا سے اعلا مٹھائیوں سے بھر دوں گا، شاکر بیٹے... بس، لڑکی مل جائے۔ ہماری آبرو رہ جائے گی اور ہمارے تصور آباد میں پھر سے بہار آجائے گی۔"

"اُس کا پتا تو لے آیا ہوں لیکن اُسے وہاں سے لانا ذرا مشکل کام ہے۔"

"کیوں...؟ کیا کوئی ایسی ویسی جگہ ہے؟" ملک جی نے شاکر کے قریب ہو کر رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ "میں نے عادل کو بلوا بھیجا ہے۔ اُس کے آنے سے پہلے مجھے بتا دو۔"

"میں، آپ کی بات نہیں سمجھا، ملک جی!"

"میرا مطلب ہے، بیٹے! لڑکی کسی غلط جگہ پر تو نہیں ہے۔ عادل کے آنے سے پہلے بتا دو۔ بیٹی کا باپ ہے، اُسے دُکھ ہوگا۔"

"آپ کا مطلب، کسی کوٹھے وغیرہ سے ہے؟" شاکر نے پوچھا۔

"ہاں، میرا یہی مطلب تھا۔ لڑکی... جوان اور خوبصورت تھی۔ کسی ایسی جگہ ہی سے مل سکتی ہے۔"

"ابھی تو کسی ایسی جگہ تک نہیں پہنچی۔ ہو سکتا ہے کہ جلد پہنچ جائے۔"

"اللہ نہ کرے۔" ملک جی بولے۔

"خُدا رحم کرے۔" ملک سہیل بھی بڑبڑایا۔

"کچھ معلوم ہوا کہ وہ یہاں سے کیوں گئی تھی؟" ملک جی نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"سب کچھ معلوم ہو گیا ہے، ملک جی! وہ گئی نہیں تھی۔ بہلا پھسلا کر لے جائی گئی تھی... یہاں کسی کی شادی تھی۔ اس میں شرکت کے لیے شہر سے ایک عورت خاص طور پر یہی مقصد لے کر آئی تھی کہ کسی خوبصورت سی لڑکی کو ورغلا کر لے جائے۔"

"... اور صاحباں، واقعی اس گاؤں کی سب سے زیادہ خوبصورت اور معصوم لڑکی تھی۔" ملک سہیل بولا۔

"ہاں۔ تبھی وہ شکار بنی۔" شاکر نے فاریہ کی ماں سے سنی ہوئی تفصیل، اُنھیں سنا دی کہ کس طرح اور کس مشکل سے وہ عورت، صاحباں کو ورغلانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ پھر دونوں کیسے گاؤں سے نکلی تھیں اور کہاں رہیں اور آخر میں صاحباں، وہاں سے بھی کس طرح فرار ہو کر میاں جی کے پاس جا پہنچی۔

"اور اب...؟"

"اب اس شخص سے صاحباں کو چھڑانا ہے، جس کا اصلی نام وارث نیازی ہے مگر وہ میاں جی کہلاتا ہے۔ سب چھوٹے، بڑے، عورت، مرد اُسے میاں جی کہتے ہیں۔ گزشتہ تین برسوں سے صاحباں، اُسی کے قبضے میں ہے۔"

"اُس کے قبضے میں... وہ کیسے؟"

"اُس نے صاحباں کی قیمت ادا کی ہے۔"

"یعنی اُسے خریدا ہے؟"

"ہاں..."

"پھر...؟ یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔"

"ہو سکتا ہے وہ اپنی خرچ کی ہوئی رقم واپس لے کر، لڑکی دینے پر آمادہ ہو جائے۔"

"لڑکی، سارے گاؤں کی عزت کا سوال ہے۔ ہم ایک سال کی فصل کی آمدنی، اس کے لیے وقف کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی

ا، راض نہیں کرے گا۔"

"اور اگر میں ہی اعتراض کروں تو؟" دروازے سے آواز آئی۔

اس آواز پر تینوں ہی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔۔۔ اور ملک جی طویل سانس لے کر بولے۔ "عادل! یہ تم ہو؟"

"عادل! تم کب آئے؟" ملک سہیل نے دریافت کیا۔

"میں سب کچھ سُن چکا ہوں، ملک سہیل!"

"مبارک ہو، تمھیں عادل۔۔۔ تمھاری بیٹی کا پتا چل گیا ہے۔"

"شکریہ، ملک جی۔۔۔ مبارک کا شکریہ! لیکن۔۔۔" عادل آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا، اُن کے قریب آکھڑا ہُوا۔ "اب اُس لڑ ں کے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" ملک جی نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

اُس کے چہرے پر خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ کیسا باپ تھا؟ بچھڑی ہُوئی، اکلوتی بیٹی کے مِل جانے کی نوید نے اُس پر کو ئی اثر نہ کیا تھا۔

"یہاں بیٹھو اور ذرا ہوش و حواس قائم رکھ کر۔۔۔"

"میں پورے ہوش و حواس میں ہُوں، ملک جی!" عادل نے بیٹھتے ہُوئے ملک جی کی بات کاٹی۔ "میرے گھر میں غربت ،، ملک جی۔۔۔ اور اس لڑکی نے دولت کے لالچ میں گھر چھوڑا تھا۔" گو عادل کا سر جُھکا ہُوا تھا لیکن اُس کے لہجے میں سنگینی تھی۔ "، جو کچھ چاہتی تھی شاید پا چکی ہے۔ اس لیے غربت و افلاس کے دروازے اُس کے لیے بند ہو چکے ہیں۔"

"ایسا نہ کہو، عادل! تمھاری ایک ہی اولاد ہے۔ اُس کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند نہ کرو۔"

"میں نے بند نہیں کیے، خود اُس نے بند کیے ہیں۔"

"پچھلی باتوں کو جانے دو۔ تم اپنی بیوی کا خیال کرو جو بستر پر پڑی ہے۔ اُسی کی خاطر بیٹی کو لے آؤ۔"

"نہیں۔ میرا یہی فیصلہ ہے۔"

"لیکن اس وقت، ہم تمھارا فیصلہ ماننے کو تیار نہیں۔ ہمارے گاؤں کا وقار اسی میں ہے کہ لڑکی واپس لائی جائے۔"

"ہاں، عادل صاحب! لڑکی واپس آنی چاہیے۔" شاکر نے بھی ملک جی کی ہاں میں ہاں مِلائی۔

"عادل، اس وقت جذباتی ہو رہا ہے۔ بیٹی گھر میں آگئی تو خود ہی اُسے معاف کر دے گا۔ اولاد چیز ہی ایسی ہے۔"

عادل نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن ملک جی نے اُسے بولنے نہ دیا۔

"یہ لو، چائے پیو۔" اُنھوں نے چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ "اس خبر نے تمھارے ہوش و حواس برقرار نہیں رہنے دیئے۔"

"آج میں ہمیشہ سے زیادہ ہوش و حواس میں ہُوں، ملک جی!"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ اب تم مت بولنا۔"

عادل کو خاموش کرا کے ملک جی، شاکر سے مزید معلومات حاصل کرنے لگے۔۔۔ ابھی اُن کی گفتگو کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ حویلی کے باہر ، لوگوں کے شور کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔

"اوئے، فضلو! باہر یہ شور کیسا ہے؟"

فضلو، دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ملک جی کی آواز سُن کر جلدی سے اندر آگیا۔ "وہ جی۔۔۔ وہ۔۔۔ مم۔۔۔ میں نے تو صرف ماسی برکتے کو بتایا تھا۔ مگر گاؤں کے باقی لوگوں کو پتا نہیں، جی۔۔۔ کیسے معلوم ہو گیا۔"

"کیا معلوم ہو گیا؟" ملک جی دھاڑے۔

"یہی جی، کہ صاحباں کا کھوج لگ گیا ہے۔"

"اور اب وہ کس لیے یہاں آئے ہیں؟"

"آپ کے اور عادل بابا کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"

عادل سر جُھکائے خاموش بیٹھا رہا، البتہ ملک جی اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

سب جانتے تھے کہ صاحباں کا سُراغ لگانے کے لیے ملک جی نے شہر سے خاص سُراغ رساں بُلایا تھا۔ وہ ذاتی طور پر اس میں دلچسپی

، رہے تھے اور آج جو صاحباں کا کھوج لگا تھا تو یہ اُنھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

ملک جی کو دیکھتے ہی سب اُن کے گِرد جمع ہو گئے۔

"ملک جی! آپ کو ڈھیر ڈھیر ساری مُبارک ہو۔ ہمارے گاؤں میں تو اس خبر نے خوشیوں کا مینھ برسا دیا ہے۔"

"سُنا ہے، عادل بابا بھی یہیں ہے۔ ہم اُسے بھی مبارکباد دینا چاہتے ہیں۔"

"وہ اس وقت شاکر سے کچھ ضروری گفتگو میں مصروف ہے۔ آپ سب لوگوں کی مبارکبادیں، اُس تک پہنچا دوں گا۔" ملک جی مُسکراتے ئے بولے۔

ہر شخص مختلف انداز میں اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ ملک جی، سب کا شکریہ اَدا کر رہے تھے اور ان کے سوالوں کے تسلی بخش جواب بھی ے رہے تھے۔

اُدھر گاؤں کی عورتیں، عادل بابا کے ہاں، صاحباں کی ماں کو مُبارکباد دینے پہنچ گئی تھیں۔ گاؤں میں ہر طرف خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ ، ایک دوسرے سے پُوچھ رہے تھے کہ جب صاحباں کا کھوج لگ گیا ہے تو پھر وہ، گاؤں میں کیوں نہیں آئی؟۔۔۔ کچھ پتا چلا کہ وہ گئی کیوں تھی؟ ،کے ساتھ گئی تھی؟ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔۔۔ اصل بات کا سوائے شاکر، ملک جی، عادل اور ملک سہیل کے، کسی کو علم نہ تھا۔

"مجھے تو پانچ رُوپے کی نیاز دِلوانی ہے۔ صاحباں کے مِل جانے کی منّت مانی تھی۔" صاحباں کی سہیلی زرینہ نے کہا۔

"اور میں نے پیر سائیں کے مزار پر سات راتوں تک دیا جلانا ہے۔"

"میں، گاؤں کے سارے بچّوں میں، اپنے ہاتھ سے میٹھے چاول پکا کر بانٹوں گی۔"

"میری اماں نے پانچ فقیروں کو کھانا کھلانا ہے۔"

"میں پورے سو نوافل اَدا کروں گی۔ اللہ میاں سے وعدہ کیا ہُوا ہے۔ شُکر ہے، پروردگار تیرا۔ تُو نے یہ دِن دِکھایا۔"

۔۔۔ اور سکینہ جو تھوڑی دیر پہلے اُٹھ بھی نہیں سکتی تھی، بیٹھی سب کے ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔

"صاحباں کا بابا کہاں ہے؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے زرینہ سے پُوچھا۔

"وہ حویلی میں ہیں۔ میرے ابّا بتا رہے تھے کہ صلاح مشورہ ہو رہا ہے۔"

"صلاح مشورہ کیسا؟"

"یہی کہ صاحباں کو لینے کون جائے گا۔"

"اُس کے بابا جائیں گے اور کون جائے گا۔" سکینہ بڑے مان سے بولی لیکن۔۔۔

دوسری طرف عادل کہہ رہا تھا۔ "ملک جی میں نے کہا نا کہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے، مگر میں نہیں جاؤں گا۔"

حویلی میں بحث چھڑی ہُوئی تھی۔ عادل اپنی ضِد پر اَڑا ہُوا تھا اور برابر انکار کیے جا رہا تھا۔ "آپ کو یاد ہو گا، جب پاکستان بنا تھا تو ہماری ت سی عورتیں اُدھر رہ گئی تھیں؟"

"ہاں لیکن اِس واقعے کا اُس کے ساتھ کیا تعلق؟"

"تعلق تو نہیں، مثال دے رہا ہُوں۔ اگر ایسا کوئی واقعہ ہو گیا ہوتا تو میں سر کے بَل چل کر لینے جاتا۔ پُوری عزّت اور وقار کے ساتھ لے کر آتا۔۔۔ ن یہ۔۔۔ یہ وہ بات نہیں ہے۔ صاحباں خود گئی ہے۔ اُسے کوئی زبردستی اُٹھا کر نہیں لے گیا ہے۔ وہ خود اپنے پیروں سے چل کر گئی ہے لہٰذا۔۔۔"

"چھوڑیئے، ابّا جی!" ملک سہیل اُلجھ کر بولا۔ "اگر اس کی یہی ضِد ہے تو یہی سہی۔ نہ جائے عادل۔ صاحباں ہماری بھی تو بیٹی ہے۔ ہم چلے جائیں گے۔"

"ہم کون۔۔۔؟" ملک جی نے چونک کر پُوچھا۔ "تم جاؤ گے، اتنی دُور؟"

"تو، ابّا جی۔۔۔ آپ چلے جائیں۔ میری بجائے شاکر چلا جائے گا۔ گاؤں کے ایک دو بزرگوں کو ساتھ لے لیں۔ اتنی تگ و دو کر کے صاحباں کا پتا چلایا ہے۔ ضِد اور بحث و مباحثے میں پڑ کر بیٹھے تو رہنا نہیں۔۔۔ کسی نہ کسی کو تو جانا ہی ہو گا۔"

"میں چلنے کو تیار ہُوں۔" شاکر جلدی سے بولا۔ "جہاں بھی سہیل کہے گا، میں ضرور جاؤں گا لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

"پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ، لڑکی کو واپس بھی دیتے ہیں یا نہیں؟"

"کیوں نہیں دیں گے۔ ہم جیبیں بھر کر جائیں گے۔" ملک جی پُرجوش لہجے میں بولے۔

"ہاں، ابّا جی۔۔۔ آپ فصل کی آمدنی کا بھی انتظار نہ کریں۔ آپ نے میری آنکھوں کے لیے بینک میں جو رقم جمع کرائی ہُوئی ہے، وہ والیں۔ میں سال دو سال ٹھہر کر علاج کرا لوں گا۔"

"نہیں... ملک سہیل! نہیں۔" عادل ایک دم چیخ پڑا۔ "وہ رقم تمھاری آنکھوں ہی پر خرچ ہوگی۔ صاحباں جیسی لڑکی سے تمھاری آنکھیں قیمتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے، یہ بحث پھر ہوتی رہے گی۔ پہلے چل کر دیکھیں تو سہی کہ وہ شخص کن شرائط پر تیار ہوتا ہے۔" شاکر نے کہا۔

"دیکھو، شاکر بیٹے... ہمیں لڑکی کو واپس لانا ہے۔ ہر قیمت پر اور ہر شرط پر۔" ملک جی فیصلہ کُن انداز میں بولے۔

"نہیں... نہیں، ایسا مت کیجیے۔"

"بس، عادل! تم خاموش رہو۔" ملک جی نے شاید زندگی میں پہلی بار عادل کو ڈانٹا۔ اُنہیں یقین ہوگیا تھا کہ بیٹی کی بازیابی کی خبر نے عادل کے اوسان بجا نہیں رہنے دیئے تھے۔

"ابا جی! آپ ابھی چاچا غلام رسول اور بھائی رفیق کو پیغام بھیج دیں۔ تاکہ وہ کل صبح کی گاڑی سے روانہ ہو جائیں۔"

"ہاں، اب مزید دیر نہیں ہونا چاہیے۔" شاکر کچھ سوچتے ہُوئے بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ اُس تک یہ خبر پہنچ جائے کہ تصور آباد والوں کو معلوم ہو چُکا ہے اور وہ..."

"... لڑکی کو کہیں غائب کر دیں۔" ملک سہیل نے شاکر کا جُملہ مکمل کر دیا۔

"ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہُوں۔"

"وہ عورت تو نہیں بتا دے گی؟"

"نہیں۔ وہ نہیں بتا سکتی۔ اُس کی لڑکی ابھی میرے گھر ہی میں ہے۔"

"اُس کی حفاظت کا انتظام تو کر لیا ہے نا؟" ملک جی نے پُوچھا۔

"بالکل، ملک جی!" شاکر مُسکرایا۔ "یہ مسئلہ حل ہو جانے دیں پھر دیکھیں، میں کیا کرتا ہُوں۔"

"کس کے ساتھ؟... اُس عورت کے ساتھ، جو صاحباں کو وَرغلا کر لے گئی تھی؟"

"نہیں۔ وہ تو صرف آلۂ کار ہے۔ وہ خود مجبور اور بے بس ہے، بیچاری... میں اس گروہ کی بات کر رہا تھا جو لڑکیوں کا کاروبار کرتا ہے۔ ایک ایک کو قانون کے سپُرد نہ کیا تو میرا نام شاکر نہیں۔"

"مجھے فخر ہے کہ میرے سہیل کا دوست تم جیسا دلیر اور ذہین ہے۔ ساتھ ہی مُلک و قوم کا خیر خواہ بھی۔"

"شکریہ! ملک جی... اب آپ تیاری کریں۔ کل، پرسوں نہ بنے۔"

"نہیں۔ انشاءاللہ! کل پہلی گاڑی سے نکل چلیں گے۔"

"ہاں... اور کچھ رقم کا بھی بندوبست ضرور کریں۔" ملک سہیل نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔" ملک جی اُٹھتے ہُوئے بولے۔ "ہر قسم کا انتظام کرلوں گا۔ ہمیں، لڑکی کو لے کر ہی آنا ہے۔"

زندگی میں یہ پہلی خوشی آئی تھی جسے میاں جی نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منانا چاہتے تھے۔ شہر کی مشہور و معروف شخصیت تھے... حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا۔

چھ سال کے طویل عرصے کے بعد، میاں جی کا بچھڑا ہُوا بیٹا مِلا تھا۔ دوست اور واقف کار مبارکباد دینے آ رہے تھے۔ رات دن، آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ ہر شخص، خلوص اور اپنائیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے مٹھائی کا تقاضا کرتا تھا۔

بی بی کی بھی اڑوس پڑوس والیاں اور مِلنے جُلنے والیاں بہت تھیں۔ وہ ہر ایک سے بڑے خلوص کے ساتھ مِلا کرتی تھیں... اور اب جواب میں وہ بھی پُوری طرح اخلاقی مظاہرہ کر رہی تھیں۔

ایبٹ آباد سے آنے کے بعد سے کسی دِن بھی انہیں فرصت کا ایک لمحہ نہیں مِلا تھا۔ بی بی کی کوئی مِلنے والی ہو کر جاتی تو میاں جی کے کسی دوست کے لیے چائے کا پیغام آ جاتا۔ اسی طرح تمام دِن گزر جاتا۔

"ہائے! آج تو میں بڑی تھک گئی ہُوں۔" بی بی تھکا تھکا سا سانس لیتے ہُوئے میاں جی کے پاس آ بیٹھیں۔

"ابھی تو ہمارے بہت مِلنے والے باقی ہیں جن تک یہ خبر پہنچی ہی نہیں۔" میاں جی مُسکرائے۔ بی بی کے چہرے پر بھی تھکن کے باوجود مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یُوں تو میری بھی کئی مِلنے والیاں ہیں۔ آئیں گی، وہ بھی۔"

"میں تو کہتا ہُوں کہ روزانہ کی اس مصروفیت سے بہتر ہے کہ سب مِلنے والوں کو کسی ایک دِن مدعُو کر لیا جائے۔ مبارک بھی دے لیں

اور ہم ان کا مٹھائی کا تقاضا بھی پورا کر دیں گے۔"

"ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔"

"ویسے بھی، بیگم! جی چاہتا ہے کہ دل کھول کر جشن منایا جائے۔"

"کس بات کا...؟"

"حارث کے آنے کا اور..." میاں جی نے گردن موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا پھر اطمینان سے بولے۔ "صاحباں اور ث کی منگنی کا اعلان بھی کر دیا جائے۔"

"شادی کر دیں گے، دونوں کی؟" بی بی نے قدرے چونک کر پُوچھا۔

میاں جی ہنس پڑے۔ "بھئی، منگنی شادی ہی کے لیے کی جاتی ہے۔" پھر سنجیدہ ہو کر بی بی کا چہرہ بغور تکنے لگے۔ "کیا تم یہ نہیں چاہتیں؟"

"میں کیوں نہ چاہُوں گی؟ اس سے بڑی میری اور کون سی آرزو ہو گی۔"

"پھر ایک دم پریشان کیوں ہو گئیں؟"

"اب انہیں اپنے سے جُدا کرنے کو جی نہیں چاہتا! نہ صاحباں کو، نہ حارث کو۔" بی بی آزردہ ہو کر بولیں۔

"تو جُدا کون کر رہا ہے؟"

"حارث جہاں مُلازم ہے، اپنی بیوی کو بھی وہیں لے جائے گا۔"

"ایبٹ آباد والی مُلازمت کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں... بے شک آپ نے اُسے چھوڑ دینے کو کہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اپنا کاروبار سنبھالے... مگر وہ ایسا نہیں کرے گا۔ آپ کے نے تو بول نہیں سکا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مُلازمت نہیں چھوڑے گا۔"

"مجھے معلوم ہو چُکا ہے۔"

"پھر...؟ جُدا تو ہو گئے نا؟"

"ماں کا دل نہ سہی مگر باپ کا دل تو میرے سینے میں بھی ہے۔ میں بھی اُنہیں خود سے جُدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے اُس کے یہیں تبادلے شش کر رہا ہُوں۔ بہت اُمید ہے، دو چار روز ہی میں ہو جائے گا۔ پندرہ روز کی جو چھُٹی لے کر آیا ہے۔ انشاءاللہ! اس کے اندر اندر۔"

"سچ..." بی بی ایک دم کھِل اُٹھیں۔ "سچ کہہ رہے ہیں، آپ؟"

"ارے! تو جھُوٹ کس لیے بولوں گا!... حارث تو اپنا خُون ہے۔ تمھیں کیا معلوم کہ صاحباں کی جُدائی بھی میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ یہ تین ءا اُس سے جُدا رہ کر دیکھ لیا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آپ کو اُمید ہے نا، حارث کا تبادلہ ہو جائے گا؟" بی بی پوری طرح اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھیں۔

"کیوں نہیں؟ سو فیصد اُمید ہے۔ حارث بہت محنتی اور دیانتدار افسر ہے۔ اُسے چھوڑیں گے تو کسی صورت میں نہیں۔ تبادلہ کر دیں گے... اپنی واقفیت بھی ہے۔"

"اللہ تیرا شُکر ہے۔ تُو نے ہمیں بیٹھے بٹھائے ہی اتنی نعمتوں سے نواز دیا۔ ہم اس قابل تو نہ تھے۔"

"ہاں۔ بیٹھے بٹھائے ہی۔" میاں جی بھی تشکر آمیز لہجے میں بڑبڑائے۔ "یہ کب اُمید تھی کہ بیٹی والا ارمان بھی پُورا ہو گا۔"

"تو کب دعوت کرنے کا ارادہ ہے۔ بہت سال روئی ہُوں۔ بہت پریشان رہی ہُوں۔ اب میرا دل بھی خوشی دیکھنے کو چاہتا ہے۔ اولاد خوشی سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو گی۔"

"ایک بار پھر اپنی تسلّی کی خاطر پُوچھ رہا ہُوں۔ تم ماں ہو تمھیں اچھی طرح علم ہو گا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے، نا...؟ یہ فیصلہ غلط تو نہیں۔ میں دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دُکھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"کمال کرتے ہیں، آپ بھی... پُورے سات دِن، ہم اکٹھے ایبٹ آباد اور اُس کے نواحی علاقوں میں گھُومتے پھرتے رہے ہیں۔ دونوں انداز سے بھی آپ کو کچھ معلوم نہیں ہُوا!"

"بھئی، میں صرف تمھیں دیکھتا رہا ہُوں اور تمھاری باتیں سُنتا رہا ہُوں۔ میں بھلا ایک باپ ہو کر اُن کی چوکیداری کرتا اچھا لگتا؟"

"بس، اب آپ یہ تمام فکریں میرے لیے چھوڑ دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ یہ رشتہ تو اب جلد ہو جانا چاہیے۔"

"بہت پیاری جوڑی ہو گی۔ ماشاءاللہ... خُدا نظرِ بد سے بچائے۔"

"ہاں، میری سب مِلنے والیاں بھی یہی کہتی ہیں۔"

"آج منگل ہے۔ دو دن بعد جمعہ ہو گا۔ مُبارک دن ہے۔ یہی رکھ لیں۔"
"لیکن اتنی جلد، ساری تیاری کیسے ہو گی؟"
"ہو جائے گی، انشاءاللہ۔ پیسہ پاس ہو تو وقت کے وقت ہر چیز خریدی جا سکتی ہے... اور خیر سے صاحباں کے نصیب کا خُدا نے بہت کچھ دیا ہے۔ کل ہی کارڈ چھپ کر آ جائیں گے اور تقسیم بھی ہو جائیں گے۔"
"مہمانوں کے بیٹھنے اور کھانے پینے کا انتظام...؟"
"الفردوس والوں کے سُپرد کر دیں گے۔"
"میرا تو جی چاہتا ہے کہ بینڈ باجا بجے۔"
"بینڈ باجا کیا، جو کہو گی، ہو گا۔ سارے محلّے میں چراغاں کرا دوں گا۔ آخر کو میری بیٹی کی نسبت طے ہونی ہے۔"
"چلو، ٹھیک ہے، آپ بیٹی والے۔ میں بیٹے والی۔"
"کیا... کیا...؟" میاں جی جلدی سے بولے۔ "بیٹی بھی میری اور بیٹا بھی میرا۔"
میاں جی کی بات سُن کر بی بی ہنس پڑیں۔ "واہ، وا! بڑے آئے..."
اچانک دروازے پر دستک ہُوئی تو بی بی جُملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئیں۔
"کون ہے، آ جاؤ؟" میاں جی بولے۔
خان گُل کمرے میں آ گیا۔
"میاں جی! آپ سے مِلنے کے لیے پنجاب کے کسی گاؤں تصوّر آباد سے کچھ لوگ آئے ہیں۔"
"پنجاب کے گاؤں تصوّر آباد سے!" میاں جی نے حیرت سے دُہرایا۔ "لیکن اُدھر تو میرا کوئی واقف نہیں ہے۔" انہوں نے قریب پڑی ہُوئی میز پر سے چشمہ اُٹھا کر لگایا اور خان گُل کو بغور دیکھتے ہُوئے بولے۔ "وہ مجھ سے کیوں ملنے آئے ہیں؟"
"جی، مجھے تو معلوم نہیں۔" خان گُل گھبرا کر بولا۔
"اوہ، ہاں۔ خود ہی جا کر دیکھتا ہُوں، کون لوگ ہیں۔"
"تو پھر..." بی بی نے جلدی سے پُوچھا۔ "ابھی جو پروگرام بنایا تھا؟"
"ہاں، ہاں، پکّا ہے۔" میاں جی جاتے جاتے رُک کر بولے۔ "ابھی سب کو بتا دو اور تیاری شروع کر دو... اور خیال رکھنا، صاحباں کا لباس بہت اعلا اور قیمتی..."
"وہ مجھے معلوم ہے۔" بی بی نے اُن کی بات کاٹی۔ "سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا، مگر آپ پہلے جا کر تو دیکھیں کہ کون لوگ مِلنے آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"
"ارے، ہاں... چلو آؤ، خان گُل!"
وہ، خان گُل کے ساتھ ڈرائنگ رُوم کی طرف بڑھے۔
"یہاں نہیں، میاں جی... اُنہیں اُدھر برآمدے والے کمرے میں بٹھایا ہے۔"
"اُدھر کیوں...؟"
"وہ جی... یہاں گھر کے اندر، اُنہیں لانا، میں نے مناسب نہیں سمجھا۔"
"کیوں...؟"
"کچھ اور طرح کے لوگ لگ رہے ہیں۔"
"اور طرح کے... کیا مطلب؟" میاں جی نے چونک کر پُوچھا۔
"جی، نہ بولی ہماری طرح، نہ لباس ہم جیسے اور... اور..."
"اور کیا...؟"
"وہ جی، دوست نہیں لگتے۔ اُن کے انداز ایسے ہیں جیسے لڑنے آئے ہوں۔"
"پاگل ہُوئے ہو؟"
"ہاں۔ جی... ہم سے نرمی سے نہیں بولے۔ بہت غصّے سے پُوچھا۔ آپ کا نام بھی اتنی عزّت سے نہیں لیا جیسے دوسرے لوگ لیتے ہیں۔"
"بس، اسی بات سے دُشمن بن گئے۔ او بیوقوف، ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے اور اپنا اپنا لہجہ۔"
کمرے کے دروازے پر پہنچ کر خان گُل رُک گیا۔

"اب جی، میرے لیے کیا حُکم ہے؟"
"تم چائے پانی کا بندوبست کرو۔ اتنی دُور سے آئے ہیں۔ شاید کھانا وغیرہ بھی کھائیں۔ ہر قسم کا انتظام ہونا چاہیے۔"
"جی، پہلے آپ، اُن سے مِل تو لیں۔"
"میں مِل لوں گا لیکن تمھیں جو کچھ کہا ہے، وہ کرو۔ مجھے دوبارہ نہ کہنا پڑے۔"
"جی، بہت بہتر۔"
خان گُل سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ میاں جی کمرے میں داخل ہوتے ہُوئے بولے۔ "السلام علیکم!"
"وعلیکم السلام!" کسی نے جواب دیا اور کوئی خاموشی سے میاں جی کی شکل دیکھنے لگا۔
"آپ ہی وارث صاحب یعنی میاں جی ہیں؟" اُن میں سے ایک بُزرگ نے پُوچھا۔
"جی، ہاں... فرمائیے۔" میاں جی، اُن سب کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ خان گُل کے کہنے کے مطابق کسی کی نگاہ میں، محبّت و خلوص اسا بھی عکس نہ تھا مگر میاں جی نے پھر بھی حلیمی سے پُوچھا۔ "آپ کہاں سے آئے ہیں اور کس کام سے آئے ہیں؟"
"ہم تصوّر آباد سے آئے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گا؟" اب اُس بزرگ کی بجائے دُوسرا شخص بولا جو شہریوں کے سے لباس میں تھا اور ی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ وہ بڑے غور سے میاں جی کو دیکھ رہا تھا۔
"معلوم تو نہیں ہے۔ آپ بتا دیجئے۔"
"واقعی تصوّر آباد کا نام، آپ نے پہلے کبھی نہیں سُنا؟"
"میرا خیال ہے، سُنا ہے..." میاں جی کچھ سوچنے لگے۔
"خیال نہیں، آپ نے یقیناً سُنا ہو گا۔"
"ہو سکتا ہے۔ آپ فرمائیے تو سہی۔"
"ذرا دروازہ بند کر سکتے ہیں؟"
"کیوں...؟" میاں جی چونکے۔
"بات ہی ایسی ہے جو ہم تنہائی میں کرنا چاہتے ہیں۔"
"چھ افراد اور تنہائی..." میاں جی مُسکرانے لگے۔
"میرے گھر والوں سے کچھ پوشیدہ رکھنا ہے؟" لہجہ اب بھی نرم ہی تھا۔
"پتا نہیں گھر والوں سے ہی یا آس پڑوس سے بھی اور سب ملنے جُلنے والوں سے بھی۔"
"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ طنز کرنے سے بہتر ہے کُھل کر بات کریں۔"
میاں جی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ انتہائی سنجیدگی سے بولے۔ "بات کرنے سے پہلے کیا آپ لوگ پنا تعارف نہیں کروائیں گے؟"
"ہمارا تعارف بہت سادہ ہے۔"
"جیسا بھی ہے۔"
"ہم صاحباں کے لواحقین ہیں اور اسے لینے آئے ہیں۔"
"صاحباں۔ صاحباں کے لواحقین۔"
میاں جی کو شاید چکر سا آ گیا تھا۔ جلدی سے ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ پھر مرتعش سے لہجے میں بڑبڑائے۔ "اسے لینے آئے ہیں گر مگر میں کیا کروں گا۔"
"ہم کوئی جھگڑا دگڑا کرنا نہیں چاہتے۔ ہم بس ہر قیمت پر اپنی لڑکی لے جانا چاہتے ہیں۔ جو قیمت آپ نے ادا کی تھی بے شک اس سے دوگنی تگنی ہم سے لے لیں۔"
میاں جی اسی طرح ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے۔ بڑبڑاہٹ بند ہو چکی تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جُڑے ہُوئے تھے در پورا وجود لرز رہا تھا۔
یہ تو اُن کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ کسی دن صاحباں کے حقدار پیدا ہو جائیں گے اور وہ اُن سے اسے جُدا کر کے لے جائیں گے۔

"ہم رقم ساتھ لے کر آئے ہیں۔ ہم چاہتے تو پولیس بھی لا سکتے تھے لیکن ہم عزت دار لوگ ہیں اور بغیر کوئی جھگڑا کیے عزت آبرو کے ساتھ اپنی لڑکی کو لے جانا چاہتے ہیں۔"

"کمزور تو بزرگوار میں بھی نہیں ہوں۔ ارد گرد بہت حمایتی ہیں میرے۔ پولیس والوں کے ساتھ بھی بات کرنا جانتا ہوں" میاں جی نے خود کو سنبھالتے ہوئے سر اونچا اُٹھایا۔ اپنی آواز میں استحکام اور مضبوطی پیدا کی "لیکن معاملہ صاحباں کا ہے۔"

"تو پھر ہم اسے لے جائیں؟"

"یوں تو میں بھی نہیں اسے جانے دوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بغیر کسی ثبوت کے میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ واقعی صاحباں کے لواحقین ہیں۔"

"یہ تصور آباد کے مالک ہیں، ملک جی۔ یہ چاچا غلام رسول اور رفیق ہیں ہمارے گاؤں کی سب سے باعزت اور قابلِ احترام ہستیاں۔ عمر سے بھی اور کردار سے بھی۔ صاحباں ان سب کی گودیوں میں پلی بڑھی ہے۔"

"اور آپ؟"

"یہ میرے بیٹے کا دوست ہے۔ پرائیویٹ سُراغ رساں شاکر۔ اسی نے آپ کا پتا لگایا ہے۔" ملک جی نے خود شاکر کا تعارف کرایا پھر دوستانہ انداز میں پوچھنے لگے۔

"صاحباں آپ ہی کے پاس ہے نا۔؟"

"ہاں۔۔" میاں جی کی مُردہ سی آواز بڑی مشکل سے حلق میں سے نکلی "وہ میرے پاس ہی ہے لیکن۔۔" میاں جی خاموش ہو گئے۔

"لیکن کیا۔۔" شاکر نے جلدی سے پوچھا۔

"بالغ لڑکی ہے آپ کے ساتھ جانا چاہے گی تو تب ہی بھیجوں گا ورنہ کبھی نہیں۔"

"وہ جانا چاہے یا نہیں ہم اسے لے کر جائیں گے۔ لڑکیاں بھی بھلا کچھ کہا کرتی ہیں۔" چاچا غلام رسول نے کھنکار کر اپنے گاؤں کی بیٹیوں کی بے زبانی کا جیسے اعلان کیا۔

"ہاں۔ جب کچھ کہہ نہ سکیں تو پھر بھاگ جایا کرتی ہیں۔"

میاں جی نے بھی اب طنزیہ لہجہ اختیار کر لیا کسی بھی طرح وہ صاحباں کو اپنے سے جُدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کر بھی نہیں سکتے تھے کسی صورت نہیں۔ اس کی جُدائی کا صرف سوچ کر ہی۔ اس تھوڑے سے وقت میں کیسے وہ ہزاروں بار مر مر کر جیے تھے۔ کیا بات کریں اور کس طرح صاحباں کو اپنے پاس رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ عقل و ہوش جواب دیئے جا رہے تھے اور لوگوں پر غصہ آ رہا تھا۔ جو اِن کا سکھ چین سکون خوشی لوٹنے آ گئے تھے۔

"تو گویا اس میں آپ کا بھی پُورا پُورا ہاتھ ہے۔" ان کا طنز سُن کر شاکر نے تیکھی نگاہ سے انہیں دیکھا۔

"ہاتھ واتھ میں نہیں جانتا۔" میاں جی نے دو ٹوک بات کرنی بہتر سمجھی۔ "میں بس صاحباں کو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں لوٹانا چاہتا۔"

"جو بھی آپ نے اس کا سودا کہیں اور طے کرنا ہے کیوں نہ ہمارے ساتھ ہی کر لیں۔"

ملک جی نے اپنی دانست میں مصالحت کرنے کی کوشش کی مگر میاں جی کا غصّے کے مارے بُرا حال ہو گیا۔

"آپ اپنی لڑکیوں کے سودے کیا کرتے ہیں؟"

"خدا نہ کرے لیکن میں نے سُنا ہے" شاکر تلخی کو پی کر ذرا چبھتے ہُوئے لہجے میں بولا "آپ عورتوں اور ۔۔ کے سودے کیا کرتے ہیں۔"

میاں جی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا شُکر کیا وہ بند تھا۔ اپنے ماضی کو وہ اپنے خیال میں بھی نہ لانا چاہتے تھے یہ اس کا طعنہ دے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ غصّے کو پیا اور صاحباں کی خاطر بات نرمی سے کرنا مناسب جانا۔

"دیکھیے محترم! اگر آپ ٹھیک نیت لے کر آئے ہیں تو بسم اللہ، میں بات کرنے کو تیار ہوں اور آپ بھی میرے ماضی کو کھنگال کر طعن نہ کریں تو بہتر ہے۔"

"ہماری نیت کی بات کر رہے ہیں۔" شاکر جس نے اس کا کھوج لگانے میں رات دن ایک کر دیا تھا، اسے تو اس بات غصہ آنا ہی تھا۔ "یا اپنی نیت کی۔ ہماری تو وہ چیز ہے۔ ہم حقدار بن کر آئے ہیں۔"

"میری نیت بھی بُری نہیں ہے لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ واقعی آپ صاحباں کے لواحقین ہیں۔"

"یہ آپ صاحباں سے پُوچھ سکتے ہیں۔ وہ ہمیں پہچانتی ہے۔"

ملک جی کے جواب پر میاں جی چُپ سے ہو گئے۔ طبیعت میں حلیمی اور نرمی ہونے کے باوجود غصّہ میں بات کی تھی۔ طنزیہ اختیار کیا تھا کہ وہ لوگ برہم ہو کر ہی چلے جائیں کسی طرح صاحباں کا مطالبہ چھوڑ دیں۔

ایک لمحے کے لیے خیال آیا۔ سرے سے انکار ہی کر دیں کہ اب صاحباں انہیں نہیں مل سکتی۔ وہ یہاں سے بھی جا چکی ہے جھوٹ نہ بولا گیا۔ اسی صاحباں کی خاطر جس کے وجود نے انہیں نیک بننے کی طرف راغب کیا تھا جس کی وجہ سے وہ نیکی اور برائی کو پہچانے تھے۔

ملک جی بڑے غور سے میاں جی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلتے بکھرتے روشنیوں اور تاریکیوں کے سائے بھی دیکھ رہے تھے۔ نجانے ان کے اندر کون سی سوچیں تھیں۔

"ایک بات آپ سے پوچھ سکتا ہوں؟" ملک جی انتہائی نرمی سے بولے۔

"پُوچھیے۔"

"ہماری لڑکی۔ وہ صاحباں۔۔" اور ملک جی جھجک کر چُپ سے ہو گئے۔ بات آگے کر ہی نہ سکے۔

"ہاں ہاں۔ جو کچھ پوچھنا چاہ رہے ہیں آپ بلا جھجک پوچھیے۔"

"میرا مطلب ہے وہ یہاں کس حیثیت سے رہتی ہے؟ آپ نے اتنی بڑی رقم کیوں اس کے لیے ادا کی؟"

"وہ یہاں، اس گھر میں میری بیٹی کی حیثیت سے رہتی ہے اور اتنی رقم اس کے لیے کیوں ادا کی تو۔ اس بات کا شاید میں صحیح طرح جواب نہ دے سکوں اور آپ لوگ سمجھ بھی نہ سکیں۔"

"آپ شاید بتانا نہیں چاہتے۔ آپ کا کاروبار۔۔"

"نہیں نہیں۔" میاں جی ایکدم ایک کرب کے ساتھ چلّا سے پڑے۔ "آپ ایسی بات بار بار مجھے جتانے کی کوشش نہ کریں۔ صاحباں میرا کاروبار نہیں ہے۔ اگر آپ سب کچھ جاننا چاہتے ہیں تو۔ تو۔۔" میاں جی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ان لوگوں کے سوائے ان کا اپنا کوئی کمرے میں نہ تھا۔

اُٹھے۔ دروازے تک گئے۔ بند چٹخنی کو غور سے دیکھا۔ کھول کر باہر ارد گرد نظر دوڑائی۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ اطمینان کا سانس لے کر دوبارہ چٹخنی بند کرتے ہُوئے دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔

"میرا خیال ہے آپ کو میرے متعلق جو اطلاعات ملی ہیں۔ پہلے میں اس کی طرف سے تھوڑی سی صفائی پیش کر دوں پھر شاید آپ لوگ میری بات کا یقین بھی کر لیں گے اور صاحباں والے معاملے کو سختی سے نہیں بلکہ ہمدردی سے لیں گے۔"

"دیکھیے محترم! ہم یہاں صرف لڑکی کو لینے آئے ہیں۔" شاکر نے سمجھا میاں جی کسی وجہ سے وقت گزاری کر رہے تھے۔ نجانے کیوں؟ شاید اس میں بھی کوئی چکر تھا۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ معاملے کی بات کریں۔"

"نہیں بیٹے! اِن کی بھی سُن لو۔" ملک جی کو میاں جی کے چہرے پر پھیلی بے بسی اور بے چارگی کا احساس ہو گیا تھا۔ تجربہ کار انسان تھے۔ ستّر سال کے نشیب و فراز دیکھ چکے تھے اور جب سے بیٹے کی بینائی گئی تھی۔ سینے میں جیسے دل ہی بدل گیا تھا ہر کسی کو ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے اور درد مند دل کے ساتھ محسوس کرنے لگے تھے۔

"میں ایسا غلط اور ننگِ انسانیت کاروبار کیا ضرور کرتا تھا مگر اب اس سے تائب ہو چکا ہُوں۔"

میاں جی سر جھکائے ہوئے ہولے ہولے بولتے چلے گئے۔

"کیوں کیا کرتا تھا۔ یہ بھی ایک دُکھ بھری کہانی ہے۔ بہر حال اب خدا نے مجھے راہِ ہدایت دکھا دی ہے اور وہ صاحباں کے روپ میں دکھائی ہے۔"

"صاحباں کے روپ میں۔؟" ملک جی نے حیرت سے میاں جی کو دیکھا۔

"ہاں۔ صاحباں نے اپنی عزت بچانے کی خاطر بڑی تگ و دو کی تھی۔ دوسری بہت ساری لڑکیوں کی طرح رو دھو کر آخر میں چپ چاپ غلط راہ پر چل نہیں پڑی تھی۔ یوں اسی سلسلے میں یہ مجھ تک پہنچی بِک کر نہیں بلکہ بھاگ کر اور میں۔ جو خود ایک بھٹکا ہوا انسان تھا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔"

میاں جی کے رخساروں پر سے آنسو بہہ بہہ کر ڈاڑھی کو بھگو رہے تھے۔ سب لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ ان کی ہر بات کا یقین

کر رہے تھے ... یہ آنسو ... یہ سچائی کے آنسو تھے ... دھوکے اور فریب کے نہیں۔ ہر کسی کو محسوس ہو رہا تھا۔

"میں ایسی کئی نیک پاک لڑکیوں کو ان کی زندگی کے صاف ستھرے راستوں سے بھٹکا چکا تھا ... لیکن ... نجانے کیا ہوگا اس کا خود مجھے بھی علم نہیں کہ کیا ہوا۔ صاحباں کی معصوم صورت اور رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں اور عزت کی بھیک مانگنے والی نگاہوں نے کچھ ایسا اثر کیا کہ میں نے اُسے اپنی بیٹی بنا لیا۔ پھر میں نے وہ کاروبار بالکل ہی چھوڑ دیا۔"

میاں جی کے چہرے پر سچائیاں چمک رہی تھیں اور سب گم سم بیٹھے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔

"اُسے بیٹی بنایا تو اس کی خاطر میں نے حق حلال کی روزی کمائی۔ یہ بچی میرے لیے مینارۂ نور ہے۔ یہ میرے لیے نیک راستوں کی پہچان ہے۔ یہ جیسی گھر سے نکلی تھی ویسی ہی پاک اور باعزت ہے۔ اور ـــ"

آخر میں میاں جی نے سر اُٹھا کر سب کی طرف دیکھا۔

"آنے والے جمعہ کے روز میں اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ اس کی نسبت طے کرنے والا ہوں۔"

"صاحباں کے ساتھ آپ کے بیٹے کی شادی ہوگی؟ وہ ایک سیدھی سادی اور کم پڑھی لڑکی جو گاؤں کے سادہ ماحول میں پروان چڑھی ہے اور آپ کا یہ رہن سہن کا جدید قسم کا انداز اور آپ کا بیٹا بھی غالباً کافی تعلیم یافتہ ہوگا۔"

"اس نے ولایت میں اعلا تعلیم حاصل کی ہوئی ہے۔" میاں جی نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"پھر یہ جوڑ کیسے نبھے گا ـــ؟"

"میری صاحباں نے بھی کافی تعلیم حاصل کر لی ہے ـــ وہ بہت ذہین بچی ہے۔ بے شک اس کے پاس ڈگری کوئی نہیں ہے لیکن قابلیت کے لحاظ سے وہ کسی سے کم نہیں ہے۔"

میاں جی فخر و مسرت کے ملے جلے جوش میں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "میں اُسے ابھی بلاتا ہوں۔"

میاں جی بڑی عجلت میں کمرے سے باہر نکل گئے۔ ملک جی اور شاکر وغیرہ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

ان کا خیال تھا معاملہ بڑا سنجیدہ ہوگا۔ ریوالور اور پستولیں ساتھ لائے تھے۔ کوئی قتل یا خون کرنے کا ارادہ تو نہ تھا لیکن ڈرا دھمکا کر لڑکی کو ساتھ لانے میں کامیاب تو ہو سکتے تھے۔

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میاں جی کا تعلق بردہ فروشوں کے ایک منظم گروہ سے رہا تھا ... کیا پتا اب بھی ایسے ہی لوگوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی ـــ تبھی ـــ

ملک جی اور شاکر اپنے ساتھ تصوّر آباد کے دو معتبر معززین کے علاوہ تین جری نوجوان بھی ... لائے تھے ... کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہر بات کی توقع رکھی تھی ـــ اور اپنے انداز سے پورا پورا انتظام کر کے آئے تھے۔

"آجاؤ ـــ آجاؤ ـــ اندر ـــ میں تمہارے ساتھ ہوں پھر خوف کس بات کا ـ؟"

یہ کہتے ہوئے آگے آگے میاں جی داخل ہوئے اور ان کے پیچھے ... اُن کے پیچھے ... یکایک سب کی نگاہیں اٹھیں۔

وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے توقع کے بالکل خلاف تھا۔ سب کی متحیر نگاہیں اس نرم و نازک پیکر پر جمی تھیں۔

"آداب ـــ" اس نے سر کے ساتھ پورا وجود ذرا سا جھکا کر کہا تو ایسا لگا جیسے خوش رنگ، خوش نما پھولوں کی خوب صورت شاخ پوری کی پوری جھک گئی ہو۔

قیمتی لباس، ریشمیں سا وجود، سلجھا ہوا انداز، نازک ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ، آنکھوں میں روشنیوں کے عکس۔ گالوں پہ لپکتے شعلے۔

"یہ ہماری صاحباں تو نہیں۔" ملک جی بڑے غور سے اُسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھ رہے تھے۔ "نہیں، نہیں۔ یہ وہ نہیں ہے۔" ان کا لہجہ پُر یقین تھا۔

شاکر نے لڑکی کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر بے چینی سے ملک جی کی طرف دیکھا۔ اتنی مشکلات اور تگ و دو کے بعد وہ یہاں تک پہنچ پائے تھے اور ـــ یہ لڑکی وہ تھی ہی نہیں ... کس قدر دکھ کی بات تھی۔ شاکر کی مایوسی انتہا درجے تک پہنچ گئی۔ ایسی ناکامی کا منہ اُس نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"بیٹی! آپ کا نام کیا ہے اور کہاں کی رہنے والی ہیں۔"

ڈوبتے، ڈوبتے شاکر نے اک یاس بھری آس سے پوچھا۔

"میں ہی صاحباں ہوں اور تصوّر آباد سے آئی ہوں۔"

شاکر کی الجھن سمجھتے ہوئے اس نے خود ہی اپنا تفصیلی تعارف پیش کر دیا۔

"میں عادل بابا کی بیٹی ہوں اور وہ ہمارے ملک جی ہیں۔ تصوّر آباد کے مالک۔"

صاحباں نے ملک جی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چونک پڑے۔ "تم ... تم ہی صاحباں ہو ـــ؟"

چند لمحے متعجب سی نگاہوں سے اسے تکتے رہنے کے بعد وہ اُٹھے اور اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

"میں تو تمہیں پہچان ہی نہیں سکا تھا۔"

انھوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ایک بار پھر اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔

"بہت بدل گئی ہو ... بالکل ہی..."

وہ آہستہ آہستہ اور قدرے تکلّف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے نجانے ان لوگوں کے ہاں کیسے رسم و رواج تھے۔ ورنہ ... طرح ان کے ہاں اس لڑکی کا آنا جانا تھا۔ وہ اُسے بے تکلفی سے گلے لگا کر پیار کرتے ... اتنے سالوں کی جدائی کا تقاضا یہی تھا۔

"ملک جی ... ملک جی"

ملک جی کے بوڑھے اور کپکپاتے ہاتھوں کا لمس، صاحباں کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے بابا اس کے پاس کھڑے تھے ... گاؤں کی مخصوص سی خوشبو ان کے وجود سے آ رہی تھی۔ جیسی اسے اپنے بابا سے آیا کرتی تھی۔

وہ ایکدم ملک جی کے ساتھ لپٹ گئی۔

"میرے بابا کیوں نہیں آئے۔"

"تمہاری ماں بہت بیمار ہے۔ بستر پر پڑی ہے۔ وہ آجاتے تو اس کی دیکھ بھال کون کرتا۔"

وہ ملک جی کے سینے کے ساتھ لگی رو رہی تھی۔ وہ بھی بے اختیار ہو گئے۔

"سارا گاؤں تیری جدائی میں رو رہا ہے۔" ان کے آنسو ان کے رخساروں کو تر کرنے لگے۔

"میں ... میں ... واپس آنا چاہتی تھی ... مگر ... مگر ..." وہ خاموش سی ہو گئی۔

"مگر کیا بیٹی! آجانا تھا ... دیکھ اس بڑھاپے میں مجھے اتنا لمبا سفر اختیار کرنا پڑا۔"

"وہ ملک جی! مجھے بابا سے ڈر آتا تھا۔"

"کس بات کا ڈر ـــ؟"

"بابا کے کئے گئے کسی فیصلے کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

"ہم پہ بھروسہ کیا ہوتا۔ ہم بھی تو وہیں تھے۔ ہم سب گاؤں والوں نے کتنا تمہیں یاد کیا تم کیا جانو ـــ اور پھر سارے گاؤں ... تمہارے بعد کسی کے گھر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ کوئی شادی بیاہ نہیں۔ کسی نے عید بقرعید نہیں منائی۔"

"میں بہت بُری ہوں، ملک جی۔ میں بہت بُری ہوں۔"

وہ روئے جا رہی تھی اور اس کے آنسو جیسے میاں جی کے دل پر گر رہے تھے۔ انہوں نے بڑھ کر صاحباں کو تھام لیا۔

"بس کر میری بیٹی! بس اب چُپ ہو جا اور جا چائے کھانے وغیرہ کا بندوبست کر۔ تیرے ملک جی آئے ہیں۔ تیرے گھر آئے ہیں۔ ان ... خاطر تواضع نہیں کرے گی؟"

"کیوں نہیں۔ ابھی جاتی ہوں۔ ابھی۔"

سارا چہرہ بھیگ رہا تھا۔ آنسو صاف کیے تو مزید نکھر اُٹھا۔ جیسے بارش کے بعد تیز دھوپ نکل آئے تو ہر چیز اُجلی اُجلی دکھائی ... ہے۔ اسی طرح صاحباں اس وقت لگ رہی تھی۔ اُجلی اُجلی اور نکھری نکھری سی۔ رونے سے آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو کر ... کے حسن میں اضافے کا باعث بن گئے تھے۔

شاکر دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ ایسے ایسے انمول ہیروں کو وہ ظالم لوگ تباہی کی دلدل میں اتنی بے دردی سے پھینک دیتے تھے ...

"چند دن کی بات ہے پھر سارے مظالم کا حساب لوں گا۔ ایک ایک کو پھانسی پر نہ لٹکوایا تو نام بدل دینا ظالمو۔"

وہ دل ہی دل میں کھول رہا تھا۔ تلملا رہا تھا۔ نگاہیں بدستور صاحباں پہ گڑی تھیں۔ اپنے آنسو پونچھنے کے بعد وہ ملک جی کو ... ان ہاتھوں سے پکڑ کر بڑی عزت اور احترام کے ساتھ صوفے پر بٹھا رہی تھی۔

"ملکانی جی کیسی ہیں ملک جی۔" ایسا شائستہ لب و لہجہ تو شہر میں بھی اس نے کم ہی کسی کا دیکھا سنا تھا۔ شاکر کی نگاہوں میں ... ستائش تھی۔

"ٹھیک ہے وہ بھی۔ لیکن سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تم نے چاچا غلام رسول اور چاچا رفیق کو نہیں پہچانا اور وہ شیر محمد اور ...

قادر ہیں۔"

"پہچان لیا ہے سب کو۔ بھائی شیر محمد اور قادر کو بھی اور چاچا، چاچی کیسی ہیں؟"

وہ رفیق سے اس کی بیوی کے متعلق پوچھنے لگی۔ غلام رسول والی چاچی وہ تصوّر آباد میں ہی تھی جب وفات پا گئی تھی۔

"تمہیں دعا سلام کہہ رہی تھی۔" رفیق نے جواب دیا۔ "اور ساتھ لانے کی تاکید بھی کر رہی تھی۔"

"آخر تم نے بیٹی، ہمیں چھوڑ کر چلے آنے میں کون سی بہتری سمجھی تھی۔" چاچا غلام رسول کا سوال ایسا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ البتہ ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔

میاں جی کی نگاہیں اسی پر جمی تھیں۔ نہ صاحباں کے بہتے آنسو، نہ صاحباں کا شرمندگی سے جھکا سر، وہ کچھ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ اسے ہمیشہ خوش اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔

"جاؤ نا بیٹی..." اس سے پہلے کہ چاچا غلام رسول اپنے سوال کا جواب پانے کے لیے اسے دہراتا یا باقی لوگوں میں سے کوئی اور ایسی بات کر دیتا تو...

اسے مزید پریشانی، مزید شرمندہ ہونے سے بچانے کے لیے وہاں سے بھیج دینا ہی مناسب جانا۔

"جاؤ... اپنی بی بی کو خبر کرو اور اگر حارث آگیا ہو تو اسے بھی یہاں بھیجنا۔"

"ملک جی اور آپ سب چائے پئیں گے یا کھانا...؟"

"چائے تو ابھی، فوراً بھجوا دو اور کھانے کا انتظام بہت اچھا ہونا چاہیئے۔"

کسی اور کے جواب دینے سے پہلے میاں جی بول پڑے۔

"ملک جی پہلی بار بیٹی کے گھر آئے ہیں ان کی عزت اور توقیر اور خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں ہونی چاہیئے۔"

"جی بہت بہتر۔" صاحباں سب کی طرف اپنائیت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تو آپ اسے ساتھ لے کر ہی جائیں گے..؟" اس کے جانے کے بعد میاں جی افسردہ سے ہو کر بولے۔

"ہماری بیٹی ہے.. ہمارے گاؤں کی عزت ہے لے کر کیوں نہ جائیں گے.. اسی لیے تو اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں۔" ملک جی انتہائی سنجیدگی سے بتانے لگے۔ "اس کے علاوہ اس کی ماں بڑی سخت بیمار ہے۔ جال باپ کا بھی یہی حال ہے مگر وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ آپ اسی سے اندازہ لگا لیں۔ پانچ چھ اولادوں میں سے صرف یہی ایک ان کی پونجی رہ گئی تھی.. اس کی جدائی میں کیا حال نہیں ہو گیا ہو گا۔"

"اس کا وجود ہی ایسا ہے ملک جی! تین سال میں نے بھی بیٹی کی طرح پیار کیا ہے اور پڑھایا لکھایا ہے جیسے کوئی سگی اولاد کے لیے کرے.. میں بھی ایک لمحے کے لیے... اس کی جدائی کا تصور نہیں کر سکتا۔"

"آپ ہم سے وہ رقم لے لیں جتنی..؟"

"ملک جی.." میاں جی نے ان کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی۔ دکھ کی ایک لہر ان کی آنکھوں میں لہرا گئی۔ "مجھے گالی نہ دیں.. وہ رقم میں نے بیٹی کی جان کا صدقہ دیا تھا۔ مول نہیں چکایا تھا۔ کبھی کوئی باپ بیٹی کی بھی قیمت لگاتا ہے..؟"

"ہم نے تو یہی سنا تھا.. کہ آپ نے اس کی قیمت ادا کی تھی۔"

"قیمت وہ لوگ کہتے ہوں گے۔ مگر میں نے صرف ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے جتنی رقم وہ طلب کر سکتے تھے اس سے دُگنی.. اس پر سے قربان کر دی۔"

"تو پھر معاملہ کیا بنے..؟" شاکر سوچتے ہوئے بولا۔

"آپ کا مال ہے آپ لے جا سکتے ہیں۔"

کہنے کو تو میاں جی نے سینے پر صبر کی سِل رکھ کر یہ بات کہہ دی لیکن آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ان کے گریبان میں ٹپک پڑے۔

شاکر آنکھوں میں، دل میں ہمدردی لیے انہیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"مانتے ہیں اب آپ کے لیے بھی اُسے جُدا کرنا مشکل ہو گا لیکن..؟"

"لیکن ویکن کچھ نہیں بھائی.. صاحباں اگر جانا چاہتی ہے تو چلی جائے۔ میں اس کی آزادی پر کوئی پابندی نہیں لگاؤں گا۔ میرا جب بھی اس سے ملنے کو دل چاہا کرے گا اس کے پاس پہنچ جایا کروں گا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ صاحباں ایک لڑکی ہے

ں کا بھی عندیہ لے لیا جائے۔"

اور بات ختم کرتے کرتے میاں جی کے بہت ڈھیر سارے آنسو قمیص میں جذب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے رُخ بدل لی طرف پھیر لیا کہ ان کی یہ کمزوری کسی پر عیاں نہ ہو..

"میں اندر آ سکتی ہوں۔"

سب کی نگاہیں اٹھیں.. بی بی پیشانی تک دوپٹہ اوڑھے دروازے میں کھڑی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر تھرتھراہٹ۔

"یہ صاحباں کی بی بی ہیں۔" میاں جی نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں جلدی سے تعارف کرایا۔ "میری بیوی۔"

"آئیے بہن جی! آ کیوں نہیں سکتیں۔"

ملک جی اور شاکر کھڑے ہو گئے۔

"آپ تشریف رکھیئے۔" بی بی اندر آ کر میاں جی کے پاس بیٹھ گئیں۔

"میں صاحباں کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتی تھی۔"

میاں جی حیرت سے بی بی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ یوں پہلے کبھی غیر مرد کے سامنے نہیں آئی تھیں اور آج میاں جی سے بھی نہیں پوچھا تھا۔ ان غیر لوگوں کے سامنے آ بھی گئی تھیں اور نہ صرف سامنے ہی آئی تھیں ان سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

"صاحباں کو آپ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔؟"

بی بی کی آواز بُری طرح بھرا رہی تھی۔ میاں جی کی سمجھ میں بی بی کے چلے آنے کی وجہ آ گئی تھی۔ یہ تین سال کی پروان چڑھی ہوئی ممتا تھی جو انہیں کشاں کشاں لیے آئی تھی۔

"جی ہاں.. ہم اسی مقصد سے یہاں آئے ہیں۔" شاکر نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"عورت کی عزت بڑی نازک ہوتی ہے۔ بعض وقت بغیر گناہ کیے بھی وہ بے عزت ہو جایا کرتی ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں..؟" ملک جی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"صاحباں جس انداز میں اپنے گھر سے نکلی تھی اب اس کا مقام وہاں کیا ہو گا۔؟"

بی بی نے بات بڑی عقلمندی کی کی تھی۔ سبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"مجھے اس بچّی سے بہت پیار ہے میں نہیں چاہتی کہ اسے وہ والا گھر بھی نہ ملے اور ہم سے بھی جُدا ہو جائے۔ پھر یہ بے چاری کہیں کی نہ رہے گی۔"

بی بی کی بات کا کوئی بھی جواب نہیں دے رہا تھا۔ سب سے زیادہ پریشان ملک جی تھے انہیں کے ساتھ عادل کی گفتگو ہوئی تھی۔ وہ تو سرے سے اس کی بازیابی کے ہی خلاف تھا اور اس نے صاف صاف کہہ بھی دیا تھا کہ اس کے گھر کے دروازے اب صاحباں کے لیے بند ہو چکے تھے.. پھر..؟ پھر اب بی بی کے سوال کا جواب کیا دیں..؟ وہ سوچ رہے تھے..

یکایک انہیں خیال آیا.. اب وہ یہاں تک پہنچ چکے تھے۔

انہوں نے اسے اپنی اور گاؤں کی عزت کا سوال بنایا تھا۔ پھر وہ بھلا عادل کے گھر کے متعلق سوچ ہی کیوں رہے تھے۔ اس کا گھر نہ سہی اپنی گاؤں والوں کے گھر تو سلامت تھے.. خود ملک جی کا بھی ایک گھر تھا.. اب تو ان کی عزت اور ان کے وقار کا تقاضا یہی تھا کہ صاحباں واپس جائے اور باپ کے گھر کا دروازہ اگر اس کے لیے بند ہو چکا تھا تو.. تو ان کے گھر کا دروازہ اس کے لیے کھُل جائے.. ہاں.... ایسا ہی ہو گا... اب ایسا ہی ہو گا..

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا..؟"

"بات تو صاحباں کی بی بی ٹھیک کر رہی ہیں۔" اب میاں جی بھی ذرا مضبوط ہو کر بولے۔ ان کی تو پہلے ہی دلی آرزو تھی کہ کوئی راستہ ایسا نکلے۔ صاحباں یہیں رہ جائے۔ واپس نہ جا سکے۔

"کیا صاحباں کو پہلے جیسا ہی مقام وہاں ملے گا..؟"

"میرا خیال ہے ملے گا۔" ملک جی نے جھکا ہوا سر اُٹھایا۔

"بلکہ شاید پہلے سے بھی بلند ہو جائے۔"

"وہ کیوں..؟" میاں جی نے قدرے سٹپٹا کر پوچھا۔ ملک جی کا یہ جواب تو ان کی آرزوؤں کے خلاف تھا۔

"دلدل میں پھنس کر بھی اس کا دامن پاک رہا ہے اور یہ اس بچی کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اس کے علاوہ آپ جیسے نیک لوگوں کے پاس رہ

کراس نے تعلیم حاصل کرلی شہروں جیسے آداب سیکھ لیے۔ سلیقہ مند ہوگئی۔ وہاں گاؤں کی سب لڑکیوں کے لیے صاحباں تو ایک بڑی اچھی مثال بنے گی۔۔ اس کو دیکھ کر سب اسی جیسی بننا چاہیں گی۔"

"اوہ..." میاں جی چپ سے ہوگئے۔

"اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" بی بی مطمئن انداز میں بولیں۔ "دوسری ایک اور بات کرنا تھی آپ سے۔"

"فرمایئے..." باقی سب چپ چاپ بیٹھے تھے... ملک جی ہی بولے۔

"ہم آئندہ جمعہ کو اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی منگنی کرنے والے تھے۔ کیا آپ کو یہ رشتہ قبول ہوگا...؟"

"اس کے متعلق تو میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا..." ملک جی چند لمحے سوچ کر بولے۔

"یہ رشتہ ضرور ہونا چاہیے۔" بی بی نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "ورنہ پھر ہم اسے نہیں بھیجیں گے۔"

"کیوں...؟"

"دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں... اگر آپ صاحباں کو لے گئے... پھر کبھی نہ ہم سے ملایا تو دو دل ٹوٹ جائیں گے آپ کو کیا ملے گا ان معصوم دلوں کو اجاڑ کر۔ میں دونوں سے ماں کی طرح پیار کرتی ہوں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" بی بی کے انداز میں، الفاظ میں عزم تھا سنگینی تھی۔

"آپ کا بیٹا پڑھا لکھا ہے... قابل ہے... پھر بھلا یہ رشتہ کیوں نہ ہوگا..." شاکر ملک جی کا ہاتھ تھام کر دباتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"ہم یہ رشتہ کردیں گے... اس سے بہتر عادل کی بیٹی کو اور کون سا رشتہ مل سکتا تھا۔"

"لیکن لڑکی کے باپ سے بھی تو پوچھ لینا چاہیے۔" چاچا غلام رسول کو شاکر کا اپنے آپ ہی کیا ہوا فیصلہ اچھا نہ لگا۔

"نہیں نہیں..." ملک جی شاکر کا مقصد سمجھ گئے تھے۔ "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم یہ رشتہ منظور کرتے ہیں۔ عادل کی جگہ مجھے حق ہے کہ اس کا باپ بن کر فیصلہ کردوں... ویسے بھی عادل نے ہمیشہ میری بات مانی ہے۔ میں جو وعدہ کرکے جاؤں گا وہ پورا ہوگا... انشاءاللہ ضرور پورا ہوگا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میاں جی جلدی سے بولے۔ "آپ یہاں سے منگنی کرکے ہی لڑکی کو لے جائیں۔ پھر جو تاریخ آپ ہمیں بتائیں گے ہم اسی دن بارات لے کر آجائیں گے۔ اس سے اچھا اور کیا ہوگا کہ صاحباں پوری عزت، وقار اور احترام کے ساتھ اپنے گاؤں سے رخصت ہو اور اس کے والدین خود اپنے ہاتھوں اسے وداع کریں۔"

"ہاں... یہ بہت مناسب ہوگا۔ مگر کوئی دُور کی تاریخ نہیں رکھیے گا ورنہ میں... میں اس کی جُدائی برداشت نہیں کرسکتی۔" اور اس کے ساتھ ہی بی بی کے آنسو بھی بہہ نکلے۔

"وقت پڑنے پر سب کچھ برداشت ہو جایا کرتا ہے بہن جی... صاحباں کی ماں بھی تو برداشت کر ہی رہی ہے۔"

"یہ تو آپ نے ٹھیک کہا... چھ سال تک حارث کی جُدائی بھی برداشت کی تھی... یہ بھی کرلوں گی۔"

بی بی اٹھ کر ان کے کھانے وغیرہ کے انتظامات کرنے چلی گئیں اور ملک جی ان سے گفتگو کرنے لگے اور اب بڑے دوستانہ ماحول میں اور بڑے پیار اور رغبت سے تبادلہ خیالات ہو رہا تھا... وہ اپنے علاقے کے متعلق معلومات بہم پہنچا رہے تھے اور میاں جی اپنے شہر، اپنے رہن سہن کے طریقے اور اپنے کاروبار کی تفصیل بتا رہے تھے۔ بڑا محنت طلب کاروبار تھا... اور جس قدر محنت کرتے تھے اتنا فائدہ بھی ہوتا تھا... تین سال کے اندر اندر انہوں نے کیا کچھ نہیں بنا لیا تھا۔

اور اب زندگی تھی... جس کا دوسرا نام آسائش تھا۔ خوش بھی تھے اور اطمینانِ قلب بھی میسر تھا۔

*

منگنی کی رسم ادا ہوئی۔ انتہائی شان و شوکت کے ساتھ۔ میاں جی کی آنی میل ملاقات تھی۔ لگتا تھا سارا شہر ہی چلا آیا تھا۔

ملک جی اور شاکر وغیرہ اس انداز سے تو آئے نہیں تھے لیکن میاں جی نے دو دن میں ہی ان سب کے لیے ملبوسات تیار کرائے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ صاحباں کے لواحقین کو ذرا بھی کمتر پوزیشن میں دوسرے لوگ دیکھیں یا انہیں خود دوسروں کے سامنے کوئی ہلکے پن کا احساس ہو۔

اور پھر... پورے مان اور فخر کے ساتھ انہوں نے سب مہمانوں سے ساتھ ان کا تعارف کرایا۔ ہر رسم ان کے ہاتھوں ادا ہوئی۔ صاحباں کو بی بی نے انگوٹھی پہنائی اور حارث کو ملک جی نے... لڑکی کا باپ بن کر۔

وہ بڑے خوش تھے اس وقت... ایسے باعزت اور تعلیم یافتہ لوگوں میں صاحباں کا رشتہ ہوگیا تھا۔ ان کے پورے مورآباد کے لیے یہ عزت کی بات تھی۔

یوں... صاحباں کے ساتھ ڈھیروں ڈھیر خوشیاں اور عزتیں لیے منگنی سے اگلے دن یہ لوگ تصور آباد سدھار گئے۔

صاحباں اس گاؤں سے خالی ہاتھ نکلی تھی اور واپس آئی تو... نہ صرف زر و جواہر اور بے شمار قیمتی قیمتی ملبوسات اس کی ملکیت تھے بلکہ وہ تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ تھی۔

اس کے طور طریقے اور انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا اور بولنا چالنا سب کچھ ہی مختلف ہو گیا تھا۔ وہ بالکل نئے اور انوکھے رُوپ میں واپس آئی تھی۔ جیسے کوئی آسمان سے اتری مخلوق تھی وہ... یا پھر کوئی نوابزادی تھی یا شہزادی تھی کسی ایسے دیس کی جو اس دھرتی پر نہ تھی کہیں اور... بادلوں میں یا آسمانوں پر واقع تھا۔

کچھ ایسا ہی سارے گاؤں کی لڑکیاں سمجھ رہی تھیں اور اسے دیکھ کر، مل کر ہر کسی کے دل میں یہی حسرت اُمڈ رہی تھی کہ کاش صاحباں کی جگہ خود وہ ہوتی... یہ سب کچھ اس کے ساتھ بیتا ہوتا۔

صاحباں کے بابا اور اماں کا دو کوٹھڑیوں پر مشتمل گھر اب اس کی رہائش کے لیے مناسب نہ تھا۔ ملک جی میاں جی کا گھر اور اس کی آسائشیں دیکھ آئے تھے اس لیے اُسے اتارا ہی حویلی میں تھا... گو اس میں میاں جی کے گھر جیسا قیمتی سامان اور دوسری آسائشیں تو نہ تھیں لیکن عادل کے گھر جیسی بے سروسامانی بھی نہ تھی۔ ان پچھلے تین سالوں میں تو وہ بالکل ہی اُجاڑ اور ویران ہو کر رہ گیا تھا جیسے ایک بھی متنفس وہاں کبھی رہائش پذیر نہ تھا۔

صبح سے شام ہونے کو آئی تھی اور صاحباں کی سہیلیوں اور دوسری ملنے والیوں کا اسے دیکھ دیکھ کر جی نہیں بھرا تھا... اس کی باتیں ایسی میٹھی اور رسیلی تھیں لگتا تھا کانوں میں رس ٹپک رہا ہو... اور ان کا جی چاہتا تھا اس کی باتیں سنتی جائیں۔

"رات ہو رہی ہے لڑکیو...! اب اپنے اپنے گھر جاؤ... صاحباں یہیں ہے۔ بے شک صبح پھر اس کے پاس آجانا۔"

ملک جی کے کہنے پر اسے ذرا فرصت ملی۔

"ملک جی! میرے بابا کہاں ہیں... وہ مجھے نہیں ملے۔"

"ایک لمحے کے لیے تو تم اکیلی نہیں ہوئیں۔ وقت ملتا تو وہ تمہیں ملتا نا۔"

"اب تو فارغ ہوں۔" صاحباں نے پاس بیٹھی ماں کی طرف دیکھا۔

"کیا بابا بہت مصروف رہتے ہیں؟"

"نہیں تو..." سکینہ پیار سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اور پھر تمہیں ملنے کے لیے بڑی سے بڑی مصروفیت بھی چھوڑ سکتے ہیں۔"

"تو پھر بابا کو بلوا دو نا... میرا دل انہیں ملنے کو تڑپ رہا ہے۔"

"میں ابھی اسے بلاتا ہوں۔" ملک جی صاحباں کو اب کیا بتاتے کہ اس کے باپ نے اس سے ملنے سے انکار کردیا تھا۔

اور... صاحباں کی خاطر ایک بار پھر وہ عادل کے گھر کی طرف چل پڑے۔ سکینہ صاحباں کی آمد کا سنتے ہی چلی آئی تھی۔ بیماری نے اسے اتنا بدحال کیا ہوا تھا کہ وہ چل پھر نہیں سکتی تھی لیکن یہ خبر ایسی تھی کہ وہ اپنے قدموں سے خود چل کر حویلی میں

اس کے پاس آ گئی تھی۔

ماں بیٹی کے ملاپ کا منظر دیکھنے والا تھا۔ ہر آنکھ آنسو بہا رہی تھی اور ہر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ہر پانچ دس منٹ بعد سکینہ اٹھتی، صاحباں کے پاس جا کر اسے گلے سے لگاتی، سینے سے لپٹاتی۔۔ سر آنکھیں، ماتھا چومتی اور پھر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھتی۔ خوشی میں نہ اس نے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا لیکن پھر بھی بہت تندرست دکھائی دے رہی تھی۔

سکینہ کا دن یوں گزرا تھا اور عادل کا۔۔ چپ چاپ اپنی کوٹھری میں پڑا رہا تھا۔ نہ باہر نکلا تھا۔ نہ کسی سے ملا تھا صاحباں کی مبارکباد دینے بہت لوگ آئے تھے مگر وہ کسی سے نہیں ملا تھا۔ طبیعت کی خرابی کا کہہ کر ہر کسی کو ٹال دیا تھا۔۔ البتہ۔۔ ملک جی سے وہ ایسی گستاخی نہ کر سکا تھا۔۔ وہ دو بارہ اسے بلانے آئے تھے۔

"من کچھ ایسا بھاری ہو رہا ہے کہ میں ابھی اس سے مل ہی نہیں سکتا"

دونوں بار اس نے ملک جی سے یہی کہا تھا۔

"ویسے بھی ابھی اس کے پاس اس کی سہیلیاں وغیرہ ہوں گی۔ جب سب مل کر چلی جائیں گی تب میں بھی مل لوں گا"

اور اب تیسری بار ملک جی اس کے پاس آئے تھے۔ رات ہو رہی تھی۔ کوئی دیا، بتی نہیں جلایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں ہی پڑا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ صاحباں اور اس کی ماں کو میں نے نہیں بتایا پریشان ہوں گی"

"اچھا کیا ہے"

"تو پھر چلو۔۔ اب سب اسے مل کر جا چکی ہیں"

"اب تو رات ہو گئی۔۔ صبح مل لوں گا۔" عادل کے جواب پر ملک جی چونکے۔

"بات کیا ہے۔ کیا تم اپنی بیٹی سے ملنا نہیں چاہتے۔۔؟"

"وہ کون سا حج کر کے آئی ہے جو میں اس سے خاص طور پر ملنے جاؤں"

"تین سال کی جدائی، وہ بھی اولاد کی، کوئی معمولی بات ہے۔۔ کمال کرتے ہو تم بھی۔" ملک جی نے اس کا بازو تھام لیا۔

"اس کی خاطر نہیں تو میری ہی خاطر چلو۔۔ میں اُسے لے کر آیا ہوں۔ جانے تمہارے دل میں کیا ہے لیکن میرا تو مان رکھ لو۔۔ اس وقت میں اس سے کہہ کر آیا ہوں کہ ابھی تمہیں لاتا ہوں"

ملک جی کی اس بات پر عادل چُپ چاپ اُٹھا اور ان کے ساتھ حویلی کی طرف چل پڑا۔۔ سارا راستے خاموش رہا۔ ملک جی نے کوئی بات کرنا چاہی بھی مگر اس کے لب جیسے کسی نے سی دیئے تھے۔۔ خاموشی کا روزہ رکھے ان کے ساتھ چلتا رہا تھا۔

"تم چلو اندر میں ابھی آتا ہوں"۔ صاحباں والے کمرے کے باہر آ کر ملک جی خود وہیں رُک گئے انہوں نے دانستہ ایسا کیا تھا، یوں بھی ان میں باپ بیٹی کے ملنے کا نظارا دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ صبح سکینہ اور صاحباں کو ملتے دیکھ چکے تھے۔ جتنا سکینہ روئی تھی اتنے ہی آنسو ان کی بوڑھی آنکھوں نے بھی بہا دیئے تھے۔۔ اور پھر۔۔ مشکل اس وقت محسوس ہوئی تھی جب انہیں یہ آنسو وہاں موجود باقی عورتوں سے چھپانا پڑے تھے۔ وہ تو مرد تھے اور مرد کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلا کرتے۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

اور اب۔۔۔ عادل کو بیٹی کے پاس بھیج کر خود کمرے سے بھی پرے چلے جانا ہی بہتر جانا تھا۔ وہ ملک سہیل کے پاس بیٹھک میں جا بیٹھے۔ پندرہ دن بعد صاحباں کی شادی تھی۔ ملک جی میاں جی کو زبان دے کر آئے تھے۔۔ سب کچھ انہیں ہی کرنا تھا۔ عادل تو کسی معاملے میں دلچسپی ہی نہیں لے رہا تھا۔

اور وہ اسی سارے معاملے کے متعلق ملک سہیل سے مشورہ کرنے لگے۔ صلاح مشوروں میں انہیں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔۔ فضلو ان کا کھانا لے کر آیا تو انہیں احساس ہوا۔

"صاحباں اور اس کی ماں نے کھانا کھایا؟"

"جی ہاں۔۔۔ ملکانی جی نے خود انہیں پاس بیٹھا کر کھلایا ہے"

"اور عادل۔۔۔ وہ کہاں ہے۔۔؟ جب تک اس کی بیوی حویلی میں ہے وہ بھی یہیں کھانا کھایا کرے گا۔" ملک سہیل اپنی بے نور آنکھوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے بولے

"ہیں! ابا جی! ٹھیک کہا ہے نا میں نے؟"

"بالکل ٹھیک کہا ہے۔۔ کیوں فضلو۔۔۔ اس نے کھانا کھایا۔۔؟"

"جی۔۔ وہ تو پتا نہیں کہاں ہے"

"میں اسے صاحباں کے کمرے میں چھوڑ کر آیا تھا"

"تھوڑی دیر بعد ہی وہ وہاں سے چلا گیا تھا"

"تم نے خود اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔۔؟"

"ہاں جی۔۔ آنسو صاف کرتے ہوئے کمرے سے نکلا تھا"

"آہ ہائے۔۔۔ اولاد چیز ہی ایسی ہے۔" ملک جی نے ایک طویل سانس کھینچا۔ "اس کا کوئی دکھ ملے تب آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس کی خوشی ملے تب بھی آنسوؤں پر اختیار نہیں رہتا"

"پھر ابا جی۔۔" ملک سہیل نے کھانے کی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا۔ "اسے بلا لیں ہم انتظار کر کے کھانا کھائیں گے"

"ہاں فضلو! جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔ جلدی جانا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"

ملک سہیل سے ملک جی پھر وہی باتیں کرنے لگے اور فضلو عادل کو بلانے چلا گیا۔ بڑی تیز گیا تھا۔ تقریباً بھاگتا ہوا۔ اسی لیے پانچ منٹ میں ہی واپس آ گیا۔

"ملک جی! عادل بابا کھانا نہیں کھائے گا۔ آپ کھائیں"

"کیوں؟"

"وہ کہتا ہے بھوک نہیں ہے"

"کہاں تھا۔۔؟"

"اپنے گھر۔۔۔ سونے لگا تھا۔"

"بھوکا ہی سو جائے گا۔۔۔"

"زندگی میں جب ایسے لمحات آتے ہیں تو بھوک کہاں لگتی ہے ابا جی! تین سال بعد بچھڑی بیٹی سے ملا ہے۔۔ جانے اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اتنے بڑے غم کے بعد اچانک ہی ایسی بے پایاں خوشی مل جائے۔ صاحباں، اس کا اچھا بر۔، دولت پیسہ، ایک انسان جو کچھ چاہ سکتا ہے، وہ سب کچھ تو۔۔ بھوک کہاں رہی ہو گی"

"ہاں۔۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا"

باپ بیٹا دونوں ہنستے ہوئے کھانا کھانے لگے۔

"فضلو! کل سے اس کے کھانے کا خیال رکھنا۔ اگر حویلی میں نہیں آتا تو دونوں وقت اس کے گھر پہنچا دیا کرنا"

"ہم سے پہلے فضلو! وہ ہمارا مہمان ہے۔" ملک سہیل نے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا مالک"

"اور ابا جی! اشا کر اب کب آئے گا۔۔۔؟"

"اسے ایک دو ضروری کام تھے۔ وہ نمٹا کر اور کچھ سامان شہر سے لانے کے لیے میں نے کہا تھا اس کے سمیت چار پانچ دن تک پہنچ جائے گا"

"میں تو کسی کام کا نہیں۔ وہ آپ کا بہت ہاتھ بٹائے گا"

"تم کام کے کیوں نہیں۔۔ تمہارے تو مشورے ہی ہمارے لیے بہت کچھ ہیں۔ آدھا کام نمٹ جاتا ہے"

ملک سہیل ہنسنے لگا۔

"آپ سب لوگ بڑے خوبصورت انداز میں مجھے زندگی سے پیار کرنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں"

ملک جی کی آنکھیں بھیگ اٹھیں۔ اب کوئی بات کرتے تو آواز صاف نہیں نکلتی تھی اور یوں ان کی دلی کیفیت ملک سہیل نے سمجھ جانا تھی۔ ہاتھ دھونے کے بہانے جلدی سے اُٹھ کر باہر نکل گئے۔

گاؤں کے تقریباً سبھی مرد مسجد میں باجماعت نماز پڑھا کرتے تھے اگر کسی کو کوئی بیماری وغیرہ کی مجبوری نہ ہو ورنہ ہر روز ایک دوسرے سے ملاقات ضرور ہو جایا کرتی تھی اور وہیں اکثر کوئی ضروری پیغام ایک نے دوسرے کو پہنچانا ہوتا یا کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ درپیش ہوتا تو حل ہو جاتا۔

فجر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی عادل پچھلی قطار میں سے نکل کر ملک جی کو ڈھونڈتا ہوا تیسری قطار میں ان کے پاس چلا آیا۔ ملک سہیل بھی وہیں موجود تھے۔ رحمت ماچھی کی گائے دو دن سے بیمار تھی چارہ نہیں کھا رہی تھی اور وہ اس کے متعلق ملک جی سے پوچھ رہا تھا۔ کہ کیا کیا جائے۔ دیسی کوئی علاج بتا دیں گے یا شہر لے جایا جائے۔

ملک جی اسے علاج بتا کر فارغ ہوئے تو عادل قریب آ گیا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

"حویلی چلو۔ صاحباں سے بھی مل لینا اور وہیں بات بھی ہو جائے گی۔"

"سب کے سامنے کرنے والی نہیں۔"

"صاحباں کی شادی کے لیے قرض ورض لینا ہو گا۔ وہ سارا انتظام ہو گیا ہے۔ اس کی شادی میں خود کروں گا اپنی بیٹی بنا کر۔"

"یہ بات نہیں ملک جی۔ آپ اِدھر آئیے۔ آپ بھی ملک سہیل۔"

عادل اُنہیں مسجد ہی کے ایک علیحدہ گوشے میں لے گیا۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو عادل۔" ملک جی اسے حارث اور میاں جی کے متعلق بتانے لگے کہ وہ کیسے سُلجھے ہوئے اور نفیس لوگ ہیں۔ ایسا سمدھی اور ایسا داماد اسے کبھی نہیں مل سکتا تھا جو اس کی خوش بختی نے اسے ملا دیا تھا۔

عادل جب بھی بات کرنے لگتا ملک جی اسے چپ کرا کے اپنی سُنانے لگتے۔

"کل سے مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ میں تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتاتا۔"

جیسا سلوک ان سب سے میاں جی، بی بی اور حارث نے کیا تھا ایسی مہمان نوازی تو انہوں نے کبھی نہ کہیں دیکھی نہ سنی پھر منگنی کا جشن ہوا۔ جس انداز میں ہوا اور جس عزت و احترام سے انہیں شہر کے شرفاء اور رؤسا کے سامنے پیش کیا گیا ویسی کوئی دوسری مثال ملنا مشکل تھی۔

اور پھر آخر میں انہیں رخصت کرتے وقت کس قدر بیش بہا اور قیمتی تحائف سے نوازا تھا۔ یہ نہ نہ کرتے رہے مگر انہوں نے ایک نہ سُنی۔ قائم ہونے والے نئے تعلق اور استوار ہونے والے نئے رشتے کی بے شمار قسمیں ڈال دیں۔ تب انہیں سب لینا پڑا۔

ایسے لوگ تو انہوں نے کم ہی دُنیا میں دیکھے تھے۔

"وہ تو میں نے سب کچھ سن لیا ہے ملک جی! یہ ساری باتیں سارے گاؤں میں مشہور ہو چکی ہیں۔"

"تو کیا تُو خوش نہیں ہے۔۔؟"

"میرے لیے آپ کی خوشی زیادہ عزیز ہے۔"

"دیکھ لے سہیل! عادل بھی خوش ہے۔ کیوں نہ ہو آخر بیٹی کا باپ تو یہی ہے۔"

"اور وہی بیٹی کا باپ ایک ضروری بات آپ سے کرنا چاہتا ہے۔"

"کرو۔ کرو۔ ضرور کرو۔۔"

"ملک جی! آج پنچایت بیٹھے گی۔۔؟"

"پنچایت۔۔؟ کیوں۔۔؟ کوئی جرم ہو گیا ہے گاؤں میں۔"

"ہاں ملک جی! بہت بڑا جرم۔"

"کون سا۔ کس نے کیا۔۔؟"

"اس گاؤں کے منصف کی بیٹی کو آج پنچایت کے سامنے لانا ہے۔"

"منصف کی بیٹی۔۔؟ میں سمجھا نہیں۔۔"

"مولاداد المعروف عادل کی بیٹی مسماۃ صاحباں کو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔۔؟"

"ہاں ملک جی! قانون سب کے لیے ایک جیسا ہوتا ہے۔"

"اس کا کیا جرم ہے۔۔؟"

"ایک غلط عورت کے ساتھ رات کی تاریکی میں گھر سے فرار ہو گئی تھی۔"

"دیکھو عادل! اس معاملے کو یہیں دبا رہنے دو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب لڑکی کو میں اپنی ذمے داری پر لایا ہوں اس کی شادی کرنے، چودہ دن بعد یہ رخصت ہو جائے گی۔"

"نہیں ملک جی! یہ نہیں ہو گا۔"

"شادی نہیں ہو گی۔۔؟"

"ہاں... نہ شادی ہو گی اور نہ لڑکی رخصت ہو گی۔"

"پھر۔۔؟ پھر کیا ہو گا۔۔؟"

"لڑکی پر مقدمہ چلے گا۔"

"کس بات کا مقدمہ۔۔؟" ملک جی تیکھے سے لہجے میں بولے "لڑکی جیسی گئی تھی اسی طرح باعزت واپس آ گئی ہے۔ بس معاملہ ختم ہوا۔ تم خواہ مخواہ ہی بات بڑھا رہے ہو۔"

"نہیں ملک جی بات بڑھا نہیں رہا انصاف کر رہا ہوں۔ آج میں نے اپنے گاؤں کی ہر لڑکی کی آنکھ میں ایک حسرت دیکھی ہے۔ صاحباں بننے کی حسرت اگر صاحباں لُٹی پٹی عزت اور بُری حالت میں واپس آتی تو تب کوئی بات نہ تھی۔ مگر اب۔۔"

"اب کیا ہو گیا۔" ملک جی نے عادل کو یوں دیکھا جیسے اس کے دماغ کے کچھ کل پُرزے ڈھیلے ہو گئے ہوں۔۔ اور انہیں ہمدردی تھی اس سے۔

"اب وہ جس انداز میں آئی ہے میرے گاؤں کی ہر لڑکی یہ رُوپ اپنانا چاہتی ہے۔ ہر کوئی ایسے سپنے دیکھنے لگی ہے۔۔ اور یوں۔۔۔ ہر لڑکی یہ سب کچھ پانے کے لیے گھر سے فرار ہونے کی کوشش کرے گی۔"

"یہ تمہاری سوچ بالکل غلط ہے۔"

"نہیں ملک جی! یہ حقیقت ہے۔ اگر آج صاحباں کا جرم نظر انداز کر دیا گیا تو ایسے جرائم اور بھی بہت ہوں گے اور پھر۔۔ صاحباں کے نصیب نے تو اسے میاں جی جیسا شخص ملا دیا تھا۔۔ دوسری لڑکیوں کو یقیناً یہ کچھ نہیں مل سکے گا اور یوں وہ اپنی عزتیں لُٹا بیٹھیں گی۔۔ میں اس بُرائی کو یہیں ختم کر دوں گا۔۔ کچھ اس طرح کہ سب غیرت پکڑیں۔۔ اور آئندہ کوئی لڑکی ایسی حرکت نہ کر پائے۔"

"آخر تم پنچایت بُلا کر کرنا کیا چاہتے ہو۔۔؟"

"صاحباں کو اس کے جرم کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔"

"نہیں۔ نہیں۔۔ میں ان لوگوں سے وعدہ کر کے آیا ہوں۔۔ اور۔۔ اور۔۔" ملک جی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ "صاحباں ہمارے گاؤں کی عزت ہے۔۔ ہمارے گاؤں کا مان ہے۔۔ بتاؤ ایسی کوئی اور لڑکی پورے تصوّر آباد میں ہے۔؟ اتنی پڑھی لکھی اور سُلجھی ہوئی۔۔؟"

جب سے صاحباں کو اس رُوپ میں دیکھا تھا ملک جی کو اس پر بے اختیار پیار آئے جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی کوئی بیٹی اگر ہوتی تو بالکل ایسی ہی ہوتی۔ اس کے خلاف وہ اس کے باپ کے مُنہ سے بھی کوئی بات نہیں سننا چاہ رہے تھے۔

"ایسی اچھی اور شہری لوگوں جیسے رکھ رکھاؤ والی ہے۔ اس کے نام سے تو ہمارے تصوّر آباد کا نام نکلے گا اور عزت بڑھے گی۔"

"میرے آپ سے بالکل مختلف خیالات ہیں۔ اور میں۔۔۔ اور میں۔۔" وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔۔ الفاظ نہیں مل رہے تھے۔۔ خون

کا دوران اتنا تیز تھا کہ دل بھی اسی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ "اگر ملک جی آپ نے صاحباں کو پنچایت میں کھڑا نہیں کیا تو میں آپ کے انصاف کے خلاف آواز اُٹھاؤں گا۔"

"یہ تم کیسے باپ ہو۔۔" ملک جی نے حیرت سے عادل کو دیکھا۔ "تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو فخر کرتا ایسی بیٹی پر اور اگر میں ایسا حکم دیتا تو سفارش کرنے آتا۔۔ مگر تم نجانے کیسے باپ ہو۔ تمہارے دماغ میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہے اور اس کی وجہ شاید صاحباں ہی کی جدائی ہے۔"

ملک جی اسے سمجھاتے رہے۔ ملک سہیل بھی باپ کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ ایک معصوم سی لڑکی کے ساتھ یہ سب کچھ کرنے سے فائدہ۔۔ مگر اس کی سمجھ میں ان کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی وہ بس اپنی ہی ضد پر اَڑا ہوا تھا۔

"میں تصوّر آباد کا مالک ہوں نا۔۔" آخر میں ملک جی جھنجلا کر انتہائی برہمی سے بولے۔ "پورے گاؤں کا بلاشرکتِ غیرے مالک۔۔۔ یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔"

"اور میں تصوّر آباد کا منصف ہوں، قاضی ہوں، سرپنچ ہوں میں انصاف کروں گا۔"

عادل اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔ دو قدم ہی چلا تھا کہ ملک سہیل نے کچھ سوچ کر اسے آواز دے ڈالی۔

"سُنو عادل! ہم تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہیں۔۔ لیکن کچھ تم بھی تو سوچو۔۔ ابا جی ان لوگوں کو زبان دے آئے ہیں۔۔ اور تصوّر آباد کا مالک بے زبان ہو جائے۔ کیا ان کی زبان کی لاج رکھنا ہم سب ہی کا فرض نہیں ہے۔۔؟"

ملک سہیل کی مدلّل بات سُن کر عادل خاموش ہو گیا۔ کتنی ہی دیر گُم سُم اور چپ چاپ کھڑا رہا۔۔ پھر ہولے ہولے قدم اُٹھاتا ہوا اسی خاموشی کے ساتھ مسجد کا صحن پار کر کے سیڑھیاں اتر گیا۔

"اس کی عقل ماری گئی ہے۔"

اس کے جانے کے بعد ملک جی بڑبڑائے۔

"ویسے ابا جی کہنا اس کا بھی درست ہے۔"

"اب تم بھی اس کی طرف داری نہ کرنے لگ جانا۔" عادل کی بحث میں ملک جی اس قدر اُلجھے ہوئے تھے کہ بیٹے کو ڈانٹنے لگے۔ "مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ ایک ہی اولاد رہ گئی ہے اس کے بھی پیچھے پڑا ہوا ہے ایسی مثال کوئی دوسری مشکل سے ہی ملے گی۔"

"اور ایسا دیانتدار، سچّا اور کھرا انسان بھی کوئی دوسرا مشکل سے ہی ملے گا ابا جی۔۔ میری نگاہوں میں وہ پہلے سے بلند ہو گیا ہے۔"

"تمہارے پاس بینائی نہیں ہے ورنہ کاش! تم ایک نظر اس بچّی کو دیکھ سکتے۔۔ اس کی صورت اتنی معصوم ہے کہ اسے پنچایت میں کھڑا کرنے کا تصوّر ہی گناہ لگتا ہے۔"

"کاش میں اُسے دیکھ سکتا۔" ملک سہیل نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "اور کاش میں عادل کو بھی دیکھ سکتا۔"

جب سے صاحباں تصوّر آباد میں آئی تھی جیسے اس کی روٹھی بہاریں واپس آ گئی تھیں۔

ہر ایک چہرے پر خوشی کی چمک تھی۔ ہر گھر میں صاحباں کا ذکر تھا اور ہر اس جگہ پر جہاں دو چار عورتیں یا مرد اکٹھا ہو جاتے صاحباں کی کہانی کا کوئی نہ کوئی باب چھڑ جاتا۔

اس کے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر آج تک کی باتیں خصوصاً یہ پچھلے تین سالوں کے واقعات تو مختلف زبانوں سے نکل نکل کر اب ایک خوب صورت اور دل چسپ ترین داستان بن چکے تھے۔

ہر کوئی بار بار اُسے سننا پسند کرتا تھا اور پھر دُہرانا پسند کرتا تھا۔ شاید ہر کسی کے ارمانوں کی تسکین اس طرح ہوتی تھی۔ تشنگی بجھتی تھی۔

اس گہما گہمی کے ساتھ ہی اس کی شادی کی تیاریاں بھی بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں۔ گاؤں کا ہر گھر اس میں حصہ لے رہا تھا۔ لڑکیاں بالیاں شام ہوتے اکٹھی ہو جاتیں۔ ڈھولک بجتی۔ مختلف قسم کے سوانگ بھرے جاتے۔ ناچ گانا ہوتا۔

بڑی بوڑھیاں ملکانی جی کے ساتھ مل کر کپڑوں پر گوٹہ کناری لگاتیں۔ چاول بینتیں، گندم صاف کرتیں صحنوں کی لپائی ہو رہی تھی۔ کمروں کے فرش دھوئے جا رہے تھے۔ دیواروں، دروازوں پر سے جالے اتار کر نئے نئے رنگ پینٹ ہو رہے تھے۔

مرد باہر کے کاموں میں ملک جی کا ہاتھ بٹا رہے تھے جہاں برات کے بیٹھنے کا انتظام تھا وہاں صفائی وغیرہ ہو رہی تھی

نہ صرف وہیں بلکہ گاؤں تک آنے والے سارے راستے کی صفائی کے علاوہ جھنڈیاں دروازوں پر لگ رہی تھیں، ساتھ ساتھ خوش گپیاں بھی ہوتی رہتیں اور کام بھی ہوتا رہتا۔

یہ سارا انتظام، سارا بندوبست، ملک جی خود ہی کر رہے تھے۔ عادل دیکھ رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ کسی معاملے میں، کسی کام میں اُس نے کوئی دخل نہیں دیا۔ اور نہ کسی قسم کی دل چسپی کا اظہار کیا۔

چودہ دن چودہ پلوں کی طرح گزر گئے آج صاحباں کی شادی کا دن تھا۔۔۔ وہ دن جس کا سب کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ صاحباں کے لیے سچ مچ کے ایک شہزادے نے آج برات لے کر تصوّر آباد میں آنا تھا۔ ہر کوئی عورت، مرد، بڑے، بوڑھے، جوان اور سب سے بڑھ کر صاحباں کی سہیلیاں اس کی دید کی مشتاق تھیں۔

ایسی شادی تو آج تک گاؤں میں کسی کی نہیں ہوئی تھی۔ صاحباں اس معاملے میں بھی خوش قسمت نکلی تھی۔ اِدھر ایک امیر آدمی نے اُسے بہو بنا لیا تھا اُدھر ملک جی بیٹی بنا کر سب کچھ کر رہے تھے۔ نصیب ہوں تو ایسے کہ کٹیا میں جنم لے کر محلوں کی مالک بن جائے اس کی ہم عمر لڑکیوں کی نگاہیں انتہائی رشک سے اس پر اُٹھ رہی تھیں۔

عین وقت پر برات آ گئی جس دھوم دھام سے اس کے استقبال کی تیاریاں ہوئی تھیں اسی شان و شوکت سے برات آئی۔ میاں جی کا ایک ہی بیٹا تھا، سب کچھ اسی کے لیے تھا۔ دل کھول کر خرچ کیا۔

سارے رستے اس پر سے روپے پیسے نچھاور کرتے چلے آئے تھے۔ بینڈ باجا بھی شہر سے ہی ساتھ لائے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ البتہ ہر ایک کا چہرہ پڑھا جا رہا تھا، جس پر مسکراہٹوں، ہنسیوں اور قہقہوں کے ساتھ ایک ہی لفظ کندہ تھا۔ خوشی۔۔! خوشی۔۔۔!! اور۔۔۔ خوشی۔۔۔!!!

سب ہی خوش تھے اور ایسی کھلکھلاتی خوشی آج پہلی بار سب نے دیکھی تھی۔

حارث کے گلے میں طلائی ہار تھے اور چہرے پر بے حد خوب صورت سہرا۔ یہ بی بی کی خواہش اور ارمان تھے جو اس کے چہرے پر چمک دمک رہے تھے۔ سڈول اور خوب صورت جسم پر سنہری زربفت کی شیروانی میں وہ سچ مچ کا شہزادہ لگ رہا تھا۔

سارے گاؤں کی عورتیں، لڑکیاں، بچّے چمکیلے، بھڑکیلے کپڑے پہنے چہروں پر مسکراہٹیں سجائے برات دیکھنے کے لیے حویلی کی چھت پر چڑھے ہوئے تھے۔ اس شادی میں سارا گاؤں مدعو تھا۔ تبھی بڑے مان تران سے ہر کوئی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ موجود تھا۔

شاکر، ملک جی، ملک سہیل اور گاؤں کے چند چیدہ چیدہ بزرگوں نے برات کا استقبال کیا۔ عادل نجانے کہاں تھا۔ ملک جی کے لوگ اُسے ڈھونڈ رہے تھے مگر وہ نہ ملا۔ میاں جی کے پوچھنے پر دوبارہ ملک جی نے اپنے آدمی اسے تلاش کرنے کے لیے بھگا دیئے۔

"ملک جی لمبا سفر ہے، نکاح وغیرہ جلد ہو جانا چاہیے۔"

میاں جی نے جلدی ڈالی ہوئی تھی۔

"کل دعوتِ ولیمہ کے سلسلے میں ہمارے یہاں بھی وسیع پیمانے پر لوگ مدعو ہیں۔ جس کی ابھی بہت تیاری ہونے والی ہے۔"

لیکن نکاح کیسے ہوتا۔۔۔ بابا عادل جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔۔۔ دیر ہو رہی تھی۔ ملک جی نے قاضی کو عقد پڑھانے کا حکم دے دیا۔

اس سارے معاملے میں وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہے تھے۔ کون سا عادل نے کسی کام میں حصہ لیا تھا یا دخل دیا تھا۔

نکاح کے بعد دعوتِ طعام تھی یوں تو آج سارے گاؤں والوں کا کھانا ملک جی کے یہاں تھا لیکن براتیوں کے لیے کھانے کا خاص انتظام تھا۔ علیحدہ جگہ پر اور علیحدہ انداز میں اور علیحدہ قسم کا۔

شہر کے پڑھے لکھے اور باسلیقہ لوگ تھے سارے، اور دُولہا تو ولایت پاس تھا۔ اس کے اسٹینڈرڈ کے مطابق سب کچھ ہونا تھا نا۔۔!

کھانے سے فارغ ہو کر رخصتی کا وقت آیا۔ ان اتنے سے قلیل دنوں میں ہی ملک جی نے صاحباں کے لیے اچھا خاصا جہیز تیار کر لیا تھا۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق اسے تحائف دیئے تھے۔

"دیکھئے آپ پڑھے لکھے ہو کر بھی جہیز جیسی فرسودہ رسم ادا کر رہے ہیں۔" میاں جی نے وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ جہیز نہیں یہ ہم لوگوں، سارے تصوّر آباد والوں کی خوشی ہے۔"

صاجباں ملک جی کی نہ پیدا کی ہوئی بیٹی تھی نہ پالی ہوئی لیکن رخصتی کا سماں ہی ایسا ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ ہی آنکھیں بھیگ اٹھیں اور ان بھیگی بھیگی آنکھوں سے میاں جی کو تکتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔

"صاجباں سب کو بہت عزیز تھی، سبھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔"

"آپ سب کی خوشی ہمارے سر آنکھوں پر، سمجھئے یہ ہم نے قبول کیا اور اب۔" ملک جی نے میاں جی کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ ہماری طرف سے گاؤں کی کسی اور بہت ہی مستحق لڑکی کو دے دیجئے گا، ہمارے لیے تو صاجباں کا وجود ہی لاکھوں، کروڑوں کا جہیز ہے۔"

"وہ تو پھر آپ نے خود ہی اِسے بنایا سنوارا، ہم رخصتی کے وقت لڑکی کو کیا دیں۔ خالی ہاتھ جائیگی ہمارے ہاں سے؟"

"آپ دعاؤں سے اس کا دامن بھر کر رخصت کیجیے۔"

پاس سے حارث نے بھی میاں جی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ملک جی کچھ افسردہ بھی ہوئے لیکن ان کے اس روّیہ پر خوش بھی بے حد تھے کہ ہر آزمائش میں وہ پورے اترے تھے۔ کوئی لالچ نہ تھا۔ اخلاق بھی اعلا تھے تعلیم یافتہ بھی تھے۔ ادب آداب بھی جانتے تھے۔

صاجباں جیسا خوش قسمت وجود صدیوں میں پیدا ہوتا ہے جو ہر کسی کے لیے خوشی، رحمت اور برکت کا باعث بھی ہو... میاں جی کے لیے تو وہ باعث برکت اور روشنی کا مینار تھی ہی۔ آج ان کے گاؤں کو بھی اُس نے بڑی خوشیوں سے ہمکنار کیا تھا... ایسی برات کب کسی گاؤں میں گئی ہوگی۔ ملک جی کا سینہ خوشی سے پھولا ہوا تھا۔

دُلہن کی رخصتی کا شور بلند ہوا تو نجانے کہاں سے عادل آگیا۔

"تم کہاں تھے۔؟" ملک جی نے حیرت سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

بیٹی کی شادی تھی، کوئی لباس تبدیل نہیں کیا تھا اسی طرح ملگجے سے کُرتے اور دھوتی میں سب کے بیچ چلا آیا تھا جبکہ آج گاؤں کا ہر فرد اُجلا اُجلا، نکھرا نکھرا نظر آرہا تھا ــــ یہ کیسا باپ تھا۔؟ بیٹی کی عزت کا خیال نہ تھا۔ ملک جی کو اس پر غصہ سا آگیا مگر اس وقت موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے پی گئے۔

"یہ تمہارا داماد ہے اور یہ اُس کے والد، تمہارے سمدھی۔" ملک جی نے آگے بڑھ کر اس کا تعارف کرا تو دیا مگر دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہو رہے تھے، وہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔

"اور یہ صاجباں کا باپ ہے، ہمارے تصوّر آباد کا معمار، منصف، قاضی، سرپنچ، جو کچھ سمجھ لیں... سب کچھ یہی ہے سب کچھ..."

غصہ اپنی جگہ تھا لیکن اس کی خوبیاں تو کسی صورت نظرانداز نہ کر سکتے تھے۔ ان کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ عادل کے تمام اوصاف گنواتے۔

عادل نے پہلے میاں جی سے ہاتھ ملایا پھر حارث سے۔ حارث کی بے شمار تعریفیں اس نے ملک جی سے سن رکھی تھیں۔ مگر وہ تو ان کی تعریفوں سے بھی کچھ بڑھ کر ہی اچھا لگا۔ عادل اُسے ایک ٹک تکے جا رہا تھا۔

"بیٹے تمہارے سسر ہیں۔" حارث واپس اپنی جگہ پر بیٹھنے لگا تو میاں جی اُسے ٹہوکا دیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولے "آگے بڑھ کر گلے ملو... غیروں کی طرح ہاتھ ملا کر پیچھے ہٹ گئے ہو۔"

باپ کی بات سنتے ہی حارث جلدی سے بڑھا اور عادل سے بغلگیر ہوگیا۔ اور ــ یہ لمحہ.. عجب جذباتی سانحہ تھا۔ عادل کی آنکھوں سے بے شمار آنسو ٹپک پڑے۔

"کاش! کاش!! یہ سب ایسے نہ ہوتا ــ!!"

"جو کچھ ہوا ہے، جیسے بھی ہوا ہے، بہت اچھا ہوگیا ہے۔ خدا کو یونہی منظور تھا۔" میاں جی نے عادل کا شانہ تھپتھپایا۔

"ہم بہت خوش ہیں یوں کہ جیسے دونوں جہاں کے خزانے آپ لوگوں نے ہمارے دامنوں میں بھر دیئے ہیں۔"

عادل نے کوئی جواب نہ دیا پرے ہٹ کر اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

"ملک جی! اور عادل بھائی آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اب لڑکی کو رخصت کر دیجئے۔"

"رخصتی سے پہلے صاجباں کے ساتھ مجھے علیحدگی میں ملنے کی اجازت ہوگی ــ؟" عادل نے ملک جی کے قریب ہو کر ہولے سے پوچھا۔

"کیوں نہیں ــ؟ کمال کرتے ہو تم بھی عادل میاں... ارے تمہاری بیٹی ہے، سارا حق تمہارا ہے... ہم سے کیا اجازت ب کرتے ہو۔"

دونوں نے اکٹھے ہی حویلی کی طرف قدم اٹھائے، اندر جا کر ملک جی نے دُلہن کے کمرے سے سب لڑکیوں کو نکال دیا۔ صرف کینہ رہ گئی تھی وہ تو لڑکی کی ماں تھی اور عادل کی بیوی۔ ملک جی خود بھی باہر نکل گئے۔

"مجھے بالکل اکیلے میں اس سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

سکینہ کو وہاں موجود دیکھ کر عادل نے سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

"تو بھلا اب مجھ سے بھی رازداری ہوگی۔" سکینہ نے بُرا منایا۔

"میں نے کہا نا تم بھی جاؤ۔" عجب گھُٹا گھُٹا مگر تیز و تند سا لہجہ تھا اور پیشانی پر بے شمار سلوٹیں تھیں۔

"آج کے دن بھی کیا حالت اپنی بنائی ہوئی ہے؟" سکینہ اسے بغور سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے رے سے نکل گئی۔ "سنکی ہوگیا ہے۔"

عادل نے بیوی کی بڑبڑاہٹ سنی مگر اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بڑھ کر اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

صاجباں سب کچھ دیکھ رہی تھی اور سن رہی تھی۔ بابا بڑے سنجیدہ تھے۔ کچھ سہم کر پلنگ پر سے اتری اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

بابا نے اس کے قریب جا کر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سرخ سہاگ کے جگمگاتے جوڑے اور زیورات میں اس کا ملکوتی حسن دنیا کی ہر خوبصورتی کو مات کر رہا تھا۔ معصومیت اور خوشی کا عجیب سا امتزاج چہرے پر تھا، نگاہیں نہیں تک رہی تھیں۔ عادل کی نظریں جھک گئیں۔

"بابا ـــ!" صاجباں نے بڑھ کر پھولوں کی ڈالیوں جیسے بازو بابا کے گلے کا ہار کر دیئے۔

بابا نے ایک بار پھر نگاہ بھر کر اُسے دیکھا اور پھر بہت آہستگی سے اس کی باہیں گلے سے نکال دیں۔

"میں تم سے ایک فیصلہ کرانے آیا ہوں۔"

"آپ ــ؟ اور مجھ سے فیصلہ کرائیں گے... بابا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میری جگہ اگر تم ہوتیں تو اپنی ایسی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کرتیں۔"

"کیا مطلب بابا ــ؟"

"تم اپنے گھر سے بھاگ گئی تھیں۔ ایک امیر اور خوب صورت آدمی کے ساتھ شادی کرنے کے لالچ میں۔"

"وہ... وہ... بابا ــ" صاجباں ہکلانے لگی۔ چہرے کے سرخ رنگت پر زردی سی غالب آنے لگی۔

"صرف میری بات کا جواب دو... میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ... تم اسی لیے اپنا گھر چھوڑ گئی تھی نا ــ؟"

"ہاں ــ بابا۔" اس کا سر جھک گیا۔ نظریں بابا کے قدموں پر لوٹنے لگیں۔

"ایک بیٹی کا گھر سے بھاگ جانا اچھی بات ہے؟"

صاجباں چُپ رہی جُھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں ــ ایک غیرت دار گھرانے کی لڑکی کا گھر سے یوں فرار ہونا اچھی بات ہے کیا ــ؟"

بابا کی آواز میں کڑک تھی، کانپ کر صاجباں نے جھکے ہوئے سرگوشی میں بلایا۔

"یوں نہیں، میری بات کا زبان سے جواب دو صاجباں ــ!"

"نہیں بابا! اچھی بات نہیں ہے۔"

"اور جن والدین کی لڑکی ایسا قدم اٹھائے ان کے لیے یہ عزت کی بات ہے کیا؟"

"نہیں مجھے معاف کر دیں بابا ــ!"

"تجھے معاف کر دوں... تجھے... جو آج مجھ سے معافی مانگ رہی ہے جبکہ تین سال تک میں بے عزّتی کی ایک ایسی آگ میں مسلسل جلا ہوں جس نے مجھے نہ جلا کر راکھ کیا ہے اور نہ زندہ رہنے دیا ہے۔"

صاجباں کا سارا وجود لرز رہا تھا، چپ چاپ کھڑی تھی اور باپ کی سن رہی تھی ــ درست کہہ رہا تھا وہ سب کچھ

"تو یہ جانتی تھی کہ تیرا باپ اسی گاؤں کی پنچایت کا سرپنچ ہے، منصف ہے یہاں کا، حق رکھتا ہے ہر مجرم کو اس کے جرم کی

سزادینے کا — ؟"

"ہاں بابا —" وہ کپکپائی۔

"پھر بھی تُو نے گھر سے فرار ہو جانے والا جُرم کیا ہے ... تُو نے لالچ کیا، تُو نے نہ میری اور نہ اپنی ماں کی عزت کی پروا کی سارے گاؤں کی۔ جس گاؤں کی لڑکی کوئی غلط فعل کرے وہ سارا گاؤں ہی بدنام ہو جاتا ہے ... تُو نے یہ نہ سوچا کہ گاؤں ساری لڑکیوں کی عزت کی ڈور ایک ساتھ بندھی ہوتی ہے ایک کی بدنامی ہو تو باقی بھی ساتھ ہی بدنام ہوتی ہیں۔"

"بابا مجھے معاف کر دیں۔"

"مجھ سے معافی کی درخواست کر رہی ہے، جس نے اپنے بیٹوں کو بھی معاف نہیں کیا تھا اور خاص طور پر اس صورت جبکہ یہ معاملہ صرف میرا اور تمہارا نہیں سارے گاؤں کا معاملہ ہے ... میں کیسے معاف کر دوں۔"

"سارے گاؤں کا معاملہ —؟"

"ہاں — سارے گاؤں کا معاملہ — تیری سہیلیاں تجھ سے ملی ہیں ؟"

"ہاں —؟"

"کیسے —؟"

"بہت اچھی طرح — بڑے پیار سے۔"

"کیوں بھلا —؟"

"میری سہیلیاں جو تھیں۔"

نہیں — وہ تجھ سے اس لیے اچھی طرح اور پیار سے ملی ہیں کہ تُو ان سے بہت بہتر پوزیشن میں واپس آئی ہے اور معیار کی مالک بن کر آئی ہے۔ اگر تُو اپنی عزت گنوا کر، لُٹ لُٹا کر بُرے حال میں واپس آتی تو سب تیرے منہ پر تھو کوئی تیری شکل دیکھنا گوارا نہ کرتی۔ اور اب ... اب تُو جانتی ہے نا کہ ہر لڑکی اس حسرت سے تجھے دیکھ رہی ہے کہ کاش تیر جگہ وہ ہوتی۔''

صاحباں خاموش کھڑی سنتی رہی ... بابا کی کسی بات کی تردید نہیں کی ... کر سکتی ہی نہیں تھی ... اس کا کہا ہوا ایک حرف درست تھا۔

اب اتنی عقل اس کو آچکی تھی ... ہر ایک کا انداز سمجھتی تھی۔ لڑکیاں جیسے مکھیوں کی طرح اس کے اردگرد بھنبھنا رہی تھ س سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب اس سے متاثر تھیں۔

کسی ایک نے بھی اس کے گھر سے بھاگ جانے والے اقدام کو غلط فعل قرار نہیں دیا یا بُرا نہیں کہا، بلکہ اس کے اندا ملبوسات، زیورات، طور اور اطوار کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں ہی بھریں۔ ساتھ ساتھ بے تحاشا اس کی، اس کی ہر ہر ور ہر ہر چیز کی تعریفیں ہی کیں۔

بابا کا کہا ہوا ایک ایک حرف نہ صرف درست تھا بلکہ وزن دار تھا۔ موتیوں میں تولنے کے برابر تھا۔ دل اندر نبد کر رہا تھا۔

میں نے ملک جی سے کہا۔ صاحباں مجرم ہے۔ اسے پنچایت میں کھڑا کریں، مگر انھوں نے میری با نہیں مانی تم جا رہی ہو۔ بڑی عزت و توقیر کے ساتھ اس گاؤں سے رخصت ہو رہی ہو۔ کیا ایک مجرم کے ساتھ ایسا ہی سلوک چاہیے ...؟"

"بابا —!"

"ہاں، ہاں بولو۔ کیا تم اسی سلوک کی مستحق ہو —؟"

"نہیں بابا ... نہیں ... میں بہت بُری ہوں، میں قصوروار ہوں ... میں گناہگار ہوں ... لیکن —"

وہ باپ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"مجھے معاف کر دیں۔ میں ہر گناہ، ہر قصور کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔"

"میں بھی معاف کر دوں تو جانتی ہے کیا ہوگا —؟"

"کیا —؟"

آج اگر یہاں سے تُو اسی طرح عزت و احترام کے ساتھ رخصت ہوئی تو کل میرے گاؤں کی ہر لڑکی گھر سے فرار ہونے کے لی سوچے گی اور پھر نہ جانے کتنے باپوں کی میری طرح عزت نیلام ہوگی اور کتنی لڑکیاں اپنی عصمتیں لُٹا بیٹھیں گی ہر ایک کو ں جی جیسا بیٹی سے محروم انسان ملنے سے رہا۔"

بابا نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"بتا کیا میں کوئی بھی بات غلط کہہ رہا ہوں —؟"

"نہیں... بالکل نہیں..." اس کی ڈوبی ڈوبی آواز بڑی مشکل سے اُبھری۔

"تو پھر یا تُو خود سنگسار ہو جا، کہ یہ تیری سزا ہے نہیں تو پھر... مجھے ایسا کرنا ہوگا.. تاکہ میری بے داغ پیشانی پر بے انصافی غ لگنے سے پہلے پہلے میرا کام تمام ہو جائے۔"

بابا نے اپنی جیب سے ایک پُڑیا نکالی۔

"اس میں زہر ہے.. یہ تیرے جرم کی سزا ہے جو تجھے ضرور ملنا چاہیے اس لیے کہ میرے اوپر عاید ہونے والی انصاف کی ے داری بھی پوری ہو جائے گی اور آنے والے زمانے میں جو بیسیوں لڑکیوں نے تیری تقلید کر کے خراب ہونا ہے وہ عبرت لیں اور بچ جائیں۔"

"بابا! اب میرا تعلق دوسرے لوگوں سے بھی ہے۔" اس نے باپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے منت بھرے لہجے میں کہا.. یاں جی اور بی بی کیا کریں گے اور... اور میرا شوہر حارث، وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں.. وہ بے موت مر جائیں گے۔ یں کس بات کی سزا آپ دے رہے ہیں۔"

"اور ہم... اور ہمارا سارا گاؤں.. ہم سب نے کیا گناہ کیا تھا جو تُو نے ہمیں یہ ذلت و رسوائی دی۔"

"بابا میں سچے دل سے معافی مانگ رہی ہوں۔ اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔"

"گھر سے بھاگنے والی ہر لڑکی کو اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا ہے نتائج تو بعد میں نکلتے ہیں، جو سب کو بھگتنا پڑتے ہیں اور ں ایسا وقت آئندہ نہیں آنے دوں گا۔ تمہاری جدائی بھی برداشت کر لی اور ذلت و رسوائی بھی سہہ لی۔ اب انصاف کا جو تقاضا ہے ہ پورا کرنا ہوگا اور اگر تم یہ زہر کھانے پر رضامند نہیں ہوئیں تو میں تمہارے سامنے کھا لوں گا.. ابھی.. تاکہ کوئی اور لڑکی اگر گھر سے بھاگنے کا ارادہ کرے تو اسے اپنے باپ کا انجام دکھائی دے جائے۔ پھر شاید... شاید..."

بابا نے پُڑیا کھولی ہی تھی کہ صاحباں کا لرزتا کانپتا ہاتھ بڑھا اور اس نے بابا کے ہاتھ سے پُڑیا جھپٹ لی۔

"بابا! میرے جرم کی سزا مجھے ہی ملنا چاہیے.. تم نے جو کچھ کہا ٹھیک کہا۔ مجھے فخر ہے اپنے باپ پر کہ وہ اس اتنے بڑے متحان میں بھی ثابت قدم رہا ہے۔ یہ فیصلہ بھی درست کیا ہے۔"

صاحباں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن اس نے جلدی سے خشک کر لیے۔

"نہیں... میں بہادر باپ کی بہادر بیٹی ہوں.. بابا! میں خوشی کے ساتھ آپ کا یہ فیصلہ قبول کرتی ہوں۔"

صاحباں چند لمحے کھڑی بڑے غور سے اپنے باپ کو تکتی رہی پھر جلدی سے پُڑیا پھانک لی، پلنگ کے قریب ایک میز پر صراحی پڑی تھی۔ گلاس میں پانی ڈالا اور بڑے اطمینان سے پی گئی۔

"صاحباں..." بابا کی زبان لڑکھڑا گئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ خاموش ہو گیا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اپنی ان محبتوں کا دل جو اس کو اس سے ہمیشہ سے تھیں۔ اس کے جانے کے بعد بھی.. اور وہ واپس آئی تو تب بھی۔

"بابا.. آپ، اب خدا اور ان تمام لوگوں کے سامنے سرخرو ہیں نا..؟"

پھر صاحباں کا سر چکرایا.. وجود لڑکھڑایا.. بابا نے سہارا دے کر اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔

"بابا.. میری اماں کو بلا دیں.. بی بی تو آئی نہیں.. میں انہیں کیسے دیکھوں..؟ میاں جی کو بلا دیں، حارث کو.. کو بھی.. آخری بار.. آخری بار.. ان سب کو د... د... دیکھ لوں۔" اور وہ بیٹھی بیٹھی لہرائی اور پھر پلنگ پر ہی دھڑام سے بے سُدھ ہو کر گر پڑی۔

عادل نے بڑھ کر اس کے چہرے کو دیکھا، مُردنی سی چھا گئی تھی۔

"میری صاحباں — میری بیٹی۔"

بابا نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پھر اپنے آپ پر قابو ہی نہ رہا.. بے اختیار ہو کر اس کی

پیشانی کو چومنے لگا۔

"دیر ہو رہی ہے دُلہن کو باہر نکالو۔"

کسی نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ عادل ہوش میں آگیا۔ صاحباں کا چہرہ چھوڑتے ہوئے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دی۔

"صاحباں کہاں ہے۔۔؟" ملک جی کھڑے پوچھ رہے تھے۔

"آپ چلیئے۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

بابا بوڑھا تھا لیکن اس وقت نجانے کہاں سے اس میں اتنی ہمت و طاقت آگئی تھی۔ صاحباں کو بازوؤں پر اٹھایا اور اسے باہر کی طرف لے چلا۔ وہاں، جہاں دُلہن کو رخصت کرنے کے لیے سب جمع تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔

عادل کے پیچھے سکینہ تھی۔۔ پھر اس کی ساری سہیلیاں تھیں اور پھر گاؤں کی باقی عورتیں۔

"صاحباں کو کیا ہوا؟ صاحباں کو کیا ہوا؟" ہر کوئی پوچھ رہی تھی۔

بابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔ اسے لیے لیے سیدھا ملک جی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ملک جی۔۔ یہ لیجئے۔۔ آپ زبان دے آئے تھے۔ اسے رخصت کر کے اپنا وعدہ پورا کر لیجئے۔"

"کیا ہوا صاحباں کو۔۔۔؟"

گھبرا کر کئی لوگ عادل کے اردگرد آن کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں میاں جی بھی تھے۔

"انصاف کا تقاضا پورا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" میاں جی پھٹی پھٹی آنکھوں سے عادل کے بازوؤں پر بے جان پڑی صاحباں کو دیکھ رہے تھے۔

"صاحباں کو اس کے جُرم کی سزا میں نے دی ہے۔ آیندہ ہونے والے بے شمار جرائم کی روک تھام کی ہے۔ بیسیوں لُٹنے والی عزتوں کو بچایا ہے۔"

عادل بولے جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس کے انداز میں ایک جنون سا تھا۔ لیکن آنکھوں میں ایک غیر معمولی سی چمک تھی جیسے کچھ کھو کر۔ تھوڑا کھو کر۔ بہت زیادہ پا لے۔

"صاحباں مر گئی ہے۔ یوں تو یہ میرے لیے آج سے تین سال پہلے ہی مر گئی تھی۔۔ لیکن پھر۔۔ پھر زندہ ہو گئی۔۔۔ اور میں نے اسے مار ڈالا تاکہ گاؤں کی باقی لڑکیاں زندہ رہیں۔"

"صاحباں مر گئی۔۔ صاحباں مر گئی۔" ہر زبان پر چیخ بن کر یہ فقرہ اترا۔

اور ابھی ابھی جہاں شادیانے بج رہے تھے۔۔۔ وہاں بین کی آواز گونجنے لگی۔۔ آہ و بکا ہونے لگی۔

"اسے مرنا ہی چاہیئے تھا۔ اس کی یہی سزا تھی۔" عادل نے وہیں نیچے ڈال دیا۔

"نہیں نہیں۔۔" میاں جی بڑے زور سے چلائے "صاحباں نہیں مر سکتی۔۔ صاحباں ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔" وہ جھک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے صاحباں کو دیکھنے لگے۔۔ بڑی دیر دیکھتے رہے۔

"میری بیٹی دُلہن بنی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔۔ لیکن۔۔ یہ یہاں کیوں پڑی ہے۔ اسے گاڑی میں بٹھاؤ۔۔۔ اب۔۔ بارات رخصت ہو جانی چاہیئے۔"

میاں جی کی آنکھوں سے وحشت عیاں تھی۔

"یہ سب لوگ یوں اسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ نظر لگانی ہے اسے۔" میاں جی نے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ "چلے جاؤ یہاں سے سب چلے جاؤ۔" پھر یکایک ہی وہ چلانے لگے "ہمیں تماشا سمجھتے ہیں۔۔ ہم اسے رخصت کرانے آئے ہیں تماشا بننے نہیں آئے۔"

انہوں نے صاحباں کو بازوؤں پر اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کا بے جان وجود۔۔ بازو ڈھلک گئے۔۔ ٹانگیں لٹک گئیں۔ گھبرا کر میاں جی نے پیار سے واپس لٹا دیا۔

"یہاں نہیں۔۔ اس چارپائی پر ڈال دو۔" ملک جی نے کسی کو حکم دیا۔

"نہ نہ۔۔۔ کوئی میری بیٹی کو ہاتھ نہ لگائے۔۔ آج اس کی رخصتی ہے۔ اور میں۔۔ میں اکیلا رہ جاؤں گا بالکل اکیلا۔" اور یہ کہتے کہتے میاں جی رونے لگے۔۔ پہلے چند آنسو گرے قمیص میں جذب ہو گئے اور پھر۔۔۔ نجانے کیا ہوا۔ ایک دم ہی انہوں نے گریبان میں دونوں

ہاتھ ڈالے اور اسے چاک کر دیا۔۔ ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑاتے جا رہے تھے۔ گریبان چاک کرنے کے بعد وہاں سے مٹی اٹھا اٹھا کر سر میں ڈالنے لگے۔۔ اور اب۔۔۔ اب تو ان کے الفاظ کی بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا بول رہے تھے۔ کچھ عجیب بے ربط سی کوئی زبان بول رہے تھے۔

آنسو۔۔۔ قہقہے۔۔۔ شور۔۔۔ ہنگامہ۔۔

حارث پرے سرے پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میاں جی کی طرح اس کے سر پر جنون تو نہیں سوار ہوا تھا لیکن ہیجانی سی کیفیت میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" پاس کھڑے شاکر سے پوچھنے لگا۔

"صاحباں کو اس کے بابا نے زہر دے دیا ہے اور وہ۔۔۔ وہ۔۔"

نہ اس نے فقرہ مکمل کیا نہ مزید کچھ حارث نے پوچھا۔ ایک دم سہرا نوچ کر پرے پھینک دیا اور گلے میں پڑے طلائی ہار تار تار کر ڈالے۔

"دُلہن کو رخصت کرا کے لے جاؤ جتنی جلد ہو سکے۔۔" شاکر نے ہولے سے کہا۔

"اس حالت میں۔۔۔ مگر یہ تو۔۔۔ شاید۔۔۔ زندہ۔۔"

اور حارث چپ سا ہو گیا۔۔ آواز حلق ہی میں ڈوب گئی۔ صاحباں کو ایسی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اپنی بھی جان نکلی جا رہی تھی۔۔ صاحباں اگر سچ مچ مر گئی تھی تو وہ کیوں زندہ تھا۔۔؟ اس میں ابھی تک جان کیوں باقی تھی۔

ایک عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میاں جی منہ ہی منہ میں کچھ کہے جا رہے تھے اور خاک اُڑا اُڑا کر کبھی سر میں ڈالنے لگتے۔۔ کبھی رونے لگتے اور کبھی قہقہے لگانے لگتے۔۔۔

باقی سارے گاؤں کی عورتیں رو رہی تھیں۔ ایک ایک آ کر صاحباں کا چہرہ دیکھتی اور چیخیں مارتے ہوئے ہٹ جاتی۔ سکینہ کو غش آگیا ما۔ کچھ عورتیں اس کے ہاتھ پاؤں کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھیں۔ کچھ مُنہ میں پانی ڈال رہی تھیں۔ ساتھ ان کے آنسو بھی ٹپک رہے تھے۔ مگر ں کی بے ہوشی بدستور تھی، کسی بھی طرح ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

عادل اسی جگہ پر کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ساری صورتِ حال کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس نے خود بنائی تھی۔ نہ آنکھ میں آنسو تھا نہ ب پر آہ۔ بس ایک پتھر کا بُت تھا جو وہاں ایستادہ کر دیا گیا تھا۔ ہوش و حواس سے عاری۔

برات کے ساتھ آنے والے دوسرے لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ دیکھ رہے تھے۔ کیسے خوشیوں کی برات چلی تھی ہنسی قہقہوں اور بینڈ باجے کے ساتھ۔ اور اب۔ یہ کیسی رخصتی تھی۔؟

ملک جی نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک بزرگ کو معاملے کی نزاکت سمجھاتے ہوئے اصرار کیا کہ وداعی جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔

"وداعی ایک دُلہن کی ہوتی ہے۔ زندہ دُلہن کی۔ اور یہ کیسی وداعی ہے؟"

"ہم زبان دے چکے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہے آپ کو رخصت کرا کے لے جانا چاہیے۔ بہت جلد۔ ورنہ اور ہنگامہ کھڑا ہو گا۔ میاں جی لی دماغی حالت پہلے ہی بہت بگڑ چکی ہے۔"

"ہاں۔ میاں جی کو یہاں سے ہٹا لے جانا چاہیے۔" اس بزرگ کو اب خیال آیا۔

"جلد جلد گاڑیوں میں سوار ہو جائیے۔ واپسی میں دیر ہو رہی ہے۔"

سب لوگ پہلے ہی سہمے ہوئے تھے۔ واقعہ بھی تو انہونا اور انوکھا پیش آگیا تھا جو نہ پہلے کبھی سُنا نہ دیکھا۔ کان میں واپسی کی بات پڑی تو جلد جلد گاڑیوں میں سوار ہونے لگے۔

"تم اپنی گاڑی میں دُلہن کو لے کر بیٹھ جاؤ۔" شاکر نے حارث کا شانہ ہلایا۔ جو ہوش و حواس سے بیگانہ کھڑا ایک ایک کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ چونکا۔

"میں کہہ رہا ہوں دُلہن کو لے کر اپنی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

میاں جی ابھی تک جنونی انداز میں عجیب عجیب حرکات کر رہے تھے۔ شاکر نے قریب جا کر ان کا بازو تھاما اور ایک گاڑی میں لے جا کر بٹھا دیا۔ وہ واویلا مچاتے رہے۔ نجانے کیا کیا کہتے رہے لیکن ان کی کسی نے نہ سُنی۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے۔

"جتنی جلد ہو سکے انہیں کسی مینٹل ہاسپٹل پہنچا دیجیے گا۔"

شاکر اسی بزرگ کو ہدایت کر رہا تھا۔

"انشاء اللہ یہ جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" بزرگ نے دعا دیتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا حکم دیا۔

حارث ابھی تک وہیں کھڑا تھا جیسے زمین میں اس کے پاؤں پیوست ہو چکے تھے۔ میاں جی کو سوار کرانے کے بعد وہ مڑا۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔" شاکر نے حارث کا بازو پکڑ کر ایک زور کا جھٹکا دیا۔

"میں نے کہا نا دلہن کو اٹھاؤ ورنہ۔ اس سے بھی بڑا حشر ہو جائے گا۔"

"باقی کیا رہ گیا ہے۔" حارث نے آنکھوں کو میچ کر ایک طویل سا ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اس سے بھی بڑا کوئی حشر ہو گا؟"

"ہو سکتا ہے حارث میاں! ہو سکتا ہے۔ لیکن تم جلدی کرو۔"

شاکر نے تقریباً اسے جھنجوڑ سا ڈالا اور اب حارث کو قدرے ہوش آیا۔ شاکر کی بات پر عمل کر لینا چاہیے۔

اس سوچ کے ساتھ جلدی سے ہجوم کو چیرتا ہوا وہ آگے بڑھا اور صاحباں کے مردہ وجود کو بازوؤں پر اٹھا لیا۔ عورتوں کے رونے کی آواز بلند سے بلند تر ہو گئی۔

"گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اسے لے کر بیٹھ جاؤ۔"

شاکر شاید اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ اسی کی آواز تھی۔ حارث پاؤں رکھتا کہیں تھا اور پڑتے کہیں تھے۔

ہوش بے ہوشی کی ملی جلی کیفیت میں صاحباں کو اسی طرح بازوؤں میں سمیٹے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

برات دلہن کی رخصتی کرا کے واپس جا رہی تھی۔ عادل اسی طرح پتھر کے بت کی طرح کھڑا ان جاتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا سکینہ بے ہوش پڑی تھی۔

ملک جی نے خود سب براتیوں کو خدا حافظ کہہ کہہ کر سوار کرایا تھا اور اب جس گاڑی میں حارث تھا اس کی کھڑکی میں سر گھسیڑے ڈرائیو کرنے والے کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں ملک جی! میں انہیں بحفاظت منزل تک پہنچا کر دم لوں گا۔"

شاکر نے عجلت سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ سب سے پیچھے یہی تھی۔ لیکن چکر لگا کر سب سے آگے نکال لے گیا۔

اور پھر۔ اس گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہونے لگی۔ چند منٹ بعد تو پچھلی گاڑیوں والوں کو اس کی تارہ جیسی دونوں بتیاں بھی دکھائی دینا بند ہو گئیں تھیں۔

"اتنی تیز رفتار۔ حادثہ نہ ہو جائے۔" حارث ڈوبا ڈوبا سا بڑبڑایا۔

"حادثہ تو ہو بھی گیا۔" شاکر نے پیچھے دیکھنے والے آئینے کو تھوڑا سا گھما کر حارث کو دیکھا۔

"اوہ ہاں۔ حادثہ تو ہو بھی گیا۔"

حارث نے اپنی گود میں پڑے صاحباں کے بے جان وجود کو دیکھا۔

"بہت بڑا حادثہ۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"سب کچھ نہیں ختم ہوا۔ صرف میاں جی کی ذہنی حالت بگڑنے والا نقصان ہوا ہے باقی خیر گزری۔"

"باقی خیر گزری۔؟" حارث حیرت سے بڑبڑایا۔ پھر ایک نظر صاحباں کے وجود پر ڈالی۔ سر سے پاؤں تک غم کی ایک لہر دوڑ گئی اور آنکھوں کے آگے دھند کی ایک دبیز تہہ پھیل گئی۔

"یہ خیر گزری ہے؟"

"ہاں۔ صرف بے ہوش ہوئی ہے کسی نے اس کی طرف پوری توجہ ہی نہیں دی۔ ایک منہ سے آواز نکلی مر گئی۔ تو یہی بات پھیل گئی اور اچھا بھی ہوا۔"

"کیا مطلب۔؟" حارث نے چونک کر صاحباں کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے! اس کی نبض تو چل رہی ہے۔" مسرت کی ایک طویل سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ لیکن نبض کی رفتار کچھ سست سی تھی۔ مسرت گھبراہٹ میں بدل گئی۔

"اسی لیے یہ تو گاڑی میں چلا رہا ہوں۔ رفتار تیز کر کے جلد از جلد کسی قریبی ہسپتال میں پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یہ سب ہو کیسے گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

حارث کے پوچھنے پر شاکر نے ساری تفصیل سنا دی۔

"بات عادل کی بھی ٹھیک تھی۔ تصور آباد کی لڑکیوں کے لیے عبرت کا کوئی نہ کوئی سامان ہونا چاہیے تھا ورنہ۔۔"

"ورنہ۔ کیا۔۔۔؟"

"سب للچائی ہوئی نگاہوں سے صاحباں کو دیکھتی تھیں۔ تم شہزادوں ایسے اس کے خوبرو دلہا کو دیکھتی تھیں۔" شاکر نے نگاہ بھر کر حارث کے حیران پریشان مگر بے حد وجیہہ چہرے کو دیکھا۔ بات سچ بھی تھی۔

"اوہ۔۔۔"

"اور صاحباں اکیلی کی زندگی کا سوال نہیں تھا کہ عادل کو من مانی کر لینے دیتے۔ تم تھے۔ تمہاری ماں تھیں اور میاں جی تھے۔"

"پھر۔۔۔؟"

"تم سب کی خاطر۔ اور کچھ اپنے جذبوں کی خاطر۔ ہمیں بھی صاحباں کی زندگی عزیز ہو گئی تھی اور جس دن عادل نے ملک جی سے اسے پنچایت میں کھڑا کرنے کو کہا ہمیں اسی دن اس کی نیت کا علم ہو گیا تھا اور اسی دن سے ملک جی نے اس کے پیچھے مجھے لگا دیا تھا۔ وہ بات کا دھن کا پورا ہے اور انصاف کے معاملے میں بہت پکا ہے۔ بیٹی کی خاطر زہر خرید کر لایا۔ جسے بڑی مشکل سے میں خواب آور پسی ہوئی گولیوں کے ساتھ بدلا۔ موقع ہی نہیں دیتا تھا۔"

"اوہ شکر ہے۔" حارث کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"اب سارا گاؤں یہی جانتا ہے کہ صاحباں مر گئی۔ صرف ملک جی ملک سہیل اور میں۔ ہم تینوں کے راز میں ہمیشہ یہ بات رہے گی۔ بے شک یوں صاحباں تصور آباد والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے گی۔ مگر۔ عادل جو کچھ چاہتا تھا اس کے مطابق گاؤں کی باقی لڑکیاں تو عبرت پکڑ ہی لیں گی۔"

"اور۔ اور میرے میاں جی نے بھی تو اپنے گناہوں کے لیے سنگسار ہونا تھا۔ وہ اس صورت میں ہو گئے۔" حارث کرب ناک لہجے میں بولا۔

"خدا جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ تمہاری شادی کے بعد بردہ فروشوں کے پورے کے پورے گروہ کو میں قانون کے حوالے کرنے والا ہوں۔ پورے ثبوت و دلائل کے ساتھ۔ اس صورت میں کیا پتا میاں جی پر بھی گرفت ہوتی مگر اب۔ دماغی توازن ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے بچ جائیں گے اور ان کے بچ جانے سے خاندان میں اور ملنے جلنے والوں میں عزت قائم رہ جائے گی۔"

"ہاں۔۔ شاید۔"

"اپنی دلہن کی نبض دیکھنا ذرا۔" شاکر نے گاڑی کی رفتار مزید تیز کرتے ہوئے کہا۔

"نبض چل رہی ہے لیکن مدھم ہے۔ خدارا جلد چلیے۔ رفتار اور تیز کر دیں۔ اور تیز کر دیں۔"

بے اختیار حارث نے صاحباں کا سر سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

اور شاکر کی نگاہ آئینے پر جا پڑی۔ ارد گرد سے بے خبر حارث اب جھکا ہوا دیوانوں کی طرح اسے چوم رہا تھا۔

"شکر ہے تم زندہ ہو ورنہ میں بھی مر جاتا۔ ہاں۔ میں بھی مر جاتا۔ میں نے سوچ لیا تھا سب کچھ۔"

بڑبڑاتے ہوئے وہ پھر اس پر جھکا۔ شاکر نے آئینے کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔

اور تیز۔

